انشائے ماجد

یا

لطائفِ ادب

انشائے ماجد

یا

لطائفِ ادب

از

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ترتیب

حکیم عبدالقوی دریابادی

ناشر:

ادارۂ انشائے ماجدیؒ، کلکتہ ۳ے

سنہ اشاعت ۱۹۹۱ء

تعداد ——— ایک ہزار

کتابت ——— عمران علی نمبر ۶ مفید الاسلام لین، کلکتہ ۱۶

طباعت ——— کیلیگراف آفسیٹ پرنٹرس، کلکتہ ۱۶

صفحات ——— ۵۰۶

قیمت ——— ۱۵۰ روپے (ایک سو پچاس روپے)

باهتمام:

منظور علی لکھنوی

ناشر:

اِدارہ انشائے ماجدی نمبر ۱۴۷ رابندر سرانی، کلکتہ ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اردو کے ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ادبی نوشتوں کے دو مجموعے انشائے ماجد حصہ اوّل اور انشائے ماجد حصہ دوم کے دو ناموں سے شائع ہو کر بڑی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ اب ان ہی دونوں حصّوں کو یکجائی طور پر چند بعد میں شائع ہونے والے مضامین کے اضافہ کے ساتھ ادارہ کے دوسرے مطبوعات کی طرح عمل میں لائی گئی ہے۔ دونوں حصّوں کے اختتام کے بعد چار نئے ادبی مضامین جو صدق جدید میں شائع ہو چکے تھے درج کیے گئے ہیں ان میں مولانا کا وہ آخری بے مثال شاہکار بھی شامل ہے جو انھوں نے دار المصنفین اعظم گڑھ کے جشن گولڈن جبلی میں مولانا شبلی پر اپنی زبان سے پڑھا تھا۔ ادارہ انشائے ماجدی نے اس کتاب کی اشاعت میں کتابت و طباعت کی ان ساری نفاستوں اور لطافتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے جو اس کی اس سلسلہ کی پچھلی مطبوعات میں موجود تھیں۔

اُمید ہے کہ انشائے ماجد کا یہ نیا ایڈیشن جس کا دوسرا نام اس پیش لفظ نگار نے "لطائف ادب" رکھا ہے دُنیائے ادب میں حُسن قبول حاصل کرے گا۔

حکیم عبدالقویؒ دریابادی

مدیر صدق جدید لکھنؤ

سنہ ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

خدا کی شان، ایک کم سواد، کم استعداد، قصباتی، دیہاتی کو بھی اس کا حوصلہ کہ اپنا نام ادیبوں، انشا پردازوں کی فہرست میں لکھائے اور دل میں ولولہ کہ زبان وادب کی خدمت کرنے والوں کی صف (صفِ آخر سہی) میں جگہ پائے۔

"اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے"

اسرائیلیوں کی زبان میں لو اور سلو، میاں طالوت کا شمار بھی پیمبروں میں ہونے لگا۔ مصر کی غریب ضعیفہ کو شوق یوسفؑ کی خریداری کا چرایا۔

اہلِ کرم کی ذرہ نوازی، دوستوں کی بے جا مدح وحوصلہ افزائی اور پھر اپنا ذوقِ نمائش، یہ سب مل ملا کر جو بھی کر گزریں، تھوڑا ہے۔

پرانے اور نئے ایسے مضمون جنھیں کچھ نہ کچھ مناسبت ادب وزبان سے ہو، اڑائے، یہ ٹھہری کہ یکجا کر لئے جائیں بعض ان میں کے نسبتہً حال کے ہیں اور بعض ۳۰، ۳۵ سال قبل کے اتنے عرصہ میں قلم کا مذاق کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس لیے نظرِ ثانی، اور وہ بھی جزئیات کی حد تک ان قدیم تحریروں پر بھی کر لی گئی، کہ طرز وعبارت میں یکسانی کسی درجہ میں تو پیدا ہی ہو جائے مجموعہ کانٹ چھانٹ کے بعد کم سے کم تین جلدوں میں آ پایا ہے۔

پہلی جلد حاضر ہے، دوسری جلد بھی انشاء اللہ جلد ہی پیش ہو جائے گی، اس کے بڑے عنوانات حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) چند مقالے و مرزا رسوا کے قصے۔ نیا آئین اکبری۔ پریم چند وغیرہ

(۲) چند نشریئے (ریڈیو سے نشر کی ہوئی تقریریں)

پھر اس کے بعد، بہ شرط زندگی نمبر تیسری جلد کا آئے گا۔ جو با کمال اس میٹھی پھیکی غذا پر منہ بنائیں گے،

وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے وہ کرم فرمائی اور صفت ستاری کا نقش بٹھا دیں گے مقام عدل و مقامِ فضل دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے خوب تر ہے اور اُس سے اعلیٰ و برتر۔

عبدُالمَاجِد

دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

فروری ۱۹۶۱ء

فہرست مضامین

نمبر شمار — نمبر صفحہ

عرض حال

پیش لفظ

چند مقالے

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	غالب کا ایک فرنگی شاگرد	۱۱
۲	پیام اکبر	۱۹
	(ا) ظرافت و زندہ دلی	۲۰
	(ب) سیاسیات	۴۶
	(ج) عشق و تغزّل	۶۴
	(د) اخلاق و معاشرت	۸۰
۳	اردو کا ایک بدنام شاعر یا گنہگار شریف زادی	۱۱۵
۴	الفاظ کا جادو	۱۳۶
۵	جھوٹ میں سچ	۱۴۱
۶	بہار کی بہار	۱۵۰
۷	ایک مختصر پیام یوم اکبر منانے والوں کے نام	۱۵۸
۸	مرزا رسوا کے قصے (کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے)	۱۶۴
۹	اردو کا واعظ شاعر	۱۹۷
۱۰	پریم چند	۲۲۰
۱۱	نیا آئین اکبری	۲۳۱
۱۲	موت میں زندگی	۲۴۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱۳	ایک بزم مشاعرہ کی غیر شاعرانہ صدارت	۲۶۰
۱۴	ایک مختصر پیام (یوم اُردو منانے والوں کے نام)	۲۶۳
۱۵	مرزا ثاقب	۲۶۶
۱۶	پیام نوجوانانِ علیگڈھ کے نام	۲۷۰
۱۷	سید جالب مرحوم	۲۷۲

اضافات

۱	ایک جشن جُبلی	۲۷۸
۲	شبلی	۲۸۱
۳	امراؤ جان ادا کے نئے اڈیشن	۲۹۴
۴	خیر مقدم لکھنؤ کی زبان سے	۳۰۱

چند مُقدّمے

۱	کلام جوہر	۳۰۶
۲	سیرت محمد علی	۳۲۱
۳	عُروس ادب	۳۲۷
۴	مسدّس حالی	۳۲۹
۵	سفر سعادت	۳۳۴
۶	سیرت سیّد احمد شہیدؒ	۳۳۸
۷	تاریخ نظم اُردو	۳۴۰
۸	مُسلمان اور آزادی کی جنگ	۳۴۷
۹	نواب جمیل الشّان	۳۵۰
۱۰	مُداوا	۳۵۲

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ

چند تبصرے

۱	مرزا بلگرامی	۳۵۴
۲	ملیٹھی کنین یا افسانۂ جمیل	۳۶۲
۳	نغمۂ زندگی	۳۶۸
۴	نقد و نظر	۳۷۰
۵	جزیرۂ سخنوراں	۳۷۲
۶	خنداں	۳۷۴
۷	گنجہائے گرانمایہ	۳۷۵
۸	ہم اور وہ	۳۷۶
۹	دلّی کا سنبھالا	۳۷۷
۱۰	شرح درد	۳۷۹
۱۱	ناکام	۳۸۰
۱۲	نزول رحمت معروف بہ میلاد شریف	۳۸۳
۱۳	چند افسانے	۳۸۵
۱۴	شیش محل	۳۸۶
۱۵	اعمال نامہ	۳۸۸
۱۶	رسالہ کلیم دہلی	۳۹۰
۱۷	انشاء	۳۹۲
۱۸	چند ہمعصر	۳۹۳

چند نشریئے

۱	ہماری زندگی اور اس کے رنگ ڈھنگ	۳۹۴

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۲	سائنس پر ایک مکالمہ	۴۰۰
۳	مولانا محمد علیؒ	۴۰۸
۴	امیر خسرو بزرگ درویش کی حیثیت سے	۴۱۴
۵	محمد علی کے خطوط	۴۱۹
۶	غالب کا فلسفہ	۴۲۸
۷	"شکوہ" اور "جواب شکوہ"	۴۳۳
۸	آدمی نامہ	۴۳۵
۹	نظیر اکبر آبادی کی دلچسپی عام چیزوں سے	۴۳۷
۱۰	اکبر الہ آبادی	۴۴۲
۱۱	"دلم در عاشقی آوارہ شد"	۴۴۶

چند مرثیے

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	عبدالرحمٰن کی موت	۴۵۱
۲	محمد علیؒ	۴۵۹
۳	راجہ علی محمد خاں	۴۶۵
۴	ہمنام نامور	۴۶۹
۵	خوش نصیب گول کیپر	۴۷۳
۶	شوکت علی	۴۷۸
۷	طبیب کی موت	۴۸۴
۸	ماں کے قدموں پر	۴۸۶
۹	سر سکندر حیات	۴۹۰
۱۰	نئی نویلی	۴۹۲
۱۱	قائدِ ملت	۴۹۴
۱۲	ہمشیر کی رخصتی	۴۹۸
۱۳	ایک قوال	۵۰۰
۱۴	جشن نوشابہ	۵۰۲
۱۵	یادِ عنم	۵۰۵

(۱) چند مقالے

غالبؔ کا ایک[1] فرنگی شاگرد

آزاد فرانسیسی

پچھلے نمبر کے شذرات (معارف) میں اُردو کے چند فرنگی شاعروں کا جو مختصر تذکرہ آگیا تھا۔ ناظرین کرام نے اس سے دلچسپی کا اظہار کیا اور احباب کو یہ داستان خوشگوار اور پر لطف معلوم ہوئی۔ ان حضرات کی ضیافت ذوق کے لیے ایک فرنگی شاگرد کا ذکر کسی قدر تفصیل کیساتھ کیا جاتا ہے۔

الگزینڈر ہیدرلی ایک فرانسیسی خاندان کے رکن[2] تھے۔ ولادت غالباً ہندستان ہی میں ہوئی تھی۔ سال ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء۔ اٹھارہ سال کی عمر سے اُردو کی شاعری کا شوق پیدا ہوا مشورۂ سخن کے لیے کلام نواب زین العابدین خاں عارفؔ[3] (شاگرد عزیز مرزا غالب) اور خود غالبؔ کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ ان حضرات کا فیض توجہ کہئے، یا خود آزاد کی طباعی کہ کچھ ہی روز میں اچھی خاصی مشق کرلی اور کلام میں وہ پختگی آگئی، جو ایک غیر قوم کی فرد کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کل ۳۲ سال کی عمر میں ۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ تاہم اس نو عمری میں کلام کا مجموعہ جس قدر

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) جنوری ۱۹۲۲ء

[2] تذکرہ خمخانۂ جاوید، از لالہ سری رام ایم۔اے۔

[3] یہ وہی عارفؔ ہیں جن کی جوان مرگی پر غالبؔ نے اپنا وہ مشہور مرثیہ کہا ہے ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان غالبؔ 'اُردو' میں درج ہے)

ہو گیا تھا وہ اوسط ضخامت کے دیوان کے لیے کافی تھا چنانچہ وفات کے دو ہی برس بعد ان کے برادر کلاں طامس ہیدرلی نے اس دیوان کو شائع کر دیا۔

تخلص آزاد کرتے تھے۔ اس لئے دیوان بھی دیوان آزاد کے نام سے موسوم ہے ضخامت ۷۰ اصفحہ ہے۔ مطبع احمدی آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اب بازار میں نایاب ہے۔ میرے پیش نظر کتب خانہ سرکاری رامپور کا نسخہ ہے۔

ابتداء میں دو دیباچے ہیں۔ پہلا دیباچہ فارسی میں منشی شوکت علی ساکن شاہپور ضلع فتحپور کا ہے۔ اب یہ صاحب خود گمنام اور محتاج تعارف ہیں۔ اپنے زمانہ میں مشہور منشیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ طرز بیان وقت کے عام تقریظ نگاروں کے دستور کے مطابق شاعرانہ ہے اور بعض بیانات اچھے خاصے مبالغہ آمیز۔ حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"فتائے ہنر مند و گوہر ذکا پیوند، خداوند عقل و تمیز صاحب فراست و ہر دلعزیز، مستعد ازلی الگزینڈر ہیدرلی کہ ذہن و ذکا، و خلقش خمیر بود و سعادت و مروت در ضمیر جا پذیر در سنِ سیزدہ سالگی بہ شنیدن اشعار اساتذہ متقدمین و متاخرین طبع وقادش در تحصیل کمالش توجہ نمود گاہ گاہ ہنگام فرصت، مطالعہ تصانیف اوستاداں پرداختے، و با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ غالب متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارف کہ ہر دو حضرات از اکابر الامراء والا دودمان دہلی بودند بذریعہ مراسلات و مکاتبات استمداد سخن داشتے۔"

آگے چل کر اسی دیباچے میں یہ ذکر ہے کہ ہیدرلی کو طب میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ مریض عموماً ان کے علاج سے شفایاب ہوتے تھے، مزاج میں سخاوت و فیاضی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ دوائیں بلا قیمت تقسیم کرتے اور دوسرے طریقوں سے بھی غریبوں کی دستگیری کرتے رہتے خود عسرت سے بسر کرتے، لیکن دوسروں کی حاجت روائی کے لئے قرض لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ریاست الور میں توپ خانہ کے کپتان مقرر ہو کر گئے۔ اسی سال وفات پائی۔

دوسرا دیباچہ اردو میں ہے یہ آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیدرلی کے قلم سے نکلا ہے۔ یہ ریاست بھرتپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ دیباچہ ذیل میں تمام و کمال درج کیا جاتا ہے آج سے سو سال قبل کی ایک فرانسیسی کی اردو نثر کا نمونہ بجائے خود ایک یادگار شے ہے

نیاز مند درگاہ لم یزلی طامس ہیڈرلی ابن مسٹر جیمس ہیڈرلی مرحوم بیان کرتا ہے اور اپنا راز دل صاحب دلوں پر عیاں کرتا ہے کہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی کپتان الگزینڈر ہیڈرلی جواں سعادت مند شیریں زباں دانش پیوند ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا مائل ہوا اور چند روز میں جیسا چاہئے مایۂ سخنوری و معنی گستری اس کو حاصل ہوا کیونکر نہ ہو طبیعت درّاک تھی۔ فکر چالاک تھی۔ جو کچھ دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا۔ اس نے گلہائے معنی کا ایک تختۂ خوش رنگ دکھایا رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنوں کو رشک ہوا اور دانشمندوں کو حیرت ہوئی۔ نواب زین العابدین خاں دہلی کے امیر زادہ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد تھے وہ اس کے اُستاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے اُستاد اور اپنے اُستاد کے اُستاد کے انداز پیشِ نظر اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے۔ ہنوز برادر موصوف بہت کچھ کہنے نہ پایا تھا بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اس کے دل میں تھا، ابھی اس کی زبان پر نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر آپہنچا اور اس سعادت مند ازلی کو پیغام اجل آپہونچا۔ چونکہ سرکار الور میں عہدۂ کپتانی پر مامور تھا۔ دنیا سے سفر کرتے وقت میری نظر سے دُور تھا۔ ایسا لائق ہونہار بھائی جس نے کل دو اُوپر تیس برس کی عمر پائی۔ ساتویں جولائی ۱۸۶۱ء کو اس کا کام تمام ہوا۔ اس غم کا جس قدر بیان کیجئے اس سے سوا ہے، جو اپنا حال بنا ہے۔ اور جس قدر غم کیا جائے بجا ہے۔ ع ایں ماتم سخت است کہ گویند جوانمرد، افسوس نہ فریاد میں فائدہ دیکھا نہ رونے میں تاثیر پائی، بہت روئے پیٹے آخر صبر کرتے بن آئی۔ اشعار اس مرحوم کے جو پریشان جا بجا پڑے پائے گویا سونے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے جڑے پائے۔ خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا نہ رہنے دیجئے اور ان سب اشعار کو ردیف وار جمع کرکے دیوان مرتب کیجئے تاکہ جو کوئی دیکھے وہ کہے کہ اگرچہ اس شخص کی تھوڑی زندگی تھی مگر واہ اس قلیل مدت میں کیا گہر افشانی تھی۔ نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے مجھ کو یہ یقین ہے کہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے گئے ہیں سو اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے ہیں۔ الٰہی یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخنور ہو اور الگزینڈر ہیڈرلی کی روح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت میسر ہو۔

دیوان کی ابتدا "قصیدہ حمد و وحدت" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد "مسدس نعت مسیح" ہے۔ انہی صفحوں میں مختلف اعزہ، احباب اور والیان ریاست کی شان میں قصیدے ہیں۔ بعض اچھے خاصے

طویل ہیں صفحہ ۵۶ تک دیوان غزلیات ہے۔ باقی صفحہ ۶۵ تک متفرق قطعہ، مخمس، مرثیہ وغیرہ ہیں، حمد میں بالکل وہی رنگ ہے جو ایک مسلمان شاعر کا ہوتا ہے۔ توحید باری کی توصیف ہر شعر میں ہے اور اس پر طرح طرح کے شاعرانہ استدلال کئے ہیں مسدس مسیحی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کا رنگ بالکل وہی ہے جو مسلمان شعراء کا نعت محمدی میں ہوتا ہے۔ وہی ذوق و شوق وہی تضرع والحاح اور وہی وابستگی و اعتماد شفاعت۔

تیری رحمت حامی رزق گدایاں یا مسیح　　تیری بخشش تاج بخش تاجداراں یا مسیح
تیری شفقت ہر کس و ناکس کی خواہاں یا مسیح　　ہے تجھی سے نیک و بد کی مشکل آساں یا مسیح
ساقی کونین و شاہ دو جہاں تو ہی تو ہے　　یا مسیحا چارہ ساز عاصیاں تو ہی تو ہے

(زبان میں اگر کوئی ناہمواری نظر آئے تو زبان داں حضرات گرفت کرنے سے پیشتر یہ یاد کر لیں کہ شاعر ایک غیر ملک اور غیر قوم کا شخص ہے۔ جس کی مادری زبان کو اردو سے کوئی مناسبت نہیں)

ایک اور بند اسی مسدس کا ہے:-

خسروا از بسکہ ہیں میری خطائیں بے حساب　　عاصیان دہر میں اصلا نہیں میرا جواب
قابل دوزخ ہوں میں اور لائق قہر و عتاب　　عین نصفت ہے جہاں تک مجھ پہ ہوں رنج و عذاب
اور کچھ چارہ نظر آتا نہیں اپنا مجھے　　تیری اُلفت پر توکل ہے شفاعت کا مجھے

ایک مخمس میں مرزا غالب کی غزل "تمھیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے" کی تضمین کی ہے۔

پہلا بند یہ ہے:-

بلا سے میں نہ سہی خاک بھی، عدو کیا ہے　　تمھیں اسی کی قسم اسکی آبرو کیا ہے
زبان شوخ بیاں کا یہ حُسن خو کیا ہے　　ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آخری بند یہ ہے:-

کہا جو میں نے کہ غالب نظر نہیں آتا　　نیاز آپ کی خدمت میں اب نہیں لاتا
تو بولے بھید کو آزاد تو نہیں پاتا　　ہوا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ایک اور مخمس میں ناسخ کی مشہور غزل "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا" کی بھی تضمین ہے۔
اپنے استاد نواب زین العابدین خاں عارف کا طویل مرثیہ کہا ہے اور بعض بعض شعر خوب نکالے ہیں، نمونہ حاضر ہے :-

اے اہل دید دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج — میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج
یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے تھے انتظار — لو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج
مردے عجب ہے گر نہ اُٹھیں جی کے قبر سے — ہم بانگ صور نالۂ اہل عزا ہے آج
ماتم سے کیوں نہ دہر میں پڑ جائے زلزلہ — تشہیر بے ثباتی ارض و سما ہے آج
پھر ہوگا شور خلق میں طوفان نوح کا — اے اہل گریہ گریہ ہی جوش بکا ہے آج
اے جذب اتحاد یہی ہے مدد کا وقت — وہ غم میں ہم کو چھوڑ کے تنہا چلا ہے آج
اے جاں زار جانے میں یہ دیر حیف حیف — کچھ بھی سر وفا تجھے اے بے وفا ہے آج

غزلیں اکثر غالب کی زمینوں میں کہی ہیں، اور ان میں صفائی بیان اور سلاست روانی و شستگی زبان کا سر رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کہیں کہیں مضمون بھی بہت لطیف پیدا کیا ہے۔ بعض اشعار حسن تعلیل کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ایک غزل غالب کی مشہور غزل "جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا" پر ہے :-

میں نہ وحشت میں کبھی سوئے بیاباں نکلا — واں سے دلچسپ مرا خانہ ویران نکلا
واعظوں سے جو سنا کرتے تھے جنّت کا بیاں — جب کہ تحقیق کیا کوچۂ جاناں نکلا
اس کی جا آج درِ یار پہ بیٹھا ہے رقیب — خاک خوش ہو وہیں جو کل یار کا درباں نکلا
وہ رخ ہوش ربا دیکھ کے کب ہوش رہا — وصل میں بھی تو نہ دل کا کوئی ارماں نکلا

اشعارِ ذیل ایک شاعر نامدار اور اہل زباں کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

شکل قاصد نظر نہیں آتی — نہیں آتی خبر نہیں آتی
وہ بلا کون سی ہے صحرا میں — جو کبھو میرے گھر نہیں آتی

ایک طویل غزل کا اقتباس یہ ہے :-

خوش ہوں مشکل سے کوئی کام جو آساں ہوتا — دور افلاک کا شرمندۂ احساں ہوتا

اب تو تا حشر نہیں ہے کوئی مرنے کا سبب — تھا مرے حق میں جو ہوتا شب ہجراں ہوتا
اہل جنت سے مری روز لڑائی ہوتی — خلد بالفرض اگر کوچۂ جاناں ہوتا
ہم بھی مجنوں کی طرح خاک اُڑاتے پھرتے — ہوتے ویران اگر گھر نہ بیاباں ہوتا
دیکھتے وہ کبھی آئینہ کے دھوکے میں اگر — میں جو بیتاب ہوا کاش کہ حیراں ہوتا
کس سے بہلائیں سگ یار کو عریانی میں — آج کام آتا وہ آزاد جو درباں ہوتا

تیسرا شعر غالباً غالبؔ کے اس شعر کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

تقدیر پہ شاکر رہے راضی برضا ہم — اب کس کی شکایت کریں اور کس کا گلہ ہم
مت حسن پہ بھولو کہ دکھا دیں گے یہ تم کو — کرتا ہے وفا حسن کہ کرتے ہیں وفا ہم
مشہور ہو سر حلقۂ ارباب جفا تم — معروف ہیں منجملہ اصحاب وفا ہم
ہیں شمع صفت انجمن دہر میں آزاد — سرگرم رہِ وادیِ اقلیم فنا ہم

غالبؔ ہی کی زمین میں ذیل کے دو شعر بھی سُننے کے قابل ہیں :-

نہ دے جو بوسۂ گیسو نہ دے جواب تو دے — بلا سے جو تجھے دینا ہو دے شتاب تو دے
حقیقت دل خوں گشتہ سر بسر ہو عیاں — ذرا وہ طرہ پرخم کو پیچ و تاب تو دے

متانت وسنجیدگی جو اکثر دہلی والوں کا حصہ ہے۔ آزاد کے ہاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وصل کے بے پردہ مضامین، بازاری محاورہ، ہوس پرستی اور عامیانہ لفظوں اور ترکیبوں سے ایک بڑی حد تک ان کا کلام پاک ہے۔ وہ عاشق ہیں مگر شریف عاشق وہ معشوق رکھتے ہیں مگر ان کا معشوق زن بازاری نہیں، وہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے مغربی ہیں۔ مگر ان کی شاعری میں مشرق کی بلند پایہ عاشقانہ شاعری کی جھلک پوری طرح موجود ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان کے منقولہ بالا کلام سے ہوگا اور مزید ثبوت آیندہ اشعار سے ملے گا۔

ہے مگر یہ نہیں ظاہر کہ کہاں — زخم پنہاں ہے کہ ہے مسکنِ جان
دل وہ دل ہے کہ سدا غم سے گداز — چشم وہ چشم کہ خونناب فشاں

مے کشو دین ہے کتنا سستا | ایک ساغر ہے بہائے ایماں
ہم نے اس شوخ کو دل میں رکھا | جب نہ پایا کوئی خلوت کا مکاں
طبع کو صرف دعا کر آزاد | ہو چکا حال و حقیقت کا بیاں

مومن خاں کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے :۔

دلبستگی سی ہے کسی زلف دوتا کے ساتھ | پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ

اس زمین میں دہلی کے متعدد شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں سالکؔ و انورؔ کی غزلیں اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، مرزا غالبؔ کی بھی غزل دیوان ناظمؔ (نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور) میں ملے گی۔ آزادؔ نے بھی اس زمین پر ایک باغ لگا دیا ہے۔ بعض اشعار کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

اڑتا ہے جسم زار ہمارا ہوا کے ساتھ | چلتے ہیں تیرے کوچہ میں باد صبا کے ساتھ
بے اعتنائیوں میں بھی کیا کیا لگاؤ ہیں | ہیں کج ادائیاں تری کس کس ادا کے ساتھ
جو ہیں، سو بس یہی ہیں مرے مشت استخواں | ہو جا شریک اے سگ جاناں ہما کے ساتھ
گویا مرا نوشتۂ تقدیر ہو گیا | وہ ربط ہے جبیں کو ترے نقش پا کے ساتھ
میں جانتا ہوں جان سے تم کو عزیز تر | اُلفت ہوئی ہے جب تو ہوئی بیوفا کے ساتھ
عشق بتاں میں وہم سے ہوں اپنے بدگماں | کیا ورنہ دشمنی مجھے خلق خدا کے ساتھ

غالبؔ کی اس غزل پر "تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے" آزاد نے ایک دو غزلہ کہا ہے۔ چند شعر یہ ہیں :۔

قانع ہوں اس پہ عشق میں جو خشک و تر ملے | کھانے کو داغ پینے کو خون جگر ملے
بے درد ہو نصیب مرے مدّعی کو دل | بے داغ دشمنوں کو ہمارے جگر ملے
حاصل زبس خلاف تمنا ہے کام دل | جب ہو وے زہر کی ہمیں خواہش شکر ملے
آزاد کس کا شیخ و برہمن نہ ان سے پوچھ | ہے مفت دین جا کے بھی وہ بت اگر ملے
افسوس خاک تک نہ ہمیں بہر سر ملے | وہ لوگ بھی ہیں جن کو اڑانے کو زر ملے
بس ہو گیا یقین کہ یہی راہ یار ہے | دل جا بجا پڑے جو سر رہگذر ملے

پھرتا ہے تو تو خلق کی آنکھوں میں اے فن — روئے زمین یہ کس کو ترا رہگذر ملے

آزاد ہم تو آج گزر جائیں جان سے — کوئے صنم میں جا پئے مدفن اگر ملے

اس میں شبہ نہیں کہ دیوان آزاد میں جا بجا لفظوں اور ترکیبوں کی غلطیاں ملتی ہیں (کس کے ہاں یہ نہیں ملتیں ؟) اور بندش تو بہت سے مقامات پر سست نظر آتی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ کلام ایک ہندی کا نہیں فرنگی کا ہے جس کو جوانمرگی نے مشاقی کا بھی پورا موقع نہ دیا، دیوان آزاد کو بحیثیت مجموعی بہت غنیمت بلکہ قابل قدر سمجھنا چاہئے۔

اردو کے مغربی شاعروں میں ایک اور "صاحب" کا دیوان نظر سے گذرا ہے۔ دیوان شور اصل نام مسٹر جارج پیس تھا۔ غالباً میرٹھ میں قیام رہتا تھا۔ دیوان دو حصوں میں ہے پہلے حصے کی ضخامت کا خیال نہیں، دوسرا حصہ ۲۲۸ صفحوں میں آیا ہے اور ممتاز المطابع پریس میرٹھ میں خود مصنف کی حسب فرمائش ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا ہے۔ لیکن کلام بہت معمولی ہے۔
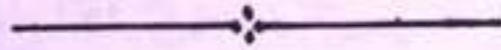
پیامِ اکبر

یعنی

حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیات سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبرؔ مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل و نظر کہیں مدتوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات ایک طرف شوخی و زندہ دلی، اور دوسری طرف حکمت وروحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یوں کہیئے کہ ایک طرفہ معجون آخر آخر ان کی شاعری نہ شاعری رہی تھی، نہ ان کا فلسفہ، فلسفہ ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود مجسم حکمت و معرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جامع تھی حکمت و ظرافت کی، ان کی صحبت ایک زندہ درس گاہ تھی تصوف و معرفت کی روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے، اور باتوں باتوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے، جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی نہ حل ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنھیں ان کی خدمت میں نیازمندی کا شرف حاصل تھا جن کی رسائی اس چشمہ حیات تک نہ ہوسکی، انہیں آج اپنی نارسائی و محرومی پر حسرت ہے، اور جن کی ہو چکی تھی انہیں یہ حسرت ہے کہ وہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہوئے۔

اکبر کے مجموعہ کلام پر تفصیلی تبصرہ کے لیے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چھپا ہوا کلام اس وقت تک تین جلدوں میں ہے اور جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے وہ بھی اتنا کہ کہ اگر دو جلدیں نہیں تو ایک کے لیے تو بالکل کافی ہے۔ رسالہ[1] کی محدود گنجائش میں سارے ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں یہاں صرف اس حصہ کلام پر نظر کی جائے گی جو انھوں نے تقریباً ۱۹۱۴ء سے لے کر آخر ۱۹۱۹ء

[1] رسالہ اردو اورنگ آباد (دکن) اکتوبر ۱۹۲۲ء، اپریل ۱۹۲۳ء۔

تک فرمایا۔ اس دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ[۱]، ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتدبہ ذخیرہ کلام اس کے بعد کا بھی ہے یعنی سنہ ۱۹۲۰ء سے لے کر عین وقت وفات ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء تک کا ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہو جائے۔ لیکن ابھی تک کہ مرحوم کی وفات کو ۲۳ سال گذر چکے ہیں، مسودہ کی حالت میں ہے، اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں[۲]۔

بہتر ہوگا کہ ان کی شاعری کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے بھی ہونا لازمی ہیں، جو ایک عنوان کے تحت میں آئیں گے۔ اور دوسرے کے بھی۔ مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے انہیں بار بار لانا پڑیگا اور تکرار بیان ایک حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبر کی کتاب شاعری کے پانچ باب بآسانی قرار دئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی

(۲) سیاسیات

(۳) عشق و تغزل

(۴) اخلاق و معاشرت

(۵) تصوف، معرفت و فلسفہ

ان میں سے ہر عنوان پر الگ الگ گفتگو مناسب ہوگی۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی

اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی، ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے۔ اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے

---

[۱] حضرت اکبر بڑے ہی پرگو، بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کرتے جاتے اور شعر کہتے جاتے لیکن کلام کا ایک خاصا حصہ ایسا بھی ہوتا جسے صرف نجی کی محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخصوص دوستوں ہی کو سناتے عالم اشاعت کے روادار اس حصہ کلام کے لیے کسی حال میں بھی نہ ہوتے۔

[۲] بحمد اللہ یہ چوتھا حصہ بھی سنہ ۱۹۵۱ء میں کراچی سے شائع ہوگیا۔

ان کو جانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے ان کو پہچانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے۔ لیکن جس زمانہ کے کلام پر یہاں خصوصیت کے ساتھ تبصرہ مقصود ہے۔ یہ زمانہ ان کی ظرافت کے شباب کا نہ تھا۔ جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی۔ صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا، سوز عشق نے سینہ کو گرمایا، ذوق عرفاں نے دل کو تڑپایا اور نور معرفت کی شعاعیں خود ان کے مطلع قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھیں قریب تھا کہ چکاچوند میں پڑ جائیں۔ یہی تو بات ہے کہ کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید ۱۰ فیصدی بھی نہ نکلیں[1] حالانکہ کلیات اوّل و دوم میں ظریفانہ اشعار کا تناسب تیس فیصدی سے کسی حال میں کم نہ تھا

لیکن ہے یہ کہ قسام ازل نے ذہانت و فطانت، شوخی و زندہ دلی کی تقسیم میں ان کے لیے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس لیے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف ذاتی صدمات و خانگی مصائب[2] کا ہجوم، اور دوسری طرف مشاغل دین و تصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پائے شمع جھلملا ضرور رہی تھی مگر بجھی نہ تھی، آفتاب ڈھل ضرور چکا تھا مگر غروب نہیں ہوا تھا بدر ہلال بننے لگا تھا لیکن بے نور نہیں ہوا تھا چمن سے بہار رخصت ہونے کو تھی۔ تاہم خزاں کا سایہ بھی ابھی نہیں پڑنے پایا تھا۔ زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے اس شدت کے ساتھ کہ دیوان

---

[1] کلیاتِ سوم میں سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۹ء کا کلام درج ہے۔ حضرت اکبر کا سال ولادت سنہ ۱۸۴۶ء تھا گویا اس وقت سن بحساب شمسی ۶۸ تا ۷۳ سال کا تھا۔

[2] حضرت اکبر کے دو محل تھے زوجہ اولیٰ سے تعلقات شروع ہی سے بہت تلخ رہے۔ زوجہ ثانی محبوب خاص تھیں انھوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں رحلت کی۔ چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم بہت محبوب تھے ۱۴ سال کی عمر میں غالباً سنہ ۱۹۱۵ء میں داغ مفارقت دیا۔ بعض اور خانگی صدمے اس کے علاوہ بھی تھے۔

پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے والے ششدر رہ گئے۔ کلیات سوم میں اس کے نمونے، پیشتر کے مقابلہ میں یقیناً کمتر، پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔

اکبر ظریف تھے۔ "ہزّال" و مخاش نہ تھے۔ دلوں کو خوش کرتے تھے چہروں پر تبسم لاتے تھے۔ جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے۔ ان کی ظرافت ہزل گوئی کی مترادف نہ تھی۔ اکثر صورت میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی، کہیں کہیں زبان یا محاورہ، لفظی مناسبت، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت کے زور سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے، اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی۔ اور جو اتنے معتقد و باادب نہ تھے، وہ تو جھنجھلاہٹ میں خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے۔ خیر ظرافت اس خاص غرض کے لیے یعنی ستر حال کے لیے اخفائے خیال کے لیے، ان کے ہاتھ میں ایک اچھے لفافہ کا، بڑے کارآمد آلہ کا کام دیتی تھی، جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردہ میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندستانی، ہندو مسلم، سنّی شیعہ سب کی صحبت میں، اور مسجد اور مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ، کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے۔ ایک ایک شئے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے اسے جھانکتے، اسے تاکتے، اس کو جانچتے، اس کو بھانپتے، ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے، لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گھرے پڑے رہتے، کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب۔ بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گذرتے۔ کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح لفظوں میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر — دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اسکو معاف
سرد موسم تھا، ہوائیں چل رہی تھیں کُہبار — شاید معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

موسم کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور "ہواؤں" سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔ آج کی نہیں آج سے ۴۰ سال قبل کی۔ ان کی ظرافت کا بہت بڑا مظہر

یہی سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں ان کا عمل عارف رومی کی تعلیم پر تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اکبرؔ، ان "دلبران" سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان اسرار کی منادی وہ سربازار کرتے، لیکن زبان وہی اپنی اور مخصوص۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہو گئے تھے، وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے، اور جو تہ تک نہ پہنچتے، وہ بھی بہرحال ایک دل لگی کی بات سمجھ کر ہنس تو پڑتے ہی تھے۔ "بت"۔ "صنم"۔ "مس"۔ "شیخ"۔ "سید"۔ "سید کا حسن" "اونٹ"۔ "گائے" "کلیسا"۔ "حرم"۔ "دیر"۔ "تبکدہ"۔ "کالج"۔ "برہمن"۔ "لالہ"۔ "صاحب" وغیرہ بیسیوں الفاظ نے ان کی زبان میں کہنا چاہیئے کہ ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں۔ انہیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس، اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارے لئے ایک جال بچھا دیا ہے۔ جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1]۔ اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا	لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں	ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو	اس باغ میں خزاں کی اکبرؔ بہار دیکھو
لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری[2] میں	اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا روئے سخن بیشتر اپنی ہی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیم اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ ہاون اگر نہ ہو تو دستہ چلے کس چیز پر؟

---

[1] کلیات اول میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر، جال گھسے گا کھال کے اندر

[2] یعنی تاریخ۔

سرکاری مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی بھول بھلیاں کچھ رکھی ہی ایسی گئی ہیں، کہ "ہم" ہمیشہ انھیں الجھاؤں میں پڑے رہیں، اور "وہ" خود عیش وعشرت کرتے رہیں۔ ہم ان کی کلرکی کی خدمت گزاری کی محنتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں اور وہ آقایانہ بے نیازیوں کے ساتھ داد عیش دیتے رہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹ[1] کی وہ گردشیں — خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا، وہ پیتے تھے جام مئے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ — الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی؟ — میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقاء سگانِ درِ حضور! — کل "تو" سے "تم" ہوئے تھے، ہوئے آج تم سے "آپ"
ہنس کر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق — گانے لگے وہ گیت، میں پڑھنے لگا سبق

سرکار نامدار کے بعض نیک نام محکموں اور سررشتوں کی ذہانت طباعی، بلکہ قوت خلاّقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے، اور محکمۂ پولس کی کارگزاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اس کے اسلاف صدہا برس سے یار کی کمر تلاش کرتے آئے ہیں۔ آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں، سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ ہستی معدوم کا اب سرکار کے خفیہ پولس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے؟ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال — خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکیٹ خفیہ پولس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا۔

مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کے لئے مخصوص تھوڑے ہی تھا۔ جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے متین و مہذب سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ دیتے۔

اس وقت ملت پر فرنگی تہذیب و معاشرت کا جن مسلّط ہے۔ اس لئے نوبت یہاں

[1] دُمدار ستارہ (com.at)

تک پہنچادی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ حُسن وعشق عیش وعشرت سب کا معیار بدل گیا ہے۔ اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہوگئی ہے ؎

فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی　　　اب تو دھن ہے انھیں فرنگن کی

اور خیر اِدھر عاشقوں کا حال تو بدلا ہی تھا، غضب یہ ہوا کہ اِدھر محبوبوں کی جماعت بھی "انقلاب زندہ باد" کی نذر ہوگئی۔ ادھر کہ وضعداری میں فرق آیا تو ادھر کی بھی طرحداریاں کب اپنے رنگ پر قائم رہیں۔ بازار حسن میں چلن نئے سکوں کا ہوگیا پرانے سکے ٹکسال باہر ہوگئے اب تک مشرق اور مشرق کی شاعری میں حسن کا سب سے بڑا زیور شرم وحیا۔ تمکین وحجاب کو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب جو جاکر دیکھا تو محفلِ ناز کا رنگ ہی بدلا ہوا، کہاں کی کم سخنی اور کیسی بے زبانی؟ مشق اب خطابت کی ہورہی ہے نہ اب نگاہ شرمگیں نہ چشم سرمگیں۔ اٹھی ہوئی نگاہیں، اور چڑھی ہوئی آنکھیں اب خود محو نظارہ، چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کمانیاں! حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں ٹھاٹھ محفل طرازی وبزم نوازی کے جم رہے ہیں۔ عاشق بیچارہ اِس قلب ماہیت پر دنگ رہ جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

خامشی سے ہے تعلق نہ ہے تمکین کا ذوق　　　اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں　　　بت بھی اب دَیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعے نے دریا کو زہ میں بند کر دیا ہے۔ مفہوم کو چاہے کتنی وسعت دیتے چلے جایئے جو علماءِ دین سمجھے جاتے ہیں وہ حجروں کی چٹائیاں، انکسار وتواضع چھوڑ، مسجدوں کی صفیں لپیٹ، پنڈال اور پلیٹ فارم کی زینت بن گئے ہیں۔ جو صوفی ومشائخ کہے جاتے تھے، خانقاہوں سے نکل، انھوں نے خود اپنے نقارہ پر چوب لگانی شروع کر دی۔ دینی مدرسوں کے طلبا استادوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے لگے اسٹرائیک اور مطالبہ حقوق کا بگل پھونکنے۔ بیویوں نے شوہروں کی خدمت چھوڑ سینما اور تھیٹر کا راستہ اختیار کیا۔ مائیں بچوں کو آیاؤں کے حوالے کر خود کلب جا پہنچیں۔ یہ سارے کا سارا مفہوم اس ایک بلیغ مصرعہ میں

میں سما گیا ع

بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

ہندستانی تہذیب و ہندستانی حکومت، خواہ کسی ملت و فرقہ کی ہو، اغیار کی حکومت، اور بیرونی تہذیب سے تو بہرحال گوارا تر ہے! اس مفہوم کو جن خوش ذائقہ کنایوں میں ادا کیا گیا عجب نہیں کہ ان سے اہل ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی　　بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

پوری اور چپاتی اور بسکٹ تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں پھر "دیس کی دھن" تو ایک معنی تو اس کے ظاہر ہی ہیں کہ وطن کا جوش محبت، باقی دھن، ایک اصطلاح موسیقی بھی ہے، اور دیس نام ہے ایک راگ کا۔ اور پھر یہ گانا ایک دیہاتی کی زبان سے! نورٌ علیٰ نور۔

اس زمین کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے ؎

شانِ نماز اکبر، شاہانہ ہو چلی ہے　　مسجد الگ بنائیں اپنی میاں بقاتی

نماز باجماعت کی تاکید تو تھی ہی اس لئے کہ شاہ و گدا، آقا و غلام، خادم و مخدوم، ایک صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں اور کم از کم اللہ کے گھر میں آکر تو دن میں پانچ پانچ مرتبہ یہ بندوں والے امتیازات مٹتے رہیں۔ یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہو کر بھی اپنی آقائی اور خواجگی کو نہیں بھولتے، اور بقاتی اور رحمن بیچاروں کے لیے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی الگ بنائیں!

ایک ذہنیت اس وقت پھیلی ہوئی ہے کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست فرنگی تہذیب، فرنگی حکومت کو خوب بُرا بھلا کہا جائے، لیکن انہیں حلقوں سے اگر کہیں داد ملنے لگے۔ حوصلہ افزائی ہونے لگے، صلہ وستائش کی طرح پڑ جائے تو اس پر بھی دل خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔ اور اندر ہی اندر لہر، فخر و مسرّت کی دوڑ جاتی ہے۔ اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی۔ اس کی گرفت اپنے پنجہ آہنی سے کی۔ صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہو کہ فولاد کی صلابت و کرختگی، کس خوبی کے ساتھ نرم و گداز مخملی دستانے کے اندر غائب کر دی ؎

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم　　یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ!

فلاں قومی شاعر، کا خان بہادر ہو جانا، فلاں خادم ملت کا شمس العلماء بن جانا، یہاں تک کہ اقبال کا "سر" کے خطاب سے سرفراز ہو جانا۔ یہ سب مثالیں اسی رقیب کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹ کی ہیں۔

ملت کے نوجوانوں کو مذہب سے جو بیگانگی ہے۔ بُعد و اجنبیت ہے۔ اس کو اکبر نے کثرت سے بیان کیا ہے، اور کہیں کہیں تو انداز ایسا لطیف اختیار کیا ہے کہ وہ ان کے سوا اور کسی سے ممکن ہی نہیں۔ دل کے آنسوؤں سے روتے جایئے، لیکن چہرہ وہی ہنسی اور تبسم کا بنائے رکھئے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے　　　پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

گویا بعد و بیگانگی کی حد یہ ہے کہ عبادت کی کوئی سنجیدہ اہمیت تو ذہن میں آ ہی نہیں سکتی، اور اب جو کوئی تاکید کرتا ہے تو خیال لامحالہ یہی گزرتا ہے کہ یہ بجز مذاق، ظرافت، دل لگی کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟

اب ملّت کی مشغولیت باقی ہی یہ رہ گئی ہے کہ صلاح و فلاح کی حقیقی تدبیریں اور ان کی جانب توجہ غائب آج یہ انجمن بنی اور کل وہ مجلس۔ چندہ اس میں بھی دیجئے، اور اس میں بھی، اور ترقی کے بجائے سایہ ترقی کو کافی سمجھ لیے! ؎

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے　　　ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جدید حریت، جدید تعلیم اور جدید کمیٹی بازی اور جلسہ سازی، حضرت اکبر ان سب چیزوں کے شدید مخالف تھے۔ چندہ کا رواج نیا نیا انہیں کے زمانے میں نکلا تھا اور خوب زور شور سے پھیل گیا تھا۔ اس لئے ان کے ترکش طنز کے تیروں کا بڑا ہدف یہی چندہ رہا کرتا تھا۔ ذیل کی مصوری ان کے اپنے نقطہ خیال سے کتنی دلکش اور کیسی جامع ہے ؎

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے　　　کالج کے چیونٹے لپٹے ہیں ٹڈی کی ٹانگ سے

عالم ہیں چپ جو مستند و باوقار[1] ہیں　　　گونجا ہوا پریس[2] ہے وفاقی کی سانگ سے

---

[1] جس زمانہ کا یہ کلام ہے، علمائے دین بھی کثرت سے سیاسی اور وطنی تحریکات کے جزو بن کر ان میں گھل مل گئے تھے۔ ایک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مع اپنے مخصوص شاگردوں اور نائبوں کے اس طوفان ؟

نیت دنیا طلبی و دنیا پرستی کی، لیکن آڑ مذہب کی، مقصود و مطلوب دنیا لیکن زبان پر نام دین و مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں، اور ذرا دیکھئے، یہ رنگ ڈھنگ دیکھ، صدا کیا لگاتے ہیں ؎

فرما گئے ہیں یہ خوب بھائی گھورن دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

کھانا ٹھونس ٹھونس کر کھایا جاتا ہے تو آخر چورن کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ چورن کچھ دل سے مرغوب ہو مقصود و مرغوب تو وہی کھانا ہی ہے لیکن کام نکلتا نہیں بغیر چورن کی مدد کے۔ مقصود تو وہی دنیا ہی ہے لیکن آڑ بہر حال مذہب کی!

"گئو رکھشا" کی جد و جہد نئی نہیں، پرانی ہے۔ اور تحریک خلافت کے زمانہ میں یعنی یہی کوئی ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں تو قدرتاً اس کا بڑا زور بندھا مسلمان اِتحاد کے جوش میں اس معاملہ میں بھی ہندوؤں سے کچھ آگے ہی بڑھ چلے۔ اکبر کا کہنا ہے کہ خیر گائے کی جان بچی تو بچی، یہ بھی ایک سیاسی مصلحت تھی۔ مصلحت نہیں ضرورت تک کہہ لیجئے، لیکن آگے چلیے۔ اصل ضرورت تو مسلمانوں کو اپنے احکام دین و شعائرِ ملّی پر توجہ کی تھی۔ تخیل کا یہ طیارہ، ظرافت کی پھلجھڑی بن کر یوں پیش ہوتا ہے ؎

چھوٹیں جو گائے ماتا حسرت سے اُونٹ بولے افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

اور یہ ترک ذبح کا مسئلہ تو پھر بھی ایک بڑا مسئلہ تھا اکبر کی نظر تو قومی و ملّی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزئیات پر رہتی تھی۔ ایک روز مجلس میں راقم سطور حاضر تھا۔ ارشاد یہ ہو رہا تھا کہ "صاحب" کی دیکھا دیکھی اب تو ہماری ہر چیز انجمن سازی اور انجمن بازی کی نذر ہے۔ اتنے میں ذکر انجمن ترقی اردو کا نکل آیا۔ فرمایا "جی ہاں دیکھئے زبان نہ ہماری اپنی چیز، اب یہ بھی ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اس کے لیے بھی ایک انجمن کھڑی کی گئی ہے۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

ہم سے چھن کر ہو گئی بزم ترقی کے سپرد سچ کہا مرزا نے اب اردو بھی کورٹ ہو گئی

حکومت کے دربار میں عزت کی کرسی حاصل کرنے کا جو ایک ہی طریقہ و تدبیر تھی، سب پر روشن

۱؎ سے الگ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے۔ اکبر کا یہ اشارہ انہیں کی جانب ہے

۲؎ اخبارات۔

وعیاں تھی۔ لیکن اسے کھلے لفظوں میں کہہ دینا سب سے لڑائی مول لینا تھا۔ اکبر کی زندہ دلی تھی۔
جس نے اس تلخی میں بھی ایک شیرینی اور حلاوت پیدا کر دی ہے

عقل نے اچھی کہی۔ کل لالہ مجلس رائے سے جھک کے ملنا چاہیئے ہم سب کو وائسرائے سے

"صاحب" کے ہاں عزت پانے کے لیے "لالہ مجلس رائے" کیا خوب، اور اس کا قافیہ وائسرائے
تو بہت ہی خوب! عقل بمعنی مصلحت اندیشی۔ داد اور لطف قافیہ کے لئے ساتھ کا دوسرا شعر
بھی ملاحظہ فرمالیجئے ہے

شعر کیسا ہی ہو، لیکن قافئے اسکے ہیں خوب کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

ندرت تشبیہات، اکبر کے نسخہ ظرافت کا جزو اعظم ہیں۔ ایسی ایسی اچھوتی، نادر و لطیف
تشبیہیں اور کہیں کہیں پھبتیاں انھیں خود بخود سوجھ جاتیں، جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار
کے بعد بھی نہ آتیں۔ یہ ہم آپ سب جانتے ہیں، روزمرہ دیکھتے ہی رہتے ہیں کہ ایک طرف تو
شوق صاحبیت کا سوار رہتا ہے۔ دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ، کچھ ذات برادری والوں کا ڈر،
کچھ وضع کا پاس غرض "نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے"۔ ایک تذبذب، گومگو
اور دو عملی کا عالم قائم۔ چار قدم آگے بڑھے تو چھ قدم پھر پیچھے ہٹ گئے۔ کتر بیونت کچھ ادھر
سے کی، کچھ ادھر سے۔ جوڑ پھر بھی ٹھیک نہ بیٹھا۔ نہ خدا کی یافت ہوئی، نہ صنم کا وصال نصیب
ہوا۔ ہنسے گئے، بنائے گئے۔ قہقہے ادھر سے بلند ہوئے، تالیاں اِدھر سے بجیں، واقعیت
کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبؔر کی گلکاری ملاحظہ ہو ہے

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبؔر کے زمانہ میں سینما کہاں تھا۔ تھیٹر ہی سب کچھ تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لیے کسی ثقہ بزرگ کا
بہ ایں جبہ و عمامہ تشریف لے جانا اور پھر اس کے لئے اونٹ جیسی مقدس سواری کا انتخاب
کرنا جان بلاغت ہے۔ کیا کیا انگلیاں اٹھی ہوں گی۔ جب حضرت سلامت کی سواری اس شان سے
اونٹ پر نکلی ہو گی!

عام شاعروں پر قیاس کر کے لوگ اکبؔر سے بھی فرمائشی شاعری کی توقع رکھتے تھے اور
فرمائشوں کی بھرمار سے انھیں زچ کر دیتے تھے۔ آپ نے یہ کیا کہ ساری توقعات سارے تقاضوں

کے جواب میں ایک پر لطف اور اچھوتی تشبیہہ پیش کر دی ہے

عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا اس قہر کو ملاحظہ للّٰہ کیجئے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

اخباروں، رسالوں کی طرف سے فرمائشوں کی حد ہی نہ تھی۔ اکبر کا نام چلا ہوا، شہرت خوب پھیلی ہوئی ہر ایک یہی چاہتا کہ اس شہرت و ناموری سے خود فائدہ اٹھائے۔ اکبر کہاں تک سب کو خوش رکھنے کے لیے وقت نکالتے۔ اور وہ بھی پیرانہ سالی کی معذوریوں میں، مروت میں صاف انکار کرتے بھی نہ بن پڑتی۔ آخر ایک مرتبہ یہ شعر چھاپ دیا ہے

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے ہمارے لخت دل ہیں، آپ کا مال تجارت ہے

یہ ضرور نہ تھا کہ تشبیہیں ہمیشہ نادر اور اچھوتی ہی ہوں۔ بعض جگہ معروف و مانوس بلکہ پامال تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ مگر اس حسن و صنعت کے ساتھ کہ اس تقلید پر جدتیں نثار ہو جائیں۔ مشاطہ پُرفن کا کمال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ بوڑھی باڑھی خاتون میں حسین و نوخیز لڑکی کا حسن و جمال رعنائی و محبوبی پیدا کر دے!

بعض نامور اُستادوں کو دیکھا ہوگا کہ شعر کہنا تو کچھ واجبی سا آتا ہے، البتہ محاورہ خوب باندھتے ہیں۔ عروض کی لغزش کوئی نہیں ہونے پاتی متروکات سے محتاط رہتے ہیں ذم کا پہلو کلام کے پاس نہیں پھٹکتا۔ اکبر کے نگارخانہ میں شبیہ ان حضرات کی ملاحظہ ہو ہے

عشق کے معنی کے عالم تھے مگر عاشق نہ تھے صورت عذرا سے واقف تھے، مگر وامق نہ تھے

ایک دوسرا تعارف انھیں حضرات کا ملاحظہ ہو ہے

صورت لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوان قیس شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی۔ نمونے اوپر ہی سے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ ایک اور ملاحظہ ہو۔ اُردو رسم الخط کے دشمنوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کو گھسیٹ میں لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ۔ یہ کہنا کچھ صدق دل سے ہی نہیں۔ بلکہ پروپیگنڈا کے ماتحت ہے واقعہ یہ ہے کہ۔ دیوناگری کی گھسیٹ اردو سے کہیں زیادہ چوپٹ ہوتی ہے اور اس کی مضحکہ انگیز مثالیں، عدالتی کارروائیوں، دستاویزوں وغیرہ کے حوالہ سے اخباروں میں بارہا نکل چکی ہیں۔ اب دیکھئے کہ اکبر کی نازک خیالی

نے اس خشک حقیقت سے کیسا طرفہ مضمون نکال کھڑا کیا ہے

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ ہو　　بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ بھی کام کی بات

بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں　　کوئی پڑھ ہی نہ سکا، مل گئی فی الفور نجات

زمانہ کی ناقدری، شاعری کی دنیا کا بڑا پرانا مضمون ہے۔ شاعر سدا سے سامعین کی بدمذاقی اور ناقدر شناسی کا رونا روتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہی صدائے درد، جب چمنستانِ ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمۂ لطیف بن کر کان میں آتی ہے رُلاتی نہیں ہنساتی ہے، اور چٹکی، گدگدی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے ہے

قدر دالوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج　　بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلّو نہ ہوئے

اُردو دالوں، اردو خوانوں، اُردو نویسوں کی بزم میں مرحبا اور سبحان اللہ کی کیا کمی۔ تحسین کے وہ غلغلے، آفرین کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج جائے در و دیوار ہل جائیں۔ لیکن لفاظی کے اس شور و ہنگامہ کے آگے؟ بس خلا ہی خلا۔ بڑی سے بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپایئے۔ اس کے بعد خود ہی اپنے ہاتھ سے مسودہ صاف کیجئے۔ مطبع والوں کے دروازہ پر دستک دیجئے۔ ان کے سارے نشتر غمزے برداشت کیجئے۔ وعدے وہ صبر آزما کہ پریس کے شکنجہ میں کتاب کے صفحوں کے ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی دبوایئے۔ اور جب خدا خدا کر کے کتاب پریس سے باہر آئے۔ تو خود ہی اشتہار لکھئے اور پھر مدتوں خود ہی پڑھتے رہیئے۔ کتابیں یا تو دوستوں کو ہدیۃً تقسیم کر دیجئے ورنہ ڈھیر اپنے سامنے لگا دیکھ کر بس خوش ہوتے رہیئے، یہ خشک حقیقت اردو اہل قلم کے لیے کیسی ہی یاس انگیز، دل شکن، ہمت توڑ[1] سہی لیکن دیکھئے ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاشہ میں کیسی جان ڈال دی ہے

کھلا دیواں مرا تو شورِ تحسیں بزم سے اٹھا　　مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

شاعروں کے ضعف و ناتوانی کا مضمون العظمۃ للہ! ضرب المثل کے درجہ تک پہنچا ہوا، جسے دیکھئے سب ہی اپنی صحت سے نالاں، اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں ہمارے حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی کہ کمزور و ناتواں اپنی صحت ہی کو نہیں، اپنی بیماری کو بھی باندھا

---

[1] اردو میں یہ لفظ شاید پہلی بار آ رہا ہے، میرے ذوق میں یہ عربی و ہندی کی ترکیب جائز ہے۔

اور اپنے نہ مرنے کو اپنی بیماری ہی کی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی　　اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرت قوافی کے بادشاہ تھے، ایسے ایسے نادر قافیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے کہ ان کے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جائے۔ یوں کہیئے کہ ان کے نمکدان ظرافت کی نمکینی اکثر یہی جنس نایاب قائم کئے ہوئے ہے۔ ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی، دکھ درد کی کہانی سُناتے ہیں، لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو رُلانے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں ؎

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے　　قافیہ ان کا ملا تھا آنت سے

صحت اب بگڑی تو ان میں درد ہے　　اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے

خواب راحت کس کو کھانا کون کھائے　　رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے

درد کے آگے رہا منجن بھی گرد　　مصطگی بھی رہ گئی باروے زرد

ایک دوسرا زعفران زار اس سے بڑھ کر ملاحظہ ہو ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے　　وہی مازو، وہی کافور[1] چلا جاتا ہے

ڈارون[2] کے اسی لیکچر کا سبق ہے ابتک　　وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے

برق کے لمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ　　روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

"روشنی" اور "نور" کا یہ نازک فرق اس کے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا! اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور! قطعہ کا آخری شعر ہے ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا　　آج تک شوق سقنقور[3] چلا جاتا ہے

اشعار ذیل میں جان محض قافیہ نے ڈال دی ہے ؎

جو سچی بات ہو کہدوں گا بے خوف و خطر اکو　　نہیں لکھے کا میں ہرگز بری ٹوکے کہ جن ٹوکے

---

[1] مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوائیں۔

[2] انگلستان کا مشہور سائنسداں۔ اس کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع بنی گئی ہے یہاں تک کہ حیوانات کا ارتقاء انسان پر ختم ہوا، اور انسان ترقی یافتہ بندروں ہی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔

[3] ماہی سقنقور، مردانہ قوت کے لیے ایک مشہور دوا۔

امیر آئے تو کیا آئے مزے ہیں لارڈ منٹو[1] کے انار آتے جو کابل سے تو پڑتے سب کے حصہ میں

"منٹو کے" کا قافیہ "جن ٹو کے" لانا بس اکبر ہی کا حصہ تھا۔

ایک غزل اسی زمین میں ہے "مجلس تو باقی ہے"۔ "نرگس تو باقی ہے" اس کے مقطع میں قافیہ "پیرس" لائے ہیں، اور وہ بھی کس روانی و بے تکلفی کے ساتھ ؎

جو اجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں، پیرس تو باقی ہے یہ مصرعہ قافیہ ہی کے لئے ہے خوب اے اکبر

اگرچہ اس میں واقفیت پر ظلم اچھا خاصا ہو گیا ہے۔ لکھنؤ غریب، انتہائی اوجِ شباب کے زمانہ میں بھی بھلا پیرس کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتا تھا!

ظریفانہ کلام میں بارہا لفظ پست و مبتذل لاتے، لیکن موقع ایسا چھانٹ کر نکالتے بندش اس خوبی سے کرتے اور مصرعہ اس ٹھاٹھ کا رکھتے کہ پستی و ابتذال غائب، کلام میں بجائے تنافر کے لطف و شگفتگی قائم۔ مذاق سلیم پکار اُٹھتا کہ بے شک اس خاص موقع کے لئے یہی لفظ مناسب تھا اور یہی موزوں۔ ایک شعر چند ہی صفحہ ادھر نقل ہو چکا ہے ؎

مسجد الگ بنائیں اپنی میاں بفاتی شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے

"میاں بفاتی" کے لفظ سے بڑھ کر جامع اور بلیغ اس موقع کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم "جواب شکوہ" کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہو گا ؎

رحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب

پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب

زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے ⁂ امرا نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے

اکبر نے مضمون کے اس سالے دریا کو اپنے دو مصرعوں میں بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی مصرعہ کے کوزہ میں بند کر دکھایا ہے

کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن ⁂ اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے

کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن۔ بہت خوب، بہت خوب۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار دلی جانا ہوا۔ زمانہ کوئی ۱۹۱۲ء کا۔ وائسرائے بہادر کلکتہ سے منتقل ہو کر دلی آ چکے تھے اور دلی

---

[1] لارڈ منٹو ہندستان کے وائسرائے۔ امیر حبیب اللہ مرحوم والی افغانستان انہیں کے زمانہ میں ہندستان آئے تھے۔ شاہ افغانستان اس وقت امیر حبیب اللہ خاں تھے

بڑی تیزی کے ساتھ "نئی دلی" بنتی جارہی تھی اجلاس امپیریل کونسل[1] کا ہو رہا تھا۔ ہندستان بھر کے چوٹی کے مسلمان ہر ہر صوبہ کے جمع تھے۔ ایک دن محلہ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا۔ نماز کے وقت پھٹے حالوں ایک موذن صاحب نظر آئے، اور انھیں کے طبقہ کے دو ایک نمازی، بس کل اتنی سی جماعت۔ نماز کے بعد میں نے موذن سے پوچھا کہ کیوں میاں، سر...... بھی کبھی نماز پڑھنے تشریف لاتے ہیں؟ موذن بیچارے نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ حیرت سے میرا منھ دیکھنے لگا، میں نے دو ایک سوال اور کر ڈالے کہ اچھا فلاں لیڈر صاحب اور فلاں؟ وہ غریب ہر مرتبہ ہکا بکا۔ تب میں نے کہا اچھا تو یہ کہو کہ

"کونسل میں بہت سیّد مسجد میں فقط جمّن"

پیش مصرعہ بعد کو لگایا۔

ذکر غالباً ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الہ آباد میں حضرت اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانہ میں الہ آباد میں ہو رہا تھا۔ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبرؔ نے دو ایک صاحبوں کو اور بلایا تھا۔ کھانے کے بعد حضرت اکبرؔ، مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک سُنّی صاحب بول اٹھے کہ کچھ بھی سہی، بہرحال شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشرتی حالت بہتر ہی ہے" لسان العصر بولے کہ "جی، کیا بات آپ نے پیدا کر دی ہے"، ہم ساری خدائی سے ذلیل ہی، پھر بھی یہ اطمینان کچھ تھوڑا ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے۔ اور جب ہی تو میں نے عرض کیا ہے ؎

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں	کیا کم ہے یہ شرف کہ بقاتی سے کم نہیں

"کیا کم ہے یہ شرف" اس ٹکڑے کو مکرر پڑھئے۔

ایک جگہ "صاحب" کے مقابلے میں صاحبیت کے مارے ہوئے گروہ کا چربہ ان الفاظ میں اتارتے ہیں ؎

مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب	بدھو فلاسفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں

کسی پچھلے کلیات میں مسلمانوں کے یاس انگیز مستقبل کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ چکے تھے ؎

---

[1] لوک سبھا کا پرانا نام۔

حکم برٹش کا، ملک ہندو کا　　　اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

پھر جب ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کے ایک مشہور و ممتاز عالم نے تحریک ترک موالات میں بالکل گاندھی جی کے پس رو ہونے کا اعلان کیا۔ تو ارشاد ہوا ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں　　　گو مُشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر حرفوں اور آوازوں سے مرکب لفظ نہیں بولتے، صورت حال کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

"بدھو میاں" سے بڑھ کر اور جامع تر لفظ اس موقع کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا!

کلیات اوّل میں مسلمان خاتون کی تعلیم کا عکس بھی ایسے ہی آئینہ میں دکھا چکے ہیں ؎

ترقی کی تپین ہم پر چڑھا کیں　　　گھٹا کی دولت اسیچیں بڑھا کیں

غرض یہ کہ کلّو، صلّو، پیرو، حسّو، بدھو، گنگو، گھورن، جمّن، بفاتی، شبراتی، کریمن، نصیبن وغیرہ کوئی لفظ بھی اکبر کی ٹکسال سے باہر نہیں اور وہ ہر جگہ کام ان سے اپنی مرضی کا لیتے رہتے ہیں اور خیر یہ تو پھر بھی عَلَم تھے، یعنی مردوں، عورتوں کے ذاتی و شخصی نام، کمال یہ تھا کہ زبان کے عام لفظ مُبتذل طبقہ سے اٹھا کر لاتے اور اپنے حُسنِ بندش و کمال مرصع سازی سے کرخت، بدزیب و بدہیئت سنگریزوں کو نگینہ بنا کر خاتم شعر میں جڑ دیتے۔ داغ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　　ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اکبر نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ "فالتو" بھی کیا خوب! اکبر کے سوا یہ کس کے بس کی بات تھی کہ دیو میں پری کا حسن و جمال پیدا کر دے! شاعر کے ذہن میں جو تحقیری تصور، ایسی عقل سے متعلق تھا اسے کس خوبصورتی سے اس لفظ نے ادا کر دیا۔

کلیات دوم میں ایک قطعہ "آزادیٔ نسواں" پر ہے کوئی صاحب اپنے گھر میں بے پردگی کے خلاف کوئی وعظ شروع کرتے ہیں، لڑکیاں تردید پر آمادہ ہو جاتی ہیں اور سند میں "دولھا بھائی" کی رائے پیش کرتی ہیں ؎

دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اس کے آگے یہی لڑکیاں، خاندان کے مردوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں ؎

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیے دیتے ہو ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

"گٹ پٹ" ! یہ کیا ! جی ہاں انگریزی کی ابجد نہیں، اے۔بی۔سی۔ڈی نہیں صرف گٹ پٹ!
حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ بھی بجائے خود نہ متبذل ہے نہ خلاف متانت۔ اصل شے اس کا موقع و محل استعمال ہے۔ اور اکبر اس موقع شناسی کے بادشاہ تھے۔ الفاظ سے گزر کر یہی سلوک محاورں مثالوں کے ساتھ کرتے رہتے۔ بازار میں چلتے پھرتے کہیں سے محاورہ یہ ہتیا لائے۔ کہیں سے وہ۔ بلاغت کے سانچہ میں ڈھال، رنگ روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح کا دے دیا کہ جس کی نظر پڑی، لٹو ہو گیا۔ لڑکوں کا ذکر نہیں اچھے تھے۔ بڑے بوڑھے انھیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنی میز پر، ڈرائنگ روم کی کارنسوں پر جگہ دینے لگے۔ فرش کو ان آرائشوں سے سجانے لگے۔ گلدانوں میں ان پھولوں کو رکھنے لگے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج اب دُم کی جگہ ملت، نمدے کی جگہ کالج

"ہات تری دُم میں نمدہ" یہ زبان شریفوں کی نہیں، عوام کی ہے۔ لیکن اکبر کی کان نمک میں آکر ہر شے نمک ہی بن جاتی ہے۔ اس لطف و لطافت کے ساتھ انھوں نے ان کو کھپایا کہ بزرگان محفل کے چہروں پر شکن پڑنے کے بجائے اور مسکراہٹ آگئی۔ ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن بڑی تیزی سے منتقل ہوتا، اور پھر ان مناسبتوں کے بل پر تخیل، دلچسپ و پُر لطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا رہتا فرماتے ہیں ؎

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا سر[1] ہو گئے تو بال[2] کا بھی شوق ہو گیا

کیمبل پور (پاکستان) کے کوئی صاحب منشی الف دین نامی تھے، ان بیچارہ نے ایک مثنوی حقانیت اسلام پر لکھی، اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لیے ارسال کی۔ پیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں میں جامع و بلیغ تبصرہ کر دیا، تصنیف و مصنف دونوں پر ؎

الف دین نے خوب لکھی کتاب کہ بے دین نے پائی راہ صواب

---

[1] (Sir) ایک بڑا انگریزی خطاب [2] (Ball) انگریزی ناچ۔

پہلے مصرعہ میں الف کے لام کو کسرہ کے ساتھ پڑھئے۔ دوسرے مصرعہ میں اس "الف" کے مقابلہ میں "ب" پڑھئے۔ سارا کھیل اس "الف بے" کا ہے۔

ذیل کا قطعہ کیا ہے، ایک مستقل گدگدی ہے، بڑے سے بڑے خشک مزاج کے لیے بھی اور بات کچھ نہیں لفظی بھی نہیں، محض حرفی ہیر پھیر ؎

یہ کہتے تھے اک لالۂ باوقار | کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
رکی ہے انہیں سے ہماری نمود | یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا "حرام" اور کہاں کا "حلال" | ہٹے حائے حطی، رہیں "رام لال"

"حرام" اور "حلال" سے حائے حطی ہٹا کر دیکھ لیجئے نہ، وہی "رام" اور "لال" باقی رہ جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کرتے کہ کوئی عام و معمولی سا لفظ لے لیتے، اور اس کے حروف میں قطع و برید کر کے نئے نئے شگوفے معانی و مطالب کے پیدا کر دکھاتے۔ الفاظ وہی جو روز ہم آپ سب بولتے سنتے رہتے ہیں۔ اکبرؔ کی ذہانت بس ان کے اجزاء ترکیبی میں الٹ پھیر کر کے، نئے نئے قالب تیار کر دیتی، اور قوت خلاقی ان کاغذی پتلوں میں نازک خیالی، اور معنی طرازی کی روح پھونک دیتی۔ ایک آدھ مثال اس صنعت گری کی ابھی اوپر گزر چکی ہے۔ دو ایک مثالیں اور بھی بے ساختہ دھاوا کیے، زبان قلم پر چلی آرہی ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۱۲ء میں جب روزنامہ ہمدم پہلے پہل نکلا ہے جالبؔ مرحوم دہلوی کی ادارت میں اور بڑی شان و اہتمام سے تو اس پر ارشاد ہوا

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم رہے | "دم" نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے

کیا بے تکلف سجع ہے۔

الف، ب، ت کے نام سے واقف تو جاہل تک ہیں لیکن کسی بڑے سے بڑے عالم نے بھی محض ان ناموں سے تصوف و معرفت کا یہ درس کیوں حاصل کیا ہوگا ؎

الف، ب، ت ہی کو پڑھکر میں سمجھا | الف اللہ کا، اور ماسوا بت

"ب" اور "ت" کو ملایئے تو بت بن جاتا ہے یا نہیں؟ بس تو اکبرؔ کا کہنا یہ ہے کہ الف تو اللہ کا ہو گیا، اور اللہ کے سوا اب جو کچھ ہے وہ بت ہی بت ہے! کیا نیا رنگ وحدت الوجود کو دیدیا ہے!

"تعلیم" کا لفظ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ علیؓ کا نام بھی عالم و عامی سب جانتے ہیں اور پڑھے

لکھے تو انہیں باب مدینۃ العلم بھی مانتے ہیں۔ اکبر کی شاعری و ساحری یہ ہے کہ ان دو بظاہر بالکل بے تعلق لفظوں کے درمیان رشتہ، اور وہ بھی کیسا گہرا پیدا کر دکھاتے ہیں ؎

سمجھاتی ہے مجھے نکتہ یہ میری طبع سلیم
"علی" "کی" تم "میں جگہ ہو تو بس وہی تعلیم

ظاہری پہلو تو یہ ہوا کہ لفظ علی" کو اگر "ت" اور "م" کے حصار کے اندر لے لیا جائے تو لفظ تعلیم بن جاتا ہے۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ حُبِّ علی کو قلب میں جگہ دینا حقیقی تعلیم ہے۔

سیاسیات کے دائرہ میں خود بلاغت ان کے اس تراش و خراش کی بلائیں لیتی ہے۔ سخن سنجی سر دھنتی ہے۔ معنی طرازی وجد میں آ کر رہتی ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

"ہ" سے ہندو "م" سے مسلم یہ دونوں مل کے ہم
سر پہ انگریزی "الف" اس سے ہوئی حالت اہم
ہے "الف" ہم سے جدا، لیکن محافظ اور معین
اسکے سایہ میں رہیں "ہ" "م" شامل ہوں بہم

لفظ "اہم" کی کتابت میں دیکھئے نہ حرف "الف" کیسا اکل کھرا، الگ تھلگ، سرکشیدہ نظر آتا ہے بخلاف اس کے "ہ" اور "م" باہم شیر و شکر، ایک دوسرے سے مدغم! "ہ" اور "م" کے اِدغام کی تصویر تو آج شاعرانہ معلوم ہوگی، لیکن ۱۹۰۸ء، ۱۹۱۰ء میں جب یہ شعر کہا گیا ہے۔ اس وقت یہ نقل تمام تر مطابق اصل تھی۔ باقی انگریزی "الف" کی اہمیت، اس کا اکل کھرا پن، اور اس کا سر پر ہونا، یہ کیفیتیں تو آج بھی جوں کی توں ہی ہیں۔

اسی گلشن کے ایک دوسرے چمن کی سیر ؎

سر تراشا اِن کا۔ کاٹا ان کا پاؤں
وہ ہوئے ٹھنڈے، گئے یہ بھی پگھل
شیخ کو تیخ کردیا، مومن کو موم
دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر "ش" تراش دیجئے تو بیچارہ تیخ ہو کر نہ رہے تو اور کیا کرے؟ مومن کا پَیر (ن) کاٹ دیجئے تو بجز "موم" بن جانے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ رہا یہ کہ کس نے یہ شیخ اور مومن کو یوں بے سر و پا کر دیا۔ تو اب کیا ناظرین اتنی سخن فہمی سے بھی گئے گزرے ہوئے۔

اکبر کے سنجیدہ کلام کا ذکر تو آگے آئے گا۔ لیکن ظریفانہ شاعری بھی اس پیر ظریف کی معنویت سے خالی نہ تھی۔ اوپر مثالیں بار بار گزر چکیں۔ کبھی کبھی اتفاقیہ دو چار شعر محض ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی کہہ دیتے۔ ورنہ عموماً صرف پردہ ظرافت کا تھا باقی اصلاً مدنظر، کسی مذہبی

اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کی تعلیم ہی رہتی تھی۔ وہ بڑا فرق اپنے اور عام شاعروں کے درمیان پاتے۔ کبھی کہتے

میں اپنے آپ اور ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں[1]

یوں بھی کہا کرتے کہ شاعری سے مقصود تفریح و تفنن نہیں۔ یہ تو ایک آلہ ہے نفس کی تربیت و اصلاح کا۔ اور کہیں یوں ارشاد فرماتے ہے

ہے میری شاعری دل آگاہ کے لیے تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے واہ کے لیے

جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لیے ہے یہ دعا کہ ترک فضولی نصیب ہو

منھ کھل چکا تھا، ورنہ مرا آہ کے لیے اک غل مچا کہ اس کو بھی لیسنس ہے ضرور

سنجیدہ بیانی کے باوجود آخری شعر میں طنز و ظرافت کا چھینٹا دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

پر عظمت شخصیتوں کی مخالفتیں بھی بڑے زور و شور کی ہوتی ہیں۔ اکبر کی مخالفت اس درجہ میں تو نہ ہوئی۔ پھر بھی کبھی کبھی یار لوگ فن عروض و لغت کی کتابیں بغل میں دبا نکلتے رہتے اور کلام اکبر کی طرف انگلیاں اٹھا دبی زبان سے کہتے رہتے کہ یہاں یہ فن کی غلطی ہے وہاں یہ لغزش ہے۔ اکبر بحث کے قریب بھی نہ جاتے، نہ زبانی نہ تحریری۔ دوسروں کو نصیحت کیا کرتے کہ کبھی مدعی کے منھ نہ لگنا اور کسی صاحب دعویٰ سے سوال و جواب میں نہ پڑنا۔ پھر بھی بشر تھے۔ منھ میں زبان رکھتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ کہہ ہی اٹھتے جو بول ان کے منھ سے نکل جاتے۔ ظریفانہ ادب میں پتھر پر لکیر بن جاتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ہے

ساتھ سارنگی کا بلبل کے لیے دشوار ہے تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے

کہاں بلبل کی قدرتی، بے ساختہ ہم آہنگی، کہاں سارنگی کی مصنوعی روں روں! خیر یہ تقابل تو ہے ہی، باقی یہ سارنگی کے ضلع میں "استاد" بھی کیا خوب! ایک دوسری جگہ شوخی کا رنگ ذرا تیز کر دیا ہے ہے

شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو قاعدوں میں حسن معنی گم کرو

---

[1] حالی کے بھی ایک قطعہ کا آخری شعر ملاحظہ ہو ہے

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالی کا خطاب اپنے ان ہمعصروں سے ہے، جن کے ترکش کا سب سے بڑا تیر یہ تھا کہ نہ دہلوی، نہ لکھنوی، یہ پانی پتی بھلا شعر و زبان کیا جانے۔

اب چند شعر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے یونہی ملاحظہ کر لیجیے۔ باغ کی سیر آزادی و بے فکری سے، خود بھی تو ایک چیز ہے۔ یہ کیا کہ قدم قدم پر پھولوں کے نام، نشان، رنگ و بو کی پوچھ پاچھ مالی سے ہوتی رہے ؎

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز — جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

ہمیں کیا بالشویک[1] آگیا یا روس آتا ہے — یہاں تو فکر سرمائی ہے، ماہ پوس آتا ہے

ایر شپ[2] سے ہم اماں اے چرخ پائینگے کہاں — آسماں بولا کہ ہم سے اڑ کے جائینگے کہاں

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندہان ہیں — لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

ہجر کی شب یوں ہی کاٹو بھائیو! — ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو!

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے — جو مارتے تھے مکھی، اب مارتے ہیں چوہے

شاعر جو ملازم ہوا اکبر ذو قافیتین ہے اس کا لقب — پوچھو گے یہ کیوں، تو سنو، تنخواہ بھی ہے اور واہ بھی ہے

جب غم ہوا، چڑھالیں دو بوتلیں اکٹھی — مُلّا کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا کہوں — گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

---

[1] جس زمانہ کا یہ شعر ہے۔ روس میں نیا نیا "بالشویک" انقلاب ہوا تھا اور بالشویک حملہ کا دھڑکا ہر وقت برطانوی ہندستان کو لگا رہتا تھا۔

[2] (Air ship) ہوائی جہاز۔

ارتقائے لنے کی، برکت دیکھیے　　　تاجر اب اہل قلم ہیں بانس کے

محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب　　　"ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے پابہ رکاب

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے　　　ایک ہیں خفیہ پولس میں، ایک پھانسی پاگئے

یہ زیادہ تر وہی شعر ہیں جو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ملیں گے۔ لیکن ظریفانہ کلام کا ایک اچھا بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس کے چھاپنے کے وہ اپنی زندگی میں کسی طرح روادار نہ ہوئے۔ شاعر، آخر شاعر خدا جانے کیسے کیسے وہم انہیں گھیرے رہتے، اور چھاپنا تو الگ رہا، نا جنسوں کو سناتے تک نہ تھے۔ کسی بے تکلف دوست یا نیاز مند کو اگر کہیں سنا بھی دیا تو سو سو تاکیدیں کہ خبردار اسے میری زندگی میں شائع نہ کر دینا اس مخفی کلام کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے کہ اسے حضرت اکبر کی زندگی میں بھی بے تکلف شائع کیا جاسکتا تھا، اور اب دنیائے فانی سے ان کے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد تو تھوڑا بہت مضائقہ بھی، اس کی اشاعت میں باقی نہیں۔ دو چار شعر، متفرق طور پر ادھر سے اُدھر سے سنے سنائے یاد رہ گئے۔ وہ آگے حاضر ہیں۔ ہائے اس وقت کیا خبر تھی، کہ چند ہی روز میں یہ گوہر بے بہا ایسے نایاب ہو جائیں گے! اس وقت اس کا احساس ہوتا تو چُرا کر، چُھپا کر، ضد کر کے، غرض "زاری سے، زور سے، زر سے" جس طرح بھی ممکن ہوتا، نقلیں ان کے منہ سے نکلے ہوئے الہامات کی ضرور ہی حاصل کر لی جاتیں۔

اکبر بڑے گہرے مذہبی! لیکن تقشف و تنگ خیالی سے بالاتر، عابد عالم، صوفی تھے "زاہد خشک" نہ تھے۔ سید احمد خانی تحریکوں کو ملّت کے حق میں زہر قاتل سمجھ رہے تھے۔ خود سر سید کی زندگی میں ان کی تحریکوں کو اپنی میٹھی چھری سے کچو کے ہی دیتے رہے اور کلیات کے اس حصہ میں تو خوب کھل کھیلے۔ تاہم ذات سر سید احمد خاں کے مخالف نہ تھے اور ان پر جو فتاوی کفر کی بارش ہو گئی تھی، ان کے قائل ذرا بھی نہ تھے۔ کہتے تھے، خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت و مغفرت ہر کلمہ گو کے لیے بے پایاں ہے۔ ہمارے مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ اسے اس قدر ضابطوں قاعدوں میں جکڑ رکھا ہے وہاں تو نیت کا سوال سب پر مقدم ہے گنہگار مسلمان کے حق میں بالکل مولانا روم کے ہم مسلک و ہم زبان تھے ؂

ما بروں را ننگریم و قال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را

ناظرِ قلبیم کو خاشع بود ۔۔۔۔۔ گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

آخر زمانہ کی ایک غزل "دوا ہو یا نہ ہو"، "شفا ہو یا نہ ہو" کی زمین میں ہے، اس میں کہتے ہیں ؎

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے ۔۔۔۔۔ گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحبان کی تشبیہہ پولس والوں سے بڑی ہی پرلطف ہے، ایک طرف ان کا احترام بھی، فرض شناسی کی داد بھی، دوسری طرف ان کی ضابطہ پرستی پر طعن بھی خیر یہ شعر تو عمومی پہلو رکھتا ہے۔ ایک رباعی اپنے مخصوص رنگ میں سید احمد خاں اور سید احمد خانیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر کہی ہے چوتھے مصرعہ میں شوخی ذرا اپنی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ طریقہ اکبر کا نہ تھا۔ ہر بزرگ کے نام کا بڑا ادب واحترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پہلے اور تیسرے مصرعہ کے الفاظ پوری طرح حافظہ میں نہیں ممکن ہے کہ فرق ہو گیا ہو ؎

کُتّا جیسے بہ فکر جیفہ دوڑے ۔۔۔۔۔ یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت ۔۔۔۔۔ لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

آخر سنہ ۱۹۱۶ء تھا، جب لکھنؤ میں رباعی اس زندہ دل زندہ جاوید شاعر نے اپنی زبان مبارک سے سنائی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ "دیکھئے میری زندگی میں کہیں چھاپ نہ دیجئے گا۔ ورنہ مولوی صاحبان جان غضب میں کر دیں گے۔ میں نے تو جنت کا سماں دکھلایا ہے۔ یہ لوگ اسی دنیا میں میرے اوپر لٹھ لئے دوڑ پڑیں گے۔"

سنہ ۱۹۱۹ء میں جب ٹرکی سے برطانیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور برطانوی مدبرین قسطنطنیہ سے ترکوں کے اخراج کا منصوبہ باندھ چکے تھے۔ اس وقت اسی قافیہ کے ساتھ پھر ایک رباعی ارشاد ہوئی۔ فرمانا یہ تھا کہ اسلام کا مذہبی اثر تو مدت ہوئی قلوب سے مٹ چکا ہے، اب نہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں کہیں عبادت کے چرچے ہیں اور نہ درس گاہوں میں کہیں دینی تعلیم کا رواج ہے۔ لے دے کے دنیوی اقتدار کی یادگار ایک ترکی سلطنت باقی تھی۔ یہ جھلملاتی شمع بھی زمانہ کی تیز آندھی کے جھکڑوں سے گل ہو کر رہی! مسلمانوں کے لیے یہ حادثہ قیامت کا حکم رکھتا ہے۔ مجازاً بھی حقیقتاً بھی مجازاً تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مصیبت مسلمانان عالم کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ انکا شیرازہ

ہی منتشر ہو گیا اور حقیقتاً اس لحاظ سے کہ حدیث نبوی کی پیشگوئی کے مطابق قسطنطنیہ سے اسلامی حکومت کا اٹھ جانا قرب قیامت کی علامت ہے۔ اب دیکھئے مضمون کے اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کرتے ہیں ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت کالج سے امام ابو حنیفہؒ رخصت
"صاحب" سے سنی ہے اب "قیامت" کی خبر قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

مرثیہ کے مضمون کو لطیفہ کی صورت میں پیش کرنا، اکبرؔ ہی کا حصہ تھا، اللہ اکبر!

ایک بار صوبہ کی حکومت علی گڈھ سے ناخوش ہوئی۔ اسی زمانہ میں اودھ کے شیعہ رئیسوں نے لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج کی طرح ڈالدی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں "تعلیم" کے متوالے "روشن خیالوں" کو بھلا کالج سے کیوں اختلاف ہونے لگا۔ انہیں منھ مانگی مراد ملی۔ لیکن شیعوں میں جو دُور اندیش تھے، وہ تاڑ گئے کہ یہ تو پوری ضرب ہے علی گڈھ کی مرکزیت پر عین اس زمانہ میں حضرت اکبرؔ کا آنا لکھنؤ ہوا۔ مہاراجہ محمود آباد کے ہاں کے ایک صاحب ملنے آئے۔ چرچے ہر جگہ ہو ہی رہے تھے یہاں بھی بات اسی کالج کی چھڑی۔ وہ صاحب بولے "ہمارے سرکار اسی لیے تو کالج سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ خواہ مخواہ شیعہ سنی کے درمیان ایک اختلاف کی بنیاد پڑ رہی ہے۔" اکبرؔ تھے بڑے پکے "سُنّی" لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی کالجوں کے حقیقت شناس کچھ اس سے بھی زائد۔ بولے "جی نہیں" علیگڈھ والوں کو رشک کیوں ہوگا، وہ تو اور خوش ہوں گے کہ چلیے ہماری تحریک کو اور کامیابی ہوئی اور ہماری ہی ایک شاخ اور کھل کر رہی۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

سیّد صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا کالج ہے یہ کچھ امام باڑا تو نہیں

یہ بھی کیا کوئی مذہبی چیز ہے؟ کوئی مسجد ہے، امام باڑہ ہے؟ علی گڈھ والے اس سے کیوں چڑنے لگے۔ اس سے تو اور خوش ہوں گے کہ عین ان کے مشن کی اعانت ہوئی۔

کیا نگاہ تھی۔ قومی، ملی، مجلسی زندگی کے ہر بڑے چھوٹے، ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھتے۔ نظر بھی کیسی، عقابی ہمہ گیر نظر۔ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا[1] کا نمونہ۔ ادھر کوئی

---

[1] قرآن کی آیت (سورۂ کہف) نامۂ اعمال کا ذکر ہے کہ قیامت میں اسے دیکھ کر کافر چلّا اٹھے گا کہ ہائے میری کمبختی یہ کیسا رجسٹر ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں۔

واقعہ، غیر معمولی نہیں، معمولی سا بھی ہوا نہیں کہ ادھر اس پیرظریف کے رجسٹر میں درج ہوگیا! اور پھر جو تصویر تیار کرتے، اس میں کیسے کیسے بظاہر بے جوڑ واقعات میں بھی جوڑ اور بے ربط حالات میں ربط پیدا کر دیتے تھے! دلکشی اور دلاویزی تو حصہ تھی ان کے تخیل کا۔

ذکر شروع ۱۹۰۷ء کا ہے علی گڈھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی سب سے بڑی چہیتی اور سب سے بڑی مرکزی انجمن ہے۔ اس کے کارفرما صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پرلے دے زور شور سے ہو رہی تھی کہ وہ انڈیا کونسل کے ممبر ہوکر ولایت تشریف لے گئے۔ ان کے جاتے ہی طوفان دھیما پڑگیا۔ ایک واقعہ یہ اپنی جگہ پر تھا۔ دوسرا واقعہ عین اسی زمانہ میں پیش آیا کہ لکھنؤ میں ایک مخدوم قوم تھے۔ مولوی نظام الدین حسن نیوتنوی، ایک اعلیٰ پنشنر عہدیدار اور فن حساب وہیئت کے بڑے ماہر۔ انھیں رویت ہلال کے مسئلہ پر طبع آزمائی کی سوجھی۔ لکھنؤ کے اخبار ہمدم میں لکھ دیا کہ ہیئت کا حساب کافی ہے۔ ہر مہینہ چاند دیکھ کر تاریخ شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ علماء شریعت اس بدعت پر کیسے سکوت اختیار کر سکتے تھے۔ فرنگی محل سے جواب نکلنے شروع ہوئے کچھ لوگ ادھر سے اٹھ کھڑے ہوئے کچھ ادھر سے اچھا خاصا اکھاڑہ قائم ہوگیا، قلمی اور اخباری۔ اکبر کی ذہانت کب چوک جانے والی تھی۔ دونوں بے ربط واقعات کو ایک رشتہ میں پروکر موتیوں کی لڑی تیار کر دی۔ پوری نظم تو اب یاد نہیں پڑ رہی ہے۔ قطعہ کی جان آخری مصرع تھا ؎

"آفتاب احمد" گئے تو "چاند خاں" پیدا ہوئے

کیا کہنا ہے زندہ دل قوم کا کوئی نہ کوئی پھلجڑی ہر روز اس کو چاہیئے۔ کل تک آفتاب قوم پر گرم گرم نگاہیں پڑتی رہیں۔ ان بیچارہ کی جان بچی، تو لیجئے رویت ہلال پر چاندماری شروع ہوگئی۔

۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کا یورپ جانا طے پایا۔ صدر وفد رئیس ملت مولانا محمد علی تھے۔ ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی (صاحب معارف) بھی قرار پائے۔ اکبر کو یہ بات ذرا کھٹکی، کہ ایک عالم دین سیاسیات کا ضمیمہ بنے ہوئے ولایت جا رہے ہیں۔ شاعری کی ساحری اور الفاظ کی نظربندی ملاحظہ ہو کہ چڑھی ہوئی تیوریوں کو بشرہ کی خندہ جبینی اور لبوں کی مسکراہٹ میں تبدیل کرتے یوں گویا ہوئے ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی | کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی

رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنیچے مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں ! خدا غیر سے ان کو کردے غنی

دل کو شبہ کیا معنی، یقین ہے کہ یہ نظم بس اتنی سی نہ ہوگی، کچھ اور بھی ضرور فرمایا ہوگا، لیکن اپنی زبان مبارک سے سنایا صرف اسی قدر تھا۔ نادراً سہی لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شوخ نگاری کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیتے اور ظرافت کے حمّام میں مخلّی بالطبع ہو کر داخل ہوتے۔ اس وقت متانت اپنا منھ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ ایک ہلکا سا نمونہ اس صنعت کا بھی ملاحظہ ہو۔ یورپ میں پہلی جنگ عظیم برپا ہے۔ ترکی غریب پر ہر طرف سے یلغار ہے۔ بتیس[۳۲] دانتوں میں ایک زبان۔ روز یہی خبریں آرہی ہیں کہ آج یہ مقام گیا، کل وہ یہاں تک کہ حریف کا قدم سالونکا تک پہنچ گیا۔ (اس مقام کا نام یاد رہے) سارا عالم اسلامی ہیجان و اضطراب میں مبتلا، مرکز خلافت کی مظلومیت وبے کسی پر دنیائے اسلام کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بنا ہوا اسی گھڑی حضرت اکبر اپنے بند کمرے میں یہ چار مصرعے بے تکلف دوستوں کو سناتے ہیں۔ دو ہی چار منٹ کے لیے سہی، بہر حال اداس چہروں پر بشاشت دوڑ جاتی ہے۔ اور غمناک آہیں بھرنے والے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ بہم کو
پھر کر کے اس پہ قبضہ کہدیں یہ ترک ان سے "سالونکا" سے اب تو سالو نکالو ہم کو

نظم کسی طرح دلّی کے ایک ہفتہ وار کو ہاتھ لگ گئی، اور اس نے اپنے یہاں چھاپ دیا۔ حضرت اکبر کو خبر ہوئی، بہت بگڑے، جز بز ہوئے۔ اس خاکسار نے عرض کیا کہ اتنی ناخوشی کیوں؟ جس لفظ کو آپ اتنا کریہہ خیال فرما رہے ہیں، اس میں آپ نے کراہت اور اس کی دشنامی حیثیت باقی کب رہنے دی ہے؟ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں تو آپ نے خود ہی رشتہ کا اعلان کر کے دنیا کو خوب جتا بتلا دیا ہے۔ اب وہ رشتہ کا مستقل نام ہو گیا ہے گالی کہاں باقی رہی؟

(ب) سیاسیات

سیاسیات سے براہ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ ان کا یہ فن، نہ اس موضوع سے انھیں کوئی خاص مناسبت۔ لیکن تھے پورے مشرقی، اور مشرقی سے بھی بڑھ کر پختہ مذہبی۔ اور دل و دماغ نہایت درجہ حسّاس اس لئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے، اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات ان کے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خارزار سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کرکے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصّہ سرکاری ملازمت میں گزرا، اور آخری حصّہ تو خاصے اعلیٰ عہدوں پر اس کے بعد بھی پنشن کے طوق سے گرانبار، اور خطاب خان بہادری کی زنجیر طلائی سے پا بجولاں۔ اس لئے زبان پر آخر وقت تک مصلحت اندیشیوں کی مہر لگی رہی، اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی نہ کرسکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے، اور اوپر شکر کا غلاف اس قدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولی اتارتا رہتا، اور ادھر زبان ہے کہ فرطِ حلاوت و شیرینی سے ہونٹ چاٹتی رہتی۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و تحریک ترک موالات دونوں کا ہیجان اپنے شباب پر تھا۔ وفات سے چند ماہ، بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے کہہ ڈالا اس میں خلافت و ترک موالات کی تحریکوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہر فریق کے خیالات کی ترجمانی کی ہے افسوس ہے کہ یہ پرلطف نظم نہ صرف مرحوم کے زمانہ ہی میں بلکہ مرحوم کے ۳۰ سال بعد بھی زیور طبع سے محروم رہی۔ جب شاعر اور خود ان تحریکات پر اس حد تک کہنگی طاری ہوچکی تو ظاہر ہے کہ اس نظم میں کوئی زندہ لطف بھی باقی نہیں رہ سکتا زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے جبتک متعلقہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں۔ ہاں تاریخی لطف البتہ ہمیشہ ہی باقی رہ سکتا ہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل، جب آخری بار الہ آباد میں حاضر خدمت ہوا ہوں چند شعر زبان مبارک سے سننے میں آئے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی یاد نہیں۔ نقل لینے کی اجازت تو اس وقت کیا ملتی؟

خود میری ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی[1]

کلیات سوم میں سیاسی اشارے کنائے رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں پچاسوں سیکڑوں جگہ ملیں گی۔ کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے چنانچہ جب نظربندیوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی۔ شوکت علی۔ ابوالکلام سب نظربند ہو چکے تھے۔ ذیل کی بلیغ و پر معنی غزل ارشاد ہوئی ؎

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند	مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
ہماری بے کسی کب تک چھپے گی	خدا پر تو نہیں راہ خبر بند
بیاد رنج یاران نظر بند	کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں درد ہی کی کچھ کمی ہے	نہیں ہے آہ پر راہ اثر بند
بت مشرق نہیں محتاج ساماں	کمر ہی جب نہیں، کیسا کمر بند
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا	کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیال چشم فتاں میں ہوا محو	مرا دل اب ہے سینہ میں نظربند۔

لیکن اظہار خیال کی یہ صورت بس خلل ہی خال نظر آتی ہے۔ عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح و ترقی کی کوئی خاص اصل تحریر کرتے ہیں یا تنزل کے کسی متعین سبب کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ یا موجودہ صورت حال سے مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور یا پھر حریف کے کسی زبردست وار کو رد کر دیتے ہیں۔ شعر میں سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گزار ہے۔ سب کو معلوم ہے محتاط مسافروں اور ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ تو اپنے قدموں کو جراحتوں سے فگار ہی پایا ہے۔ لیکن اس پیمبر سخن کا اعجاز یہ تھا کہ اس کے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا۔ سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہو گئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزور شمشیر کی ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے لیکن اپنی "توپ" پر بھی کبھی نظر کی ہے؟ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی

---

[1] گاندھی نامہ، غلط سلط، کسی صورت سے سہی سنہ ۴۸ء میں چھپ کر شائع ہو گیا۔

مذہب ہی کی تو کی، توحید و رسالت ہی کے لیے تو کی۔ گردنیں اس لیے ماریں کہ دوزخ کے دائمی عذاب سے بچائیں، جنت کی دائمی راہ دکھائیں، مے فروشی سود خواری، بے حجابی حرام کاری، زرپرستی کی اشاعت کے لیے تو نہیں کی۔ توپ دم قوموں کو قبیلوں کو اس لیے تو نہیں کردیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، انکی جائیدادوں پر ان کی دولت پر کریں اور ان کی جانوں کو ان کی اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں! اسالیے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے　　غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے

یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام　　یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور و ناتواں قوموں کی قوت مقاومت توڑنے، اور ان کے جسموں کو ہلاک کرنے کے لیے تو، توپ گولہ بندوق، مشین گنیں استعمال ہوتی ہیں، پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما، انہیں بدبختوں کے دلوں اور دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیم گاہیں کھول دی جاتی ہیں۔ غرض کمزور اقوام کے مقابلہ میں "صاحب" کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی ان کی روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ اس خشک حقیقت کو کس ترزبانی سے بیان کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے　　جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری اصلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لے کر جس قدر بھی کارگذاریاں ہمارے یہ "خداوند" کرتے رہتے ہیں، ہمارے لیے درس گاہیں کھولتے ہیں۔ عدالتیں قائم کرتے ہیں معشیت میں سہولت بہم پہونچاتے ہیں، ان سب کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں ؎

وہ اس کو محو کلیسا بنا کے چھوڑیں گے　　اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے

کریں گے شوق سے مسلم، غذا میں اسے دخل　　شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

کہا یہ شیخ نے اکبرؔ سے روک اپنی زبان　　کہ تجھ کو بھی وہ مجھی سا بنا کے چھوڑیں گے

اونٹ اور "خرِ عیسیٰ" اکبرؔ کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں "مسلمان" اور "صاحب" کے لیے "اونٹ" اور "گاڑی" کا ذکر بھی بڑی کثرت سے آتا ہے۔ مسلمان اور ہندو کے لیے خرِ عیسیٰ کے بجائے کہیں کہیں جان بل

بھی استعمال کیا ہے اور کہیں "بندر" بھی۔

اکبر کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصول قوت تھا، اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں، سیاسیات نام ہے توازن قوت کا۔ جو قوم جس قدر قوی ہوگی، اسی قدر دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہوگی۔ طاقتور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی، اور کمزور کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑیگا۔ تحصیل قوت کی بار بار تعلیم دیتے ہیں، مثلاً ؎

مذہب سوسائٹی ہے اور دین آخرت ہے　　پولیٹیکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت ہے

صحیح طریقۂ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے۔ نہ یہ کہ شکوہ و شکایت یا خوشامد و تملّق میں وقت ضائع کیا جائے ؎

نہایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مردہ　　مناسب داد دینا ہے مجھے یارب کہ رونا ہے
ندا آئی مناسب ہے کہ جینا اپنا ثابت کر　　خوشامد یا شکایت دونوں ہی میں وقت کھونا ہے

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بننا لاحاصل ہے۔ یہاں ہاتھ بن کر رہنا چاہیئے ؎

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ　　ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

ترک ہوں خواہ عرب، اسلام کے اقتدار دنیوی کے محافظ وہی ہو سکتے ہیں، جن کی تلوار میں دم موجود ہو[1] ؎

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ　　کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زور بازو ہندستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل، اور وہ بھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں، تاہم کم ازکم اس محدود دائرہ کے اندر تو وہ اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں ؎

گو رہتے ہیں ممبری فانی پر، شاد　　لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی　　عاقل ہیں مکرمی بھوانی پرشاد

---

[1] ترک اس وقت تک محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا۔

جب تک قوت ہاتھ میں نہیں، زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محفل طرازی سب بیکار ہے پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہیے مگر کیا اتنے سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی؟

روز ٹیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

اس وقت صرف مسلمان ہی ایسے ہی جو تذبذب، کشمکش و دو عملی میں مبتلا ہیں۔ باقی قومیں یا تو حکمران قوت میں جذب ہو گئی ہیں، یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہیں۔ اس حقیقت کو کس اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

شیخ صاحب تو ادھر فکر مساوات میں ہیں
بھائی صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں[1]

قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں
صرف آنر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں

سر بسجدہ ہے کوئی، اور کوئی تیغ بکف
اک ہمیں اس رزولیوشن کے خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خود ضعیفی و کمزوری کی دلیل ہے، اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کا مادّہ خودداری پہلے سے رخصت ہو چکا ہے ؎

کونسل میں سوال کرنے لگے
قومی طاقت نے جب جواب دیا

اس سوال و جواب کا پورا لطف جب ہے، جب یہ بھی یاد رہے کہ "سوال کرنا" اردو محاورہ میں خیرات مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شے کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں، یہ سب انہیں کی ترقی ہے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی ایک نئی یونیورسٹی بنالی وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک نیا سانچہ تیار ہو گیا۔ ہم تالیاں بجاتے رہے، کہ اب تو گورنری تک ہمیں ملنے لگی، صیاد اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ نادان چڑیا کیسی جلد، اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہو گئی۔ بس اتنا ہی ہوا نہ کہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی کر دینی پڑیں! اس صورت حال کی تصویر کتنی موثر اور سچی، اکبر کے مرقع میں ملے گی ؎

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات انکی

---

[1] حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کئے تھے۔ اور فوراً ایک گرامی نامے میں بھی تحریر فرمائے تھے کلیات دوم میں پہلا شعر کسی قدر مختلف ہو کر چھپا ہے یعنی بھائی صاحب پہلے مصرعہ میں ہے اور شیخ صاحب دوسرے میں یہاں کتابت وہی کی گئی ہے جو مکتوب اکبر کے موافق ہے۔

فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضمون انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات انکی!

بت کدہ میں ہماری عزت کیا خاک ہو سکتی ہے، جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو قشقہ ہماری پیشانی پر ہے، وہ بھی ہمارا اپنا نہیں، غیروں کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ ہماری بے دست و پائی کا نشان اور کلنک کا ٹیکا "وفاداری" کی مسلمہ پالیسی جو ملت پر کہنا چاہئے کہ کوئی چالیس سال تک مسلط رہی، یہ تمام تر اسی کی تفسیر و تفصیل بیان ہو رہی ہے ؎

عزت اکبر نہ مثل برہمن در دیر بود! قشقہ بودش بر جبیں، لیکن ز دست غیر بود

اپنی اس بے لبسی، بے کسی، بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہ سنئے۔ نئی اور لطیف، پھڑکتی ہوئی پھدکتی ہوئی۔ اسے کمند ڈال کر گرفت میں لانا حصہ تھا اکبر ہی کی ظرافت کا ذہانت کا ؎

یوز نہ کو رقص پر کس بات کی ہیں دھمکیاں ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

گویا گوری قوموں کو تو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں جس خطہ میں، جس جتن سے بھی چاہیں قابض ہو جائیں، حکومت قائم کر لیں، ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی، کہ حکمرانی و جہانبانی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے۔ لیکن کوئی مشرقی قوم، خصوصاً مسلمان، اگر کہیں ذرا بھی سنبھلنا چاہیں، اپنے پیروں اٹھ کر کھڑے ہونے لگیں، تو انھیں روکیے، تھامیے، ماریئے پیٹیے، نوچیے، پھاڑیئے۔ بلگیریا، سرویا، رومانیا، یونان اگر بڑھیں، ترقی کریں، تو یہ ان کا حق ہی ہے، انھیں خوب بڑھاوے پر بڑھاوے ملتے رہیں، لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی، اپنی کمر بھی کسنا چاہیں، تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھے، کہ لو، وہ پین اسلامزم، کا جن نکل آیا۔ اب مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں" حالات و واقعات کی اس رفتار سے تو اب بچہ بچہ بھی واقف ہو چکا ہے لسان العصر بھی اس حقیقت کو اپنی زبان میں دہرا نے چلے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں ظرافت کے کھلونے لیے ہوئے ہیں، انھیں زور زور سے اچھالتے جاتے ہیں، اور زیر لب مرثیہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں اور زیر لب آواز ہے کہ کسی کی کان میں آتی ہے اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہو "اونٹوں" کی سرافرازی تو گردن کاٹیے ان کی اگر "بندر" کی بن آئے تو فیض ارتقا کہیے

کہا جاتا ہے، کہلایا جاتا ہے، کہ عہد حاضر کی برکتیں دیکھو خدا کی رحمتوں کی طرح شمار و حساب

سے باہر۔ اسکول ہیں، کالج ہیں، ریل ہے، تار ہے، اسپتال ہیں، امن و امان ہے، وغیرہا ــــ عندلیب گلشن حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری "برکتیں" برکتیں مان بھی لی جائے جب بھی بلبل تو دلدادہ اپنی قوت پرواز کا ہے، اسے صیاد کا سجا سجایا رنگین و پرتکلف قفس درکار نہیں ؎

کہا صیّاد نے بلبل سے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے

کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی نشاط طبع کی مہلک، مگر بیکاری پر ہے

مسلمانوں کے لیے یہی قہر الٰہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی کھو چکا تھا، ستم یہ ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے ہوئے "آپ" مل گئے۔ اونٹ راستہ بھول ہی چکا تھا لیکن شاید کہ بھٹکتے بھٹکتے منزل مقصود تک کبھی پہنچ جاتا۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ زمین پر لٹکتی ہوئی نکیل بندر کے ہاتھ آگئی اور وہ اچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اب خدا ہی ہے جو کبھی بھی اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکے زبانی خاطر داریوں میں لفظی واہ واہ میں ذرا کمی نہیں، لیکن یہ مجال کس کی جو مساوات کا کلمہ کفر زبان پر لاسکے ؎

گم کی تھی میں نے راہ مصیبت یہی تھی سخت اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے

باتیں بھی مجھ سے کیں، میری خاطر بھی کی بہت لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے

کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت دو چار برگ خشک تو دو چار پر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشہ چشم بھی ہمارے لیے طرہ افتخار۔ "صاحب" کا ادنیٰ سا التفات بھی ہمارے لیے موجب ناز۔ فرنگیت سے شرمانا کیسا، وہ تو ہمارے خون میں رچ گئی ہے روح میں بس گئی ہے ؎

ان کو بسکٹ کے لیے سوجی کی تھیلی مل گئی

کمپ میں غل مچ گیا، مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

بیمار ہم پڑیں، تو علاج سرکاری شفا خانوں میں کرائیں بچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کرایا ہوا پڑھیں۔ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں، مدد سرکاری پولیس کی لائیں۔ جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و اعزاز سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ پیٹ خالی ہو، بھوک لگے، تو روٹی کا سوال وہی سرکاری محکموں سے حل کریں۔ غرض سرکار دولت مدار کا دامن عاطفت جو آغوش مادر سے بھی بڑھ کر وسیع ہو گیا ہے، اور ہمیں ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے، ہماری خودی سے دُور کرتا جا رہا ہے۔ آخر اس

صورت حال کا اثر ملت کی سیرت پر کیا پڑے گا اور کیا پڑ رہا ہے؟ یہ سوال اکثر زبانوں پر ہے، جواب آئینۂ اکبر کے جام جہاں نما میں دیکھیں ؎

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج | بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید
ہر گام پر، جو طاعت حق سے الگ پڑا | ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید
ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب | ہو جاؤ گے بتان کلیسا کے تم مرید
حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا | حافظ کا ایک شعر جو معنی کو تھا مفید
سِرّ ازل کہ عارف سالک بکس نہ گفت | در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستاران وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے، اور ظاہری خاطر داری کے عقب میں خلوص اور قدر کتنی رہتی ہے، اس کی توضیح و تشریح سے اخبارات کے کالم روزانہ خشک نثر میں ہی لبریز رہتے ہیں۔ اکبر کی قادر الکلامی نے اس سارے دفتر کو بس ایک مصرعہ میں سمیٹ لیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مثل سی آپ نے بارہا ہو گی۔ محلِ استعمال کی صحیح تر مثال مشکل ہی سے ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظ طریقت | دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو | انگریز کو ہے نیٹو سے جس قدر تعلق

سیکڑوں پر جوش اخباری مضمون، سیکڑوں شعلہ بار سیاسی تقریریں، ان چار مصرعوں کی بلاغت جامعیت و نکتہ وری پہ قربان!

بیرونیوں اور بدیسیوں کی کفش برداری سے تو اپنوں کی غلامی، چاہے وہ اپنے کوئی بھی ہوں، بہر حال و صورت بہتر ہے۔ اس خیال کو ذرا دیکھئے کس مزے سے ادا کیا ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی | بسکٹ سے ہے ملائم، پوری ہو یا چپاتی

"دیس" کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں، باقی دیس ایک راگنی کا نام ہے گانا، دھن، دیس، اب سب اکٹھے ہو گئے۔ بسکٹ کا اشارہ صاحب کے میز کی طرف پوری کا ہندو کی رسوئی کی طرف، اور چپاتی کا مسلمان کے باورچی خانہ کی طرف بالکل کھلا ہوا ہے۔

ہندیوں کی باہمی ناچاقی، ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ "صاحب" بھی اس رمز سے

خوب آگاہ ہیں، جب کبھی اس آگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو کبھی بندش ذبح گاؤ کا شعلہ چھوڑ دیا۔ کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قصہ لے بیٹھے کبھی مسجد کے آگے باجہ کا سوال چھیڑ دیا، اور کچھ نہ سہی، تو حملہ افغانستان ہی کا ہوا بنا کر پیش کر دیا۔ اکبر کی نگاہِ دوربین نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے زبان کے معاملے میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اتحاد وطنی کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی کم فہمی و نادانی پر تاسف و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

پوچھا کہ اس صدی میں کیوں چپ ہو گئے جی میں　　کہنا ہے مجھ کو جو کچھ سنئے گا اُس صدی میں

کہنا ہے جو، کہیں ہم وہ کون سی زباں میں　　بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیان میں

ایک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہکر　　سن کر یہ بات ان سے ہر اک کو آیا چکر

چلتے رہیں گروجی، زندہ رہیں یہ بھولے　　پیر فلک نہ کیوں کر ابواب بحث کھولے

غیر ملکی حکومت کی بدگمانیاں اور سخت گیریاں، خدا کی پناہ! بات بات پر شبہ بے بات کی گرفت۔ خود غزلیہ اور عاشقانہ شاعری کے اندر بھی غدر، بغاوت و قانون شکنی کے جراثیم سرکاری خوردبین میں عیاں۔ اس دار و گیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر، شاعر کے نگارخانہ میں ملاحظہ ہو ؎

اک غزل میں اتفاقاً میرا ایک مصرعہ یہ تھا　　دیدۂ عبرت سے رنگ دیر فانی دیکھئے

کوئی بول اٹھا، زوال حسن بت مقصود ہے　　اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے

عارفانہ شاعری بھی آجکل دشوار ہے　　بزم دنیا میں یہ زور بدگمانی دیکھئے

اکبر کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے ۱۹۱۴ء جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے۔ تو یاد ہوگا کہ بالکل ابتدا میں اعلان جنگ صرف آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا۔ اکبر نے معاً ایک نظم کہی ایک مصرعہ یہ تھا ع

بحمد اللہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلہ میں گولی چلنے اور اس سے مسلمانوں کے شہید ہونے سے مسلمانوں کا دل چھلنی ہو رہا تھا "خون شہیداں" کی تلمیح اسی جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لیے گئے۔ اکبر صاحب بھی نرے شاعر تھے، کوئی دار و زنداں کے مرد میداں تو تھے نہیں، اعلان کر دیا کہ بہت اچھا آئندہ شعر گوئی سے توبہ، نہ معلوم کس وقت کیا نکل جائے، اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں۔ لیکن رند قدح خوار

کی طرح شاعری کی توبہ ہی کیا، اور گئے دن کی! توبہ کیجیے! اخیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی۔ لیکن تخلیہ کی مجلسوں میں قاضی و محتسب کی دست رس سے دور، شغل اس وقت بھی جاری ہی رہا ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی	سینے ادھر ایسے کہ سہیں جو رو رفل بھی
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے	حکم اکبر کو ملا ہے کہ نہ لکھو اشعار

جنگ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں تک خالی نہیں۔ نئی نئی تشبیہیں، میدان جنگ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
مرا تقویٰ کہاں تک ان کو روکے بلجیم بن کر[1]

یہ کونسلیں، یہ اسمبلیاں، یہ ووٹ بازیاں، اور الکشن جنگیاں، یہ علامتیں ہیں ہماری ترقی اور آزادی کی! یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے، اور ہمارے حق میں مزید پھندے؟ اکبر کے ہاں یہ سوالیہ نشان بار بار وضاحت کے ساتھ ملتا ہے ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا	قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا
اس کو سمجھیں فرض کفایہ	کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ
سلف گورنمنٹ کے آگے آئی	بھائی بھائی میں ہاتھا پائی!
ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی	پاؤں کا ہوش، اب فکر نہ سر کی

ایک دوسری جگہ ان کی دُور اندیشی اور اپنی غفلت و کوتاہ بینی کی حکایت یوں کر رہے ہیں۔ تاسف اور دلسوزی کا رنگ اب اور گہرا ہے ؎

لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا	ہادن تو ہے ہوس کا، دستہ ہے پالسی کا
ہر سو اچھل رہے اور جُوڑ ہو رہے ہیں	ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں
اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو	اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو
اندھیر ہو رہا تھا، بجلی کی روشنی میں	لکھے گا کلک حسرت، دنیا کی ہسٹری میں

---

[1] پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حملہ اتحادیوں پر بلجیم کے راستہ سے ہوا تھا اور بلجیم بیچارہ پہلی ہی زد میں گر گیا تھا۔

ایک اور مقام جہاں شاعرانہ دوربینی اور حقیقت سنجی، اس ظاہر اور اوپر سے خوش نما منظر کو یوں بے نقاب کر رہی ہے ؎

کونسل تو ہے انکی جن کا ہے راج | نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج
سوشل حالت کی ہے تباہی | کہتے جاتے ہیں یا الٰہی !
اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں | ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں
پنجرہ میں پھدک رہی ہے مینا | دراصل نہ دین ہے نہ دنیا
لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں | اسکیم[۱] کا جھولنا وہ جھولیں !!

مئی و جون کی گرم لو اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں، قاضی و محتسب کی دھڑ پکڑ کی گرما گرمی دیکھ شاعر غریب کو اپنی خیریت تو اسی میں نظر آتی ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔ اور منھ کھولنے کے لیے انتظار کسی مناسب موسم کا کیا جائے۔ بے فصل اگر بیج ڈالا جائے تو پودا ہرگز نہ اُگے گا۔ کہتا ہے کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہے، اسی طرح ایک موقع سکوت و بے تعلقی کا بھی ہوتا ہے، اور آج وہی موقع ہے ؎

کس سے کہیئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو | گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ لیکن
بزم میں موقع اظہار خیالات تو ہو | داستانِ غمِ دل کون کہے، کون سنے
وقت بالیدگی تخم و نباتات تو ہو | عدم نشو و نما سے نہ کہو تخم کو بد

تینوں شعر سوز و درد کی تصویریں، اور انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو لیئے ہوئے پھر کہتا ہے کہ زمانہ نے مساعدت کی، تو کبھی ہماری بھی زبان کھلے گی ورنہ یہ سکوت، سکوت اجل سے ہم آغوش ہو رہے گا ؎

ہوا ہی بدلی ہوئی ہے، فلک سے کون لڑے | ہم اس زمانہ میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے
ابھی تو چپ ہیں، کوئی لاکھ اعتراض جڑے | خدا ہی ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے
جو اٹھ سکے تو ہے قصہ ہی ختم، خود ہی گڑے | اگر اٹھے تو علم اپنا گاڑلیں گے کہیں

حق پرستوں کے لیے کھلے ہوئے راستے تو دو ہی ہیں، یا سیدھے سیدھے اس دارِ فانی سے

۱ـ اشارہ ہے وقت کی چلی ہوئی ماٹینگو "ریفارم اسکیم" کی طرف۔

رخصت ہو جائیں، اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ؎

حق پرستی کا نشاں اب قہر ہے یا صبر ہے　　اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط اک جبر ہے

فرماتے ہیں مومن کے لیے فضا یکسر تاریک، ماحول تمام تر ناسازگار۔ ہر ہوا جو چلتی ہے ناموافق۔ اہل ایمان کے لیے اس عالم یاس و حرماں میں بھی بھروسہ صرف رحمت باری کا۔ تاریک خانہ میں بھی ایک شعاع امید ؎

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھپک، جب منھ میں زباں جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو ایسی ساعت پر، افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے، یا کچھ نہ کہے، یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے

قاتل کو بھروسہ قوت کا، اور ہم کو خدا کی رحمت کا
ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا، وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

"صاحب" کا ساتھ دیجیے تو دین رخصت۔ بے نیازی اختیار کیجیے تو دنیا سے ہاتھ دھوییے ؎

بے گزٹ ہو کے جو چلیے تو محلہ میں حقیر　　با گزٹ ہو کے جو رہیے تو فرشتوں میں خفیف

"گزٹ" کے لفظ سے بھی اکبرؔ نے خوب کام نکالے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بغیر سرکاری اعزاز کے اگر رہیے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا؟ مادی تعلق منصب و اعزاز سے دل لگائے رکھیے تو پھر دین کا خدا حافظ۔

اور تو اور، اب اپنے کو محض مسلمان کہنا اور کہلانا بھی تو مشکل ہو گیا ہے ادھر آپ نے اعلان اپنے اسلام کا کیا، ادھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آپ مضحکہ کے ہدف بن کر رہے مسلمان کہلانے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو چارہ بجز اس کے نہیں کہ اپنے کو تجدّد کا بندہ، صاحب زدہ مسلمان کہلائیے ؎

جو پوچھا مجھ سے دور چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے

کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوف قہر یزداں ہے

بالآخر کہہ دیا میں نے کہ "گو مسلم تو ہے بندہ"
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

لیکن اس ساری پستی و ادبار کے اسباب اکبر کی تشخیص میں خارجی نہیں داخلی ہیں۔ جن مصائب کے ہم شکار ہو رہے ہیں یہ خود ہمارے ہی ہاتھوں کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا، اغیار ہم پر دلیر ہو گئے۔ ہم نے ملی طور طریقوں کو خیرباد کہا، اغیار ہم کو نگلنے لگے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید و نقالی شروع کی، بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑو جب تک بندھی ہوئی ہے تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے۔ ادھر اس کا مُٹھا کھلا، ادھر اس کی ایک ایک سینک ہوا کے ہر جھونکے کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شے تو صرف قوم و ملت میں خودی و خودداری کا احساس ہے اقبال کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہی ہے لیکن اس کی جھلکیاں اکبر کے یہاں بھی موجود ہیں فرماتے ہیں ؎

طریق حکمت و تزئین ہر ایک رنگ میں ہے ۔۔۔ نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے
نگاہ غور کرو سوئے ٹرکی و ایران ۔۔۔ نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویران
تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے ۔۔۔ تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جاں آئے
جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا ۔۔۔ تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا
جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں اسے کھل کر ۔۔۔ کہ سلطنت نہ سہی، تم رہو تو مل جُل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبال مند نظر آتے ہیں۔ ان کی بھی اقبال مندیاں، خوش بختیاں کامرانیاں کب تک ہ؟ کے دن کے لیے! ایک دن احتساب کا آخر ان کے لیے بھی آنے والا ہے جہاں فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر کبھی کبھی ان بدمستوں کے کان تک پہنچا دیتا ہے۔

مجبور بدلتے جانے پر اقبال و حشم کے دور بھی ہیں
یکتائی کا دعویٰ خوب نہیں، اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ فقیر مدہوشان غفلت کے قصر و ایوان کے سامنے آکر صدائے عبرت بلند کرتا ہے ؎

ہرج کیا وقعت نہیں میری جو بزم غیر میں ۔۔۔ عزت مسلم ہے اس کی کس مپرسی دیر میں

تار برقی سے ہوا معلوم حال زار روس[1] — شور برپا ہے کلیسا میں، حرم میں دیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد — لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدود انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے ؎

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے، منو یا نہ منو — ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہموطنو
اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد — آسمان تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اس وقت کا ہے جب پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر صلحنامہ مرتب ہو رہا تھا اور اس کا خاص اہتمام تھا کہ اب کی یورپ کی تنظیم جدید کی جو قبا تیار ہو، اس کا دامن ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے ؎

کو رانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ ان کو دیں گی نہیں!
نقشوں میں لکیریں کھنچنے سے فطرت کی حدیں بدلیں گی نہیں!

یہ دوسرا مصرعہ تو اپنی بلاغت، وایجاز و جامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت حاصل کرلے۔

آج انہیں اپنی طاقت و توانائی پر غرہ ہے، کیا انھوں نے کبھی خیال نہیں کیا، کہ شمع نے دم بھر میں سیکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں، لیکن خود صرصر فنا کے ایک طمانچہ کے سامنے معاً بے نور تھی۔ ہاتھی نے ایک قدم رکھتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا لیکن قضائے الٰہی کے پیلتن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے خود تودۂ خاک تھا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو، زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، روما کے قیصروں کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، اسیریا کے ویرانے مذبوح و مقتول زار روس کے جسم کی تڑپ، اور زندہ در گور قیصر جرمنی کے دل کی حسرتیں دیں گی۔ اکبر کا مرقع سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج ان کی رفل کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ، اجل کی زد پر

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہو گیا زار روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعون باسامان، اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا۔

سنت آلہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینہ ظلم وجور چشم زدن میں غرق ہو کر رہتا ہے لیکن شروع میں نہیں۔ قہر وانتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اس وقت ہیں جب پہلے خوب مہلت مل چکتی ہے اور تمرد ورعونت، خود فراموشی وخدا فراموشی کی کشتی حد سے زیادہ بھاری ہو چکتی ہے اکبر کی ذہانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامان مشرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کر رہا ہے، جب تک اس طغیان وتمرد کی کشتی پوری طرح گرانبار نہ ہو چکے گی، غضب الہی جوش میں نہ آئے گا گویا اس مشغلہ میں دیر تک مصروف رہنا، آنے والے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

یورپ کو پالیسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

اس تمام سیاسی کشمکش وبین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہونے والی ہیں، ان سے تو اب کسی کو انکار نہیں، البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی۔ "صاحب" اور صاحب زدوں کا کہنا یہ ہے کہ آخری جیت، ہمت وحوصلہ مندی، باقاعدگی، وخوش نظمی "علم" "روشن خیالی" "تہذیب وشائستگی کی رہنا یقینی ہے، اکبر کا فیصلہ یہ ہے کہ مشیت آلہی آخری تائید اسی فریق کی کرے گی جو نیکوکار ہے اور حسن عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے اور استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظ خشک میں بھی زندہ دلی کی ادائیں بھر دی ہیں ؎

بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی؟	شامت آئی ہے یہ مسلّم ہے
یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی	میری جانب اشارہ غالب ہے
کھل ہی جائیگا، آئی ہے جس کی	خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو؟
بڑھ گئی ہے بہت مری وسکی	اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے

اہل ملک کے لیے اس صورت حال کا آخر علاج کیا ہے؟ جتنی زبانیں، اتنی باتیں۔ اکبر کی تشخیص اور طریق علاج سب سے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا؟ کس نے اسے مجبور کیا! کسی نے بھی نہیں، بجز اس کی ہوس وطمع کے اکبر بے نیازی بے طمعی، بے غرضی کا آئیڈیل (مطمح نظر) پیش کر کے سیاسیات کیا، تصوف کی تعلیم دیتے جاتے ہیں ؎

مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی انکو جو مری پروا نہ ہی	ہو تجھ پہ بتوں کی چشم کرم دل کو یہ طلب اصلا نہ رہی

دنیا کا تردد جب تک تھا، جب تک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم، رغبت نہ رہی، دنیا نہ رہی
سچ پوچھیے تو راحت ہی ملی دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اداسی ہے بھی تو ہو آفت تو مگر برپا نہ رہی

تحریک ترک موالات" جو ان کے زمانہ میں چلی۔ اکبر اس سے متفق ضرور تھے، پھر بھی تحریک کے علم برداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے، کہتے تھے، یہ بھی کوئی جنگ ہے، کہ روٹی نہ ملی نوکری نہ ملی، تو حکومت سے بگڑ بیٹھے، اور روٹھ کر جھنجھلاہٹ میں لگے غصہ اسی پر آتا رہے مولوی ہو یا گریجویٹ، جھنجھلاہٹ کا باعث وہی بھوک ہے ؎

نئی روشنی کا ہوا تیل کم	حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے	نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے	سیاسی کمیٹی میں پل جائیے
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور	خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

حضرت اکبر نے شخصاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا، ان کا مطمح نظر وطن کے بجائے عاقبت، ملک کے بجائے حقانیت، اور قوم کے بجائے خدا تھا، اس لئے جن مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں یہ خاموش رہتے اور اسی خاموشی کی تعلیم دوسروں کو بھی دیتے ہیں ؎

آزادی کا شور مبارک	یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر	میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو بے ہوشی زیبا	عاقل کو خاموشی زیبا

ان کے خیال میں سیاسی، ملکی، ملی، ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی، طاعت، عبادت، عقیدت۔ مومن کے لیے ابتلا و آزمائش کا وقت آنا لازمی ہے، مومن وہی ہے جو اس آزمائش میں پورا اترے، اور انتہائے کرب و اضطراب میں بھی نظر شافی مطلق پر رکھے، اس مضمون کو لیکر پوری ایک غزل کہہ ڈالی ؎

مسجد میں خدا خدا کیے جاؤ	مایوس نہ ہو دعا کیے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں	مرتے مرتے ادا کیے جاؤ

کتنا ہی ہو وقت بے حجابی　　تم پیروئ حیا کئے جاؤ
امید شفا خدا سے رکھو　　کیوں ترک کرو، دوا کئے جاؤ

غلامی ومحکومی کا راز صرف یہ بتاتے ہیں، کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے۔ سلطنت وحکومت تو مادّی حیثیت سے خلافت ونیابت الٰہی ہے، آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کرلیں تو مادی غلبہ ابھی حاصل کرلیں،

قوت ایماں سے کہدو سب کو سمجھاتی رہے　　نیکیاں کثرت سے ہوں مغلوبیت جاتی رہے

اس حقیقت کا مشاہدہ تاسف وحسرت کی نظروں سے کرتے تھے کہ نام وطنیت وقومیت کا لے لیکر ساری دنیا، کیا مشرق اور کیا مغرب محض مادی غرض مندیوں کے لیے ایک دوسرے سے مصروف کارزار ہے، خوفِ خدا، حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جارہا ہے اور اس لیے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہورہا ہے ؎

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے　　دنیا اٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں، رہیں گے وہ اللہ ہی کیساتھ　　اللہ ہی ہے ان کی تسلّی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج وزوال، زمانہ کی معمولی دھوپ چھاؤں ہے آج اس قوم کا طبل اقبال بج رہا ہے، کل اس کا بجے گا۔ دولت کا تاج آج ایک قوم کے سر پر ہے، کل دوسری کے، یہ مدوجزر زمانہ کے سمندر میں ہر وقت اور ہر آن لگا رہتا ہے، ترک اگر اس حکومت سے بے دخل کیے جاتے ہیں تو یہ کوایسی بڑی بات نہیں[1]۔ ماتم انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صبر وعزم، غیرت وخودداری، صدق وثبات، ہم سے رخصت ہورہا ہے، اور ہم روز بروز توفیق الٰہی اور قوت ذاتی پر اعتماد کرنے کے دوسروں کے محتاج ودست نگر ہوتے جاتے ہیں، حسرت ہماری اس قلب ماہیت پر نوحہ کرتی، اور عبرت آنسو بہاتی ہے ؎

انتظامی بات ہے یہ، ہوتی رہتی ہے یونہی　　اس کا کیا شکوہ جو ہم پر اس کو غالب کردیا
ہاں یہ ہے افسوس، ہم سے چھن گیا صبر وقرار　　طالب حق کو فلک نے بت کا طالب کردیا۔

---

[1] جس عہد کے کلام پر یہ گفتگو چل رہی ہے، ترک اس وقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے سب سے بڑے (باقی ص۔)

اس وقت دنیا صرف "صاحب" ہی پر بھوٹے ہی مسلط ہے، ہماری ساری جدوجہد کا مرکز بھی تو دنیا اور محض دنیا رہ گئی ہے، اس سے آگے کی دوربینی رخصت۔ فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سے سررشتہ صبر کسی حالت میں نہ چھوٹنے پائے ؎

ارماں بہ قدر طاقت ہر سو نکل رہے ہیں — "صاحب" تو اڑ رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں
غصہ میں ہیں ہم ان پر، وہ ہم پہ ہنس رہے ہیں — دام فریب دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں!!
دونوں کو چاہیئے یہ طاقت سے منھ نہ موڑیں — وہ اپنا جبر چھوڑیں، ہم صبر کو نہ چھوڑیں!!

تحریک ترک موالات کو درجہ قبول صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس کے ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمہ عبودیت ہو نہ کہ اس کی بنا خود بینی پر ہو کہ یہ تو عین ابلیسیت[1] ہوئی ؎

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم — کہ دل کو طاعت حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز — ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی، ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو تحریک ترک موالات سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت "خانگی" اتنی ہے کہ کسی نامحرم کی زبان سے کیا ادا ہو۔ بہتر ہوگا کہ اسے خود انھیں کی زبان سے سنیے۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سنا کر بولے کہ یہ بھی آپ سمجھے کہ میں نے اپنے کو مدخولۂ گورنمنٹ کیوں کہا؟ پنشن پاتا ہوں

(باقی حاشیہ صفحہ) اور زبردست نمائندہ تھے، سلطان المعظم اس وقت تک خلیفۃ المسلمین تھے، اور خادم الحرمین الشریفین ترکوں کو جنگ عظیم اول میں جو شکست ہوئی (۱۹۱۸ء میں) یہ محض ایک سلطنت یا جغرافیائی اقلیم کی شکست نہ تھی، عالم اسلامی اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضرب کاری سمجھا، ہندوستان میں جو عظیم الشان تحریک خلافت کے نام سے قائم ہوئی، وہ اسی احساس کا نتیجہ تھی۔

[1] جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا تھا، آہ کہ وہی آخری ملاقات تھی میرے اوپر نشہ تحریک خلافت و ترک موالات کا سوار تھا، مہاتما گاندھی کی روحانیت اور تقدس کی تعظیم و احترام میں سرشار تھا بات بات پر انکی بزرگی اور حیثیت کا حوالہ، دل میں اس کی آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی یہ جادو چل جائے دو چار منٹ تو صبر کیا، اس کے بعد ایکبارگی پوچھ بیٹھے، اچھا صاحب تو گاندھی جی روحانیت کے بڑے قائل ہیں اپنی اس کمیٹی میں داخلہ کی پہلی شرط انھوں نے لا الٰہ الا اللہ تو ضرور ہی رکھی ہوگی، میں چوکڑی بھول گیا، مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ "جی نہیں" ایسا تو نہیں" بولے" بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں بس ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آج کل ہیں۔

نا! ملازمت میں ہوتا تنخواہ پاتا تو مدخولہ نہیں منکوحہ کہتا!

(ج) عشق و تغزل

اکبر کی شہرت عام، غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیات اوّل و دوم میں ان کی متعدد غزلیں اچھی سے اچھی موجود ہیں، ایسی کہ نہیں بلا تامل استادان غزل اُردو کے کلام کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے کلیات اوّل کا سال طبع ۱۹۰۶ء ہے اس میں حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دَور قائم کیے ہیں سلسلہ بیان کے لیے ان میں سے ہر دَور کے نمونہ کلام پر ایک سرسری نظر کرتے چلیے۔

پہلا دَور ۱۸۶۶ء تک اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء ہے، گویا یہ دوران کی شاعری کے بچپن کا تھا شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا۔ یہ سن بھی کوئی سن ہے۔ اپنے اور اپنی شاعری دونوں کے اس لڑکپن میں وہ عام غزل گوئیوں کے بالکل ہم نوا ہیں۔ تاہم برجستگی شوخی روانی طبع و لطف زبان کے جوہر جو آگے چل کر اس آب و تاب سے چمکے، اس وقت بھی مخفی و غیر نمایاں نہیں۔ اور رعایت لفظی، لکھنؤ کے رنگ کی بھی خاصی موجود ہے، اشعار ذیل کے پڑھتے وقت یہ خوب یاد رہے کہ زمانہ ۱۸۶۶ء اور اس سے قبل کا ہے اودھ میں انگریزی نئی نئی قائم ہوئی ہے، نوابی کو گئے ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے اودھ و مضافات اودھ میں، زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً شعر و ادب میں پرانے لکھنؤ کی خوبو پوری طرح باقی ہے بلکہ وہی مذاق ابھی تک قائم ہے ؎

بے تکلف بوسۂ زلف چلیپا لیجیے — نقد دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجیے
دل تو پہلے لے چکے، اب جان کے خواہاں ہیں آپ — اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجیے
پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیر زنداں میں رہو — وحشت دل کا ہے ایما راہ صحرا لیجیے

سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی — یاد آتی ہے، بلبل، مجھے تقریر کسی کی

دوسرا مصرعہ غالباً طرحی ہے۔

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب، یہ مروت کیسی

کوچہ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا   قیس آوارہ ہے جنگل میں یہ وحشت کیسی

جذبۂ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہے   گھنگھروؤں کی جانب در کچھ صدا آئی تو ہے
عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے   پر کروں کیا؟ اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے
آپ کے سر کی قسم، میرے سوا کوئی نہیں   بے تکلف آئیے، کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۴ء، رندی و ہوسناکی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں، تاہم جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے، رنگ تغزل کہیں زیادہ نکھر گیا ہے اور لطف زبان و حسن بیان کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آج آرائش گیسوئے دوتا ہوتی ہے   پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے
شوق پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز   گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انسان   سچ تو یہ ہے، کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے
جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے   جان کیونکر ہدف تیر قضا ہوتی ہے
ہوں فریب ستم یار کا قائل اکبرؔ   مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اسی زمین میں ایک مشہور و مقبول غزل مرزا لکھنوی کی ہے، اکبر کی غزل اس کے ٹکر کی ہے

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا   آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا   بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
میں نزع میں ہوں آئیں تو احساں ہے انکا   لیکن وہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام   وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

دوسرے شعر میں اکبر کی معنویت پوری طرح ادا کر دی ہے، اور چوتھا شعر تو گویا اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

یار نے کچھ خبر نہ لی، دل نے جگر نے کیا کیا   نالۂ شب سے کیا ہوا، آہ سحر نے کیا کیا

کھل گیا سب پہ حال دل ہنستے ہیں دوست ملا ضبط کیا نہ رازِ عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

دورِ سوم ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۸ء اس دور کا کلام، رنگ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے۔ طرزِ ادا میں سنجیدگی بڑھ گئی ہے۔ مضمون آفرینی پر توجہ زیادہ ہوگئی ہے۔ غزل میں اخلاقی و روحانی مضامین کی آمد بے تکلفانہ شروع ہوگئی ہے، ظرافت کا چٹخارا ابھی جا بجا موجود ہونے لگا ہے، پھر بھی تغزل کا جو رنگ مسلم و مستند اور ثقہ استادوں کے درمیان متعارف ہے اس سے مجال نہیں کہ مصرعہ الگ جا پڑے۔ ملاحظہ ہو ے

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس ایک سر بھی اسے آمادہ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش طالبِ زمزمہ بلبل شیدا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبرؔ مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

دل مرا ان پہ جو آیا تو قضا بھی آئی درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا میں بھی آیا ترے گھر، میری بلا بھی آئی
وائے قسمت کہ میرے کفر کی وقعت نہ ہوئی بت کو دیکھا تو مجھے یادِ خدا بھی آئی
ہوئیں آغازِ جوانی میں نگاہیں نیچی! نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنچۂ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا
شانِ محبوبئ صانع کا نشاں رکھا ہے یہ ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
کیا مرے اک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں ایک کن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے، ہوش و خرد وہم و تمیز خانۂ دل میں تم آئے ہم نے پردہ کر دیا
شاہدِ بزمِ ازل نے ایک نگاہ ناز سے عشق کو اس انجمن میں سند آرا کر دیا
شورِ شیریں کا مزہ رکھا، سرِ فرہاد میں قیس کو دیوانۂ اندازِ لیلیٰ کر دیا

گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع　　رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبرؔ میں تم سے کیا کہوں
اس نے مجھ کو کیا کیا، دل کو میرے کیا کر دیا

وہ حجاب ان کا آج تک نہ گیا　　نہ گیا ان کے دل سے شک نہ گیا
اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی　　وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا　　اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا
ایسے ستم کئے کہ مرا قلب ہل گیا　　اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا
تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا　　بلبل کو وجد آگیا، غنچہ بھی کھل گیا
خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز　　اپنے ہی دل میں مجھ کو مرا رب بھی مل گیا

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے　　مانگی نہ مدد دل نے مرے طولِ امل سے
ان کی نگہ مست ہے لبریزِ معانی　　ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے
اوراک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھولیں　　واقف نہ ہوا روشنیٔ صبحِ ازل سے
قرآں ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے　　کس حسن سے یہ بھی تو سنو، حسنِ عمل سے[1]
حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ　　ہیبت تیرے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے
درجہ متحیر کا ہے، بے خود سے فروتر　　ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

---

[1] یہ غزل حضرت اکبرؔ نے لکھنؤ میں ایک مشاعرہ میں پڑھی، لکھنؤ کے ایک مشہور وکیل منشی حاجی اطہر علی کاکوری مرحوم، ایک صاحب علم وصاحب دل بزرگ بھی مشاعرہ میں موجود تھے، اکبرؔ نے خود یہ روایت مجھ سے بیان فرمائی کہ جب اس شعر پر پہونچا، ابھی پہلا ہی مصرعہ زبان سے نکلا کہ آنکھیں منشی صاحب سے چار ہوگئیں، منشی صاحب کے تیور پر بل تھے کہ قرآن اور خدا سے یہ شوخی کیا معنی۔ میں تاڑ گیا۔ برجستہ عرض کیا کہ مصرعہ ملاحظہ ہو، اور پھر دوسرا مصرعہ پڑھا، تو منشی صاحب پھڑک اٹھے بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔

جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے　　بحث کہن و نو، میں سمجھتا نہیں اکبرؔ

یہ تین دَور تو خود حضرت اکبر کے قائم کیے ہوئے تھے، کلیات اول کے زمانہ تک۔ اب اس کے بعد دَورِ چہارم ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک سمجھیے۔ یہ کوئی مستقل دور نہیں، لسے دَورِ سوم تک کا کلام سمجھنا چاہیئے، دورِ سوم تک کا کلام، کلیات اوّل میں موجود ہے اس کے بعد کے چار سال کا کلام کلیات دوم میں ہے، بس اسی لیے اس حصہ کے لیے ایک جداگانہ دَور قائم کرنا پڑا۔ ۱۹۰۸ء تک غزل میں جتنی پختگی آنا تھی آچکی تھی، شاعر کی عمر اب ۶۰-۶۲ سال کی ہو چکی تھی، اور شمار اب اُستادوں میں تھا اس کے بعد صنف غزل میں نہ کسی جدّت کی توقع تھی، اور نہ کوئی جدت واقع ہوئی کیفیت وہی قائم رہی، البتہ اتنا فرق ہوا کہ کلیات اول بیشتر حصہ غزلوں کا ہے کلیات دوم میں اوّل تو یہ تناسب ہی گھٹ گیا ہے اور پھر جتنا حصہ غزلیات کا ہے بھی، اس میں بھی صرف عشق و محبت ہی کے بندھے ٹکے ہوئے معاملات نہیں، بلکہ اخلاق، معاشرت، فلسفہ و سیاست و تصوف و معرفت سب ہی کے مضمون شامل۔ با ایں ہمہ اس دَور کا عاشقانہ حصہ بھی کسی معیار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ لطف و کیفیت ہر سطر سے نمایاں پختگی اور شگفتگی کے ثبوت ہر صفحہ پر۔ مضمون آفرینی اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پھوٹا پڑتا ہے، طبیعت کی آمد، جدّت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہے ؎

اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا　　وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا
یا اِس نے خوب سمجھا، یا اس نے خوب دیکھا　　اس نے خدا کو مانا، وہ ہو رہا بتوں کا

یہ جنوں اگر نہ ہوتا، تو کہاں یہ ہوش ہوتا　　نہ یہ رنگ طبع ہوتا، نہ یہ دل میں جوش ہوتا
مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا　　غم دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا
نہ یہ ہوتی چشم نرگس، نہ یہ گل کا گوش ہوتا　　تمہیں دیکھ سن کے فطرت نے یہ نقش کھینچے ورنہ
کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا　　دل و دیں سب اُسکے صدقے، جو وہ خود نما بنا ہے
تجھے میں ولی سمجھتا جو تو خرقہ پوش ہوتا　　حسن نظامی اکبرؔ کا کلام سُن کے بولے

بتوں سے میل، خدا پر نظر، یہ خوب کہی — شب گنہ و نماز سحر، یہ خوب کہی!
تمھاری خاطر نازک کا ہے خیال فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر، یہ خوب کہی
شباب و بادہ و فکر مآل کار چہ خوش — جنون و عشق و خیال خطر، یہ خوب کہی
سوال وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی — وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر، یہ خوب کہی

آہ دل سے جو نکالی جائے گی — کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یاد ان کی ہے، بہت عزلت پسند — آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں — حشر کہتا ہے منالی جائے گی
یاد ابرو میں ہے اکبر محو کیوں! — کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ایک صوت سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے — ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس — شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحب آغوش ہے
حضرت منصور انا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ — دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

(یہ تیسرا شعر منصور حلاج کی پر شور و معرکتہ الآرا بحث میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت "تکلیف شرعی" کی اصطلاح یاد رہے۔

شوق وصل شعلہ رویاں کیوں نہو برسات میں — ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے

رنگ شراب سے مری نیت بدل گئی — واعظ کی بات رہ گئی، ساقی کی چل گئی
تیار تھا نماز پہ میں سن کے ذکر حور — جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے — صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی!
چمکا ترا جمال جو محفل میں وقت شام — پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی
حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں — پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دَورِ پنجم ۱۹۱۴ئہ تا ۱۹۱۹ئہ۔ اس دَور کا کلام کلیات سوم میں ہے اور وہی اس تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ شاعر کی عمر اب ستر کے لگ بھگ یا ستّر سے اوپر ہے اور اب وہ شاعر سے کہیں زیادہ مفکر ہے، دل شاہد و شراب چنگ و رباب کے تذکروں سے اچاٹ ہو چکا ہے، آگ معرفت اور عشق حقیقی کی بھڑک چکی ہے، رواجی مجازی تغزل کا رنگ ہلکا پڑ چکا ہے۔ غزل کہنا بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا تھا زیادہ تر سیاسی، اخلاقی عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ بظاہر عنوان غزلیات کا کلیات سوم میں بھی خاصا بڑا ہے، لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے عموماً واقعات حاضرہ پر شاعر کے خیالات اور تبصرے ہیں، صرف موزوں انھیں غزل کے سانچے میں کر دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت موجود تو ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی تھی درمیانی کلام میں اور بڑھی اور آخری زمانہ میں تو یہی خصوصیت، دوسری خصوصیتوں پر چھا گئی، اور کلام پر غالب آ گئی۔

کلیات اوّل کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے پر ایک سنجیدہ ناقد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ:۔

"مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تھنکر (سوچنے والا، صاحب فکر) یا فلاسفر ہے، جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے بڑی پسند آئی، اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے اور واقعہ ہے بھی یہی، کہ جوں جوں ان کی شاعری نکھرتی گئی، وہ روز بروز اس کے مصداق صحیح سے صحیح تر ہوتے گئے ابھی کلیات سوم کی دو ایک غزلیں درج ہوتی ہیں، ان سے معلوم ہوگا کہ قالب اگرچہ غزل کا ہے، لیکن روح ذرا بھی غزل کی نہیں (غزل اپنے عام عرفی و مقبول معنی ہیں) جام و سبو کی شکل پر جایئے تو اب بھی ہر طرف شراب ہی شراب نظر آئے گی، لیکن چکھ کر دیکھیے تو آپ خود ہی پکار اٹھیں گے کہ استغفر اللہ، شراب یہاں کہاں، یہ تو پیالیوں میں عرق ما اللحم یا شربت روح افزا چھلک رہا ہے ظرافت کی چاشنی اخلاق و سیاسیات کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آ رہی ہے۔"

ذیل کی غزل کو آپ غزل کہیں گے، یا ایک درس تصوف و معرفت "سخن بازنان گفتن"[1]، یہ کس معنی میں سہی؟

نگاہ اٹھی ہے احساس ماسوا کے لیے کہاں ہے دل ذرا روکے اسے خدا کے لیے

---

[1] غزل کے لغوی معنی۔

رواں ہو کارِ جہاں کیوں ہماری مرضی پر　　خدا ہمارے لیے ہے کہ ہم خدا کے لیے
عمل خدا کے لیے ہو تو اس کا کیا کہنا　　مگر ریا یہ بری صرف واہ وا کے لیے

لیلائے تغزل کے مجنوں دور سے محمل کو دیکھ شوق سے اس کی طرف لپکتے ہیں پاس آکر اندر جھانکتے ہیں، تو نہ کوئی عشوہ فروش ہے، نہ کوئی زہرہ جبیں، بلکہ کوئی شیخ وقت کچھ تسبیح و تہلیل کرتے سے نظر آتے ہیں ؎

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں　　نہ صرف آپ میں ہم ہیں، تمام عالم میں
اسی کا نام نہ کیوں مرکز زبان ہو جائے　　کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں
خدا پرست کو کافی ہے مثل ابراہیم　　زوال شمس و قمر، صبح و شام عالم میں
یہی مشن تھا جناب رسول اکرم کا　　اور آج انھیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

ذوق نظر کے شیدائی، چنگ و رباب کے رسیا، دور سے باجے گاجے کی آواز سن سنا دوڑتے ہوئے آتے ہیں کہ چلیں اندر سبھا ناٹک کا لطف اٹھالیں، جلوہ گاہ کا جب پردہ اٹھتا ہے تو سارا وہم و تخیل ہی برباد۔ نہ مطرب ہے نہ ساز، ناز نہ انداز۔ محفل میں بجائے ساز کے سوز ہے لبوں پر بجائے واہ کے آہ ہے طبلہ کی تھاپ کی جگہ ضربیں کچھ اللہ ہو کی سی لگ رہی ہیں۔ چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے، خشیت کے آثار و انوار اور وسط بزم میں ایک صاحب حال بیٹھے ہوئے اپنی آگ سے دوسروں کو گرما رہے ہیں ؎

گو سعی ہوائے شوق نے کی، بو اس کی نہ نکلی محفل سے
مجنوں نے اڑائی خاک بہت، لیلیٰ نے نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال باری کو
پروانہ کو مطلب شمع سے ہے، کیا کام ہے رنگ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہ ہوا، فریاد و فغاں میں کیا کرتا
جس وقت تہ خنجر تھا گلا، آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

طبیعت زہد خشک سے اکتا چلی ہو، اور دل میں ظرافت کی گدگدی اٹھ رہی ہو، تو اس رنگ

کو لینے کہیں دُور نہیں جانا ہے۔ ندرت قافیہ کے طلسم ساز کے لیے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے، اس نمونہ کا کلام بھی غزلوں کے تحت موجود ہے۔

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے | صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں | کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

غرض یہ تو ایک حقیقت ہے کہ آخری دور کا کلام غزلیات کے زیر عنوان رکھا گیا ہے، اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ بس وہ غزلیں نام ہی کی ہیں۔

بایں ہمہ جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں، پورے عاشق بن گئے ہیں جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے، خوب کہا ہے اپنے مرتبۂ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے، اور درجۂ اُستادی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ لطف زبان و سلاست بیان ان کی غزل کی جان ہے۔ دشوار پسندی نے بعض اچھے اچھے غزل گویوں کو غارت کر دیا ہے۔ اکبر کا گلستان ان کانٹوں سے پاک ہے۔ پھر بیان کی لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی بھی قائم و برقرار۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ معنی کی پاکیزگی کی طرف سے آنکھ ہی بند کر لیں جانتے ہیں کہ قافلہ میں لوگ سب ہی طرح کے ہیں۔ ایسے بھی جو محض محمل کی آب و تاب، چمک دمک سے جی خوش کر لیں گے ایسے بھی جو محمل نشین کی زیارت کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ دونوں طرح کے دلوں کی ڈوریں یہ ناقہ بان سخن اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔

رسمی غزل گوئی کے برخلاف، ایک غزل میں تماشا گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں دن دوپہر وہ مزے حاصل کرتے ہیں، جن کی تلاش رسمی شاعروں کو خدا جانے کہاں کہاں سرگرداں رکھتی ہے لیکن پھر آخر جذبات مشرقی شاعر کے رکھتے ہیں، اور اس شان کو مقطع میں نباہ لے جاتے ہیں

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا | کیا دلکشا یہ سین ہے فصل بہار کا
نازاں ہیں جوش حسن پہ گلہائے دلفریب | جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم ابھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب | نقشہ کھنچا ہوا خط و زلف یار کا
سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے | شبنم ہے، بحر یا گہر آب دار کا
مرغان باغ میں زمزمہ سنجی میں محو ہیں | اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
موج ہوا سے زمزمۂ عندلیب مست | اک ساز دل نواز ہے مضراب و تار کا

ابرتنک نے رونق موسم بڑھائی ہے　　غازہ بنا ہے روئے عروس بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے　　سوہان روح ہجر ہے اک گلعذار کا

حقیقت سے بے نیاز کبھی شاعر محض الفاظ کی تراش خراش میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری پر، یہ حقیقی شاعر کیسی جنچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ رائے شاعرانہ بھی اور مطابق واقعہ بھی ہے۔

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں　　وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

ذیل کی غزل میں تغزل کے پامال مضمونوں کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ اور آخری شعر عجب نہیں، کہ کہنے والے کی نجات کے لیے بس ہو جائے۔

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں مقدور مرا　　بڑھتا جاتا ہے شمار ان کے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مرتے ہیں　　فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازار جہاں میں ہر سو　　کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا
فطرت اٹھی ہے شفاعت کو ملائک ہیں خموش　　حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا

غزلیہ شاعری کا سب سے زیادہ پامال مضمون عشق ہے۔ ہر سخن گو کا تختۂ مشق کہنا چاہیے یا تکیہ کلام۔ دفتر کے دفتر اس کی شرح میں سیاہ ہو چکے ہیں، اور عاشقوں کی تعداد کا تو کوئی شمار و حساب ہی نہیں۔ لیکن عشق جس کیفیت قلب سے عبارت ہے، وہ لفظ و عبارت کی گرفت اور حد بندی سے اب بھی پرے ہے۔ اکبر اس گونگے کے خواب کی مصوری اپنے مرقع میں یوں کرتے ہیں، اور خوب کرتے ہیں ؎

عشق میں حسن بیاں وجہ تسلی نہ ہوا　　لفظ چمکا مگر آئینہ معنی نہ ہوا

اسلوب بیان کی ندرت و بلاغت ملاحظہ ہو۔ شاعر کو دعویٰ اپنی قوت گویائی پر ہے، بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو وہ دو دو باتوں میں سمجھا دیتا ہے، دقائق کی گتھیاں وہ اشارے اشاروں میں سلجھا دیتا ہے "حسن بیان" اس ساری داستان کا ترجمان ہے، لیکن عاشق ہونے کے بعد اسے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوت گویائی بیکار ہی گئی، الفاظ کا ذخیرہ اب بھی وہی، بیان کا ملکہ اب بھی وہی، قدرت زبان وہی، لفظ سجل اور سڈول تقریر بلیغ و شستہ یہ سارا مفہوم "لفظ چمکا" سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہے کہ معنی کی توضیح

نہیں ہو پاتی، کیفیت قلب کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے پاتا۔ شیشہ میں آب و تاب، چمک دمک سب موجود۔ لیکن عکس قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے، آئینہ معنی نہ ہوا، جام بلوریں اس پوری کیفیت کا آئینہ ہے، ضمناً یہ پہلو بھی وجہ تسلی نہ ہوا میں آگیا ہے، کہ تسلی کا تعلق زبان و بیان سے نہیں، بلکہ قلب اور اس کے احساس سے ہے۔

اسی زمین میں ایک دوسرا شعر بھی ہے افسردگی یاس و حرماں نصیبی کی ایک بولتی ہوئی تصویر۔ ایسے کلام کی قدر چڑھتی جوانی میں نہیں، بڑھاپے کے ڈھلتے ہوئے سن کو پہنچ کر ہوتی ہے ؎

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن　　کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں کچھ بھی نہ ہوا

اکبر کے دور آخر کی اکثر غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے دنیا کی بے ثباتی، اور اس سے اپنی بے تعلقی، لذت دنیا کی بے حیثیتی یہ موضوع اکبر کی اکثر آخری غزلوں میں مشترک ہے، ذیل کی غزل انہیں جذبات کی ترجمان ہے بعض تشبیہوں کی ندرت پر لطافت لوٹ لوٹ جاتی ہے،

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں　　بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی　　ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں

اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث　　سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں

افسردہ ہوں عبرت سے، دوا کی نہیں حاجت　　غم کا مجھے یہ ضعف ہے، بیمار نہیں ہوں

وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے　　الجھوں کسی دامن سے، میں وہ خار نہیں ہوں

یارب مجھے محفوظ رکھ اس بت کے ستم سے　　میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں

گو دعوی تقوی نہیں درگاہ خدا میں　　بت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبرؔ　　کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دنیا میں رہ کر دنیا میں بے لوث و بے تعلق رہنے کو بہت شاعروں نے باندھا ہے لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن دلنشیں تشبیہات کی مدد سے یہ مضمون باندھا گیا ہے، وہ اکبر ہی کا حصہ ہے۔ ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اکبرؔ چوتھے شعر میں ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی میں اس قدر لاغر ہوں کہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں، اور دوا کی فکر میں ہیں، چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی رمز اور کنائے ہیں۔

عشق کا زبانی دم بھرنے والے بے شمار ہیں لیکن واقعی عشق کی کسک اپنے پہلو میں رکھنے والے کہیں دو چار ہی ملیں گے۔ آہیں سب کرتے ہیں۔ لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ سوزِ عشق کی اہلیت بس مخصوص اَنے گنے لوگوں میں ہوتی ہے، عام خلقت کو اس سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔ اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہے ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں   سینہ میں سب کے دل ہیں سب اہلِ دل نہیں ہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے۔

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں
آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

"مقبول" و قابل کا تقابل بھی کیا خوب!

اسی زمین میں ایک اور شعر ہے، اور وہ بھی اس مضمون سے متعلق ؎

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

تیغ کے بسمل تو ہزار ہا نکل آئیں گے، لیکن اس تڑپ میں لذت پانے والے کتنے نکلیں گے! مجاز پر محمول کیجیے یا حقیقت پر سیاست میں لے جایئے یا معرفت میں، واقعیت سے خالی کوئی بھی پہلو نہ نکلے گا۔

عاشق خوب جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں گھومنا پھرنا اپنی جان سے ہاتھ دھونا ہے لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے، اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے تو پھر وہ عاشق کیوں کہلائے؟

ذوق ہوائے کوچہ قاتل کو کیا کروں
مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اس کی تڑپ، اس کا سوز، اس کا جوش و خروش، ان میں سے کوئی شے اس کے قصد و اختیار کے اندر نہیں۔ یہ ساری کیفیات تو اضطراری ہیں، اس کا اثر زدہ قلب اس سے خود بخود یہ سب کچھ کراتا رہتا ہے ؎

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں
پہلو میں لیکن اس دلِ بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے ہیں کہ نظارہ گل ترک کر دو تو دل خود بخود قابو میں آجائے گا، لیکن کوئی یہ بتاتا کہ ہوا کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں دل پر قابو ہی کب رہنے دیں گی ؎

قطع نظر گلوں سے نہیں مانع جنوں　　بوے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

داغ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

بات میری کبھی سنی ہی نہیں　　جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

اس کا یہ شعر خوب چلا ہوا ہے ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اس زمین میں اکبرؔ نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں، ذرا اس کی بھی سیر ہو جائے ؎

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں　　آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

چاہتا تھا بہت سی باتوں کو　　مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأت عرض حال کیا ہوتی　　نظر لطف اس نے کی ہی نہیں

اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا　　ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں

آپ کیا جانیں قدر "یا اللہ"　　جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا　　میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

پوچھا اکبرؔ ہے آدمی کیسا!
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" جیسے عوامی لفظ کو کس خوبی سے کھپا دیا ہے۔ اور "سوسائٹی" کا قافیہ لانا تو اکبرؔ ہی کا حصّہ تھا گردش چرخ کا شکوہ سب ہی شاعر شروع سے کرتے آئے ہیں، اکبرؔ نے دوسروں کے تجربہ سے فائدہ یہ اٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے قائم نہ کی اور مزے میں رہے پانچویں شعر میں ایک نادر مضمون باندھا ہے، مصیبت زدہ کی تسکین کے لیے دوسروں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے، ان کی نظیر اب تک موجود ہی نہ تھی، وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دے مصیبتوں کے بے پناہ اور بے حد و حساب ہونے کا یہ ایک اچھوتا انداز بیان ہے چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ

سے ہے، ان کی داد کے لیے آپ بیتی کی مدد لینی لازمی ہے۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو ے

جلوہ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں ۔ شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو پیے لیتے ہیں

دل میں یاد اُن کی جو آتی ہوئی شرماتی ہے ۔ درد اٹھتا ہے کہ ہم آڑ کیے لیتے ہیں

دَور تہذیب میں پریوں کا ہوا دور نقاب ۔ ہم بھی اب چاک گریباں کو سیے لیتے ہیں

خودکشی منع، خوشی گم، یہ قیامت ہے مگر ۔ جینا ہی کتنا ہے اب خیر جیے لیتے ہیں

لذت وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق ۔ وہ مزہ کیا ہے جو بے جان دیئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لیجیے تو بھڑکا دینے والا اور عارفانہ اعتبار سے بھی گرا ہوا نہیں مضمون کتنا سچا کہ بغیر درد کے ان کی یاد ہی نہیں ہو سکتی، اور اسے ادا کس بانکپن سے کیا ہے آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے، تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر پھر اپنے اصلی عالم میں چلا گیا ہے۔

نامانوس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، ازل سے یہ دولت اکبر کے حصہ میں آچکی تھی، فرماتے ہیں، اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں۔

اس دَور میں شاعر کے لیے قوت نہیں ہے

اس باغ میں طوطی کے لیے توت نہیں ہے

نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا

سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب فاعل و افعل

چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے

نیچر ہی کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبرؔ

تم دیکھتے ہو پھل میں کہیں چھوت نہیں ہے

اکبر کا مقام معرفت و حقائق کا "لاہوت" ہے، لیکن جب قافیہ پیمائی کے "ناسوت" میں اُترتے ہیں تو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتے ہیں، اور اب مزید توصیف سے "سکوت" ہی اولیٰ۔

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی، اپنے ذوق کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان ان غزلوں میں پالیں گے

عشق کہتا ہے بیان حال کی پروا نہ کر

تیرے دل کی خود بخود ان کو خبر ہو جائے گی

میں شب فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے

کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائے گی

تجھے اے امید فردا، دل و جاں سے پیار کرتے ہیں

مگر اپنی زندگی کا نہیں، اعتبار کرتے

ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم

میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے

ترے ہاتھوں کی یہ زینت تو ہے شاخ گل سے افزوں

ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے

ضبط کرتا ہوں، مگر آہ نکل جاتی ہے

کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی امیدوں کا

دل تو بڑھتا ہے، طبیعت تو بہل جاتی ہے

شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہوا انجام

مگر اس عزم سے سانچہ میں تو ڈھل جاتی ہے

کتمان راز عشق مرے آب وگل میں ہے

خاموش ہے زبان، جو کچھ ہے وہ دل میں ہے

افعی و زلف مس کا تو سودا برا نہیں؛

پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس کے بل میں ہے

"بل" (فردِ حساب) کا تعلق "سودے" سے تو خاص انگریزی دکانداری کا ضلع ہے۔ لکھنؤ کا ذوق قدیم اس کی زیادہ قدر نہ کر سکے گا۔ البتہ یہ "افعی" "و زلف" دونوں کے لیے "پیچیدگی" خوب! عجب نہیں جو اہلِ لکھنؤ اس شاعری پر "لوٹ پوٹ" ہو جائیں، اکبؔر کے سارے قصور اس ایک شعر کے خاطر معاف کر دیں داد میں، دفتر کے دفتر سیاہ کر دیں نقطہ نقطہ کی تشریح "مُو بمُو" کرنے لگیں، بلکہ بال کی کھال نکالنے لگیں اور "سلسلہ بیان دیر تک" برہم "نہ ہونے پائے۔

کہیں کہیں شعر اس رنگ کا بھی فرما گئے ہیں، جو استاد امانت کی رُوح کو وجد میں لے آئے، مثلاً ؎

اس سرو قد پہ اکبرؔ مدت سے مر رہا ہوں
اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

گو تصنع سے زیادہ بے ساختگی یہاں بھی موجود ہے بہ حیثیت مجموعی لفظی گورکھ دھندے کی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ عموماً کہتے وہی ہیں، جو دل میں محسوس کر چکے ہوتے ہیں ان کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب نہیں، واردات قلب کا عکس ہے۔ اپنے پر جو گزرتی ہے، وہی دوسروں کو بھی سنا چلتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس کے اور میرے کلام میں ہے کیا؟ ؎

شعر اکبرؔ میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا، اسے بھی صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں

اتنا نمونہ حضرت اکبرؔ کے آخری دور تغزل کا کافی ہوگا، ضمناً ابتدائی اور وسطی دور کے کلام سے بھی تعارف ہو گیا۔ یہ صحیح ہے، کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد ان کے عاشقانہ کلام پر نہیں، حکیمانہ، عارفانہ، ظریفانہ اصناف سخن پر ہے، لیکن اس کے باوجود خاص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اردو شاعروں میں کچھ ایسا نہیں، کہ جو ان کے لیے باعث ننگ و عار اور ان کے شیدائیوں کے لیے باعث شرم ہو، روزمرہ کی شیرینی اور زبان کی صفائی میں ان کی متعدد غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے، اور معنوی بلند پروازیوں میں وہ اگر غالب کے ہم سطح نہیں، تو بھی مومن اور شیفتہ کے طبقہ میں تو انھیں بہر حال جگہ مل سکتی ہے رنگ

تغزل کی مثالیں کلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں کثرت سے ملیں گی، آخری دور میں کمتر۔

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے ان کی شاعری کی روح، ان کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے اوّل سے آخر تک کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ ایک زبان کی لطافت اور انداز بیان کی ظرافت۔ دوسرے معنی و موضوع کلام کے حدود کے اندر، بھلائی کی پکار اور خیر کی طرف دعوت۔

ان کی شاعری کے عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہے لیکن ان کی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی اور بیسویں صدی کے شروع ہی سے وہ خاصے مشہور ہو چکے تھے، ہندستان خصوصاً مسلم ہندستان میں۔ عین یہی زمانہ، مغربی تمدن، مغربی معاشرت، مغربی علوم غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج، مقبولیت و فروغ کا ہے، اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں، تو اس وقت کی صورت حال کا نقشہ ذرا تصویر میں لے آیئے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو فرد ہوئے، ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں اور ہندستان پوری طرح مزہ چکھ چکا ہے کہ زبردست کے مقابلہ میں کمزور کے سر اٹھانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے ملت اسلامی خصوصیت کے ساتھ اپنی غفلتوں اور عیش پرستیوں کے نتائج بھگت رہی ہے صدیوں تک جس ملک میں حکومت کی، کر و فر کے ساتھ، شان و شوکت کے ساتھ، کبھی ترکوں اور کبھی پٹھانوں کا جھنڈا اڑا کر۔ اور آخری تین چار سو سال مغلوں کے نام سے۔ اس ملک میں مسلمان، اب سب سے زیادہ حقیر و ذلیل تھے، ہر سمت سے پٹے ہوئے، چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے۔

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے، وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ثروت و خوشحالی اول تو باقی ہی کہاں تھی جائیدادیں بار قرض سے دبی ہوئی اور زیور، مہاجنوں ساہوکاروں کے یہاں رہن اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ رہا وہ بھی ناچ رنگ

کھیل تماشے، ٹیم ٹام کی نذر۔ نہ اعلیٰ تعلیم و تربیت۔ نہ کوئی ملی اتحاد و تنظیم، نہ ہمت و خودداری، نہ جوش توحید و ولولۂ دینی نہ قناعت و ایثار۔ عقیدے مشرکانہ، اخلاق جاہلانہ معاشرت مسرفانہ آپس میں حسد و بغض، ایک کی تاک میں ایک لگا ہوا عجمیت اور ہندیت کے حملے تو سیکڑوں سال سے جاری تھے، اب آخری زبردست ٹکر، فرنگیت سے ہوئی، اور اس نے کہنا چاہیے کہ پرانے سفینۂ عرب کو پاش پاش ہی کردیا۔

ادھر مغرب کی اس زیرک و زمانہ شناس اور اقبال مندی کے لحاظ سے پرشباب قوم انگریز نے تیر و تبر، توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ بے پناہ حربہ تعلیم اور پروپیگنڈا کا استعمال کرنا شروع کردیا۔ اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں کارندوں کو اسکول اور کالج کے قالب میں لا کھڑا کیا! نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دل پر عظمت فرنگ کا نقش۔ ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ! داد خواہی کے لئے گھر سے نکلیے تو قانون انگریزی، عدالتیں انگریزی۔ لڑکوں کو پڑھنے بٹھایئے تو اسکول انگریزی کالج انگریزی، کتابیں انگریزی، زبان انگریزی، سفر کے لیے باہر نکلیے تو سڑکیں انگریزی سواری (ریل) انگریزی ٹکٹ انگریزی، سفر کی منزلیں (اسٹیشن) انگریزی، دکھ درد میں مبتلا ہوجیے تو علاج کے لیے دوائیں انگریزی، تشخیص انگریزی، شفاخانے انگریزی، مرہم پٹی انگریزی۔ خط بھیجیے، پارسل منگایئے تو ڈاک انگریزی، ڈاک خانہ انگریزی۔ روپیہ جمع کرنے، بہی کھاتا کھولنے کا شوق ہوا۔ تو بینک انگریزی سیونگ بینکس انگریزی، مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں انگریزی قصہ کہانی کے لیے جی لہرائے تو افسانے انگریزی۔ ناول اور ڈرامے انگریزی، ورزشی کھیلوں کے لئے دل للچائے تو کھیل انگریزی، فٹ بال اور کرکٹ اور ٹینس اور انٹا[1] شام کو سیر و تفریح کے لیے قدم اٹھایئے تو سامان تفریحی انگریزی، پارک میں، لان میں، کلب میں، ہوسٹل اور رسٹوران میں۔ رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر، کنسرٹ، آپیرا[2]۔ ماضی کو جاننا چاہیے تو تاریخیں انگریزی۔ حال سے باخبر رہنا چاہیے تو اخبارات انگریزی،

---

[1] ایک بہت پرانا انگریزی کھیل، اب مدت ہوئی متروک ہوگیا ہے شروع انگریزی راج میں اس کا بڑا رواج تھا، جن شہروں میں شروع شروع انگریزی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، وہاں انٹا گھر کے نام سے عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ میاں منیر شکوہ آبادی ایک پرانے اردو شاعر ہوئے ہیں صاحب دیوان۔ وہ بھی ایک جگہ اسے باندھ گئے ہیں، جیت جاتے ایک مہینہ بھر کے بوسے بات میں ؛ ہم جو انٹا اس قمر سے فیس دے کے کھیلتے

[2] پکچر ہاؤس۔

تار برقیاں انگریزی پیشے انگریزی، بیرسٹری وکالت ڈاکٹری انجنیری عہدے انگریزی، علوم انگریزی، فنون انگریزی صنائع انگریزی خلاصہ یہ کہ زمین انگریزی، آسمان انگریزی۔

اپنی یہ پستی اور "صاحب" کی یہ بلند پروازی، اپنی خاک نشینی، اور صاحب کی فلک پیمائی دیکھ، حواس بجا کس کے رہ سکتے تھے؟ خصوصاً جبکہ دل کا سرمایہ پہلے ہی لٹ چکا ہو۔ حواس گم، نگاہیں خیرہ، عقل دنگ مرعوبیت غالب دماغ مفلوج، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی نظر آیا، اندھیرے میں اپنے ہی سایہ پر بھوت کا گمان گزرا۔ التباس حواس میں دیو میں پری کا حسن و جمال معلوم ہوا، دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا اچھے اچھے ہوشمند اور مخلص سید احمد خاں اور ان کے سارے رفیق یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" بھائیو بجز مذہب کے ہر چیز میں انگریز بن جاؤ، فلاح اور زندگی کا سہارا بس اسی میں ہے —— حالی بڑے خشوع و خضوع سے مسدس اسلام کھول کر بیٹھے لیکن مناجات کا خلاصہ بس یہی کہ اے پاک پروردگار ہم کو اگر قدیم مسلمانوں کا سا نہیں تو آج کے انگریزوں سا بنا دے شبلی نے بڑے ٹھاٹھ سے ناموران اسلام کا دربار سجایا لیکن لب لباب اس کا بھی یہی، کہ ہمارے اکابر سلف دانایان فرنگ سے کتنا قریب تھے، اور نذیر احمد ذکاءاللہ، محسن الملک، چراغ علی بیچاروں کا تو ذکر ہی نہیں، اور بات علی گڈھ تک محدود نہ تھی۔ فرنگی محل ہو یا ندوہ سب ہی خیر سرکار کی مناتے تھے۔

اب قوم تھی اور اس کے سر پر جادوئے فرنگ! ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بول چال میں کسی طرح لب ولہجہ "صاحب" کا سا ہو جائے۔ یہاں تک کہ اس کی خاطر قصداً اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے، اپنی زبان، اپنے علوم، اپنے ہاں کے کھانے پینے اپنے طرز کے پہننے اور رہنے اپنی ساری معاشرت، اپنے خاندان، اپنی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے بھی شرم آنے لگے، اپنے ہاں کی ایک ایک چیز میں ذلت و حقارت نظر آنے لگے معزز صرف "صاحب" اور "میم صاحب" ٹھہر جائیں، اپنے ہاں کی شرم و حیا، حجاب و نقاب اس لیے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں سب کچھ دیکھتی دکھاتی پھرتی ہیں، جن و ملائک کا شمار اس لیے اوہام میں داخل کہ مل اور اسپنزان کے قائل نہیں عرش کا وجود اس لیے باطل کہ جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں آتا۔ وحی، نبوت توحید کے بنیادی مسائل اس لیے فرسودہ و متروک کہ مشرکانہ مسیحیت ان پر دلائل عقل قائم کرنے سے قاصر رہی، داڑھی منڈانا اس لیے واجب کہ صاحب جو روزانہ شیو کرتے ہیں، سود جیسی حرام کمائی اس لیے جائز کہ صاحب کے دیس میں شہر شہر سودی بینک گھر کھولے ہوئے

ہیں، "سرا" ذلیل ہوٹل معزز، مختار کارندہ حقیر، ایجنٹ، قابل عزت "حکیم" غریب کس مپرسی میں پڑے ہوئے "ڈاکٹر" ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے ہیں،

غرض فرش سے لے کر عرش تک علم، عمل، معاشرت، اخلاق، عقائد کے دائرہ میں کوئی شے ایسی نہ تھی۔ جو "صاحب" کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو، ساری فضا اسی مرعوبیت سے معمور "دانشِ فرنگ" "حکمت مغرب" عقلائے فرنگ اقبال سرکار، دانایانِ "مغرب"، وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے اور ترکیبیں اس دورِ مرعوبیت کی یادگار مسلّم وبدیہی علوم متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے، اور ادب کا گویا جزو بن گئے "فرنگی" کا لفظ اس سے قبل ذم و ہجو کا پہلو لیے ہوئے تھا اس دور میں "فرنگ" محل مدح و عظمت میں استعمال ہونے لگا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں، زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پا جاتے ہیں، تو بس یہی ہونے لگتا ہے، ہر چیز حاکموں کی عینک سے محکوم خود بھی دیکھنے لگتے ہیں، اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے، نہ اپنی نظر۔ اور تاریخ کا بیان ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آرہا ہے ؎

ازل سے یوں ہی مرے یار ہوتی آئی ہے　　وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبرؔ نے اپنی آنکھیں کھولیں، یہ تھا وہ ماحول جس میں انہیں اپنا پیام پہونچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے، ہوتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس طرح اور ان کے ہمعصر اچھے اچھے خوش فکر شاعر، زینت مشاعرہ بنے ہوئے تھے، یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزل کہتے رہتے۔ یا بے طرح بھی قافیہ پیمائی میں لگے رہتے لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے، ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے، ایک خاص مقصد حیات لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی، تبلیغ کا بار ان کے نشانہ پر تھا، یوں کہیے کہ فطرت کی جانب سے ایک "رسول" ہو کر آئے تھے، صاحب کتاب حقیقی رسولوں کے جانشین اور ادنی خادم۔ دل کڑھا، دماغ متاثر ہوا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا، ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا، ان کی شاعری اول سے آخر تک، اس مادیت و فرنگیت کا جواب ہے، ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانہ پر آکر لگتا ہے، ان کے فلسفہ ان کی ظرافت، ان کی سیاست کے دائرہ کی معمولی سی بھی پیمائش ممکن، تا وقتیکہ نظر اس مرکزی نقطہ پر نہ جمالی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع ہی سے تھا، سن و تجربے میں پختگی کے ساتھ نکھرتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا، عورتوں کی بے پردگی سے متعلق ان کا مشہور و ضرب المثل قطعہ ان کے آخر زمانہ

کا نہیں، شروع ہی کا ہے، اور کلیات سوم میں نہیں" کلیات اوّل میں درج ہے،

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیویاں — اکبر زمین میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جوان سے آپکا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

"عقل پر پردہ پڑ جانا" اس محاورہ کا تصرف اس خوبی سے، اس سے قبل کبھی کیوں ہوا ہوگا!

قوم کی انتشاری و اضطرابی حالت خود اپنی ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے، اس کا نقشہ بھی، ان کے قلم کا کھینچا ہوا بہت مدّت کا ہے ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا — چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا

شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر — اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت ہے، تزکیۂ اخلاق ہے، شعائر اسلامی کا احیاء ہے تہذیب اسلامی کی تجدید ہے اور یہ واعظ سطر سطر میں موجود ہے لیکن ہاں حالی کی طرح اکبر خشک وعظ نہیں وہ پہلے شاعر ہیں، پھر کچھ اور پہلے ظریف ہیں، پھر مصلح۔ پہلے نقاش فطرت ہیں، پھر معلم اخلاق۔ ان کی مجلس میں شراب کے گلاس گردش میں رہتے ہیں، خوش رنگ، خوش مزہ یخنی کے پیالے[1] تقسیم نہیں ہوتے اور یہ اس رند پاکباز کی کرامت ہے کہ حلق سے اترتے ہی وہ "شراب خانہ خراب" نہیں رہ جاتی، شراب طہور ثابت ہوتی ہے لا فیہا غول ولا ہم عنہا ینزفون۔

اکبر سے قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چیٹر جی یہی مشن لے کر پیدا ہوا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، اور بنگالی زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی تھی، اردو میں بھی اس کا ایک آدھ ترجمہ درگیش نندنی وغیرہ کے نام سے آچکا ہے، بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں کو رکھا تھا، اکبر نے اس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا، اکبر کا نشتر عموماً زیر آستین رہا،

جدید تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر "آزادی نسواں" ہے اس شاندار لفظ کے عقب میں

---

[1] یہ تشبیہ بھی خود حضرت اکبر ہی کی سجھائی ہوئی ہے۔ کہیں فرما گئے ہیں (افسوس ہے کہ کلیات میں کہیں وہ قطعہ نہ ملا) کہ لوگ مجھ میں اور حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ وہ کہاں اور میں کہاں آخری مصرعہ کا آخری ٹکڑا ہے، وہ یخنی ہیں میں شراب۔

حقیقت عریاں بے پردگی، بے حجابی و بے عصمتی کی ہے، اکبر کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے،

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے، وہاں شوہر سے بھی حمیت و غیرت سلب ہو جاتی ہے، اکبرؔ کے نگار خانے میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ملے گا،

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں اور شہادتوں میں جیسے جیسے حیا سوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، وہ وہاں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور "صاحب" کے قدموں کے طفیل ہندستان بھی ان برکتوں سے مستفید ہو چکا ہے اب یہاں بھی ایسے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں نہیں رہے ہیں۔ لیکن یہاں ابھی حساس حمیت و غیرت بہرحال کچھ نہ کچھ زندہ ہے، اس لیے واقعہ ہو چکنے کے بعد حسرتیں بھی ہوتی رہتی ہیں، اور ندامتیں بھی۔ یہ کیفیت اکبرؔ کی زبان سے سنیے ؎

کیا گزری جو اک پردہ کے عدد رورو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی، "دولت بھی گئی" بیوی بھی گئی، زیور بھی گیا

اس غزل کے چند اور شعر بھی ہیں، درد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، بے محل نہ ہوگا، اگر انہیں بھی اس سلسلہ میں سن لیا جائے ؎

اکبر نہ تھا بت خانہ میں زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا
کچھ نام خدا سے انس بھی تھا، کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹ خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اس قصر پہ کل میں رویا بہت
کوئی متنفس تھا، نہ وہاں اندر بھی پھرا باہر بھی گیا

آخری شعر میں شاعر جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے، اکبرؔ دنیوی حیثیت سے بھی ایک خاصے بڑے

آدمی تھے، وطن (الہ آباد) میں عشرت منزل کے نام سے کوٹھی بنوائی (اپنے صاحبزادہ کے نام پر) ایک زمانہ میں واقعی عشرت منزل ہی تھی، دعوتیں جلسے اسپیچیں، شعر و سخن، چہل پہل، فرنیچر اور سامان آرائش وغیرہ۔ آخر زمانہ میں حالت اس کے ٹھیک برعکس۔ پہلے محبوب بیوی نے داغ مفارقت دیا، پھر نوجوان محبوب بیٹا رخصت ہوا۔ جج صاحب کی پنشن ہوئی، آنکھیں خراب ہوئیں، صحت نے جواب دیا، صاحبزادے پردیس میں ملازم۔ مکان سنسان، پائیں باغ ویران، سامان آرائش وغیرہ غائب' ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہو حق کا عالم، ایک حضرت اکبر خود، ایک مرد ملازم، ایک بوڑھی ماما، بس کل اتنی آبادی۔

خیر، یہ ایک جملہ معترضہ آگیا تھا' اب پھر پہلے شعر کیا گزری جوانی کو دہرا کر آگے چلیے۔

ایک جگہ بے پردگی اور تعلیم نسواں کو لازم و ملزوم بتاتے ہیں، اور دو مختلف مفہوموں (پردہ اٹھنے اور تعظیم کے لیے اٹھنے) کے لیے لفظ "اٹھنے" کے اشتراک سے فائدہ اٹھا کر کیا خوب شاعرانہ استدلال سے کام لیتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو
پردہ اٹھا چاہتا ہے، علم کی تعظیم کو

تخیل ہے تو شاعرانہ، لیکن اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے کہ پردہ شکنی کی حمایت میں ہے بھی تو بڑی دلیل یہی، کہ پردہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر علم کی تازہ ہوا نصیب ہونا ممکن کہاں؟ اور علم و تعلیم" کے جو معنی اس گروہ کے ذہن میں ہیں ان کے لحاظ سے یہ قول ہے بھی بالکل بجا۔

ہمارے ہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ شروع سے دبی لجی رہے خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اسے گھر کی ملکہ بننا ہے، بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانہ جنت خیال کرے، خانگی شیرازہ اس کی ذات سے بندھا ہوا رہے، خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں، صحیح معنی میں "اہل خانہ" ثابت ہو اولاد کو تربیت کے بہترین راستہ پر ڈال سکے، شوہر کی عزت و محبت، بڑوں کی تعظیم و خدمت گزاری اور چھوٹوں کی الفت و شفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے اور انھیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو، فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار ہی کچھ دوسرا ہے، ان کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لیے باعث توہین ہے، موجب تحقیر ہے ان کی فرہنگ میں ادب و تعظیم، اطاعت و خدمت گزاری مرادف ہیں محکومی کے، غلامی کے، ان کا قول ہے کہ عورت اپنے کو چھپانے کے لیے نہیں، دکھلانے کے لیے آئی ہے، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ جب دیکھیے گھر ہی کے اندر، شوہر کے، یا ساس

نند کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے، وہ عورت ہی کیا جس کے حسن گفتار حسن رفتار، حسن صورت، زیب و زینت، خوش لباسی، گلف بازی، رقاصی، کے چرچے سوسائٹی میں عام نہ ہوں؟ اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں، اس کا نام زبانوں پر لذت کے ساتھ آئے۔ اس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کر دے، اور اس کا تصور دلوں میں شوق۔ بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو یا بہترین ماں، بلکہ وہ ہے، جس کی ذات، دوست احباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو۔ اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی و دل ربائی کے نقش ثبت ہوں، کلب کے در و دیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر۔ ہوٹل کے کوچ اور صوفے پر۔

"ہمارے" اور "ان" کے تخیل کے اس بعد المشرقین کو اقلیم لفظ و معنی کا یہ تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور جس ندرت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے یہ اسی کا حصہ تھا۔

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے، یہ "چمک" مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ پرانے فانوسوں میں ڈیوٹ والے چراغوں میں چمک دمک بھلا کہاں! شرم و حیا سے آزادی، دنیا کی دل ستانی کے لیے ناز و انداز، قابلیت کے جوہر کی جلا، یہ سب کچھ اس ننھے سے لفظ "چمکی" سے ظاہر و آشکار۔ اور "یہ شمع انجمن" اور "چراغ خانہ کی مثال کس قدر روشن کیسی ضیا بار ـــ تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی! شعر کیا ہے بیسویں صدی کی "کالج گرل" کی قد آدم تصویر۔

حسن و ناز کی دنیا میں قابلِ داد اب تک کم سخنی، کم گوئی و بے زبانی تھی۔ مشرقی شوہر "چاند سی دلہن" بیاہ کر اس لیے لاتا تھا، کہ وہ اسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنائے۔ "اور تخیل" خانہ آبادی کا غالب رہتا۔ اب جو جاکر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں نقشہ ہی بدلا ہوا ہے ٹھاٹھ بزم آرائی کے جمے ہوئے حجاب کی جگہ بے حجابی۔ سکوت کی جگہ طوفان تکلم۔ مستوری کی جگہ نمائش۔ عاشق بیچارہ، اس کایا پلٹ پر دنگ حیران، گم صم۔ کل تک جو نقش تصویر تھا، وہ آج گراموفون نظر آ رہا ہے۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں اسٹیج کا شوق
شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں — بت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ، اپنی لطافت کے، جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب بس آپ! تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب

رہنمائی کر رہا ہے۔ کہ جو کچھ ہوا قدرتی نتیجہ ہے تغیر ماحول کا۔ جب فضا میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی، راحت پر لذت مقدم ہو گئی، شوہروں کا مطمح نظر بجائے تسکین قلب کے ہیجان نفس قرار پا گیا، تو قدرتاً عورت نے بھی اپنی محبوبیت کے انداز بدل دیئے۔ مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی اب دوسرے ہو گئے۔

اکبرؔ کے اسی مرقع کا ایک اور منظر ؎

خدمت میں ہے وہ لیزی[1] اور ناچنے کو ریڈی[2]	اعزاز بڑھ گیا ہے۔ آرام گھٹ گیا ہے
شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی	تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزہ میں کیسا مشرق و مغرب کا سمندر سمو دیا ہے! مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت تھا۔ زچہ خانہ تھا اور باورچی خانہ تھا مغرب کے ہاں معیار ناچ ہے، بال روم ہے، کنسرٹ ہے، اور اب عورت بھی کرے کیا، نظام تعلیم ہی اس ڈھنگ کا ہے۔ شروع سے سکھایا یہی جاتا، دل میں بٹھایا یہی جاتا ہے۔

آج یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات (سائیکالوجی) وحیاتیات بشری (ہیومن بیالوجی) کہہ رہے ہیں، اور لکھ رہے ہیں کہ دونوں صنفوں کے درمیان کشش جنسی بالکل طبعی ہے۔ دونوں جب باہم ملیں گے۔ اور کوئی امر مانع موجود ہو گا نہیں، تو آگ کا دفعتاً بھڑک اٹھنا، اور بجلی کا اکبارگی رگڑ سے پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے، شریعت اسلامی نے اس گہری اور بنیادی حقیقت کے پیش نظر بدکاری کے نفس عمل ہی کو حرام نہیں قرار دیا، بلکہ اس منزل تک پہنچنے کی جتنی راہیں ہیں، ان پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔ گویا دشمن کی پوری ناکہ بندی کر دی۔ بانس ہی نہ ملے گا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔ بیگانہ عورت و مرد کو تنہائی و اختلاط کے جب موقع ہی نہ ملیں گے، تو پینگ بڑھنے ہی کہاں سے پائیں گے۔ بالکل بچپن کو چھوڑ کر۔ باقی آگے بڑھ کر مشترک پڑھنا لکھنا، مشترک کھیل کود۔ بلاضرورت یکجائی سب ناجائز۔ تاک جھانک تک حرام، تاکہ سوسائٹی میں، مفاسد کا زہر سرے سے پھیلنے نہ پائے۔ معاشرت ہمیشہ بے داغ رہے۔ تعلیم جدید نے ان میں سے ایک ایک بند کو توڑا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ آزادیاں بڑھیں، بے حیائیاں آئیں، بے حجابیاں دلیل ترقی بنیں۔ جو باتیں کل تک ان ہونی تھیں آج ہو کر، گزر کر رہیں، بھولے بھالے لوگوں نے کہا "کہ محافظ عصمت یہ تعلیم ہو گی نہ"! سبحان اللہ! زنگی کا نام اگر کافور رکھ دیا گیا تو گویا چہرہ کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی! توقع لٹیروں سے

---

[1] سست کاہل (LAZY) [2] آمادہ بتیار، مستعد (READY)۔

پہرہ داروں کے کام کی کیجانے لگی! اب تو مثالیں، کوئی کہاں تک گنا سکتا ہے۔ لیکن اکبر کے زمانہ میں بھی فرانس کی میڈیم ڈی اسٹیل[1] اور انگلستان کی جارج ایلیٹ[2] کی سی ہستیاں خال خال نہ تھیں۔

اکبر کے توسط سے ایک مختصر سا مکالمہ، ایک صاحب اور صاحبہ کے درمیان سنیے ؎

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ   علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ
دونوں نے پاس کرلیے ہیں سخت امتحان   ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگماں
بولی یہ سچ ہے، علم بڑھا جہل، گھٹ گیا   لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

یہ سب سچ، لیکن پھر بھی یہ کہتے اور سوچتے ہیں کہ حیا و حجاب کے قیود و احکام تو مسلمان عورت کے لیے ہیں، جب دین ہی سرے سے غائب ہو گیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بند سے آخر حاصل کیا؟ پردہ تو بقائے ناموس کے لیے ہے لیکن جب ناموس ہی نہیں تو اس کی بقا کیسی! کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کے لیے ہے۔ لیکن جب زندگی ہی رخصت ہو چکی تو مردہ کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں قفل اس وقت تک پڑے رہتے ہیں، جب تک اس میں قیمتی مال محفوظ ہے۔ لیکن جب وہ خالی ہو گیا تو اب اس کی حفاظت خود ایک دردِ سر ہے، پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے جب تک وہ تازہ و شاداب ہیں، باسی سوکھے مرجھائے پھولوں کو گلے کا ہار بنانا کوئی کیوں پسند کرنے لگا۔ فرماتے ہیں ؎

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید   بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ   شمعِ خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

چوتھے مصرعہ کی تشبیہ اکبرؔ ہی کا حصہ تھا۔

خاتونِ مشرق کو مغربی میم بنا دینے کا اب تک نتیجہ کیا نکلا ہے! خود مردوں ہی نے شیکسپیئر و ملٹن کی ورق گردانی اور مل و اسپنسر پر دماغ سوزی کر کے اب تک دنیا بلکہ ہندستان ہی کی محدود دنیا میں کون سے خاص امتیازات حاصل کر لیے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار   کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

---

[1] فرانس کی مشہور ادیبہ، اخلاق کے قانون سے آزاد۔
[2] انگلستان کی مشہور ناول نویس، مردانہ نام رکھنے والی خاتون جو ایک اہل قلم مرد، جارج ہنری لوئیس کے ساتھ مدتوں بے نکاحی بیوی کی طرح رہی۔

خیر یہاں ذکر مردوں کا نہیں، عورتوں کی تعلیم کا ہے، مرد جس طرح پڑھ پڑھ کر بڑھ بڑھ کر صاحبیت میں ضم ہوتے گئے، اپنوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے، اسی طرح عورتیں بھی بڑھ بڑھ کر میم صاحبیت میں گم ہوتی گئیں، ہاتھ سے نکلتی گئیں، کلیات اول میں جوان کا قدیم ترین کلام ہے۔ اس حقیقت کو ظرافت کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں۔

ترقی کی تپیں ہم پر چڑھائیں　　گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھائیں

رہیں ہر پھر کے آیا بی لفیبن!　　وہ گو اسکول میں برسوں پڑھائیں

کلیات سوم میں اس مرقع میں آب و رنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں ؎

ایک پیرے نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا　　ایک پیرے نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے بال میں رقصاں　　باقی جو تھے، گھر ان کا تھا۔ افلاس کا مارا

"بیرا" وہ بنا کمپ میں یہ بن گئیں "آیا"　　بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا

دونوں جو کبھی ملتے ہیں، اگاتے ہیں یہ مصرع　　آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

خیال نہ گزرے کہ اکبر سرے سے تعلیم نسواں کے مخالف تھے، اور لڑکیوں کے بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی وہ تعلیم نسواں کے حامی و ہمدرد یقیناً تھے، لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ تائید میں اس تعلیم کے تھے جو قوم میں نمونے رابعہ بصریہ کے نہ سہی دَورِ مغلیہ کی جہاں آرا بیگم کے پیدا کرے، نہ اس تعلیم کے جو زینت ہو ہر اپیرا ہاؤس کی، ہر پکچر پیلیس کی۔ اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں، خدائی قہر سمجھتے تھے، جس پر بنیادیں تعمیر ہوں، ہالی وڈ[1] کی، وہ آرزومند تھے اس نظام تعلیم کے، جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ اس کے جو تھیٹر میں ایکٹری اور نیم برہنہ رقاصی کے کمالات کی جانب لے جائے[2]۔

---

[1] امریکہ کا مشہور شہر، فلمی دنیا کا کہنا چاہیے کہ دارالسلطنت، ہزارہا کی آبادی، روزانہ فلم سازی کی مختلف شاخوں، محکموں میں سرگرم رہتی ہے۔

[2] ۱۹۱۲ء کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک برطانوی مس صاحبہ، ماڈائین (MAUDAAIN) نامی مشہور "آرٹسٹ" ہندستان تشریف لائیں۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ انگریزی اخبارات روز ہی ان کے تذکروں اور کارناموں سے بھرے رہتے تھے، ان کا خاص "آرٹ" ناچ" تھا، ایک مخصوص ناچ کے وقت جسم پر ہلکا باریک سا لباس، غالباً موتی کی لڑیوں کا رہتا تھا، نیم برہنہ تو خیر شروع ہی سے رہتی تھیں، رقص جب شباب پر پہونچتا تو گردش اس تیزی سے کرتیں کہ گویا جسم میں کوئی کمانی لگی ہوئی ہے لباس کی لڑیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اڑنے لگتیں، یہاں تک کہ جسم پر ایک تار بھی سلامت باقی نہ رہ جاتا! یہ ضرور ہے کہ گردش رقص اس مسلسل تیزی کے ساتھ ہوتی کہ •• (باقی حاشیہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے، کہ دنیا نمونہ جنت بن جائے۔ پریوں کے مشتاق نہ تھے کہ ملک کا ملک راجہ اندر کا اکھاڑہ ہو کر رہ جائے ان کا قول تھا ؎

دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم   قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مزید توضیح سنیے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر   خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں، جو ہوں ان کے منتظم!   استاد ایسے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

"استاد جی" آپ سمجھے، محاورۂ لکھنؤ میں ارباب نشاط کے "تعلیم" دینے والوں کو کہتے ہیں خود لفظ تعلیم بھی لکھنؤ کی زبان میں اسی خاص معنی میں مستعمل ہے۔ ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے چند شعروں سے اندازہ کیجیے۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے   لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

بیشک معاشرت میں سراسر فتور ہے   اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت   جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت   ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ   شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

عصیاں سے محترز ہو، خدا سے ڈرا کرے   اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت و خواند ۔ اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے وغیرہ کو درس نسوانی کا لازمی نصاب بتاکر آخر میں فرماتے ہیں ؎

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو   پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے   مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

** دیکھنے والے کی نظر کا جمنا ناممکن تھا اور یہی ان کے آرٹ کا کمال تھا حضرت اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے تحریر فرمایا کہ "مس ماڈ ایلن آئی ہوئی ہیں سنا ہے کہ برہنہ ہو کر اس طرح ناچتی ہیں کہ شائقین سائنس کو وجد آجاتا ہے اور یہ ذکر دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہے، اس وقت تک یہ کمالات بہرحال بعض پیشہ ور بیسواؤں ہی تک محدود تھے، مگر اب حدیث نبوی ؐ الکاسیات العاریات آیا ہے یعنی لباس مگر برہنہ اس کی صحیح تفسیر اس دور سے قبل کیونکر کسی کی سمجھ میں آسکتی تھی۔

دنیا میں لذتیں ہیں، نمائش ہے شان ہے | ان کی طلب میں، حرص میں سارا جہاں ہے
اکبرؔ سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے | دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب | آج اس کا خوشنما ہے، مگر ہو گا کل خراب

عجب دقیانوسی خیال کے تھے، آخر تک "آج" اور "کل" کے چکر میں پڑے رہتے آج تو خیر آج ہی ہے۔ یہ "کل" آخر کیا بلا ہے! خواہ مخواہ ہر عیش کو منغض کر دینے والا۔

فرماتے، یہ سب کچھ جاتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانے ہوئے، سمجھے ہوئے تھے، کہ رفتار زمانہ کا رخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، انبیاء تک کو یہ قدرت نہیں۔ مشیت تکوینی ہر صورت میں اپنا چکر، اپنا دورا پورا کر کے رہتی ہے، ہودؑ و صالحؑ کی نصیحت کس نے سنی؟ یحییٰؑ و عیسیٰؑ پر کتنے ایمان لائے؟ یونس و لوط کی تصدیق کتنوں نے کی؟ بیچارے ہر دور میں طعنے ہی سنا کیے، شاعر ہونے، مجنوں ہونے کے، آج کی اصطلاح میں VISIONARY ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد ہی عذاب الٰہی کے زلزلہ نے یک بیک دھر پکڑا ہو، اور مایۂ ناز نظام تہذیب و تمدن کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دی ہوں۔ زار روس کی جباریت و شہنشاہیت مطلقہ کا چشم زدن میں مٹ کر رہنا[1]، اس غیبی گرفت کی تازہ چشم دید مثال ہے۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر یورپ کی پہلی مہابھارت[2]، اور یہ دوسری مہابھارت[3] جو ان سطروں کی تحریر کے وقت تک ناتمام ہے۔

حضرت اکبرؔ بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بارہا اس کا اظہار فرمایا ہے۔ کلیات دوم میں ایک قطعہ میں آزادیٔ نسواں کے مستقبل کا مرقع کھینچتے ہیں، حسب معمول دلکش انداز میں فرماتے ہیں کہ ضبط نفس، اور تقویٰ و ایمان رکھنے والے تو گزر گئے، اب دور دورہ ہے "صاحب" کے قائم کیے ہوئے کالج کے نوجوانوں کا ؎

اُٹھ گئے وہ جنھیں مقدور تھا خود داری کا
نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی اُمید
ولولے لے کے نکلنے لگے کالج سے جواں
شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

---

[1] ۱۹۱۷ء میں [2] ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء [3] ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء

کرکٹ فیلڈ ان کی مسجد، تھیٹر ان کی عیدگاہ۔ اس تمدن کے لازمی نتیجہ کے طور پر ؎

بحث میں آہی گیا فلسفہ شرم و حجاب

دورِ گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید!

عورتوں کو "حقوق" سیاسی حقوق مل گئے "مطالبات" منظور ہو گئے۔ کام وہ مردوں کے دوش بدوش کیے۔

ع زہرہ ممبر ہوئیں، ووٹر تھیں جناب خورشید

کچھ پرانے بڈھے ٹھڈے زندہ تھے، ڈرے ہوئے سہمے ہوئے بولے کہ گل کھلانے کے لیے صاحبزادے کچھ کم تھے، جواب صاحبزادیوں کو بھی اس میدان میں لایا جا رہا ہے۔

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب وقار

کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

روشن خیال دنیا کی لعنتوں، متمدن دنیا کی ملامتوں کی بجلیاں، ان دقیانوسیوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ع

نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور گھر گھرانوں کی کنواریاں، المومنات الغافلات نہیں۔ شوخ و بیباک کھیلی کھائی ہوئی ؎

لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریقِ تائید

دولہا بھائی کی یہ ہے رائے نہایت عمدہ   ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ ہوا ہے، بیت الغزل سارے قطعہ کی جان ؎

خود تو گٹ پٹ کے لیے جان دیئے دیتے ہو

ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

شیخ بیچارہ اس حملہ کی تاب کہاں سے لاتا؟ بھاگ کر حجرہ میں پناہ لی، کنڈی اندر سے چڑھا لی ؎

اکبر افسردہ شد از گرمیٔ ایں طرزِ سخن

شیخ بگریخت و در صومعہ خویش خزید

تجدد کی جئے، تالیوں کی گونج میں پکاری گئی۔ اور آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹوں دونوں نے مل کر حصولِ آزادی کی مبارکباد گائی ؎

کھل گیا در، نہ رہا شاہدِ مشرق کو حجاب

غل مچا ہے رے کا، بول اٹھے یہ مغرب کے مرید
للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید!!

ایک پرانی غزل میں بھی مضمون اس آزادیٔ نسواں کا آگیا ہے ؎

بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کب تک | بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
تو منھ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک | جو منھ دکھائی کی ہے رسم پر مصر ابلیس!

مقطع میں انجام کی پیشین گوئی ہے ؎

سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

اسلامی نظام تہذیب کے جوہر لطیف یہی عصمت و عفت، شرم و حیا کے جذبات ہیں۔ اور فرنگیت کی زد سب سے پہلے اخلاق کے انہیں ستونوں پر پڑتی ہے، اس لئے قدرتاً اکبر نے بھی طبع آزمائی اس موضوع پر بہت زائد کی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی مغربیت و فرنگیت کے جو نمایاں مظاہر ہیں انھوں نے تقریباً ان سبھی پر کم و بیش توجہ کی ہے۔ عبرت پذیری ان کے قلب کا، اور عبرت آموزی ان کے قلم کا جوہر ہے، اس ایک قوت کے سہارے ہر تختۂ زمین میں نئے نئے شگوفے کھلائے ہیں، اور ہر ریگستان کو لالہ زار بناتے چلے گئے ہیں،

کمیٹی بازی اور جلسہ بازی کے مشغلوں میں پڑ کر دین کی طلب اور روح کے تعلق کے ضعف کا عکس ذرا اکبر کے جام جم میں ملاحظہ ہو ؎

نفس کو تو انھیں باتوں میں مزا آتا ہے | جن پہ ہر گام پہ اک دام بلا ہے درپیش،
ممبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکر خدا آتا ہے | اس کمیٹی میں نہیں روح کی لذت کا خیال

خالص دوستی اور بے غرض محبت کے لفظ سیاسیات حال کے لغت میں بے معنی ہیں، ہندو اگر اتحاد کا ہاتھ مسلمانوں کی طرف بڑھا رہا ہے تو صرف اس لیے کہ دونوں مل کر انگریز سے مقابلہ کریں، انگلستان اگر روس سے لگاوٹ کر رہا ہے۔ تو محض اس غرض سے کہ جرمنی سے لڑنے کے لیے ایک زبردست حلیف ہاتھ آجائے خود مطلبی کا نام مہذبوں کی اصطلاح میں ڈپلومیسی ہے، دل سے نہ یہ ان کا شریک، نہ وہ ان کا دلوں میں زہر

کے انگارے بھرے ہوئے، لبوں پر بیٹھے بول، اسلام کے شاعر کو عبرت کا یہ منظر دیکھ، اپنے ہاں کا بھولا اور بھلایا ہوا سبق الحب للّٰہ والبغض للّٰہ کا یاد آجاتا ہے۔ اور اس کے منھ سے یہ نالۂ موزوں نکلتا ہے ؎

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار　　جس کا تو حاسد ہے اس کا جو ہو حاسد تیرا یار

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا　　اب تو ہر اک ہے مجاور اک جدا درگاہ کا

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سود　　چند روزہ متفق ہوں، ورنہ یہ شیخ و ہنود

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

۱۹۱۷ء کا ذکر ہے کہ ہندستان کے اخباری میدان میں بحث طریقت و شریعت کے درمیان چھڑ گئی۔ شریعت کا جھنڈا لاہور میں دفتر زمیندار[1] سے بلند ہوا۔ طریقت والوں نے دہلی کی ایک خانقاہ[2] میں پناہ لے، یہیں سے ضربیں لگانا شروع کیں۔ اور جب دیکھا کہ حریف کی گولہ باری بے پناہ ہے، تو جھٹ حکومت سے فریاد نقض امن عامہ کے نام پر کر دی۔ اکبر نے عین اس وقت جبکہ اشتعال جذبات کا شباب تھا، مصلحت شناسی و مصالحت جوئی کے چھینٹے ڈالنے شروع کیے۔ آگ اپنے وقت پر بہرحال بجھتی ہی (اور مدت ہوئی کہ اب اس کی خاکستر بھی باقی نہیں) البتہ اکبر کے چشمہ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے۔ وہ کبھی انشاء اللہ خشک نہ ہوں گے، پوری نظم ذرا طویل ہے، اقتباس ملاحظہ ہو ؎

اس وقت مولویت صوفیت سے بھڑ گئی ہے

اغیار کو ہو مژدہ، آپس میں چھڑ گئی ہے

ملا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم

صوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پویم!

ملا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو

صوفی کا ہے اشارہ، میرا پیالہ دیکھو

---

[1] لاہور کا مشہور روزنامہ ایڈیٹر ظفر علی خاں۔ [2] درین لبیرا۔ خواجہ حسن نظامی۔

ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے بڑھیے

صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنے سمجھ کے پڑھیے

کہتے ہو کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن

دیکھا نہیں سنا لیکن مُردوں پر آپریشن

اس وقت کیا تمھاری یہ خوش خیالیاں ہیں

آپس میں گالیاں ہیں، غیروں کی تالیاں ہیں

شیعہ ہوں خواہ سنّی، ملّا ہوں خواہ صوفی!!

بے سود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی

دیکھو ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے

موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے

وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو!

سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" میں ہے۔ مغرب کا ہر عیب آج ہماری نظر میں ہنر ہے اس کی ہر بدروی ہماری آنکھ میں حُسن ہے، اگر ہم عیب کو عیب سمجھ لیں، جب بھی کوئی صورت اس سے بچنے کی پھر بھی نکالیں یا سوچیں۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ معائب کو مناقب نقائص کو کمالات سمجھ رہے ہیں۔ اور زہر کو تریاق کے درجہ میں رکھ رہے ہیں "ترقی" "تہذیب" "شائستگی" "ارتقا" "روشن خیالی" وغیرہ چند الفاظ کان میں پڑ گئے ہیں! الٹ پلٹ کر یہی ہماری زبان پر آ رہے ہیں یہی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے شوق انھیں مقصدوں کی تحصیل کا، ارمان انھیں مقصدوں کی تکمیل کا داد دیجیے، فرشتوں کے مشہور معلم کی ذہانت کی، شکار کو پھانسنے کے لیے کیا افسوں کانوں میں پھونک گیا ہے۔

شیطان نے ترکیب تنزل کی نکالی!

ان لوگوں کو تم شوق "ترقی" کا دلا دو!

شکاریوں کا بیان ہے کہ جب شیر کا شکار منظور ہوتا ہے تو درختوں میں بھینسے باندھ دیے جاتے ہیں، شیر ان کی خوشبو پا کر انھیں نوش جان کرنے جلدی جلدی لپکتا ہوا جھپٹتا ہوا آتا ہے، اور شکار کرنے کے عوض خود ہی شکار ہو جاتا ہے، شاعر اس تشبیہ کو بھی کام میں لاتا ہے ؎

شیرانِ شرق کا انہیں منظور ہے شکار
بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

حقوقِ سیاسی کی توسیع پر مسرور ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اب ہمارے نمائندے اتنوں کے بجائے اتنے ہو گئے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرزِ انتخاب نے خود ہماری جماعت کے اندر کیسی پھوٹ پیدا کر دی ہے، باہمی رشک و حسد، بدگمانی و نفسانیت، خود غرضی و نا اتفاقی میں کتنی ترقی دے دی، اور طرح طرح کی ناجائز لالچوں، ترغیبوں کا دامن ہمارے نفس کے لیے کتنا وسیع کر دیا ہے، عذابِ عقبیٰ کو چھوڑیئے، یہ عذابِ دنیوی اپنے ہاتھوں مول لیا ہوا کچھ کم ہے! ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے
خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

یہی راگ ایک دوسری دھن میں بھی سُنیئے ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — سمجھیں اس کو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی! — سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر[1] کی — ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

اس جدید نظامِ اخلاق کو تعلق نہ والدین کی خدمت و تعظیم سے، نہ بزرگوں کی بزرگداشت سے، نہ اللہ و رسول کے احکام اور حقوق و فرائض سے فضا ہی ایسی تیار ہو گئی ہے، ماحول ہی ایسا بن گیا ہے ؎

باپ ماں سے شیخ سے، اللہ سے، کیا انکو کام
ڈاکٹر جنوا گئے، تعلیم دی سرکار نے

یہ شاعری نہیں، حقیقت کی ترجمانی ہے۔

آخرت کا خیال جانے دیجیے، یہ ارشاد ہو کہ تہذیبِ جدید نے اس دنیا کی زیست کی سہولتیں کہاں تک پیدا کی ہیں؟ جینا آسان کر دیا ہے یا اور مشکل؟ جنگ، ہلاکت غارت گری و سفاکی کے وہ حیرت انگیز

---

[1] لکھنؤ اور دہلی کے روزمرہ میں "سر" (یا لکسر) ہے نہ کہ سر (بفتح)

آلات و وسائل، جو چنگیز و ہلاکو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے، کس کے ایجاد کیے ہوئے ہیں؟ موٹر، موٹر سائیکل، ریل، لاری، ٹریم کے روزانہ ناگہانی حادثوں نے ہر بڑے اور متمدن شہر میں موت و ہلاکت کا اوسط کچھ گھٹا دیا ہے یا اور بڑھا دیا ہے؟ روزمرہ کی ضروریات زندگی کی اس کمیابی (اور اب تو نوبت نایابی تک پہنچ چکی ہے) کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملے گی؟ ملوں کی بھرمار چمنیوں کی افراط، انجنوں کی ریل پیل مل کے مزدوروں کی آبادی کی گنجانی، ہر وقت کی گھڑگھڑاہٹ، ہر گھڑی کے شور و ہنگامہ دم بدم کے دھوئیں نے بڑے بڑے متمدن شہروں کی صحت کا کیا حال کر دیا ہے؟ بڑے شہروں کے شہریوں میں فی صدی کتنوں کے دانت دُرست ہیں؟ معدے ٹھیک ہیں؟ آنکھیں عینک سے بے نیاز ہیں، جو سکون قلب، آسائش و راحت، تمدن سے بیگانہ دیہاتیوں کو حاصل ہے اس کا کوئی حصہ بھی تمدن جدید کے پر آشوب، ہنگامہ پرور ہیجان آفریں، مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا حل اکبر کی زبان حقیقت ترجمان یوں پیش کرتی ہے ؎

دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے — تہذیب نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر

کیا ہو رہا ہے آخر، کیسی گذر رہی ہے — نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو

کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے — دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد

سنتے آئے ہیں، کہ ہر درد کی دوا علم ہے، خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے، بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے کہیں اور کبھی بے شک یہی ہوتا ہوگا! لیکن اپنے نصیب کو کیا کہہ کر رویئے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے، ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے، مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع جسے شربت کا نام دیا گیا، وہی جام زہر نکلا، جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا وہی رہزن ثابت ہوا۔ جس نظام کو ہم نے نام "علم" و تعلیم کا دے رکھا ہے، وہی تو عین جہل ہے۔ یہ تو عین وہی علم ہے جس کا مقصود دلوں میں حب دنیا اور پختہ و راسخ کرنا ہے، خیال عقبیٰ و آخرت کے لیے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں۔ نصاب تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسول کے اعتقاد سے ناآشنا۔ اس کا سائنس مادیات کے اوپر کچھ دیکھنے سے اندھا۔ اس کی حکمت میں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود عنقا اس پڑھائی لکھائی کے نتیجے جو نکلنے تھے، نکل کر رہے۔ ان پر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کیے جانا، تو گویا یہ چاہنا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو، پانی کا وجود ہو، لیکن وہ کسی شے

کو تر نہ کر سکے۔ آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے منور نہ ہونے پائے! اکبر کی تشخیص میں یہی! نظام تعلیم تو ہے جس نے ابتری ہمارے اخلاق میں معاشرت میں، مذہب میں پیدا کر رکھی ہے ؎

اک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند اس علم میں ماہر کون کرے
جب علم کی عاشق دنیا ہو، پھر کون بتائے راہ خدا!
جب خضر اقامت پر ہوں فدا، تائید مسافر کون کرے
سودا بھی ہے رنگ طبع بشر، فطرت ہی میں ہیں اسباب جنوں
اکبر کو بھی ہوش آجائے، تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

اسی حقیقت کی ترجمانی، ایک دوسرے وزن و قافیہ میں ؎

مسٹر نظّی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی — شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس — چارہ کیا تھا اے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

یہی مضمون ایک تیسری جگہ ؎

اس چیز کا کیا کہنا اکبرؔ، تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا، ہموار کیا، اور ایک کیا
جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب انکا اثر پر رونا ہے — معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے
اس کا جو سبب ہے سن لو، سب پردہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں، یہ مطلع اکبرؔ حاضر ہے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

فرماتے ہیں کہ ملت کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علی گڑھ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتا ملازمت اور چاکری کے سکوں کی ٹکسالوں کا کام تو یہ قومی کالج ضرور دے سکتے ہیں، لیکن قوم کا قوام تو انگریزی سے نہیں، عربی ہی سے درست ہو سکتا ہے، خشک حقیقت کو ظرافت کے چٹخارہ کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں ؎

یہ بات تو کھری ہے، ہرگز نہیں ہے کھوٹی — عربی میں نظم ملت، بی اے میں صرف روٹی

لیکن جناب لیڈر یہ شعر سُن کے بولے　　بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی

اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے　　کس کی نظر ہے غائر، کس کی نظر ہے موٹی

لیکن نظم ملت و اصلاح امت کی اب پرواہی کس کو ہے؟ دین کا اب سوال ہی کیا؟ پیش نظر تو صرف دنیا اور اس کی ترقیاں ہیں۔ کونسل اور اسمبلی، اسکول اور کالج، جاہ و منصب، مشاہرہ و اعزاز۔ خودی کی پرستش سے اب فرصت کس کو جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر یہی منظر دیکھ کر صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبرؔ، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظام کائنات میں اذیت و تکلیف کا وجود رکھا ہی اس غرض سے گیا ہے کہ اس سے نفس میں شکستگی و تفرع پیدا ہو۔ دھن بجائے "اسباب" کے مسبب الاسباب کی پیدا ہو مخلوق اپنے ہم جنسوں سے بے آس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرلے۔ چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہی ہے۔ فطرت سلیم ایسے موقعوں پر راہ ہدایت پاجاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہے، اس کی شقاوت و قساوت کے لیے یہ تمام تازیانے بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان غیبی، ہر جدید آیت الٰہی۔ ہر تنبیہ فطرت، غفلت و جمود، الحاد و اعراض میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ جو تریاق ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ ہجوم مصائب میں بھی اسے تکیہ مادی اسباب پر، اور بھروسہ دنیوی وسائل پر رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کرتا رہتا ہے دفتر کے سر دفتر کے آگے، دراز ہوتا رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کرتا رہتا ہے ہر امیر ہر وزیر، ہر بڑا افسر امیدوں کا مرکز، حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے۔ اللہ سے بے تعلقی مصیبتوں کے ہجوم کے وقت بجائے گھٹنے کے کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔ اکبر اپنے گردوپیش یہ منظر دیکھ، اپنی زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے ہیں لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یاران مجلس کو درد و عبرت کے تذکروں سے واسطہ کیا۔ یہ تو اس کے نام ہی سے وحشت کرتے ہیں، بزم میں قدم اس شان سے رکھتے ہیں، کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے نشاط و زندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے، لیکن منھ سے صدائیں درد و عبرت کی نکل رہی ہیں۔ اور زیر لب آواز سوز و فغاں ہی کے سروں میں آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی[1] زیادہ ہیں۔ اہل نظر چند۔ تماشائی یہ سوانگ دیکھ کر

---

[1] حالی ؎ اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی　　بزم میں اہل نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

تالیاں بجاتے ہیں اور اہل نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک جھلک دیکھتے چلیے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو — دعا منھ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

فضا کی حالت یہ ہے کہ سچی بات زبان سے نکالنا مشکل، بس جو کچھ سب کہہ رہے ہیں وہی کہے جائیے جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں۔ وہی کیے جائیے۔ جس حمام میں سب ہی ننگے ہیں، اسی میں آپ بھی بلا تامل بے پردہ ہو جائیے۔ جب تو آپ اچھے، آپ کی باتیں اچھی، آپ کی سوسائٹی اچھی، ادھر کلمہ حق زبان سے نکالا کہ مارے گئے۔ ہر طرف سے آوازے کسے گئے، نکالے گئے، اعزاز و عافیت کی تلاش ہے، تو جو رنگ چھایا ہوا ہے بس اسی میں چپکے سے خود بھی رنگ جائیے ؎

یہ عجب عمل، یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش بھرے گئے

جو لچے بہت تو بچے ذرا، جو کھری کہی تو دھرے گئے

تری بزم اکبرؔ خوش بیاں ہے محل فرحت دوستاں

جو ملول آئے وہ خوش گئے، جو فسردہ آئے ہرے گئے

مذہب اور اخلاق، خدا اور رسول، حشر و ملائکہ کو چھوڑیئے، اس وقت ڈگری حاصل کرنے گریجویٹ ہونے، ڈاکٹریٹ کی سند ہتیانے، کونسل کی ممبری اُچک لینے، ملازمت میں داخل ہو جانے کی دھن میں اتنے حواس بھی کسی کے نہیں، کہ خشک عقلی و علمی بحثوں پر قوت خوص صرف کی جائے اور اتنی فرصت کسے کہ رومی و رازی نہ سہی سعدی و طوسی کے لیے ہی وقت نکالا جائے؟ معیار تو صرف یہ ٹھہر گیا ہے کہ فلاں مطالعہ جلب زر میں، حصول جاہ میں، کہاں تک معین رہا اور بس۔ یہ لمبی کہانی، اکبرؔ کی زبانی دو لفظوں میں سن لیجیے ؎

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض

سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا

بہر خدا جناب، یہ دیں ہم کو اطلاع

صاحب کا کیا جواب تھا، بابو نے کیا کہا

لڑائیاں حکومتوں کے درمیان پہلے بھی ہوتی تھی، اب بھی ہوتی ہیں۔ البتہ پہلے ان کی بنیاد تحفظ عقائد، پاس عزت، حفظ ناموس تھی۔ گویا کوئی نہ کوئی پہلو خودداری کا لیے ہوئے، اب دنیا اس درجہ غالب

آگئی ہے کہ یہ سب اڑا اڑا کر، جنگ کی محرک تقریباً ہر جگہ تجارتی رقابت رہ گئی ہے اور معاشی مسابقت، فرماتے ہیں ؎

مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے ۔۔۔ ہے اب تو جنگ حکم و تجارت کے واسطے

لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھ کو پریڈ پر ۔۔۔ تیار ہو رہا تھا، میں جنت کے واسطے

کسی زمانے میں ہمیں یہ تعلیم ملی تھی۔ کہ راہ خدا میں جو کچھ کرو، حتی الامکان خلق کی نظر سے پوشیدہ کر کے، اور جو کچھ بھی خیرات کرو، اس سے مقصود بس اللہ کی رضا جوئی ہو نہ کہ بندہ پر کوئی احسان۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہے اور اعلان پہلے کیا جاتا ہے، جلسوں میں بھی تالیوں کی گونج کے درمیان اور پھر اخبارات کے ذریعہ سے بھی، بلکہ بہت سی صورتوں میں تو بس اعلان ہی اعلان وعدہ ہی وعدہ رہتا ہے، اس سے آگے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ اور پھر اس "کار خیر" سے مقصود کیا ہوتا ہے! عموماً و بیشتر یہی نہ کہ فلاں انجمن کی صدارت، فلاں مدرسہ کی سرپرستی ہاتھ آجائے، فلاں پارٹی پر اثر اور اپنا حق قائم ہو جائے" یا پھر یہ کہ چندہ خان بہادری[1]، آنریری مجسٹریٹی، نائٹ ہڈ، غرض کسی معزز منصب یا خطاب کی قیمت سمجھ لیا جائے۔ شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر حسرت و یاس کی لے میں پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کے لیے ۔۔۔ جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لیے

ایک دوسری جگہ عبرت و حسرت کے اس گنجینہ کو شوخی و شرافت کے دوشالہ میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے ؎

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں ۔۔۔ قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں ۔۔۔ بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

انتشار ملت کی اس سے صحیح تر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے؟

حمایت مذہب کے دعوے، اب بھی زبانی بہت کچھ کیے جا رہے ہیں۔ لیکن عموماً اس طبل بلند بانگ کے پیچھے حقیقت کیا ہوتی ہے؟ یہی ہے نا کہ ذاتی مخالفتوں، مخاصمتوں کی تسکین کا موقع ہاتھ آئے اور مخالف کی رسوائی اور بدنامی جی بھر کے ہو رہے مخالف اگر "وہابی" ہے تو آپ اس کے مقابلہ میں "صوفی" اپنے کو کہنے لگیے۔ اور اس کی وہابیت کو خوب خوب اچھالیے۔ حریف اگر "بدعتی" ہے تو آپ اس کے جوڑ پر اتباع سنت کے مدعی ہو جائیے۔ اور اس کے بدعتی ہونے کو خوب چمکائیے، خوب پھیلائیے۔ اکبر کا قلم یہ

---

[1] خان بہادری، آنریری مجسٹریٹی، نائٹ ہڈ ("سر" کا خطاب) انگریزی دور حکومت کے خاص اعزاز تھے۔

تصویر یوں پیش کرتا ہے، بلاغت کے رنگین نقش اس پر اضافہ ؎

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے، ہاں اسکے لیے لٹھ تان سکے
مذہب نے ہمیں پہچان لیا، ہم اس کو نہیں پہچان سکے

اور کہیں بالکل سادگی سے یہی مقصد یوں ادا کر دیا ہے ؎

مذہب کا نام لیجیے۔ عامل نہ ہو جیسے — جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجیے

خدا فراموش نظام معیشت اور خود پرست آئین معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ امن و عافیت کا نشان نہ رہا۔ انبساط قلب و سکون خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے، آئین ہمدردی کے بجائے فلسفہ "تنازع" للبقا اور "کارزار" حیات کا رائج ہو گیا زندگی کی ضرورتیں گراں ہوئیں، بدکاریاں ارزاں ہوئیں، ہلاکتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمینان میں کمی آئی۔ محبتیں مٹیں، خصومتیں اُبھریں خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے۔ "تمدن و تہذیب" کی اس زندگی سے عقبیٰ جیسی سنورتی ہے اسے "توکل" پہ اٹھا رکھیے۔ آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوئی جاتی ہے۔

گلشن مشرق کا باغبان اپنی انکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے، اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکے۔ ہاں اپنے اوپر تو کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے زبان پر مرثیہ ہے۔ لب پر آہ ہے! آستین آنکھوں پر ہے اسے ہٹا کر دیکھیے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، ممکن ہے۔ مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی قیمت لگا سکے ؎

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل — گر ہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کروٹوں میں ٹوٹیں — بخیے جو فطرتی تھے، وہ اب ادھڑ رہے ہیں
سطح زمین سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو — نظروں میں پھلجھڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن امید کیا ہو جب دل اُجڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کس کی کریں گی زینت — لفظوں میں یہ نگینہ کیوں آپ جڑ رہے ہیں

فلسفہ کو چھوڑیئے کہ یہ تو خود ہی ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے سائنس کو لیجیے کہا جاتا ہے کہ یہ قطعیات، و یقینیات کا ہادی ہے اور سائنٹفک ترقیاں مخصوص فیض ہیں تمدن جدید کا۔ لیکن یہ

ارشاد ہو کہ یہ آلات ونت نئی ایجادات والی ترقیوں سے دنیا میں برکتیں زیادہ پھیلی ہیں یا لعنتیں؟ مجموعی طور سے ان سے اب تک دنیا کے ذخیرۂ مسرت وراحت میں اضافہ ہوا ہے یا جنگ جدال میں، قتل وغارت میں جعل سازی اور دھوکہ بازی میں؟ ان سے تحریک وتقویت انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ پہنچی ہے یا جذبات بہیمی کو؟ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات ومشاہدات محفوظ ہیں، آہِ سرد کے ساتھ وہ "صاحب" اور "صاحب" کے لائے ہوئے سائنس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنا اخلاق، اپنا جوہر شرافت، سب آپ کی خوشی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو بیگانہ بنا لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے الٹی مصیبتیں ہی بڑھ کر رہیں ؎

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں، نہ بھائی خوش ہیں، نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا، دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر، دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دور میں پن مگن تھے تمہارے دور میں پاپ خوش ہیں

"مشرق ومغرب" کا جو فرق ہے وہ مشرق ومغرب کا فرق ہے بعد المشرقین ہے جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے فروع میں نہیں اصول میں ہے عرض میں نہیں جبلت وسرشت میں ہے وہ مادیت میں مست ہے، ہم روحانیت میں غرق۔ وہ تجارت وثروت کے گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہم صبر وقناعت کے حجرہ میں فقر کی کملی لپیٹے ہوئے ہیں، وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دھن میں ہیں، ہمیں اپنے عرفان نفس کی کوششوں سے کہاں فرصت وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے اچھل پڑتے ہیں، کہ "انسان کی اصل بندر ہے" ہم بدمستی وبیہوشی میں بھی نعرہ لگاتے ہیں تو یہ کہ "انسان خدا میں گم ہے"۔ اکبر اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی ۔۔۔ مغربی میں ہے میل جسمانی!
کہا منصور نے خدا ہوں میں ۔۔۔ ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست ۔۔۔ "فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست"

اکبر نرے حافظ نہ تھے۔ حکیم اخلاق بھی تھے۔ راہ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے

والے نہ تھے۔ راستہ کی پیچیدگیوں راہ روکی دقتوں سے بھی واقف تھے اس لیے مسافروں کو راہ کے پیچ وخم، منزلوں کی مشکلات کی بابت بھی ہدائتیں دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ بھی آنکھ بند کر کے رٹ ڈالے۔ جذبات کی کشش ایک سمت ہوتی ہے عاقبت اندیشی کا فتویٰ دوسری جانب۔ اور پھر خود جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش و کشمکش۔ اکبر کہیں کہیں ان گتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں، جا بجا ان کی حکیمانہ فکر و عارفانہ نظر نے اخلاق و معاشرت کے محض جزئیات کو نہیں، بلکہ فلسفۂ اخلاق کے اصول کو لیا ہے، اور بنیادی مسائل کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

شباب کی بدمستیاں و بے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم ساتھ ہی مذہب و اخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ کل چار مصرعوں کے اندر (اور چار مصرعوں کی بھی کوئی بساط ہے ؟) پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، آپ ابھی اسی کو دیکھتے ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک علامت بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ اس کی داد ابھی دینے نہیں پاتے کہ چٹ پٹ وہ ایک نسخہ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں، مکمل تشخیص اور علاج کل چار مصرعوں میں ؂

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے فرانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوف خدا ہے اس کی دوا

دین و مذہب کی تحصیل بہتوں نے محض ایک علم و فن کے طور پر کرنا شروع کی ہے یعنی بجائے اس کے کہ اس کو برتیں، اسے اپنی زندگی میں بتاہیں، اسے ایک مسلک حیات قرار دیں۔ محض اس کے کچھ مسائل یاد کر لیتے ہیں۔ مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے۔ یا پھر دوسروں کی لتاڑ کرنا۔ اکبر کا قول ہے کہ مذہب و اخلاق سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جبکہ ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انھیں جزو زندگی بنا لیا جائے، نہ یہ کہ ان کے قیل و قال سے کام محض گرمی محفل کا لیا جائے۔ لیکن عمل میں ظاہر بینوں کو لذت کہاں، نفس کو لذت تو دوسروں ہی کے بتانے، پڑھانے سکھانے میں آتی ہے ؂

علم دین حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی! صرف سکھلانے میں لذت ہے عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصرعہ بنے خود آہ سوزاں، تب ہے لطف ورنہ اے اکبر تری نظم و غزل میں کچھ نہیں

مذہب کا لیبل چپکا لینے، مذہب کا محض نام رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شے ایمانیات میں عقیدۂ توحید ہے، اور اعمال میں درستی اخلاق۔ جب یہ حاصل ہے، تو سب کچھ حاصل اور جب یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں حاصل۔ باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بولیاں ہیں ؎

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں!
جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں، بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت، لو لگی ہے جن کی خالق سے
نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست، بس وہ طاہر ہیں

مذہب کی حیثیت انفرادی سے زیادہ جماعتی تھی تو پہلے بھی، لیکن اب تو کہنا چاہئے کہ یہی جماعتی حیثیت اور سب حیثیتوں پر غالب آگئی ہے کوئی شخص عیسائی ہے تو اس کے معنی اب یہی رہ گئے ہیں کہ اس کا میل جول، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کے طور طریقے فرنگیوں کے سے ہوں گے، سال میں "بڑا دن" منائے گا، خوشی کرے گا۔ کیک کھائیگا۔ ہفتہ میں اتوار کو کام کاج بند رکھے گا۔ ملنے جلنے میں رہے گا۔ عجب نہیں کہ گرجا بھی ہو آئے۔ کوئی صاحب اگر شیعہ ہیں، تو معنی یہ ہیں کہ محرم میں مجلس کریں گے عزا و ماتم میں پیش پیش ہوں گے۔ آمد و رفت شیعوں کے ہاں رکھیں گے۔ کوئی بزرگ اگر سُنّی ہیں، تو میل جول اہل سنت سے رکھیں گے، مدح صحابہؓ کے جلسہ جلوس میں شریک ہوں گے۔ گھر کی ریت رسم سنیّوں کی سی رکھیں گے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے معنی اب یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اپنے جماعتی ماحول میں تغیر کر دیا۔ فلاں فلاں کے بجائے فلاں فلاں سے تعلقات اور رابطے بڑھ گئے۔ عقائد کا سوال بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے۔ یہاں گفتگو مذہب کے صرف ظاہری، معاشرتی و مجلسی پہلو سے متعلق ہے اس لئے اکبر کہتے ہیں کہ معتقدات کی کرید کی حاجت دنیا کو بالکل نہیں۔ دنیا کے دیکھنے کی بات تو صرف اتنی ہے کہ وضع و طرز اعمال اور اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہے امر قومی، سمجھو نہ فعل ذاتی معذور سب ہیں اس میں گفتگو ہو یا دو خاتی
شیعہ ہوں خواہ سُنّی، لالہ ہوں یا برہمن! مذہب کو موروثوں سے پاتے ہیں سب عموماً

پولیٹیکل ضرورت بیشک تھی اس کی اوّل   اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل
اچھا برا نہ کہہ دو تم مذہبی بناء پر   اخلاق اس کے دیکھو ہے اصل تو یہ جوہر
تعلیم جو ہے عمدہ صحبت اگر ہے اچھی   پاؤ گے اس کو اچھا، طینت اگر ہے اچھی
ناری ہے یا کہ ناجی، اس کا بیاں نہیں ہے   سوشل طریق یہ ہے، اور وہ تو رازِ دیں ہے

دنیا کا قانون تکوینی کچھ ایسا رکھ دیا گیا، کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں، ایک آج ملازمت سے موقوف ہوا، یا پنشن پر ہٹا۔ اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے۔ لیکن جس نے اس کی جگہ پائی۔ کوئی اس کے گھر میں دیکھے، کیسے شادیانے بجتے ہوتے ہیں۔ پرانی آبادی ویران کرکے، محکمہ آرائش بلدہ جہاں ایک خوش نما و خوش فضا پارک بنواتا ہے خلقت وہاں تفریح کے لیے امنڈ امنڈ کر جمع ہوتی ہے، اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال کیا گیا ہے، کہ کتنے بھرے پرے گھر مسمار ہو گئے ہوں گے۔ جب جا کر یہ قطعہ زمین پارک کے لیے نکلا ہے۔ ان ہنستے بولتے گھر والوں پر کیا کچھ گزری ہوگی۔ اپنے اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت، اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے وقت، انھیں کھدتے دیکھ کر، اپنی کھیل کود کی جگہ پر اپنے کھانے پینے، لیٹنے سونے کی جگہ پر پھاوڑے چلتے دیکھ کر، انھیں خاک میں اٹتے اور تپتے دیکھ کر! — فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے۔ بھولا ہوا، بالکل بھولا ہوا۔ کہ کتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئیں کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے خاندان برباد اور کتنے گھر بے چراغ! ؎

یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے کتاب میں اسکو کیا پڑھے گا
حدود دنیا کے ہیں معین، جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

انسان معصیت سے ہاتھ اگر کھینچتا ہے تو عموماً اسی وقت، جب خود گناہ ہی کی قوت سلب ہو چکی ہے، ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہے، نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ ذرا مشکل ہی سے موقوف ہوتا ہے ؎

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے   مگر اس بزم میں سچ یہ ہے کہ جی ہاں ہے بہت
وعظِ تقوے نہ کہو، رحم کرو اکبر پر   چشمِ بد دور، ابھی طاقتِ عصیاں ہے بہت

نیکی اور بدی پر آخرت میں ثواب و عذاب جو کچھ بھی مرتب ہو، وہ تو ہوگا ہی ایک بیّن فرق

دونوں کے درمیان تو اس دنیا میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی، اطمینان، سکون پایا جاتا ہے، اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب لاحق ہوتا ہے ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب
دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

محض کتابی معلومات، انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے، اس کے لیے اچھی صحبت لازمی ہے زندگی پر اثر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے ایمان میں قوت عمل میں رسوخ زندہ معلم ہی کے واسطہ سے نصیب ہوتا ہے عالم بے عمل وہی کہلاتے ہیں جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں۔ لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بناتے ہیں!
جستجو ہم کو آدمی کی ہے ، وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

ایک اور موقعہ پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتبخانوں سے
رہیے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

انسان کو اپنے خلاف مزاج دنیا میں ہزارہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن کارخانہ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا۔ اس کے بس کی بات نہیں، یہ نظام کائنات تو اس کی مرضی کا نہیں کسی اور ہی کی مشیت کا پابند ہے اس لیے مآل اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر نا ملائم واقعہ پر، ہر حادثہ پر، صبر و تحمل، بلکہ رضا و تسلیم سے کام لے۔ یہی اُصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہر طرح خوشگوار بنا دیں گے ؎

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں
بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں
چل بسے چھوٹے بڑے، تھا جن سے لطف زندگی
مجھ کو کس کا ناز ہے، میں ناز اب کس پہ کروں
وصل کی شب حسب موسم ہو ہی جائے گی بسرا
لطف اٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص غایت و مصلحت کے ماتحت حرکت کر رہا ہے ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہے گا۔ ہر مبتدا کی خبر ضرور نکلے گی۔ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کوئی نتیجہ پیدا کر کے رہے گی، انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے، اور دل کو عیش و عشرت کی غفلتوں میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہے، جام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی فراموش کاریاں، غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں کس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبر اس فطرت خاموش کو بے حس نہ سمجھ ہاں بصیرت سے تہی، دیدۂ نرگس نہ سمجھ

راحت زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ امتحان گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ

جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ خاتمہ جس کا ہو افسوس اسے آفس نہ سمجھ

صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسن عمل بہر انجام یہ امرت ہے اسے بس نہ سمجھ

دل کا دنیا کی امیدوں سے بہلنا ہے برا زندگی تلخ جو کر دیں، انہیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے دل میں ہمدردی، رواداری، دوسروں کی ہوا خواہی زیادہ پیدا ہوتی ہے البتہ فطرت کی نیرنگیوں، مشیت تکوینی کی عجائب کاریوں علم مطلق کے مظہروں کو دیکھ کر حیرت ضرور طاری ہوتی رہتی ہے ؎

شیخ جی کی نظر میں میں ہوں فقط! میری نظروں میں ساری دنیا ہے

بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر مجھ کو حیرت ہے ان کو غصہ ہے

علائق دنیوی کی جتنی بہتات ہوگی، اسی نسبت سے سامان غم و الم بھی بڑھتے رہیں گے امن و عافیت مقصود ہے تو دنیوی تعلقات جہاں تک ممکن ہو کم کرنے چاہییں ؎

ایک جمتا ہے، ایک پگھلتا ہے کام دنیا کا یوں ہی چلتا ہے

دل تعلق بڑھا کے پچھتایا پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب چینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطا کاریوں کی جانب ذرا توجہ نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو کس پر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

میری نسبت جو ہوا ارشاد، وہ میں نے سنا

یہ تو کہیے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کہ وہی اس کی اصل کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے انسان ساری دنیا کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے لیکن خود اپنے ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے
تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

اخلاق کی صفائی، نفس کے تزکیہ کے لیے محض گوشہ نشینی کافی نہیں۔ اصل شے قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے اچھی باتوں کی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ لیکن انھیں نہ دل سے ماننے والے ان پر عمل کرکے داد دینے والے کم ہی نکلتے ہیں ؎

ترکِ دنیا سے نہیں ہر صاحبِ عزلت بری
خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے
مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاق سند،
خوب کہنا اور ہے، اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے اور اب تو بہت ہی بڑھی ہوئی، پھیلی ہوئی ہے۔ انسان دوسروں کی بدکاری پر انھیں بُرا بھلا کہہ لینا اپنے لیے بالکل کافی سمجھتا ہے اور خود اپنی اصلاح کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتا۔ گویا عبادت و حسن عمل کا بنیادی پتھر، اللہ کی حمد نہیں، بلکہ شیطان پر لعنت ٹھہر گئی ہے یہ صورت حال اکبر کے فلسفۂ اصلاح کے بالکل مخالف ہے۔ اہل فرنگ اگر ہمیں ناتوان و بے بس پاکر ہمیں اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں تو اس کا یہ علاج نہ صحیح ہے نہ کافی، کہ ہم بس انہیں کوستے کاٹتے رہیں ان کے طور طریق پر لعنت بھیجتے رہیں۔ ہم کو اصل فکر اپنی ترقی و اصلاح کی ہونا چاہیے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اس دور میں شیطنت کی یہ ترکیب خوب نکالی ہے کہ کچھ بندوں کو بس اس پر لگا دیا ہے کہ وہ اس کے اوپر لاحول پڑھنے میں لگے رہیں اور حمد و مناجات توحید و حسن عمل کے لیے وقت ہی نہ نکال سکیں ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی
خدا کی حمد کیجیے ترک، بس مجھ کو بُرا کہیے

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں کہ حریف اگر ہمارے اوپر ستم پر ستم توڑ رہا ہے اور ہم ہیں کہ بجائے اپنی اصلاح حال و تصحیح اعمال کے محض اس پر لعنت بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں، تو تباہ ہم اور وہ دونوں

ہلو کر رہیں گے قانون فطرت، انتقام دونوں سے لے گا حریف سے اس کی زیادتیوں کا، ہم سے ہماری کوتاہیوں کا۔ اس سے اقدام جور وستم کا، ہم سے غفلت و جمود کا۔ دشمن کی تباہی، ہماری فلاح کی خود بخود مستلزم ہرگز نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو قسمت یہی رہیگی
زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا، ہماری حالت یہی رہیگی
یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح امید کیسا
یہی ہے زلف بتاں کا سودا، تو میری شامت یہی رہیگی
عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیاں غیر کیسا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہیگی

سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے، سارے اولیا انبیاء کا بتایا ہوا راستہ

ع صد ہزاراں پیر بر وے متفق

یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی و بیزاری۔ دل میں لو اور لگن کسی اور ہی کی لگی رہے۔ باقی ہاتھ پیر، چلتے، پھرتے حرکت، اسی دنیا میں کرتے رہیں بقول عارف روم ؎

ہیچ گنجے بے دَد و بے دام نیست   جز بہ خلوت گاہ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف نے بھی کی ہے ؎

جو اہل دنیا کا رُخ کروگے سکون خاطر کبھی نہ ہوگا
شریک غفلت بہت ملیں گے، شریک عبرت کوئی نہ ہوگا
یہی ہے مذہب کا جزو اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقدم
نئے طریقے میں لیکن اے دوست ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کردی گئی تھی کہ اطمینان قلب و راحت دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں، اور اپنی بدعملیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ اکبر کی آواز بھی اس آوازہ حق کی صدائے بازگشت ہے خلقت کو اصلاح دینوی کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں انھیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا کان لگا کر

تو سُنیے ؎

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیوں کر — اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر[1]

اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام — طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا یہ ہے کام[2]

بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر دعا کچھ، — آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ[3]

منظور مفاخر کا اگر تجھ کو سبق ہے — تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے[4]

یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل — اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل[5]

نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے — کھوٹے کو جدا کر دے، وہی بات کھری ہے[6]

لیکن یہ سارا دفتر وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف، اور فطرت کی رفتار تکوینی، مشیت الٰہی کا رُخ دوسری طرف مشیت نے بڑے بڑے انبیاء و رسل کو ظاہری نتیجہ کے اعتبار سے ناکام رکھا۔ جس حکمت تکوینی نے خدا معلوم کتنے ہی معرکوں میں صورت و ظہور کے اعتبار سے کفر کو ایمان پر، اور ظلمت کو نور پر غالب رکھا۔ اس کی عادت میں بیسویں صدی کے ایک مصلح شاعر کی خاطر فرق کیونکر پڑ سکتا تھا؟ ہدایت و گمراہی کے دور کا آخری سلسلہ انسان کے نہیں، انسان آفرین کے ہاتھ میں ہے۔ اس کارخانۂ کائنات کی بنیاد جس فطرت پر رکھی گئی ہے۔ اسی پر کارخانہ برابر چلتا رہے گا۔ پیمبروں جیسی مقبول و برگزیدہ ہستیاں جب فطرت کی رفتار کو نہ بدل سکیں تو کسی

---

[1] "جو بھی مصیبت تمھارے اوپر آتی ہے خود تمہارے ہاتھوں آتی ہے" (سورہ شوریٰ رکوع ۴) "تمھیں جو کچھ بھی بُرائی پیش آتی ہے خود تمھارے نفس کی لائی ہوئی ہے (سورۂ نساء رکوع ۱۱) اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے" (سورۂ رعد رکوع ۲)

[2] اللہ ہر قسم کی فراہمی اسباب پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں (سورہ کہف رکوع ۵) "ساری قوت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے" (سورہ بقرہ رکوع ۲۰) "حکومت و اختیار صرف اللہ کا ہے" (سورہ یوسف رکوع ۵)

[3] مسلمانو، فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے، پس جو شخص بُرا کرے گا، اس کی سزا پائے گا (سورۂ نساء رکوع ۱۸)

[4] وہی اللہ تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا، تمہیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کیے اور مومن بھی (سورۂ تغابن رکوع ۱)

[5] ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں (سورہ آل عمران رکوع ۱۴)

[6] "تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے وہی اللہ کے نزدیک سب سے معزز ہے (سورۂ حجرات رکوع ۲) "جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں، سو عزت تو ساری کی ساری صرف اللہ ہی کی ہے" (سورۂ فاطر رکوع ۲)

شاعرِ غریب کی بساط ہی کیا۔ اکبر بھی اس تماشا گاہ عالم میں اپنا جلوۂ حسن و ادا، کمال و جمال کے ساتھ ادا کرکے رخصت ہو گئے۔ لیکن چلتے چلتے یہ بھی کہہ گئے کہ زمانہ کا رخ میری یا کسی کی بھی تبلیغ سے نہیں پھر سکتا، چند ہی روز میں یہ حال بھی ماضی بن جائے گا، یہ "آج" بھی "کل" میں تبدیل ہو جائے گا۔ حال کی تازگی ماضی کا افسانہ پارینہ بن جائے گی۔ اس وقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔ احساسات خود ہی تبدیل ہو چکیں گے عیب ہنر بن جائیں گے، اور کمال کا نام بے کمالی پڑ جائے گا۔ عقل کو جنون کا لقب دے کر پکاریں گے اور جنون کی تعبیر عقل سے کریں گے ؎

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون سی چیز گم ہو گئی۔ عنفوانِ شباب کی لذتوں اور مستیوں میں پڑ کر یاد ہی کس کو رہ جاتا ہے، کہ بچپن کی معصومیت کا زمانہ رخصت ہو گیا، بیفکریوں کا وقت کیسا خواب و خیال بن گیا، اور نئی نئی فکروں ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر آ پڑا ہے، آنکھ کھلتی ہے مگر کب! جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہوتا ہے عجب نہیں کہ کچھ ویسا ہی حشر ہماری موجودہ معاشرت کا بھی ہو اکبر کے جام جم میں اس قلب ماہیت کے ایک ایک جزو کا عکس موجود ہے۔ بہتر، ہوگا کہ مرثیہ کا آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیا جائے[۱] ؎

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملک عدم ہوں گے

نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی

نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

---

[۱] افسوس کہ وہ "دوسرا وقت" کبھی نہ آیا۔ مضمون کی تقسیم شروع میں پانچ حصوں میں کی گئی تھی اور پانچویں حصہ کا عنوان "تصوف، معرفت، فلسفہ" تھا لیکن مضمون جب ۱۹۲۳ء میں رسالہ اردو میں نکلا، تو صرف چار ہی حصے نکلے، اور پانچواں حصہ جو سب سے زیادہ ضخیم ہوتا سارے کا سارا لکھنے سے رہ گیا تھا۔ اب ۱۹۴۳ء میں نظر ثانی کے وقت اتنی ہمت نہ ہوئی کہ تکملہ کے لیے پوری محنت ایک مستقل مقالہ کی گوارا کی جائے۔ یوں ہی بہت زیادہ وقت نظر ثانی کی نذر ہو گیا تھا۔ مضمون اسی طرح ناتمام صورت میں شائع ہوتا ہے! دنیا میں خدا معلوم کتنی خیالاتی اسکیمیں اور کتنے منصوبے اسی طرح ناتمام رہ جاتے ہیں۔ اور انسان انھیں چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

(عبدالماجد مئی ۱۹۴۴ء)

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردہ کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے
بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہونگے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنیؔ نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زبان نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

اُردو کا ایک بدنام شاعر[1]

یا

گنہگار شریف زادی

لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ "جان عالم" کا لکھنؤ۔ زمانہ یہی اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط کا۔ آج سے کوئی ستر پچھتر سال قبل۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوش تمنا۔ ہر شام میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم۔ یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا پرا۔ ادھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، ادھر گلے سے نکلی ہوئی تانیں اور ہاتھوں سے بجتی ہوئی تالیاں گلی گلی "جنت نگاہ و فردوس گوش" چپہ چپہ "دامان باغبان و کف گل فروش" بڑے بڑے متین اور ثقہ، گویوں اور سازندوں کی سنگیت میں اچھے اچھے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کی صحبت میں۔ سفید پوشوں کے دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لالوں لال، جبّے اور عمامے والے، پیشوازوں کی گردش پر نثار۔ غرض یہ کہ آج کی اصطلاح میں ہر طرف "آرٹ" اور "فائن آرٹ" کا دور دورہ عشق کا چرچا، حسن کا شہرہ۔ اس فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں، کوئی عالم دین نہیں، صوفی درویش نہیں، واعظ و مصلح نہیں چونچلوں کے آدمی، یار باش زندہ دل، رند مشرب، اہل بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لے کر بیٹھے تو انگلیاں انھیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے اور منھ سے بول نکلے تو وہی، جن کے نقش دلوں میں جمے ہوئے تھے۔

غزلیں شاید زیادہ نہیں کہیں، کہیں ہوں گی بھی، تو اس وقت کسی کی زبان پر نہیں۔ تھوڑا بہت جو کچھ کہا اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

---

[1] رسالہ سہیل (علیگڈھ)

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیر ابھارے کئی دن سے

اک شب مرے گھر آن کے مہمان رہے تھے
ملتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

آخر میری آہوں نے اثر اپنا دکھایا،
گھبرائے ہوئے پھرتے ہو پیارے کئی دن سے

پھر شوقؔ سے کیا اس بت عیار سے بگڑی
ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

حکیم صاحب کی حکمت وطبابت سے یہاں غرض نہیں۔ شاعری کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا ہے اور تخلص شوقؔ۔ اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی، ان کی غزلیں نہیں مثنویاں ہیں۔ تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ ہوں گے، لیکن یہ یقیناً یا تو استاد کے بعد کی ہیں۔ یا ان کی زندگی میں ان سے چرا چھپا کر کہی ہیں، ورنہ آتشؔ کی نظر پڑنے کے بعد عجب نہیں کہ نذر آتش ہو جاتیں، خواجہ آتشؔ کی متانت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد آوارگی اور تماش بینی کی بولی ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں، اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ ان کی یاد کی چمک دمک قائم رہے بھی تو اسی روشنی میں!

ان مثنویوں کا نام پڑھے لکھوں کے مجمع میں لیا جائے؟ تہذیب جدید کی اجازت ہے کہ ایک مشرقی شاعر کی عریاں نگاری کی لفظی یادگاروں کا نام لیا جائے؟ نواب مرزا غریب لکھنؤ کا تھا۔ انگلستان کا نہ تھا۔ امریکہ کا نہ تھا۔ کہ اس کی ہر بے حیائی "آرٹ" کا کمال سمجھ لی جاتی، اس کی ہر عریاں نگاری پر کمال فن کی داد ملتی اور اس کا ہر عیب ہنر بن جاتا! بیسویں صدی کا نہیں، انیسویں صدی عیسوی کے وسط کا تھا۔ "نئے ادب" کے دور سے بہت قبل کا تھا۔ "آج کے ترقی پسند" ہندستان کا نہ تھا۔ کہ اس کی ہر فحش نگاری "ترقی پسندی" کی سند اور دستاویز بن جاتی۔

بہرحال مثنویاں منسوب تو اس کی جانب کئی ایک ہیں، لیکن لذت عشق کی زبان قطعاً شوقؔ کی زبان نہیں۔[1]

---

[1] ۱۹۲۴ء میں یہ محض قیاس سے لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں لذت عشق کا ایک بہت قدیم مطبوعہ نسخہ (باقی حاشیہ پر)

اور فریب عشق مشکل ہی سے ان کی تسلیم کی جا سکتی ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ نو مشقی کے زمانہ کی کوئی ابتدائی کوشش ہو۔ یقین کے ساتھ جن دو مثنویوں کو ان کی تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے ان میں ایک کا نام بہار عشق ہے اور دوسری کا زہر عشق۔ اور ان دونوں میں شہرت عام زہر عشق ہی کے نصیب میں آئی دونوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ کوئی طلسم کشائی، نہ شاعر منبر پر بیٹھ کر اخلاق کا وعظ کہہ رہا ہے نہ کالج کے لکچر روم میں تحلیل نفسیاتی کر رہا ہے اسے محض اپنی ہوسناکی کی کہانی سنانی ہے اور یہی وہ خوب مزہ لے لے کر سنا رہا ہے چونکہ محض "آپ بیتی" ہی سنانی ہے۔ اس لئے "جگ بیتی" سنانے والوں کی طرح کسی دوسرے کو عاشق فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی ہے۔

بہار عشق میں افسانہ کا انجام، شادی پر ہوتا ہے پیش نظر نسخہ کانپور کے مطبع علوی علی بخش خاں کا چھپا ہوا ہے، ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء کا۔ یہ نسخہ نسبتاً صحیح ہے، حال کے مطبوعہ نسخے، علاوہ بہت زائد اغلاط مطبعی کے آخر سے ناقص بھی ہیں، شادی کا ذکر ان میں غائب ہے۔ کل نظم میں آٹھ سو سے اوپر شعر ہونگے۔ شعر خاصی تعداد میں ایسے ہیں جو بزرگوں کے سامنے کیا، بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی زبان سے ادا ہونے مشکل ہیں۔

کتاب کے شروع میں حسب دستور زمانہ بادشاہ کی مدح ہے اور سننے کے قابل ہے ارشاد ہوتا ہے۔

نوبت مدح شاہ آئی ہے	اے قلم وقت جبہ سائی ہے
کر رقم اب دعائے شاہ زماں!	کہ ہے وہ ملک ہند کا سلطان
آفتاب سپہر جاہ و حشم	شاہ واجد علی شہ عالم!

یہ "شاہ زماں" اور "سلطان ہند" اور "شہ عالم" اور "آفتاب سپہر جاہ و حشم" کے خطابات اس وقت عطا ہو رہے ہیں، جب حکومت اور بادشاہت کے سارے اختیارات تو چند مربع میل کے رقبہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور اس محدود چار دیواری کے اندر بھی مجال نہ تھی کہ صاحب عالیشان رزیڈنٹ بہادر کے حکم کے خلاف کوئی انگلی ہلا سکے! آگے اور سنئے ؎

خلق پر سایہ الٰہی ہے	مالک تاج و تخت شاہی ہے

لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانہ میں نظر سے گزرا۔ اسکے سرورق پر تصریح ہے کہ یہ مثنوی شوق کے ہمشیر زادہ ایک ادیب حکیم صاحب کی ہے

ہے بشر، پر خدا کی قدرت ہے — نیک سیرت ہے، خوبصورت ہے
سرورِ خسروانِ عالم ہے — سچ تو یہ ہے کہ جانِ عالم ہے
دل تمنائے وصل او دارد! — چہ بلا مشکل آرزو دارد!!

ان آخری شعروں میں بادشاہ کی مدح رعایا کی زبان سے ہو رہی ہے یا جہاں پناہ اپنے کسی محل کو یاد فرما رہے ہیں؟

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک روز لبِ بام ایک ماہ لقا دکھائی دیتی ہے، اس کے سراپائے حسن و جمال کا عکس اس آئینہ میں ملاحظہ ہوے

بام روشن ہے طور کی صورت — سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حسن یوسف بھی اس کے آگے ماند — چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن! — گات جس طرح قمقمے روشن
ناک میں نیم کا فقط تنکا! — شوخی و چالاکی مقتضا سن کا
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی — جسم میں وہ شباب کی پھرتی!
قد میں آثار سب قیامت کے — گوری گردن میں طوق منت کے
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں — بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگ گل سی کمر مچکتی ہوئی — چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

یہ منظر دیکھتے ہی حکیم صاحب اپنی ساری حکمت بھول بھال سو جان سے عاشق ہو جاتے ہیں اپنے گھر تک واپسی مشکل ہو جاتی ہے اور جب کسی طرح گرتے پڑتے پہنچتے ہیں تو اٹوانی کھٹوانی لے کر پڑ جاتے ہیں غش پر غش آنے لگتے ہیں۔ زندگی سے یاس ہو جاتی ہے۔ ماں باپ بھائی، بہن، دوست، احباب سب گھبرا جاتے ہیں، اور طرح طرح کا دوا علاج کر کے جب اسے بے اثر پاتے ہیں تو رونے دھونے لگتے ہیں۔ ان مرحلوں کے بعد ایک روز ایک رازدار دوست آ کر حکیم صاحب کے دل کی نبض ٹٹول ان کے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، اور اس مقدس روشن پر روانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے گھائل کرنے والی ستمگر پری پیکر کے گھر کا پتہ لگائیں گے اور کسی دم دلاسے سے اسے گھیر گھار ان سے لا ملائیں گے در یار پر پہنچ کر پہلے گھر کی مہری کو گانٹھتے ہیں۔ یہ مہری صاحبہ بنی ٹھنی ہوئی خود اس انتظار میں کھڑی ہیں کہ آپ ان کی چھب تو دیکھتے ہی چلیں۔ زبان

سے لاحول پڑھتے ہوئے لیکن نظر کو نظر سے چار کرتے ہوئے ے

....	سانولا رنگ چلبلی صورت
لال نیفہ ازار بند بڑا !	گچھا اک کنجیوں کا اس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی	آنکھ اک ایک سے ملاتی ہوئی !
آنکھ اک ایک پر لگاوٹ کی	بات اک ایک سے گھلاوٹ کی
حسن کے دن جوانی زوروں پر	رات کی باسی مہندی پوروں پر
یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری	دو منھ ہنس بول لی جہاں ٹھہری
آگے اور پیچھے یار، فوج کی فوج !	دھینگا مشتی کسی سے گالی گلوج

یہ نہ دیکھیے کہ کیا کہا، نظر اس پر رکھیے کہ کس طرح اور کیسا کہا۔

جیسی روح ویسے ہی فرشتہ۔ اگر یہ عاشق صاحب تماش بینی میں شہرۂ آفاق تھے تو ان کے دوست صاحب بھی کٹنا پے میں طاق۔ زنانی ڈیوڑھی تک رسائی پیدا کر کرا، ان نام کی بیگم صاحبہ پر کچھ ایسا افسوں پڑھا۔ اور "عاشق صادق" پر حالت نزع کے طاری ہونے کا کچھ اس طرح سماں باندھا، کہ آخر وہ ان کے بھرے میں آگئیں، یہ بیگم صاحبہ بھی خیر سے کچھ ننھی نادان نہ تھیں، کھیلی کھائی ہوئی تھیں، لیکن پھر آخر ناقص العقل ایک شریف بدمعاش کی قسما قسمی اور خدا اور رسول کے واسطوں پر یقین کر بیٹھیں، اور درگاہ حضرت عباس[1] کی حاضری کا بہانہ کر، گھر سے سوار ہو گئیں کہاروں کو پہلے ہی سے پٹی پڑھادی گئی تھی۔ سواری آکر لب مرگ "عاشق بیمار" کے دروازہ پر رکی۔ خدمت گار خبر دینے آتا ہے کہ ڈیوڑھی پر ایک سواری آئی ہے۔ یہ خدمت گار صاحب بھی آخر کس دل پھینک مخدوم کے خادم تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں "ایک ماما بھی آئی ہے ہمراہ۔ کتنی چالاک ہے خدا کی پناہ" ماما پردہ نشین نہیں بے پردہ ہے اور "حسن رہ گذرے" آپ کے اخلاق کے دار الافتاء میں "سرود خانہ ہمسایہ" ہی کی طرح معاف ہے۔ موقع ہے کہ آپ اپنی متانت اور ثقاہت کو خطرہ میں ڈالے بغیر، چپکے سے ایک نظر، اچٹتی سی، ادھر بھی ڈال لیں۔

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر ہاتھ رکھے کھڑی ہے کوٹھے پر

---

[1] لکھنؤ کے غربی حصے میں ایک مشہور شیعی زیارت گاہ۔

اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے ۔ بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے

شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر

ہنسی ٹھٹھا ضلع جگت میں طاق! چل رہی ہے زبان تڑاق پڑاق!

کھڑی اک اک کا منھ چڑھاتی ہے ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے

چوٹی لپیٹی ہے باسی ہاروں سے لڑ رہی جگت کہاروں سے

راستے والے جو گذرتے ہیں! سن کے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں

بہرحال سواری اترتی ہے۔ تخلیہ میں یکجائی ہوتی ہے شہد پن کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے، شرم و حیا کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں، اور بیحیائی و نفس پرستی کے پردے ہر طرف چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ایک طرف ہوسناکی کی تمنائیں ہیں، دوسری طرف انکار کی ادائیں ہیں، منت و سماجت کی دھیمی آوازیں تو خلوت گاہ کی دیواروں کے اندر گونج کر رہ جاتی ہیں، البتہ ڈانٹ پھٹکار کی گرما گرم صدائیں پردہ کے باہر بھی صاف سنائی دے رہی ہے ؎

بل بے فقرہ ترا معاذ اللہ میرے تو ہوش اڑ گئے واللہ

لوگ کہتے تھے ہے لبوں پر جان مکر کے صدقے جھوٹ کے قربان

کون کہتا ہے زہر کھایا ہے یہ بھی اک شعبدہ بنایا ہے

توبہ کس درجہ بے حیائی ہے واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے

کیا کہوں اور بے حیا تجھ کو پھٹے منھ لعنت خدا تجھ کو

میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس جو ترے جل میں آگئی افسوس

جھوٹا بدذات فیلیا مکّار ان گنوں پر ترے خدا کی سوار

مکر کا بانی جھوٹوں کا سرتاج سنتے تھے فیلسوف دیکھا آج

ایسے فقروں کو کوئی کیا سمجھے اور تو کیا کہوں خدا سمجھے

لیجئے اب تو آواز اور بلند ہوگئی، اور لہجہ میں غصہ کی تھرتھراہٹ اور صاف ہوگئی ؎

چربی آنکھوں پہ تیرے چھائی ہے کچھ نگوڑے کی شامت آئی ہے

کبھی آفت نہ یہ اٹھائی تھی چھائیں پھوئیں ہیں نوج آئی تھی

کیا دھما چوکڑی مچائی ہے تیری بختاوری کچھ آئی ہے

موذی، بدذات، بے حیا بے شرم — جانتا ہے کہ ہم ہیں گرما گرم!

کس قدر صاف تیرا دیدہ ہے — ایک نٹ کھٹ حرام زادہ ہے

کون سمجھے بتجھے ادھورا ہے — ارے تو سب گنوں میں پورا ہے

میں اگر بولنے پہ آؤں گی! — لاکھوں دھرے ترے اڑاؤں گی

ابھی سب کہہ کے سن کے رکھدونگی — سات پیڑھی کو پن کے رکھدونگی

اور وہ ہوتیاں ہیں البیلی — میں نہیں کچی گولیاں کھیلی

گالیاں کیسی، کوسنے دوں گی — میں بھی اک اپنے نام کی ہوں گی

رحم کرنا ہے تجھ پہ نادانی! — وہاں ماروں جہاں نہ ہو پانی

تیری بیسہ پہ بوٹیاں کاٹوں — چیل کوؤں کو بیٹھ کے باٹوں

یہ جو شعر آپ نے سنے پھر بہت صاف اور سنجیدہ ہیں باقی ایک بڑی تعداد نقل کے قابل کسی طرح بھی نہیں جلوت کو کوئی آئینہ خلوت آخر کس طرح بنا دے ظالم نے مصوری کی یہ خدا داد قابلیت کاش کسی شریفانہ نظم میں صرف کی ہوتی! شاعر جس ماحول میں تھا اس میں اخلاق کی پستی، جذبات کی فرومائگی و رکاکت، بیحیائی و عریاں نگاری کی کمی نہ تھی، حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ آخری دربار اودھ کے شعرائے باکمال اور سخن گویان شیریں مقال میں میں کون اس میدان کا مرد نہ تھا؟ با ایں ہمہ ان کاملوں کی سرداری کا تاج شوقؔ ہی کے سر پر رکھا گیا۔ اس بزم کی صدر نشینی نواب مرزا ہی کے حصہ میں آئی، لیکن اس صدارت و سرداری کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ بھی سب پر عیاں ہے آج اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اس غریب کے لیے کوئی جگہ ہے؟ اُردو کے مشاہیر شعرا کی فہرست میں کسی نمبر پر ان کا نام آتا ہے؟ اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کا یا ان کی مثنویوں کا نام تک بھی لیا ہے؟ شاعروں کا کوئی طبقہ آج تلمذ یا کسی دوسری حیثیت سے اپنا انتساب ان کی جانب پسند کرتا ہے؟ یا اس کے برعکس ان کا نام آتے ہی کچھ جھینپ سا جاتا ہے اور بے اختیار اپنی تبرّی کرنے لگتا ہے؟ نقادانِ شعر کے حلقوں میں، سخن سنجوں کی صحبتوں میں، پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں میں نواب مرزا شوق اور ان کی مثنویوں کی کہیں بھی وقعت اور پرسش ہے؟

ؔلہ یہ صورت حال ۱۹۲۷ء کی بیان ہوئی دور "ترقی پسندی" کے طلوع ہونے سے قبل اس وقت خود اس مقالہ کا لکھنا اور اسے بھری مجلس میں سنانا، ذرا جرأت ہی کا کام تھا۔

کلام کا کچھ نمونہ اوپر گذر چکا ہے بہت کچھ ابھی آنے کو ہے محاورات پر یہ عبور بیگمات کے روز مرہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحت، بیان کی یہ سلاست جذبات نگاری کی یہ قوت، کیا ہر شاعر کے نصیب میں آتی ہے، ان تمام حیثیات سے، شوقؔ کا کلام اردو کے کسی شاعر سے فروتر ہے؟ پھر آخر اس بے التفاتی کی وجہ؟ شوق کی کس مپرسی کا سبب؟ وجہ ظاہر اور سبب واضح ہے۔ مشرق، کم از کم اسلامی مشرق، اپنی جبلت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ قدر شرم وحیا کے جذبات کی کرے؟ عزت کی مسند پر جگہ شرافت کے لیے خالی کرے اور اپنا سر عصمت وعفت کی تصویروں کے آگے خم کر دے۔ بے حیائی عریاں نگاری اور تحریری شہد پن کی عزت وقعت اس کی سرشت کے مخالف ہے۔ جس طرح ہر فرد ایک مخصوص طبیعت اور خاص مزاج رکھتا ہے، ہر قوم کا بھی ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، ہر تمدن کی بھی ایک مخصوص سرشت ہوتی ہے قومی زندگی کی جو کارروائیاں اس عام مزاج وسرشت سے الگ ہوتی ہیں، وہ کبھی قوم کے قوام میں نہیں داخل ہونے پاتیں۔ قومی تمدن کا مستقل نظام انہیں اپنے میں جذب کرنے قبول کرنے اور اپنا جزو بنانے سے انکار کر دیتا ہے اور نظام تمدن کا ایک بڑا مظہر ہر قوم کا شعر وادب ہوتا ہے شوق کی کھلی ہوئی عریاں نگاری، مشرق کے ذوق سلیم کے مخالف تھی، بگڑی اور اجڑی ہوئی تہذیب اسلامی کے بھی منافی تھی، اس لئے اسلامی مشرق نے شوق کی ساری شاعرانہ خوبیوں کے باوجود ان کے لیے اپنی فہرست مشاہیر میں کوئی جگہ نہ رکھی۔ اور نام کو بالکل "گمنام" ہونے سے بچا کر رکھا بھی تو "بدنام" کر کے زندہ رکھا۔ مشرق کا صوفی بگڑے گا، بہکے گا بھی، تو بندگی میں خدائی کے دعوے کرنے لگے گا۔ یہ نہ ہو گا کہ مغرب کے ترقی یافتہ حکیم کی طرح اپنی انسانیت کو بھلا کر فخر اپنے بندر بھمنے پر کرنے لگے! بیہوش ہو جائے گا۔ بدحواس نہ ہو گا۔" بگڑنے پر بھی بات اس کی بنا کی۔ جان عالم کا ہندستان، بھانڈوں اور سازندوں کا ہندستان، لاکھ بگڑنے پر بھی اپنے سے اتنا بیگانہ نہیں ہوا تھا، اپنے کو اتنا نہیں بھولا تھا، کہ کوئلہ کا نام ہیرا رکھ دے اور پیتل کو سونا سمجھنے لگے!

غرض نواب مرزا کو اپنی پست مذاقی اور مبتذل نگاری کی سزا مشرق کی معدلت گاہ سے ملی اور بجا طور پر ملی، لیکن وہ خود بھی آخر مشرقی ہی تھا، باوجود انتہائی بے حیائی کے یہ ناممکن ہوا کہ چوری کے جرم پر سینہ زوری کا بھی اضافہ کرے۔ لارڈ بائرن اور آسکر وائلڈ[1] کی سی یہ جرأت وجسارت کہاں سے لاسکتا تھا، کہ گندہ نظم اور گندہ تر

---

[1] اور اب تو وہ دونوں غریب بھی جیمس جوائس اور جیسے بیسوں فحش نگار مردوں اور خاتونوں کے آگے گرد ہو کر رہ گئے ہیں۔

نثر کو شعر و ادب کا بہترین نمونہ کہہ کر پیش کرتا! یہ بیباکی اور ڈھٹائی نیویارک کے ایوننگ گریفک لندن کے نیوز آف دی ورلڈ اور لندن لائف اور اسی مرتبہ کے اور اونچے اونچے فرنگی اخباروں رسالوں ہی کے حصہ میں آئی ہے، الفاظ و عبارت ہی نہیں، فوٹو اور تصویریں تک زیادہ سے زیادہ عریاں چھاپتے رہیں اور نام "آرٹ" کی ترقی کا یا صحت کے رکھ رکھاؤ کا لے دیا کریں[۱]! غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا عمل میں کیسی ہی شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں لیکن عقیدے میں فحش و بے حیائی کا جواز داخل نہ تھا۔ اپنے شہدپن کی کہانی سنانے کو تو سناڈالی لیکن معاً یہ خیال بھی سامنے آگیا کہ خود تو خیر رسوا ہو چکے ایسا نہ ہو کہ داستان فسق دوسروں کے لیے سامان تباہ کاری بن جائے۔ آخر مشرقی تھے، مسلمان تھے، بات کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آگیا۔ اٹھے تھے شیطان پورہ کی دلالی کرنے، رخ خود بخود خانقاہ کی جانب پھر گیا۔ اور ابتدا میں جس کی حمد میں زبان کھلی تھی

کس زباں سے کروں صفات خدا — کیا بشر سمجھے کنہہ ذات خدا

جب نبی یوں کہے کہ اے مالک — ما عرفناک حق معرفتک

انتہا میں بھی اسی کا خوف غالب آگیا، اور اسی کی خشیت نے قلب کو لرزا دیا زبان اب چل رہی ہے اور مضمون عشق ہی ہے، لیکن اب وہ مرادف فسق نہیں۔ ذرا کان لگا کر تو سنیے یہ ایوان حسن و عشق میں داستان فسق بیان ہو رہی ہے، یا کسی حلقۂ ذکر میں تسبیح و تہلیل ہو رہی ہے؟ ؎

اب سنیں صاحبان عقل و شعور — ہے یہ دنیا تمام مکر اور زور!

شہد ظاہر میں زہر اندر ہے — جس قدر اس سے بھاگے بہتر ہے

صاحب عقل کو نہیں ہے زیب — کہ اٹھائے جہاں میں رہ کے فریب

سب یہ دنیا سرائے فانی ہے — عشق معبود جاودانی ہے

ہائیں! یہ کیا سے کیا ہوگا! ابھی تو شرافت اور متانت کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے تھی، اور اب ہے کہ آنکھیں بچھا دینے کو تیار! کہاں ابھی گلفام و سبز پری کا سوانگ جما ہوا تھا، اور کہاں رومی و غزالی کا دفتر موعظت کھل گیا ؎

کہتے ہیں صوفیان صافی دل — کہ ہے عشق خدا بہت مشکل

---

[۱] ملاحظہ ہوں انگلستان کے رسالہ (HEALTH & EFFICIENCY) کے چند نمبر۔

عشق اللہ کا جو مائل ہو،	ترک دنیا کرے تو حاصل ہو
ب یہ لازم ہے جو کہ ہے انسان	ترک دنیا کرے بہر عنوان
کوئی الفت نہ لے وفا سے کرے	عشق کرنا ہے تو خدا سے کرے
چار دن کی یہ زندگانی ہے	جو ہے اس کے سوا وہ فانی ہے
ہے وہ مستجمع جمیع صفات	لائق سجدہ ہے اسی کی ذات
وہی اوّل میں ہے وہی آخر	وہی باطن میں ہے وہی ظاہر
کون سی جا ہے جس جگہ وہ نہیں	چاہیئے ہے نگاہ وحدت بیں

تلقین زہد و موعظہ معرفت سے طبیعت اُکتا چلی ہو تو بس تھوڑے سے صبر کی اور ضرورت ہے چند ہی شعر باقی رہ گئے ہیں ؎

لکھتے ہیں صوفیان با توقیر	عشق اللہ ہے عجب اکسیر
جس کو اس در تلک رسائی ہے	دین و دنیا کی بادشاہی ہے
مثل سیماب دل کی ہے تاثیر	خاک ہو جائے تب بنے اکسیر
دنیا کہتے ہیں جس کو پردہ ہے	باقی اللہ کے سوا کیا ہے
منکشف اس کی کیا حقیقت ہو	وہی جانے جسے بصیرت ہو
پردے اٹھ جائیں جب جدائی کے	حال اس دم کھلیں خدائی کے

یہ کس کا کلام ہے؟ کسی صوفیٔ خرقہ پوش کا؟ یا اسی حیا دشمن کا جو ابھی ابھی اپنی سیہ کاری کی داستان مزے لے لے کے سنا رہا تھا؟

اس بدنام مشرق کے مقابلہ میں مغرب کے نیک ناموں کے پاس کیا ہے! یہ ننگ مشرق تھا، جو فخر مغرب ہیں سوال ان کی بابت ہے۔ یہ مشرقی تخیل کا اسفل سافلین تھا۔ لیکن جو مغربی تخیل کا اعلیٰ علیین ہے اس کے صحن چمن میں گلگشت کے بعد، پند و موعظت، سلوک و معرفت عبرت و اخلاق کے کتنے گلدستے تیار ہو سکتے ہیں! ـــــ ذکر مستثنیات کا نہیں، عمومی اور اکثری حالات کا ہے۔

(۲)

نواب مرزا کا شاہکار بہار عشق نہیں، زہر عشق ہے ان کے نام کو بری یا بھلی جو کچھ بھی شہرت حاصل

ہے اسی زہر عشق کے طفیل میں ہے۔ یہ مثنوی بہار عشق سے چھوٹی ہے۔ کوئی پانچ سو شعر ہوں گے، بحر وہی، زبان وہی، طرز بیاں وہی، لیکن درد و اثر کے اعتبار سے اس سے بڑھ چڑھ کر، بہار عشق کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوا تھا۔ زہر عشق کا انجام ہیروئن کی خودکشی اور عاشق کے اقدام خودکشی پر ہوتا ہے بہ حیثیت مجموعی یہ نظم بہار عشق کے مقابلہ میں بہت مہذب اور سنجیدہ ہے۔ عریانی اگر اس میں ہے تو تو بس اتنی جتنی ہر عاشقانہ افسانہ میں ہوتی ہے۔ ہیروئن اس کی بھی کوئی عصمت مآب نہیں، لیکن دوسری طرف کوئی "لکھا بلیسوا" بھی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے کی ایک الھڑ لڑکی، نوعمری کی نادانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔ تاہم غیرت و عزت سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھی ہے۔

لکھنؤ میں شروع شروع تھیٹر کا رواج ہوا تو کسی کمپنی نے اس تماشہ کو اسٹیج پر بھی دکھایا تھا۔ پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ تماشہ میں گنہگار کنواری کے جنازہ کا اٹھنا اور اس کے پیچھے غم زدہ والدین کا ماتم کرتے ہوئے چلنا اور پچھاڑیں کھا کر گرنا، جب دکھایا گیا تو تماشا گاہ ایک بزم عزا بن گئی لکھنؤ کی نزاکت قیامت خیز واقعیت کی نقل کا تحمل نہ کر سکی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کا تار بندھ گیا۔ بعضوں کو غش آ گئے اور ایک آدھ نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشہ کا دکھانا قانوناً ممنوع ہو گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصہ تک بند رہی، اب چند سال ہوئے لکھنؤ کے مطبع مجتبائی نے پھر شائع کیا ہے۔ میرے پیش نظر اس مطبوعہ نسخہ کے علاوہ ایک بدخط قلمی نسخہ بھی ہے، اندازہ سے کوئی پچاس ساٹھ سال ادھر کا لکھا ہوا۔

کتاب کے سرنامہ پر حمد باری و نعت رسول کی جھریں ثبت ہیں ؎

لکھ قلم پہلے حمد رب ودود — کہ ہر ایک جا پہ ہے وہی موجود

ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

ہمسر اس کا نہیں، ندیم نہیں — سب ہیں حادث، کوئی قدیم نہیں

مدح احمد زباں پر کیونکر آئے — بحر کوزہ میں کس طرح سے سمائے

ذات احمد کو کوئی کیا جانے — یا علیؓ جانے یا خدا جانے

آگے چل کر بجائے جہاں پناہ کی مدح کے ۱۰، ۱۲ اشعار عشق کی تعریف و تعارف میں ہیں۔ ان میں سے بعض شعر اپنی صفائی و روانی کی بناء پر عام زبانوں پر چڑھ گئے ہیں ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی | کر دیئے اس نے گھر کے گھر خالی
پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے | ڈالتا ہے جگر میں یہ چھالے
اس سے امید رکھنا ہے بیجا | بھائی مجنوں سے کیا سلوک کیا
آتش ہجر سے جلاتا ہے | آگ پانی میں یہ لگاتا ہے
مار ڈالا تماشں بینوں کو! | زہر کھلوا دیا حسینوں کو

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ :-

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر | وہیں رہتا تھا ایک سوداگر

اس کے ایک نو عمر حسین لڑکی تھی - ماں باپ کی آنکھ کا تارا، لکھی پڑھی نستعلیق ایک روز کوٹھے پر آئی، نواب مرزا سے آنکھیں چار ہو گئیں - یہ حضرت تو اپنا دل نذر کرنے کے لیے ہر وقت ہتھیلی پر لیے پھرتے ہی تھے - کھٹ سے عاشق ہو گئے اور اپنے ماں باپ کے سامنے خوب خوب فیل لائے اب کی عشق ایک طرفہ نہ تھا ! ادھر بھی اثر ہو چکا تھا - ایک روز ماما نامۂ شوق چپکے سے لاکر شوق کے ہاتھ میں دے گئی - خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور خوشی سے پرنم آنکھوں کے ساتھ کھول کر پڑھا ؎

ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام | غم فرقت سے دل ہے بے آرام
شکل دکھلا دے کبریا کے لیے | بام پر آ ذرا خدا کے لیے

دل کی چوٹ بری ہوتی ہے لڑکی قسمت کی ماری عقل و ہوش سے اندھی ہو چکی ہے پھر بھی شریف زادی ہے - اس لیے قلم اس سے زیادہ بے حیائی پر نہیں اٹھ سکتا فوراً اپنی خودداری کو یوں سنبھال ہے ؎

سارے الفت نے کھوئے اوسان | ورنہ یہ لکھتی میں خدا کی شان!
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے | جس کو چاہے خدا ذلیل کرے
اس محبت پہ ہو خدا کی مار | جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار!

عاشق صاحب یہ پڑھ کر بھلا جامہ میں کہاں سما سکتے تھے - ایک جواب بحر طویل میں دھر گھسیٹا - جا و بیجا - مناسب و نامناسب سب ہی کچھ زبان قلم نے اگل ڈالا - ادھر سوداگر زادی بھی بڑی برق دم نکلیں - انہیں کے جوڑ کی، کھوٹے کھرے مال کی خوب پرکھ رکھتی تھیں - پیام "شوق" پڑھ کر خوب لطف لیا اور ہنس کے بولی کہ واہ وا کیا خوب جواب لکھنے بیٹھی تو بسم اللہ یوں کی "کچھ قضا تو نہیں ہے دامنگیر" اور پھر خوب خبر لی ؎

ذکر ان باتوں کا یہاں کیا تھا | چھیڑنے کو یہ تیرے لکھا تھا
یہ تو لکھے تھے سب ہنسی کے کلام | ورنہ ان باتوں سے یہاں کیا کام
مجھ کو ایسی تھی تیری کیا خوب | بام پر تو بلا سے آ، کہ نہ آ!
تم پہ مرتی، میں کیا قیامت تھی | کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
میری جانب سے یہ گماں کیا خوب | جھوٹ جم جم سے ہے بہت مرغوب
کالا دانہ ذرا اتروالو!!! | رائی لون اس کسبجھ پہ کر ڈالو!
دیکھ تحریر فیل لائے آپ | خوب جلدی مزے میں آئے آپ

چند روز اسی طرح مزہ مزہ کی نوک جھونک جاری رہی اس کے بعد ایک جمعرات کو وہی درگاہ کی زیارت کا چلتا ہوا فقرہ کام آیا۔ شامت کی ماری والدین کے گھر سے چلی آئی اور نواب مرزا کی ڈیوڑھی پر آکر رکی، آگے جو کچھ ہونا تھا ہوا، شرافت لٹی، عزت ڈوبی۔ آمد و رفت کا سلسلہ اس کے بعد قائم ہو گیا، لیکن یہ چوری چھپے کی ملاقات کب تک راز رہ سکتی تھی۔ گھر والوں کو ٹوہ لگ گئی اور والدین نے اپنی رسوائی دفع کرنے کو یہ تجویز کی کہ لڑکی کو لکھنؤ سے دور شہر بنارس میں کسی عزیز کے پاس پہونچا دیا جائے۔ ادھر لڑکی کو بھی سن گن مل گئی۔ دل نے کہا کہ "ہائے کٹ جانے کی بات ہے ماں باپ کو بھی آخر اس روسیاہی کی خبر ہو گئی۔ اب ان کا سامنا کیسے کیا جائے گا۔ اس سے زندگی سے تو موت بھلی" نوعمری کا زمانہ، دل دنیا کی تلخیوں سے ناآشنا، حوصلے زندہ اور ولولے تازہ سامنے دنیا اور اس کی بہاریں، ابھی لڑکی ہی ہے کوئی پیر زال نہیں، کچھ بیمار دکھی بھی نہیں۔ بس بات اتنی ہے کہ رگوں میں مشرقی شرافت کا خون گردش کر رہا ہے۔ دماغ میں خاندانی روایات کی یاد محفوظ ہے، دل میں غیرت و حمیت کی آن باقی ہے۔ جان جیسی عزیز چیز سے ہاتھ دھونا گوارا، لیکن اس کی برداشت نہیں کہ سب عزیزوں قریبوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو کر زندگی بسر کی جائے۔ بس یہ دل میں ٹھان آخری ملاقات کے لیے عاشق کے پاس آتی ہے۔ جان دینا تو عاشقوں کا کام سمجھا جاتا ہے یہاں جان دینے پر وہ آمادہ ہے جو خود اس قابل ہے کہ دوسرے اس کے اوپر اپنی جانیں فدا کرتے ہیں! ؎

تھی نہ فرصت سے جو اشکباری سے | اتری روتی ہوئی سواری سے

شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں عاشق و معشوق کی جدائیوں اور وداعی ملاقاتوں کے منظر بارہا دکھائے ہیں۔ خودکشی، اقدام خودکشی اور مصنوعی خودکشی کے منظروں سے بھی اس کے صفحات خالی نہیں اور رومیو جولیٹ کے بعض سماں تو

بہت ہی مؤثر اور درد انگیز سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہے اس فرنگستان کے مشہور و ممتاز ڈرامہ نگار کے یہاں کوئی منظر جو اثر و عبرت انگیزی میں مشرق کے اس بدنام شاعر کے کھینچے ہوئے نقشہ کا مقابلہ کرسکے۔؟

حسرت نصیب آتی ہے اور کہتی ہے ؎

اقربا ہو گئے مرے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں — جبر کیوں کر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

لیجیے کہاں ابھی غفلت کے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور کہاں عبرت کا درس شروع ہو گیا دنیا اور اس کی ساری دلفریبیاں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہی ہیں۔ اب سابقہ پڑنے کو ہے بندی کا اپنے مالک سے، کمزور کا زور والے سے، بے بس کا قدرت والے سے۔ غفلتیں دور ہو گئیں، مدہوشیاں کافور ہو چلیں۔ شمع جھلملانے لگی، چہرہ پر زردی چھانے لگی۔ اب نہ جوانی میں وہ لذت و سرور، نہ حسن و رعنائی میں پندار و غرور، اب ندامتیں ہیں اور اشکباریاں، عبرتیں ہیں اور آہ و زاریاں — موت کی آمد شاید ہر غافل کو اسی طرح جھنجھوڑ کر ہوشیار کر دیتی ہے ؎

جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے! — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
بات کل کی ہے نوجوان تھے جو — صاحب نوبت و نشان تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی! — نام کو بھی نہیں نشاں باقی!
غیرت حور مہ جبیں نہ رہے — ہے مکان گر تو وہ مکیں نہ رہے
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسین کھا گئے ان کو آسمان و زمین!
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے یہی دنیا کا رخ مانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ نہ کسی جا ہے نل و دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان
موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے

موت کے تصور سے اچھے اچھے دلیر اور رستم وقت لرز اٹھتے ہیں۔ یہ تو بیچاری ایک پردہ نشین لڑکی ہی تھی، کمسن و نادان ــــ یہ وصیتیں کرتے وقت اس کے جسم نازک کے اندر قلب نازک کی کیا حالت ہوگی؟ ــــ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ دل کا ہول بڑھتا جاتا ہے، چہرہ پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔ کلیجہ میں پنکھے لگے ہوئے ہیں زبان لڑکھڑا رہی ہے آواز تھرتھرا رہی ہے الفاظ پورے پورے ادا نہیں ہو پاتے پھر بھی تقدیر پر صبر کرکے طبیعت کو سنبھالتی ہے آنسو پونچھتی جاتی ہے اور کہتی ہے ؎

ہم اگر جان دیدیں کھا کے سم تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم!
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا یا مری قبر پر چلے آنا!!
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی! ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی!
رو کے رہنا بہت طبیعت کو یاد رکھنا مری وصیّت کو
میرے مرنے کی جب خبر پانا یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہولیں سب اقربا جس دن رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم! ساتھ تابوت کے نہ رونا تم!
ہو گئے تم اگرچہ سودائی! دور پہونچے گی میری رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر

گنہگار سوداگر زادی، اپنے گناہ کا احساس رکھتی تھی خلق میں اپنی رسوائی سے شرماتی تھی، کوئی ماڈرن آرٹسٹ، کوئی فرنگی "فلم اسٹار" نہ تھی کہ فخر اپنی بے حیائی پر اور ناز اپنی سیاہ کاری پر کرتی، گنہگار جتنا قسمت میں لکھا کر آئی تھی سو بن چکی لیکن گناہ کی اشاعت کی روادار کسی حال میں نہ تھی، دامن عصمت داغدار ہونا تھا ہو چکا، پھر بھی عزت کے وزن سے واقف تھی، شرافت کی قدر و قیمت پہچانتی تھی۔

پردہ پوشی کے لیے کیسی کیسی منت و سماجت کرتی ہے ؎

سامنا ہو ھزار آفت کا ——— پاس رکھنا ہماری عزت کا
جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں ——— آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیے گا ——— بند اپنی زبان رکھیے گا!!
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا! ——— نام منھ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا ——— ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے ——— سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے ——— تاکسی شخص پر نہ حال کھلے
ذکر سن کر نہ میرا رو دینا ——— یوں نہ عزت مری ڈبو دینا

کہتے ہیں مرد کی خاطر عورت اپنے کو مٹا دیتی ہے فنا کر ڈالتی ہے کم سے کم ہندستان کی عورت کا تو بیشک یہی حال ہے۔ خود تو جان دے رہی ہے مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ مرد کا رویاں میلا ہو تسلی و تشفی کا دھیان آخری سانس تک قائم ہے ؎

رنج کرنا نہ میرا میں مترباں ——— سن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں
دے نہ اس کو خدا کبھی کوئی دلو ——— ہوتا نازک کمال ہے دل مرد!
دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو ——— جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو
رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں کو ——— تانہ ہو جائے دشمنوں کو جنون
کبھی آجائے گر ہمارا دھیان ——— جاننا ہم پہ ہو گئی مترباں
دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال ——— خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو ——— آج دل کھول کر گلے مل لو!

خوب سا آج دیکھ بھال لو تم! دل کی سب حسرتیں نکال لو تم!
دل میں باقی رہے نہ کچھ ارمان خوب مل لو گلے سے میں قربان
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں
دل کو اپنے کرو ملول نہیں! رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں

اپنی آنکھوں سے ندی نالے جاری کر رکھے ہیں۔ لیکن بہر کے چہرہ کی اداسی دیکھنا بھی گوارا نہیں ؎

رو نہ اس طرح سے زار و قطار دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
کر نہ رو رو کے اپنا حال زبوں ارے ظالم ابھی تو جیتی ہوں
اشک ہوتے ہیں ناگوار ترے تو نہ رد ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں یوں کہیں مردوے بھی روتے ہیں
تو سلامت جہاں میں رہ میری جان نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان!
واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا چاند سی بنو گھر بیاہ کے لا
ہے یہی لطف زندگانی کا! دیکھ سکھ اپنی نوجوانی کا!

حسن بے ثبات کی نیرنگیاں ختم ہو رہی ہیں، عشق فانی کی ساری لذتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں۔ اور چل چلاؤ کے وقت نفس پر ہجوم کر رہی ہیں ؎

کل گلے سے کسے لگاؤ گے یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل اب تو جاتے ہیں اس جہاں سے کل
یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں پان کل کے لیے لگاتے جائیں
دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے
ختم ہوتی ہے زندگانی آج! خاک میں ملتی ہے جوانی آج
سمجھو اس کو شب برات کی رات ہم ہیں مہماں تمہارے رات کی رات
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا!! نہ ملا کچھ مزہ جوانی کا!!!
باغ عالم سے نامراد چلے دل میں لے کر تمہاری یاد چلے
پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی | بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی
پھر ہم اٹھنے لگیں بٹھا لو تم ! | پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم
پھر لبوں کو چبا کے بات کرو | پھر ذرا مسکرا کے بات کرو

یہ آخری راز و نیاز کتنی دیر ؟ یہ زندگی کی آخری اختلاط کی گھڑی، جھلملاتی ہوئی چراغ کی آخری بھڑک کب تک ؟ مادی لذتیں ختم اور جسم کی مزیداریاں ایک ایک کرکے تمام ہو رہی ہیں، ناسوتی صحبتوں کا تار تار بکھرنے کو ہے، نفس کی ماری ہوئی لیکن غیرت دار، گناہ گار مگر گناہ کی اقراری، عزت لٹائے ہوئے لیکن بہرحال پاس عزت رکھنے والی، پردہ نشین کی آنکھوں سے پردے ہٹ رہے ہیں۔ "آج ختم ہو رہا ہے" "کل" شروع ہو رہا ہے، حسن و جوانی نزاکت و رعنائی چہرہ کا رنگ و روغن سب کی نمود مٹی ہی سے تھی اور سب مٹی ہی میں ملی جا رہی ہے رفاقت پر کوئی آمادہ نہیں حاضری اس دربار میں درپیش ہے جہاں ایک ایک بدنظری کا پورا پورا حساب درج ہے سامنا اس مالک کا کرنا ہے جس نے خلاف قانون آنکھ اٹھانے پر بھی باز پرس رکھی ہیں روبکاری حاکم کی جس عدالت میں ہے۔ اس سے بڑے بڑے متقی اور صالحین لرزتے رہتے ہیں۔ یہ نازک جسم اور نازک تر قلب رکھنے والی، گناہ کے بوجھ سے لدی ہوئی، اپنی جان اپنے ہاتھ سے لینے والی لڑکی اس نازک گھڑی میں کس کا سہارا پکڑے اور کس کی نگاہ کرم کی آس لگائے، اسے ہر مشکل کو آسان کرنے والے اس دکھیاری کی مشکل کو تو ہی آسان کر، تیری ہی ستاری کا دامن اس بے چادر کی پردہ پوشی کرسکتا ہے تیرے ہی بحر مغفرت کا ایک قطرہ اس بدنصیب کے نامۂ عمل کی سیاہیاں دھو ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ تیری یاد سے غفلت بے شبہ تھی، پر تیری حکومت سے سرکشی نہ تھی۔ نفس کی لغزشیں یقیناً تھیں، پر تیرے احکام سے جان کر بغاوت نہ تھی۔ ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ڈھارس بندھاتی ہے، فاتحہ، قرآن خوانی اور دعائے خیر کی قدر "آج" مانگ چوٹی کے جھمیلوں نے نہ کرنے دی۔ "کل" کے لیے سب سے قیمتی چیزیں یہی نظر آرہی ہیں ؎

اب تم اتنی دعا کرو مری جان | کل کی مشکل خدا کرے آسان
اگر آجائے کچھ طبیعت پر | پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا ! | پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
دیکھیے کس طرح پڑے گی کل | سخت ہوتی ہے منزل اول
میرے مرقد پہ روز آنا تم ! | فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم

گو میں دنیا سے روسیاہ چلی ‌ ‌ ‌ ‌ لیکن اپنی سی نباہ چلی!

جی کو تم پر فدا کیا میں نے ‌ ‌ ‌ ‌ حق وفا کا ادا کیا میں نے

کانپتے ہوئے جسم، زار و قطار آنکھوں، لرزتی ہوئی زبان کے ساتھ دل کی بیتی بیان ہو رہی تھی کہ رات تمام ہو جاتی ہے۔ اور کمسن کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح آسمان کے تارے بھی ایک ایک کر کے ڈوبنے لگتے ہیں، صبح کا گھڑیال بجتا ہے اور اس کے ساتھ ناسوتی کرشموں کے جنجال میں پھنسے ہوئے جوڑے کی آخری ملاقات بھی اس عالم آب و گل میں ختم ہو جاتی ہے کلمہ کی آواز سنی سنائی کان میں پڑی ہوئی تھی، وہی اس آڑے وقت پر کام آتی ہے ؎

ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد ‌ ‌ ‌ ‌ دست و پا تھرا کے ہو گئے سرد

بید کی طرح جسم تھرایا ‌ ‌ ‌ ‌ سر سے لے پاؤں تک عرق آیا

باتیں جو کرتی تھی سو بھول گئی ‌ ‌ ‌ ‌ دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی

بولی گھبرا کے رہیو اس کے گواہ ‌ ‌ ‌ ‌ اور کہا لا الٰہ الا اللہ

اب فقط ہے یہ خوں بہا تیرا ‌ ‌ ‌ ‌ بخش دیجیو کہا سنا میرا!

سر سے لے کر بلائیں تا بقدم ‌ ‌ ‌ ‌ بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم

آگ لگ جائے وہ گھڑی کمبخت ‌ ‌ ‌ ‌ بام پر آئی تھی میں کون سے وقت

یہ کہا اور سوار ہو گئی۔ چند گھنٹوں کے بعد محلہ میں شور و شین برپا ہوا، جا کر دیکھا تو سوداگر کے گھر کہرام مچا ہوا ہے گنہگار شریف زادی نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ جوانی کی نیند مشہور ہے لیکن یہ زہر کھا کر وہ نیند سوئی تھی، جس میں قیامت سے قبل کوئی بیداری نہیں، یہ ہے "آغاز کی بدمستیوں کا انجام" پھولوں کی سیج پر رات بسر کرنے والی کو آخری چادر وہی کفن کی نصیب ہوئی۔ اتنی جلد! اس کمسنی میں! الیٰ آنا فاناً!

جوان جہان اولاد، نازوں کی پالی اکلوتی اولاد، کون انسانی سینہ ہے جو اس داغ کو برداشت کر سکے؟ لڑکی ماں کی آنکھ کا تارا، باپ کے کلیجہ کا ٹکڑا، اندھیرے گھر کا چراغ، سات بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی۔ گھر بھر میں کیا معنی، محلہ بھر میں حشر برپا ہو گیا۔ بوڑھے والدین کی یہ حالت کہ کھڑے پچھاڑیں کھا کر گرتے تھے اور بین کچھ اس درد کے ساتھ کر رہے تھے کہ اپنے تو خیر اپنے تھے، راہ چلتے بیگانوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جنھوں نے گودوں میں کھلا کر پالا تھا، نہالچوں پر تھپک

کر سلا دیا تھا، ساتھ کی کھیلی ہوئی سہیلیاں اور ہمجولیاں کوئی پردہ کے اندر، کوئی پردہ کے باہر دوپٹہ کا ہوش نہ چادر کی خبر، منھ پیٹنے بال نوچنے میں مصروف غسل وکفن کے بعد جب جنازہ مرتب ہو کر چلا ہے تو اس سج دھج کے ساتھ کہ بن بیاہی نامراد کے تابوت پر دھو کا بیاہی ہوئی دلہن کے ڈولے کا! بے شک دلہن ہی تھی، آج رخصتی اس دیس کو ہو رہی تھی جہاں سے پھر کوئی میکہ واپس نہیں آتا ؎

شامیانہ نیا زری کا ہے | نیچے تابوت اس پری کا ہے
سہرا اس پر بندھا ہے اک زرتار | جیسے گلشن کی آخری ہو بہار
عود سوز اس کے آگے روشن تھے | مر گئی پھر بھی لاکھ جوبن تھے
بھیڑ تابوت کے تھی ایسی سات | جیسے آئے کسی دلہن کی برات

خیر، اور تو جس پر جو بیت رہی تھی، تھی ہی اس ماتا کی ماری کا کیا حال تھا، جس کی ہری بھری گود ابھی خالی کرائی گئی تھی، عمر بھر کی کمائی دم کے دم میں واپس لے لی گئی تھی، کلیجہ ابھی ابھی تیروں سے چھد چکا تھا، کس انسانی قلم میں قدرت ہے کہ اس کے داغ دل کا نقشہ صفحہ کاغذ پر کھینچ سکے، آہ! کہ جس کے دل میں بیٹی کی مانگ بھرنے کا ارمان ڈالا گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس لاڈلی کو کفن پہنوایا جا رہا ہے، آہ کہ جو آنکھیں بیٹی کا سہاگ دیکھنے کے انتظار میں نور حاصل کر رہی تھیں، انھیں کو اسے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن ہوتے دکھا کر بے نور کیا جا رہا ہے۔

نواب مرزا تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت کہ تو نے کوکھ اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر بھی کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منھ سے یہ بول نکل رہے ہیں۔ یا دل وجگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں ؎

تیری میت پہ ہو گئی میں نثار | کم سخن ہائے میری غیرت دار
دل پہ جو گذری کچھ بیان نہ کی | کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو | کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں | بٹیا اماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا | گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے | جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دیدے کوئی تو کھا جاؤں | یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں

داغ تیرا جگر جلاتا ہے | چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں | کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں
تیری صورت کے ہو گئی قربان | چلیں دنیا سے کیسی پر ارمان!
ہوئیں کس بات پر خفا بولو | اماں واری ذرا جواب تو دو
بولتی تم نہیں پکارے سے | اب جیوں گی میں کس سہارے سے
کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا | آج گھر میرا بے چراغ کیا
نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان | ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان
ایسی اماں سے ہو گئیں بیزار | لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار
عمر کٹنی تھی ایسے صدمہ میں | ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا شاید کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے۔ لیکن الٰہی غافلوں اور سرمستوں کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رُلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے، اپنی ہی رحمت بے نہایت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم بے حساب کے حساب سے!

الفاظ کا جادو[1]

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعث توہین، لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں، حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے، ہندستانی ہے، دیسی ہے اور "ہوٹل" مغربی ہے، انگریزی ہے، ولائتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ "سرا" کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منھ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا بڑا ربط و ضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سرا کے "بھٹیارے" اور ہوٹل کے "منیجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولائتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسہ میں اگر آپ "مدرس" ہیں تو بات کچھ معمولی ہی ہے، لیکن کسی "کالج" میں آپ "لکچرار" یا "پروفیسر" ہیں تو معزز ہیں صاحب وجاہت ہیں حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے "مدرس" اور "پروفیسر" ایک ہی چیز ہیں۔

ندوہ کے "دارالاقامہ" میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا لیکن اسی "دارالاقامہ" کا نام جب آپ "شبلی ہوسٹل" سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ فخر و خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ "مدرسہ" میں اگر آپ پڑھتے یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے وقعت ہیں لیکن اگر آپ کا تعلق کسی "کالج" سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ، طبیہ اسکول" اور مدرسہ تکمیل الطب اور "مدرسہ" منبع الطب، اب تکمیل الطب کالج اور "منبع الطب" "کالج" ہیں۔ مدرسہ وہاجیہ طبیہ کا زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام طبیہ وہاجیہ" کالج "ہے، طبی درس گاہوں کو چھوڑیئے، خود دینی درس گاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر مدرسہ "چشمۂ رحمت کا تذکرہ تھا۔ اب وہ چشمۂ رحمت کالج ہے اور وہاں کے صدر مدرس "پرنسپل" صاحب ہیں مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کے سب سے بڑے استاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کے تو دیکھیے آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرسی کا نہیں "پرنسپلی" کا ہے۔

---

[1] سچ جلد ۷، نمبر ۲۴، مورخہ ۲۶ جون ۱۹۳۱ء

کوئی آپ سے کہے کہ یہ کیا آپ گلی میں کھڑے ہو کر "گلی ڈنڈا" کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما سے جائیں گے، لیکن جب آپ "کرکٹ" یا "فٹ بال" یا ہاکی کا میچ کھلے میدان میں دیکھ رہے ہوں گے تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے بلکہ عجب نہیں کہ گراں قدر ٹکٹ خریدنے کے بعد دوسروں کی طرف اکڑ اکڑ کر دیکھیں مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لیے گئے تو اپنے کو کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے۔ لیکن جب شہر میں باکسنگ کا مقابلہ ہو گا یا کوئی HEAVY WEIGHT CHAMPION آجائیں گے تو ان کا تماشہ دیکھنا تہذیب و روشن خیالی میں داخل۔ کہیں چوری چھپے "رہس" یا "نوٹنکی" دیکھنے کھڑے ہو جایئے تو خود آپ کی ثقافت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے کے لگے۔ لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجیے کہ "ڈراما" جیسے فن شریف کی شرافت و عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ کسی ڈھاڑی سے، اگر آپ سے شناسائی ہو گئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہم عصروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ ہی کر کرتے ہیں۔ لیکن "چارلی چیپلن" اور "میری پکفرڈ" کے کمالات اور "آرٹ" کی جتنی داد، جی چاہے دیجیے، بھری محفلوں میں، بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی جائے گی! "نٹوں" کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے اور خدانخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں، تو نہ آپ اُن سے ملنے میں شرماتے ہیں۔ نہ تعلقات بڑھانے میں۔

جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے۔ اپنی جان اور اس کی جان ایک کر دیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں یہی ذلت ہمارے لیے عین عزت بن جاتی ہے اور بڑے بڑے رئیس اور معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے۔ نخاس میں کسی کباڑیئے کی دوکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لیے باعث ننگ، لیکن مال روڈ پر "ہیک ایلن" کی کوٹھی میں گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ کوئی شرم، اس لیے کہ "ہیک ایلن" صاحب کوئی کباڑیے تھوڑا ہی ہیں "آکشنر" اور "نیلامیے" ہیں۔ چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خریدیئے تو نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ویلریو کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر کھڑا کر کے کیک و پیسٹری کی خریداری بہ نفس نفیس، بلا جھجک فرمایئے، اس لیے کہ "ویلریو" حلوائی نہیں، "کنفکشنر" ہے، نظیر آباد کے کسی چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے

منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی دوکان پر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر "ریسٹران" پڑ جائے تو وہی عار فخر میں تبدیل ہو جائے۔ "نائی" بیچارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں۔ لیکن وہی جب اپنے کو ہیئر ڈریسر HAIR DRESSER کہلانے لگے اور اپنی چوراہے کی دوکان پر "ہیر کٹنگ سیلون" کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لیے خوشگوار و پسندیدہ بن جائے۔ عدالت کا پیادہ جب تک "چپراسی" یا "مذکوری" ہے حقیر و ذلیل ہے لیکن وہی پیادہ اگر "بیلف" کہہ کر پکارا جائے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ "بیلف صاحب" آنے لگے کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منھ لگائیں، لیکن وہی رذیل اگر کسی ٹینری کا مالک کہلانے لگے تو معاً اس کی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے، اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل اعزاز، بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو آپ کی نظر میں محض "بنیا" ہے لیکن وہی بنیا اگر وہیں کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے تو دیکھیے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے کسی رئیس کا "مصاحب" آپ کی نظر میں۔ اخلاقی حیثیت سے بے عملی، خوشامد چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن صاحب کے "پرائیوٹ سکریٹری" اور "اے، ڈی، سی" کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں کارکردگی و مستعدی، رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! پنچایت کا نام آیا اور آپ کے ذہن نے نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا، لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور کارپوریشن کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن ان فرنگی پنچائتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا۔ کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے تو غبی ہے۔ کودن ہے، کندہ ناتراش ہے محض "ملا" ہے۔ لیکن اگر کسی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے نظائر ازبر ہیں۔ تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔

فسانہ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام آج محال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے لیکن لندن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات رومانی ناولوں کے نام سے جاسوسی افسانوں کے نام سے "سنسنی خیز" خبروں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ہفتہ، اور ہر روز اور ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا علم و روشن خیالی کی دلیل اور مہذب

و تعلیم یافتہ ہونے کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ "لوہاری" کا پیشہ اختیار کیجیے، تو آپ اسے گالی سے کچھ ہی کم سمجھیں لیکن "میکینکل انجنیری" کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ "جراح" کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کس درجہ پست ہے، لیکن "سرجن" کا نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے محلہ اور پڑوس کے "جلاہے" آپ کے خیال میں پست و ادنیٰ، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکاشائر کے ہیں، تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ "بزاز" گز ہاتھ میں لیے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معزز ہیں، بلند ہیں۔ "بزرگوں" کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں کالج کے احاطے میں "فاؤنڈرس ڈے" یا "یوم تاسیس" دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہان روشن خیالی۔ لکھنؤ کے چوک یا دلی کی چاوڑی کی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ ہرگز اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے لیکن ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے ریڈیو سے، بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں "جان" کے نغموں، ٹھمریوں سے لطف اٹھائیں گے اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کر لے گی، پوری بیباکی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کرینگے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لیے یہ کافی بلکہ کافی سے کچھ زائد ہی ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑایئے اور دیکھ لیجیے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا رعب ہم پر، اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک معنی و مفہوم متحد، لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے "صاحب" کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں ان کے دیسی مترادفات سے کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لیے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص اسی دور یا جوجی کے لیے اٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی فتح کر لیے جاتے ہیں اور ہاتھوں پیروں کے علاوہ عقلوں دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خط غلامی لکھا لیا جاتا ہے یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس، خیر و شر حسن و قبح، ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی چشم التفات کدھر ہے؟ عزت بھی "صاحب" کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ، اور دنیا بھی وہیں

کی بخشش، اب نہ ہندو ہندو ہے، نہ مسلمان مسلمان۔ سب رعایائے "سرکار" اب نہ کوئی اللہ دین ہے نہ رام دین بلکہ سب کے سب چھٹ چھٹا کر "صاحب دین"۔

الفاظ عمومی کو چھوڑیئے۔ ستم یہ ہے کہ اعلام اور اسماء معرفہ تک یورپ زدگی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ میاں "کلو" کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا "یکہ بانی ہی کرتے پایا، لیکن میجر بلیک (BLACK) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں! "کلوا مہتر" آپ کے محلہ ہی میں رہتا ہے، لیکن پروفیسر "بلیکی" (BLACKEE) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! "لالہ گھاسی رام" بیچارے "کابجی ہاؤس" کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے، لیکن بریگیڈیر جنرل "ہے" (HAY) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں! "میاں رمضانی" اور میاں شبراتی کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن مسٹر "مے" (MAY) اور ڈاکٹر فرائڈے (FRIDAY) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں! "مٹھوا" کہار اور "طوطا" کلوار آپ کی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں لیکن سر جان پارٹرج" (PARTRIDGE) آپ کے صوبہ کے گورنر تھے۔ مسٹر کاک" (COCK) اس وقت آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور "سوان" (SWAN) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں! آپ کی ماما کا لڑکا "شیرا" بیچارہ اب تک چپراسی کی جگہ امیدواری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (BULL) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے اور مسٹر لیمب (LAMB) اور مسٹر "کڈ" (KID) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ "دریاؤ سنگھ" غریب کو لائن جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سر جان لیک (LACK) دیکھتے دیکھتے ای، آئی، آر کے ایجنٹ ہو گئے! "لالہ لوہاری مل" کے چلائے عرائض نویسی کا کام بھی نہ چلا، جسٹس اسمتھ (SMITH) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے! "شیخ جھاؤ" کی زندگی نوربافی کرتے کرتے ختم ہو گئی۔ سر چارلس "ووڈ" (WOOD) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں! جنگلی گھسیارہ بیچارہ عمر بھر گھاس ہی چھیلا کیا، سر جان فارسٹر (FORESTER) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہو گئے۔

جھوٹ میں سچ[۱]

قصہ گل بکاولی" بھی کوئی کتاب میں کتاب ہے؟ عجب نہیں کہ ایک سنجیدہ مقالہ میں اس کا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر حقارت کا تبسم آجائے۔ لیکن کیا ہرج ہے، اگر کبھی کبھار خلاف وضع صحبتوں کا بھی تحمل کرلیا جائے اور پھر دنیا میں یوں بھی تو ہوا ہے، کہ پھٹی پرانی گدڑیوں سے لعل و جواہر نکل آئے ہیں۔

کوئی بادشاہ کہیں کے زین الملوک نام ہیں۔ ان کے چار لڑکے پہلے سے موجود ہیں پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہو جاتا ہے طبیبوں نے کہا کہ شفا صرف اس پھول کے لگانے سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجوان شہزادے اس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں اور سفر کرتے کرتے ایک مشہور بیسوا کے دروازہ پر پہنچتے ہیں۔ مکان کے اندر داخلہ کی فیس ایک لاکھ زر نقد ہے۔ دولت کے نشہ میں اندھے شہزادے اس کے مکان پر پہنچ، اطلاع کے لئے طبے پر چوب لگاتے ہیں۔ کتاب کوئی اخلاق کا پند نامہ نہیں عشق و عاشقی کا افسانہ ہے، چاہیے تھا کہ مصنف بیسوا کے ذکر میں کھل کھیلتا، اور اس "پری جمال" کے حسن و شوق کی مصوری اس انداز سے کرتا کہ پڑھنے والے نوجوانوں کے دل میں شوق و اشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی، لیکن برعکس اس کے دیکھیے تو سہی کہ اسی موقع پر نظر عبارت ذیل سے دو چار ہوتی ہے:۔

سنتے ہی اس مکارہ دوراں نے دل میں کہا کہ الحمد للہ مدت مدید کے بعد ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا اغلب ہے کہ دام میں پھنسے، پھڑک پھڑک کر مرے۔ نقل مشہور ہے کہ یہ طائفہ اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے، سو خدا نے ویسے ہی شخص زیر بھیج دیئے"

ان الفاظ کو خصوصاً جو عبارتیں زیر خط کر دی گئی ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد فرمایئے کہ شوق و اشتیاق کی آگ کچھ بھڑکی، یا جو تھی وہ بھی ٹھنڈی ہو کر خاکستر بن گئی؟ کتاب "ترقیوں" کے دور سے بہت قبل کی تصنیف ہے،

---

[۱] سچ جلد ۸ نمبر ۴۱ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء

مصنف، تاریکی کو روشنی عیب کو ہنر، زہر کو تریاق کہہ کر پیش کرنے کے "آرٹ" سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرہ پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا، وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے، تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے للّٰلہ اس کے فریب میں نہ آجانا۔

بیسوا ایک مخصوص چالاکی کے ساتھ شطرنج کا کھیل کھیل کر اپنے ہاں آنے والے امیر زادوں کو ہرا دیتی تھی، اور پھر ان کی جائیداد لے لوا، انہیں قید میں ڈال دیتی تھی۔ یہی ماجرا ان چاروں شہزادوں کو بھی پیش آیا۔ بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے انہی چالبازیوں کے کرتب سے بیسوا کو بھی مات کر دیا۔ اس کی قید سے اپنے بھائیوں کو چھڑایا۔ اور یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ چاروں شہزادے اپنے نابینا والد کی آنکھ کے علاج کے لیے تلاش گل بکاؤلی میں گھر سے نکلے تھے۔ مشرق کی بازاری کتاب کے مصنف کا قلم ان واقعات سے نتیجہ یہ نکالتا ہے:۔

"اے عزیز، تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا۔ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تخت شاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرو کا تھا، جب اس کی آنکھ اس خلقت ناپاک پر پڑی اس کی بصارت کو زنگ لگا، اور دیدۂ روشن تاریک ہو گیا، اب اٹھ اور سرمۂ بینائی، ڈھونڈ، یعنی گل مراد کی تلاش میں کوشش کر، لیکن راہ میں دنیائے عیارہ کی بازی میں کہ تختہ فریب کا دھرا ہوا ہے، مشغول نہ ہونا مبادا وہ فاحشہ تجھ کو پہلے فریفتہ کر کے بٹھا دے اور بعد اس کے مکر کی بلّی اور فریب کے چوہے کی مدد سے اچھا پانسہ اپنے حسب مرضی پھینکے اور اچانک تیرے توکل کا سرمایہ آخر ہو جائے، تب تجھ کو دائم الحبس کر رکھے۔ اگر تو صبر کرنے والے کی اعانت سے اس مکارہ کی بازی، طلسم کو درہم کر دے تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشیں ہے تیری فرمانبردار لونڈی ہو کر چاہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر لبھائے، پھر اگر تو اس کے منہ پر الفت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گل مراد کے دامن تک تیرا دست رس ہو۔"

ضمناً ایک حکایت ایک سادہ لوح برہمن کی آگئی ہے جس نے ایک بندھے اور جکڑے ہوئے شیر کی زنجیریں کھول دی تھیں، اور شیر نے خود اسی پر حملہ کر دیا تھا۔ تاج الملوک حکایت اس بیسوا کو سناتا ہے۔ اور معاً بعد ایک ناصح مشفق بن جاتا ہے۔

"اے عزیز سچ ہے، جو کوئی بے صبری اور فریاد لپنے نفس کی، جو مثل شیر جسم کے پنجرہ میں ہے

اسے اور اس کے حال پر رحم کرکے صبر و توکل کی رسی، اس کے ہاتھ پاؤں سے بے محابا کھول دے،
تو بہر صورت آپ کو اس کا لقمہ بنائے، مگر خضر راہنما کی دستگیری سے بچے تو بچے اے بیسوا، یہ
ذکر میں نے اس واسطے کیا جو تو جانے کہ طاقت جسمانی، طاقت روحانی پر زیادتی نہیں رکھتی،
اب تجھے یہ لازم ہے کہ پورب پچھم کے شہزادوں کو جو تو نے اپنے مکر و فریب سے قید کیا ہے،
چھوڑ دے، حق تعالیٰ تجھ کو بھی دوزخ کی قید سے نجات دے گا۔"

یہ آپ کوئی مبتذل و عامیانہ افسانہ پڑھ رہے ہیں، یا کسی عارف کے حلقۂ معرفت میں بیٹھے ہوئے ہیں؟
یہ مشرق کی گری ہوئی تصنیف ہے، آپ اس کے مقابلہ میں مغرب کے کسی بلند پایہ قصّہ کو تو لائیے۔

تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گل بکاؤلی "قلعہ بکاؤلی کے اندر ہے اور قلعہ
کے پہرہ پر اٹھارہ ہزار دیو مقرر ہیں۔ شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دیووں کو رام کرتا
ہے، اور دیووں کی ایک بوڑھی سردارنی حمالہ کا دل اس حد تک اپنی مٹھی میں لیتا ہے کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ
کا نکاح اس کے ساتھ کر دیتی ہے افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب منتقل ہوتا ہے :-

"اے عزیز روشنی چشم ظاہر بیں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کہ نور دیدۂ اولیا
ہے۔ ستر ہزار پردے میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس
بڑے نگہبان دیو نفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر، کہ وہ لعین اپنی کج روی
کو چھوڑ کر محمودہ[1] کے مقام میں پہنچا دے، لیکن یہ بات یاد رکھ اگر دیو سے الٹا کیجیے تو سیدھا پڑے۔"

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے، اور اس عزیز و عزیزالوجود پھول کو اپنے باغ سے غائب پاکر، سخت پریشان اور
ملول ہوتی ہے، پری خانہ کی کنیزیں اور خواصیں صدہا کی تعداد میں ہیں، سب کی تلاش و سعی بیکار ثابت ہوتی
ہے، بالآخر بکاؤلی خود اس "چور" کی جستجو میں نکلتی ہے۔ اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے، اور
تلاش و جستجو میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے افسانہ نگار اس موقع کو بھی ہاتھ سے
جانے نہیں دیتا اور آئین افسانہ نگاری کو بھول بھال یوں درس معرفت شروع کر دیتا ہے :-

"سبحان اللہ کیا الٹی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا، اور عاشق اسکا مطلوب، لیکن

---

[1] تلمیح ہے قرآن پاک کے "مقاماً محمودا" کی جانب

نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے، کیونکہ جبتک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو،
اس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بے فائدہ۔ آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان
سے مشتعل ہے فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے ؎

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود
گر نہ سوزد شمع، کے پروانہ شیدا می شود

بات بڑھ گئی، قلم کہتا ہے اے شخص بس کر، میں نے لکھنے میں بہت ہی کوشش کی، اور
ہاتھ اپنی سعی کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قلم سے کیا کیا ہم نے لکھا۔ بازو اپنے تردد کا دم مارتا ہے
کہ دست و قلم سے کیا ہوا، جو کچھ کیا سو میں نے کیا۔ غرض اس طرح اسباب تحریر کے بڑھے،
اور ایک کو ایک پر فوقیت ہوتی گئی، دفعتہً ایک ایسا سبب پایا گیا کہ وہ محتاج کسی کا نہ
تھا، پس اے عزیز اگر تو بتا دے کہ فی الحقیقت لکھنے میں کس کی سعی ہے، اور ظاہر میں کس کی،
تو میں بھی عاشق و معشوق کی سعی کا جواب دوں۔"

کیا اب بھی آپ کی یہ رائے قائم ہے کہ اس عامیانہ قصہ کا ذکر ایک سنجیدہ پرچہ میں لانا، نازیبا اور بے محل تھا؟
بادشاہ، شہزادہ تاج الملوک کی صورت سے بیزار ہو چکا تھا، اسے ملک بدر کر چکا تھا۔ لیکن شہزادہ نے
اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ مہینوں بلکہ برسوں کی سختیاں اٹھا کر گل بکاؤلی
لے کر آیا۔ راہ میں چاروں بڑے بھائیوں نے اس سے چھین کر اس کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کر لیا۔ بادشاہ اس وقت
تو چاروں سے بہت خوش ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد تاج الملوک بھی پایۂ تخت کے قریب پہونچا اور دیووں کی مدد
سے اس کے مقابل ایک دوسرا شہر نہایت ہی پر رونق آباد کیا، اور پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ وہاں حکومت
شروع کی۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ قاصد اور وزیر سلطنت کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ انھوں نے واپس ہو کر
بہتر سے بہتر اطلاعیں پہنچائیں۔ آخر بادشاہ خود ملنے آیا، اور یہ پہچان کر کہ اپنا ہی لخت جگر ہے، بے حد مسرور
ہوا، گلے سے لگایا، ہر طرح کے اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا اور وہ چاروں بھائی مقہور و مردود قرار پائے۔
قصہ کے اس جھوٹ میں اب سچ کا پیوند ملاحظہ ہو:-

"اے عزیز تیری عزت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہو گی، چاہیے کہ شہزادے
کے مانند کار شائستہ کرے تو تیری محبت شاہ کے دل میں موثر ہو، اور پیغام اپنی ملاقات

کا تجھے بھیجے، بلکہ بے باکانہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے اور بے اختیار تیرا سر اپنی چھاتی
سے لگائے۔ اگرچہ پہلے دیدار کے لائق نہ ہو۔ لیکن آخر کار اسی مقام میں آپ کو پہنچائے
کہ وہاں کوئی تیرا شریک نہ ہو سکے۔ پھر ایسا کام نہ کیجیو کہ شہزادوں کے مانند داغ لعنت
اٹھائے اور کس و ناکس کے روبرو رسوا ہو"

رینالڈ اور میری کاریلی، اڈگرویلس اور آسکر وائلڈ کو چھوڑیئے۔ اسکاٹ اور جارج ایلیٹ، ڈکنس،
اور تھیکرے، برنارڈ شا اور ایچ جی ویلز کے ہاں بھی اسی انداز کے مواعظ اور معارف ملیں گے۔؟

تاج الملوک ایک بار پھر مصائب و آفات کا شکار بنا۔ طلسمی عصا اور ٹوپی کو الگ رکھ کر سو گیا۔ سو کر
اٹھا اور ایک حوض شفاف میں نہانے کو اترا، تو مرد سے عورت بن گیا طرح طرح مصائب جھیلے، مدت کے بعد
پھر ایک حوض میں غوطہ لگایا۔ اب کی جو سر نکالا تو از سر نو اپنی اصلی ہیئت پر آگیا۔ یہ طلسماتی "کارخانہ اساں"
نولس کی زبان سے ایک گنجینہ حقائق و معارف بن جاتا ہے:۔

"اے یاران دہر، حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عصمت کا عصا
ہاتھ میں دے کر، طلسم گاہ دنیا میں کہ مزرعۂ آخرت ہے عافیت کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے
پس انسان کو چاہیئے کہ گل و خار اور آب و سراب خوب پہچانے، ہر ایک باغ کے پھول کو
نہ سونگھے ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے، کہ یہاں کانٹے گل سے رنگین اکثر اور شراب
بصورت آب ادھر ادھر ہے۔ اے عزیز اگر گوہر دنیا کے لینے کو چشمۂ جہاں میں غوطہ مارے گا
مقرر اپنا کلاہ و عصا کھو دے گا یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالب دنیا مؤنث ہیں اور طالب
مولیٰ مرد ہیں۔ تیرا پیکر معانی جو مانند مرد کامل ہے، بصورت زنان ناقص العقل ہو جائیگا
پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیے کہ دم بخود ہو کر پھر دریائے ذکر الٰہی
میں غوطہ مارے۔ اس کے بعد جو سر اٹھائے گا وہی عصا ہاتھ میں، اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا۔"

تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ اور باہم عقد کے خواہاں ہیں لیکن کہاں پری اور
کہاں آدم زاد۔ بکاؤلی کی ماں بگڑی ہوئی ہے کہ خاکی کے ساتھ اپنی نور نظر کا پیوند کر کے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبو دی
جائے۔ بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملوک پر مہربان ہو جاتی ہے۔ اس کی سفارشی بن کر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔ گفتگو
یہی چھڑتی ہے اور اس وقت یہ پری رومی و غزالی کی بولی میں حقیقت انسانی پر یوں ایک مقالہ سناجاتی ہے۔

"سچ کہتی ہے، لطیف کو ہم صحبت کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے لیکن تو حضرت انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے خیال فاسد دل میں ہرگز نہ لاتی۔ سن۔ اے نادان، بشر خلیفۂ یزداں ہے اور اس کی صفت بے پایاں، مخلوقات میں اشرف اور افضل ہے اسکے رتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں۔ وہ ایک نہنگ ہے دریا کا بہنے والا اور ایک قطرہ ہے حقیقت میں دریا۔ جامع کمالات علم کونی و الٰہی کا، یعنی مادیات اور مجردات کا اور مجمع ہے مراتب بندگی اور بادشاہت کا ؎

انسان کی ذات برزخ جامع ہے بے گماں
ظلِ خُدا و صورت خلق اس میں ہے عیاں

جان، کہ صوفیا ہر ایک کو عالم ارواح کے نوعوں میں سے باری تعالیٰ کے ایک ایک اسم اور صفت کا مظہر خاص جانتے ہیں اور اس عالم صورت کو کہ حواس ظاہری اور باطنی سے نسبت رکھتا ہے اس عالم کا سایہ۔ پس ہر ایک ذرہ کائنات روشن ایک تجلی ابدی سے اور سیراب ایک قطرہ سرمدی سے ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس عالم میں انسان کہ سارے افراد کون و فساد اس کے لازمی ہیں خدا کے سارے اسموں اور صفتوں کا مصدر ہے اور اس کی تجلیات خاص کا مقام کلام فضیلت انسان میں دریائے بے پایاں ہے، اس قدر پر اکتفا کیا۔"

مغربی افسانوں اور ناولوں، ڈراموں اور ناٹکوں، تھیٹروں اور سینما گھروں پر اس طرز تعلیم کا کوئی سایہ بھی پڑنے پایا ہے۔ تاج الملوک ایک بار پھر آوارۂ وطن ہو کر فقیرانہ لباس میں گھوم رہا ہے۔ گردش سوار ہے، اس ملک کا وزیر ایک سازش کر کے اس بے گناہ کو گرفتار کرا دیتا ہے۔ فسانہ نگار اس بات سے بھی ایک بات پیدا کر لیتا ہے:۔

"سچ ہے کہ جو کوئی حکمت حکیم مطلق کی گوناگوں تامل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے نہ پاوے، اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے۔ اے عزیز حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو بدن سے رخصت دی ہے پس جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو حقیقت میں روح سے ہے غرضکہ جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو تو

اس کی طرف سے جان لیکن شر نہ سمجھ کہ درپردہ وہ خیر ہے، کیونکہ وہاں شر کی گنجائش نہیں۔"

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے، اور وہ اور اس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوئی تھی، وہ کسی کے بھی حسن و جمال، زیب و زینت سے متاثر نہ ہوا۔ شہزادی غش کھاکر گر پڑی اور تڑپنے لگی، تاج الملوک پر یہ آتش باطن اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھ دینا چاہیے، کہتا ہے:-

"سن اے عزیز، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادت کو بادشاہ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا، عجز سے کہا کہ عبادت تیری میں نے جیسی چاہیے نہیں کی، پھر کس کا منہ ہے کہ اپنی عبادت پر نازاں ہو، بہتر یہی ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی گھریا میں یہاں تک پگھلائے کہ اکسیر کی مانند خاک ہو جائے، تاشاہان اکسیر پسند کی آنکھوں میں سونے سے زیادہ نظر آئے۔"

تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہو گئی لیکن دل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رخ معاً یوں پھیر دیتا ہے:-

"اے عزیز، جب تک تیرے دل کی آنکھیں، اغیار کے حسن کو دیکھنے والی ہیں تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر چند بے پردہ ہو پہلے خار رغبت اغیار کو دل کی سرزمین سے اکھاڑ کر پھینک دے، پھر گل رخسار یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشن وجود کو بہ نظر تامل دیکھے تو اس میں رنگ و بو کے سوا کچھ نہ پاوے۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۰، ۹۲ صفحے کا ہے اتنی مختصر ضخامت کے اندر حکمت و معرفت، پند و موعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔ اب کتاب ختم ہونے کو آگئی، دو ایک نمونے اور ملاحظہ فرما لیے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیر زادہ بہرام بکاؤلی کی ایک عزیزہ روح افزا پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ بار یابی تک کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر و حکمت سے خلوت تک جا پہونچتا ہے۔ اس عشق فانی میں عشق ربانی کا رنگ ملاحظہ ہو:-

"اے عزیز، اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا جلد نہ ملتا، اور اپنے مطلب کو نہ پہونچتا۔ فی الواقع جو عاشق کہ معشوق کا رنگ پکڑتا ہے، معشوق خود عاشق اس کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا صلعم نے بھی اس وضع کا کلام فرمایا ہے، حاصل اس کا یہ ہے

کہ خصائل خدا کی پیروی کرو تاکہ قربت اس سے حاصل ہو۔"

بہرام اپنی محبوبہ کی خلوت گاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے مگر اس کے ظاہری غصہ اور ناگواری کو دیکھ کر سہم جاتا ہے، ڈر سے غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیکھ جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے خود اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو جاتی ہیں نگاہ عینیت اس میں بھی ایک منظر معرفت دیکھتی ہے :-

"اے عزیز اگر اپنے نورِ عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائے تو تجلی یار سے فائدہ نہ پائے گا۔ اگر تو یہ ہستی موہوم نہ چھوڑے تو حیات ابدی کب تیرے پاس آئے۔ جو راہ عشق میں آپ سے نہ گزرا، وہ منزل مقصود میں کب پہونچا۔"

روح افزا اپنے گھر والوں کے ڈر سے بہرام کو سحر کے اثر سے پرندہ بنا کر، ایک پنجرے میں بند کر کے لٹکا لیا ہے کہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔ ماں کو کچھ سن گن ملتی ہے چور کے ڈھونڈنے کو آتی ہے اور گھر کا کونہ کونہ ڈھونڈ مارتی ہے، چڑیا کے پنجرے کی طرف خیال بھی نہیں جاتا، حالانکہ وہ بالکل نظر کے سامنے ہے فسانہ نگار یہاں بھی پتے کی بات سے نہیں چوکتا :-

"اے عزیز تو عرش پر کسی کے ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے، جو تیرے خانہ دل میں ہے اس کی تو تجھے خبر نہیں، واہ واہ، دور کا دھیان اور نزدیک آپ سے انجان۔"

دو سطریں آگے بڑھ کر اسی پرند اور قفس کی کہانی کو ایک پورا مقالۂ حکمت بنا دیتا ہے اور اسی پر کہنا چاہیے کہ افسانہ کی معرفت آموزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کی کنہہ سمجھ لے اے نادان، یہ سب علاقہ، روح سبزہ زار دنیا کی سیر کو آتی ہے جبتک یہ مربع طلسم عناصر اس کے گلے میں پڑا ہے اور قفس وجود میں طوق بندگی اس کا گلوگیر ہے چشم ظاہر بیں، مشت خاک کے سوا کچھ نہیں دیکھتی۔ جس دن یہ طلسم ٹوٹ گیا، کیفیت اس کی کھل جائیگی کہ وہ کون ہے اور یہ نیرنگ کیا ہے، چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے، جب لوگ آویں گے اس حال سے ہوں گے۔ وجود مطلق ایک دریا ہے، اور ہر موجود مثل حباب ہے جب حباب سے ہوا نکل گئی دریا کے سوا کچھ نہیں۔ پس تامل سے دیکھ کہ اصلی ہستی دریا کی ہے، لیکن فرق مرتبہ کا البتہ ہے، حباب کو کوئی دریا نہ کہے گا اور دریا کو حباب اور کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں، اور بتخانہ کو کنشت، جہنم کو دوزخ، اور جنت کو بہشت

ہر مرتبہ میں اور ہی حکم وجود ہے
زندیق ہے جو فرق مراتب کرے نہ تو

واقعی مسئلہ وحدت وجود کا مشکل ترین مسئلہ ہے اور بہتیرے اس بحر عمیق میں گر کے مذہب جبری کے بھنور میں جا پھنسے، اور اکثر مسلک دہری کے گرداب میں ڈوبے، ہادی یہاں فضل الٰہی اور کرم رسالت پناہی کے سوا کوئی نہیں۔"

جو کہانی ننگ مشرق تھی، اس کا جائزہ آپ لے چکے۔ جو افسانے "فخر مغرب" ہیں وہ بھی ان کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے؟ ہمارے ہاں کی جو سچی کتابیں، سچوں پر اتری ہوئی یا سچوں کی لکھی ہوئی ہیں انہیں چھوڑیئے ان کی سچی شرحوں کو بھی جانے دیجیے۔ جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں، جنھوں نے اپنے جھوٹ کو چھپایا نہیں صاف اس کا اظہار کر دیا ہے؟ ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں اور گہری سچائیاں آپ نے دیکھ لیں؟ جس قوم کے جھوٹ میں اتنی سچائیاں ہوں جس قوم کے جھوٹے بھی اتنے "سچے" ہوں۔ خدا کی شان ہے کہ اسے درس اخلاق و صداقت دینے وہ قوم آئی ہے۔ جس کی تہذیب و تمدن کا ہر سچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

بہار کی بہار[1]

مارچ سنہ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت جلسہ دستار بندی[2] کے موقع پر انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اس کے والد ماجد کے ہمراہ کھینچ کر لکھنؤ لائی، کانوں کو اشتیاق تھا، دو تقریروں کے سننے کا اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چیزوں کی زیارت کی۔ اللہ نے دونوں شوق پورے کرائے پہلی بار تقریر سننی نصیب ہو گئی مولانا شبلی کی، اور زیارت ہوئی ان کے چہرے کی دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی، جس کے مضامین اُستاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، الندوہ میں نکل رہے تھے۔ جلسہ گاہ (رفاہ عام متصل سٹی اسٹیشن) میں پہونچ کر یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر، خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی عینک، سر پر مدنی وضع کی مندیل۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ دستار بندی ہوئی یا صاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہیے کہ کانووکیشن ایڈریس پڑھا گیا اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں، اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور پھر ایک فرمائشی عنوان پر برجستہ تقریر عربی میں بھی۔ آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں ——— ہائے لڑکپن کی نیم معصومانہ مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے۔ جی بھر کر پوری ہوئیں۔ سنہ ۱۹۰۷ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا، جو آج ان سطور کا راقم ہے، اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا، جو بحمداللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب "مولانا" اور "علامہ" کے القاب کے اضافہ کے ساتھ سید سلیمان ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت و عظمت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا

---

[1] رسالہ ندیم (گیا) بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

[2] "جلسہ دستار بندی کی اصطلاح اب غیر مفہوم ہو چکی ہے۔ پرانی درس گاہوں میں دستور یہ تھا کہ طلباء کو تحصیل علم سے فارغ ہونے پر ایک جلسہ عام میں سند دی جاتی تھی اور سر پر فضیلت کی پگڑی باندھی جاتی تھی۔

بنا برگ و بار پیدا کئے، اور آج ایک درخت ہی نہیں، پورا باغ کا باغ تیار۔ ۳۲ برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی! قرن کا قرن گزر گیا۔ خدا جانے کتنی آندھیاں، کتنے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے، لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار آج بھی قائم۔ بلکہ اس میں دم بدم اضافہ و ترقی۔

میں بے حد شرمیلا اور بدہمت۔ الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری۔ ملنے کی جرأت اس وقت نہ ہوئی۔ کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی۔اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ غالباً آخر سنہ ۱۹۱۱ء تھا، اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحدانہ تنقید کے سلسلہ میں "نام" حاصل کر چکا تھا۔ جب جا کر تعارف کی نوبت آئی۔ اور نیازمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ ایسے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیزداری سے جا ملے اور اب سید صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں گویا کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا۔

مقامی خصوصیات، تمدن، معاشرت، ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں پنجاب، بمبئی، سی پی، سب کہیں کا رنگ اودھ سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود یوپی کے شمالی مغربی اور جنوبی علاقے طرز معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ خصوصیت بہار ہی میں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ بالکل اودھ کا اجنبیت کم سے کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوئی۔ پٹنہ کا تمدن لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ۔ جس بہاری سے ملا معلوم ہوا اپنے ہی جوار کے کسی شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔

سید صاحب کے سلسلہ میں ان کے متعدد عزیزوں، ہم وطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سید نجیب اشرف ندوی اب ماشاء اللہ ایم اے ہیں اور بمبئی کی طرف کسی کالج کے پروفیسر ہیں۔ میری نظر میں ان کی وہی لڑکپن کی بھولی صورت پھر رہی ہے، جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے اور ہنستے مسکراتے ہوئے نیم معصومانہ چہرہ کے ساتھ نو مشق بچوں میں ایک ہونہار مقرر تھے مولوی ابو ظفر صاحب ندوی، مولوی سید ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے) مولوی سید محمد ندوی (شاگرد مولانا حبیب الرحمٰن نگرامی مرحوم) اور مولوی سید عبد الحکیم صاحب دسنوی، وغیرہم ان میں سے بعض کی ملاقاتیں خود مستقل داستانیں ہیں۔

بہار و اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سید صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سید صاحب ہی کے ایک بزرگ ہم نام، ابھی کل تک زندہ و سلامت مولانا قاری سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے ۳۰۔۳۵ سال ادھر علیگڈھ کانفرنس کا ہر اجلاس ان کے دم سے آباد، تو ندوہ کا ہر جلسہ ان کے

وجود سے شاد اور میلادی بیان تو گویا ان کا حصہ تھا۔ ان کا ذکرِ خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بارہا سننے میں
آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے اُنسے مخلصانہ تعلقات ۱۰ء تا ۱۲ء اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی
کا ایک زمانہ لکھنؤ فرنگی محل میں گزرا تھا اور ہمارا خاندان بھی اپنے قربِ تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل کا ایک جزو تھا،
شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں، اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریاباد میں تشریف لاتے
تھے، مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود موصوف نے اپنی زبان سے فرمایا جب بہت مدت کے بعد غالباً
۳۱ء میں مجھے ذاتی طور پر شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم فرمائی بھولنے کی چیز نہیں۔ ۲۷ء
میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لیے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب اور ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً
مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے میرے لیے پردیس کو وطن بنادیا۔ دوسرے
صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عزالدین سلمہ کی کرم فرمائیاں عین اپنی ان کی روایاتِ خاندان کے
مطابق ہیں۔

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ ایک بڑا مرکز بہاری نوجوانوں کا ہے۔ اپنی کالجی طالب علمی کے زمانے میں بس
یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ کھینچ کر لکھنؤ آگیا ہے اور ندوہ کا دارالاقامہ پٹنہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے
کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ ہوگئی۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفاء راشدین) اور مولوی مسعود عالم
(ایڈیٹر ایضاء، عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مولوی ابوالحسنات بے چارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے
زائد نہ ہوں، بڑے ہونہار تھے۔ عین شباب میں وفات پاگئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں
پڑھتے تھے۔ مولوی احمد اللہ ندوی مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی (اب یہ سب حیدرآباد میں ہیں) سے بھی تعارف
اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سید ریاست علی ندوی آج ماشاءاللہ دوسروں کے "ندیم" و رہبر ہیں۔ ان کا وہ زمانہ یاد ہے،
غالباً ۲۰ء میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کے عزیز و مخصوص شاگردوں میں تھے۔
مولوی عبدالغفور صاحب شررؔ کا نام لیجیے بھول ہی چلا تھا۔ دفتر ندوہ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے، اور اب تو
شاید نائب ناظم وہی ہیں۔ ایک زمانہ میں واقعی شر رہی تھے۔

دارالعلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج ہوسٹل تھا (جو اب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں ۱۹۱۱ء
میں ایک سال قائم رہا۔ یہاں پٹنہ کے ایک نوجوان سید باقر حسن پہلے سے بورڈر تھے۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سر سلطان

کے چھوٹے بھائی۔ وجیہ و خوشرو، ہونہار و خوش خو علیگڈھ رہ کر آئے تھے۔ انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں برق، مسلمانوں کے کام میں آگے آگے مجھ سے ایک سال آگے تھے۔ میں بی اے کے پہلے سال میں تھا، وہ آخری سال میں بیچارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے، اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے سنی طلبہ سے ایسے شیر و شکر رہے کہ ان کے شیعہ ہونے کا پتہ بھی نہ چلا۔

سر علی امام کے بھائی حسن امام، اور والد ماجد نواب امداد امام صاحب اثر۔ نواب نصیر حسین خاں خیال اور اس وقت کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا لیکن بجز نواب خیال کے اور کسی سے ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی، پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹر محمد وارث ایڈنبرا یونیورسٹی کے ایم ڈی، لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے۔ حکیم مہدی کے مقبرہ کے مقابل جگت نرائن روڈ پر ۱۹۰۹ء تھا کہ اپنی مریض آنکھوں کا معائنہ کرانے گیا، بڑی توجہ او شفقت سے دیکھا۔ میں طالب علم، بھلا فیس کیا پیش کر سکتا تھا، ان کی توجہ ہی بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر ان کے ہاں آتا جاتا رہتا۔ کام تو بیچارہ کا یوں ہی سا چلتا۔ البتہ اپنے فن سے متعلق پڑھے لکھے بہت تھے پہلی جنگ یورپ کے زمانے میں کہیں سول سرجن ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں کہیں ہوں اللہ خوش رکھے۔

خلافت و ترک موالات کی تحریک نے دور دور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بہار و اودھ کا تو پڑوس ہی تھا۔ میں تحریک میں شریک اس وقت ہوا، جب خود تحریک ختم ہو رہی تھی، محمد علی کی ذات اس وقت بھی بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی، میں تو خیر عاشقوں میں تھا، باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے۔ دہلی بار بار میری آمد و رفت رہتی۔ یہ ذکر ۱۹۲۴ء اور اس کے بعد کا ہے اور دفتر ہمدرد کامریڈ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ مولوی محمد شفیع داؤدی، مولوی عبد الغنی، پروفیسر عبد الباری (جو اب شاید "باری جی" کہلاتے ہیں) مولوی سید حسن آرزو وغیرہم سے اس سلسلہ میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حضرات بہار کی سادگی اور اخلاص مندی سے دل خاص طور پر متاثر رہا۔ مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبد الغنی کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہو کر نماز کے پورے پابند ہیں۔ لباس سادہ رکھتے ہیں۔ بازار میں پیدل چلتے پھرتے اور اپنے ہاتھ سے سودا سلف لے آتے ہیں، بھلا ہمارے ہاں کے ارکان کونسل مسجد کی حاضری، اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا کیا جانیں؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار کو پہلی بار مولانا عبد الباری فرنگی

محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی۔ دل ان کے علم و تدین دونوں کا قائل رہا۔ اور آگے چل کر جب ان سے اور مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی سے جو شدید جنگ برپا ہو گئی تھی تو دل اس سے برابر دکھتا ہی رہا ــــــ دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ مخاصمہ کے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ بے قصور ہی نکلے۔

ایک مرکز اہل بہار کا علی گڑھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں وہاں کئی سال سے آمد و رفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہو گئے تھے، لیکن ان کا خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھے کا۔ ان کی زبردست شخصیت بعض عجیب خصوصیات کی مالک تھی۔ اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم اے جو عرصہ سے پرو وائس چانسلر ہیں۔ اسم بامسمی پیکر حلم و خوش خلقی ہیں۔ مرزا اختر حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔ ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔

سچ بھی ایک ذریعہ اہل بہار کی توجہ منعطف کرنے کا تھا۔ بلکہ دکن کے بعد سچ کی سب سے زیادہ قدر افزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرا کے وکیل، محمد اسمٰعیل صاحب ترہٹ ضلع گیا کے قاضی احمد حسین صاحب، رانچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب اور پٹنہ کے مولوی منظر علی ندوی مرحوم (المبشر والے) اسی سلسلہ سے مہربان ہوئے۔ مولوی منظر مرحوم تو خدا کے گھر سدھارے باقی حضرات کی خیریت ادھر ایک عرصہ سے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم صاحب دریاباد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔

سال اب خوب تو خیال میں نہیں ۲۰ء یا ۲۱ء ہوگا ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔ مولانا شروانی صدر الصدور امور مذہبی کے دولت کدہ پر کوئی علمی کمیٹی تھی نظر ایک نئے چہرہ پر پڑی، اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو برابر پڑی ہی رہے ہٹنے نہ پائے۔ نرم اور روشن چہرہ پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی پر پڑی، تو دل نے کہا کہ اس چہرہ کو دیکھتے ہی چلے جایئے۔ بتلانے والے نے یہ بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا دھوکہ ہوا۔ نام سے عرصہ سے واقف تھا۔ ایک خیالی صورت بھی ذہن میں تھی۔ لیکن یہ صورت، سیرت ہر چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا غلط نکلا خیال تھا کہ مسن ہوں گے، یہ تو جوان نکلے۔ قیاس تھا کہ بڑے بحاث بڑے مناظر ہوں گے اور خشکی و کرختگی کے پتلے۔ مشاہدے نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو چھپائے ہوئے ہے! خندہ دہن، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت برعکس اس کے ایک پیکر لینت و لطافت قال کے موقع پر قال، اور حال کے محل پر حال۔

صورت پر نورانیت برستی ہوئی، گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔ علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق تعارف ہوا اور ملاقات کے پینگ بڑھے۔ اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا کیا کچھ سیکھا، ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجیے۔ حیدرآباد کی ہمراہیاں لکھنؤ کی یکجائیاں، دریاباد کی سرفرازیاں، اور پھر عرشہ جہاز پر ساتھ، مدینہ کے "روضۂ جنت" میں ساتھ، بیت اللہ کے طواف و زیارت میں ساتھ، منیٰ کی نمازوں میں ساتھ۔ یہ ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہوگئی تو سمٹنی مشکل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری سید زادہ کے علم و فضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری سید کی محبوبیت کی نذر ہوگیا۔ دماغ اگر ایک کی عظمت کا قائل تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل "بہار کی بہار" اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟

۲۹ء میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاز پر مولوی نصیر الدین صاحب پنشنر منصف اور ان کے صاحبزادے ضمیر الدین صاحب کا خوب ساتھ رہا۔ ضمیر صاحب جو اس وقت ایک پرجوش خلافتی تھے، ان کے لطف و کرم کی تجدید ۸-۹ سال بعد خاص شہر پٹنہ میں ۳۷ء میں ہوئی۔ مولوی شاہ لطف اللہ صاحب مونگیری، اور ان کے برادران عزیز مولوی نور اللہ و مولوی منت اللہ (اب ایم ایل اے ہیں) سے خصوصیت پیدا ہو جانے کے لیے اتنا ہی بس تھا کہ یہ حضرات مولانا گیلانی کے عزیز قریب ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان حضرات کا لطف و اخلاص بجائے خود بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ اور مدینہ منورہ میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب کا وجود تو ہر مسافر و زائر کے لیے ایک آیۂ رحمت ہے، ہم لوگوں پر کرم خاص رہا۔ مسجد نبوی میں باب جبرئیل کے دربان بھی ایک بہاری تھے اور خوب شخص تھے ہم لوگ عموماً اسی دروازہ سے جاتے تھے روز ملاقات رہتی تھی۔ نام اس وقت ذہن میں نہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ کے سلسلہ میں ستمبر ۱۷ء سے ستمبر ۱۸ء تک ایک سال مسلسل حیدرآباد میں قیام رہا۔ سرکار عالی کے نائب صدر محاسب (اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل) مولوی عبد الغنی بہاری مرحوم تھے۔ ان کے کرم بے حساب رہے۔ ان کے صاحبزادے محی الدین صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا محکمہ تعلیمات میں تھے۔ اب شاید اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہیں۔ جوانی ہی میں مذہب کے دلدادہ، لطف و کرم میں باپ کے قدم بہ قدم۔ انہیں کے ہاں شمس العلماء مولوی محب الحق کی زیارت کئی بار ہوئی۔ اس وقت تو بہت بزرگ صورت معلوم ہوئے۔ بعد کو سننے میں آیا کہ عقاید کچھ "اہل قرآن" کے سے ہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ایسا شخص اور منکر حدیث ہو! بہار ہی سے ایک صاحب مولوی ابو مصلح ایڈیٹر حسن و عشق، مراسلت عرصہ سے فرما رہے تھے حیدرآباد کی

آمد و رفت کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی ۔ تحریک قرآن کی دھن میں لگے ہوئے دکن ہی کے سلسلہ میں ایک اور بہاری عبد الرحمٰن خان صاحب بھی یاد آ گئے ۔ انسپکٹر پولیس تھے ۔ مدتوں مہربان رہے ۔

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی کا نام رہا ہی جاتا تھا ۔ نظر ثانی کے وقت یاد پڑا ۔ یہیں ٹانکے دیتا ہوں ۔ اب مدت سے کلکتہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں، ایک زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے ۔ اس وقت تو میں ہی ذرا الگ رہا ۔ بعد کو معلوم ہوا بڑے مسلمان تھے ۔ مراسلت اور ان کے مقالات حدیث نبوی سے اس کی تصدیق ہو گئی ۔

پٹنہ کی حاضری کا اتفاق کل دو بار ہوا ۔ بوئے انس شہر کی گلی گلی سے آئی ۔ نئی کوٹھیوں سے کم تر، عظیم آباد کے کھنڈروں سے بیشتر پہلی بار ستمبر ۲۷ء میں جانا ہوا ۔ مولانا مناظر صاحب شدید علیل ہو کر پٹنہ کے بڑے اسپتال میں داخل ہوئے تھے ۔ تار پا کر عیادت کو دوڑا ہوا گیا ۔ مہمانداری مولوی منظر علی مرحوم ایڈیٹر المبشر نے کی ۔ مولانا کے والد ماجد حیات تھے، ان کی زیارت ہوئی اور مولانا کے برادر عزیز سید مکارم احسن سے خوب ملنا ملانا رہا ۔ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی قاضی احمد حسین صاحب ایم، ایل، سی، مولوی نور محمد صاحب ایڈیٹر "اتحاد" وغیرہم لطف فرماتے رہے اور مولوی سید محمود ندوی تو ہر وقت خدمت کے لیے وقف رہے ۔ میزبان صاحب موٹر پر پھلواری لے گئے ۔ مزارات کے علاوہ زندہ بزرگ امیر شریعت مولانا محی الدین صاحب کی زیارت نصیب ہوئی ۔ مولانا قاری شاہ سلیمان مرحوم و مغفور اور ان کے اہل خاندان کی عزیزانہ مسافر نوازی و محبت کا مزہ دل اب تک لے رہا ہے ۔ جناب تمنا کو بھی وہیں دیکھا اور کلام سنا اور جناب تمنا کی لطف فرمائیاں رہیں ۔ غرض "پھلواری" کی سیر سے دل باغ باغ رہا اور اس کی سدا بہار سر سبزی کے لیے دعائیں نکلتی رہیں ۔

دوسرا سفر ۳۷ء میں ایک اردو کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا ۔ ضابطہ سے میزبان قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر تھے ۔ لیکن قیام مولانا سید سلیمان کی رفاقت میں، ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفر پور کی کوٹھی پر رہا ۔ موصوف مولانا شبلی مرحوم کے ملنے والے اور اس رشتہ سے میرے بھی بزرگ ہوئے ۔ بزرگانہ شفقتیں عین روایات بہار کے مطابق رہیں ۔ تمنا صاحب اب کی بھی کرم فرماتے رہے، اور ان کے علاوہ ضمیر الدین صاحب اور متعدد حضرات کی عنایتوں کا مینھ دن بھر برستا رہا ۔ افسوس ہے کہ ان کے اسمائے گرامی ذہن میں نہیں ۔ شام کو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کے اعزاز میں علیگڈھ اولڈ بوائز کی طرف سے ایٹ ہوم تھا ۔ متعدد نوجوانوں سے ملاقات رہی ۔ سب خلوص و

محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اور اردو یونیورسٹی کے طلبہ کی صورت کا نقش ذہن میں ہے۔ لیجیے ایک ہدیۂ حقیر بزرگان بہار کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے، گو ان کے مرتبہ کے قابل ہرگز نہیں تیار ہو گیا۔ موضوع "احباب بہار" خود ایڈیٹر صاحب ندیم کا عنایت کیا ہوا تھا۔ محفل خاص میں اغیار کے بار پانے کے کوئی معنی نہیں۔ بہار نمبر میں ایک غیر بہاری کے لیے جگہ نکالنا محض اس کا دل بڑھانا ہے لیکن یہ بہار نمبر ہے، ایسا کہ اس پر کسی خصوصی نمبر کا اطلاق ذرا مشکل ہی ہے۔ ایک تو اودھ اور بہار کے تمدن و معاشرت کی یہ یکسانی کہ ایک کو دیکھ بے اختیار دوسرے کی زبان سے نکلے۔ ع کمال جذب تو دیکھو بہم تمیز مشکل ہے

اور پھر اس عموم میں خصوص ان سطور کے راقم کا اہل بہار کے ساتھ نیازمندانہ خلوص ـــــ قند و شکر کو جب تولتے ہیں تو خس و خاشاک کے ذریعے بھی قند و شکر ہی کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں عجب کیا جو اس غیر بہاری کو بھی ایک اعزازی (آنریری) بہاری سمجھ لیا جائے۔

اضافہ ۱۹۶۱ء۔ اس تحریر کے بعد دوبارہ پھر سفر بہار کا اتفاق ہوا۔ ایک بار ۵۲ء میں جو اصلاً سفر گیلانی تھا۔ مولانا کی حیات میں ضمناً سفر پٹنہ بھی رہا۔ دوبارہ ۵۸ء میں جو اصلاً سفر پٹنہ تھا اور ضمناً سفر گیلانی (تربت مولانا پر فاتحہ پڑھنے) سفر ڈلیسنہ۔ سفر راجگیر۔ سفر نالندہ اور سفر پھلواری اس سفر میں قیام گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کے یہاں رہا۔ اور نیاز خصوصی حاصل رہا پروفیسر عبدالمنان بیدل۔ حکیم عبدالاحد (پرنسپل طبیہ کالج) اور انوار احمد ایڈوکیٹ سے۔

ایک مختصر سا پیام[1]

"یوم اکبر" منانے والوں کے نام

سنہ ۱۹۱۲ء ہے اور مہینہ غالباً اپریل کا۔ لکھنؤ میں ابھی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی ہے صرف کیننگ کالج وغیرہ ڈگری کالج ہیں"۔ ایک طالب علم بی۔اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الہ آباد پہونچتا ہے اور اپنی پہلی فرصت میں یہی نوجوان شرمیلا اور بڑوں کی صحبت میں جھینپنے والا، شوق کے پیروں سے دوڑ کر، اور اشتیاق کے پیروں سے اڑ کر "عشرت منزل" جا حاضر ہوتا ہے — پیر طریقت کا سن کوئی ۶۶ سال کا۔ جسم لاغر و نحیف، چہرہ دُبلا، اور اس دُبلے چہرہ پر جھریاں، لباس سادہ، وضع و معاشرت سادہ۔ ایک وسیع برآمدہ اس میں ایک آرام کرسی پر نشست، آنکھوں پر عینک، آنکھیں عینک کے اندر سے بھی چمکتی ہوئیں، ڈاکٹر کے ہاتھ کی قدح کی ہوئی، اس پر بھی پر نور گفتگو لطیفوں سے پر ظرافت سے معمور، بشرہ سے ذہانت کا ظہور ہنستے کم ہیں، ہنساتے زیادہ ہیں، فقرے گویا ڈھلے ہوئے، پہلے سے سوچے ہوئے، جنچے ہوئے، منھ سے نکل رہے ہیں۔ جو ملنے آیا ہے، وہ سن میں ان کی بڑی اولاد سے بھی کہیں چھوٹا ہے، لیکن باتیں اس سے یوں گھل مل کر کر رہے ہیں، جیسے وہ ان کا کوئی پرانا دوست ہے، ہم سن و بے تکلف — ان پیر ظریف کو آپ نے پہچانا؟ یہ تھے مشہور و نامور شاعر اور میرے عقیدہ میں حکیم و عارف، حضرت اکبر۔ اور سنہ ۱۹۱۲ء کے اس میلے نوجوان کو آپ نے جانا؟ وہ نامہ سیاہ ہے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یوم اکبر کے لیے پیام نویس!

سنہ اب یاد نہیں، اور مقام کا اظہار کچھ ضروری نہیں، بہرحال اودھ کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے حضرت اکبر کے صاحبزادہ سید عشرت حسین صاحب ("عشرت منزل" کا نام ابھی ابھی سن چکے ہیں، یہ انہیں کے نام پر ہے)

---

[1] سنہ ۱۹۴۲ء میں یہ یوم اکبر، عالم پور (دکن) میں رگھو بندر راؤ صاحب جذب کے زیر صدارت منایا گیا تھا۔

وہاں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اکبر صاحب بھی وہیں آئے ہوئے ہیں شہر کے کچھ لوگ رئیس یا وکیل، ڈپٹی صاحب سے ملنے آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اتفاق سے گھر پر موجود نہیں وہ حضرات ان کے بجائے حضرت اکبر کو جلوہ افروز پاتے ہیں اور نام سن کر بھی ان کی جانب چنداں التفات نہیں کرتے، اتنے میں ڈپٹی صاحب باہر سے آجاتے ہیں اور حاضرین سے کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے پہچانا؟ "یہ میرے والد ماجد ہیں" اب کیا تھا وہی حضرات تعظیم کے لیے سروقد کھڑے ہو جاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ "معاف کیجیے گا ہمیں اس رشتہ کی خبر نہ تھی" اکبر نے فرمایا نہیں اس میں مضائقہ کیا۔ ایک بار یورپ میں کیا ہوا، کہ اللہ میاں مجسم ہو کر آئے، گرجوں میں جاکر ایک ایک سے کہا میں تمہارا خدا ہوں، پروردگار ہوں، کوئی مخاطب نہ ہوا، پھر فرمایا، ارے مجھے اب بھی نہ پہچانا" میں ہوں تمہارے عیسیٰ مسیح کا باپ! بس اس تعارف کی دیر تھی، سب دوڑ پڑے، سب کے سر تعظیم کے لیے جھک گئے!" یہ تھا اکبر کی برجستہ لطیفہ گوئی کا ایک نمونہ!

سنہ غالباً ۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ ہے۔ اکبر لکھنؤ میں امین آباد پارک کے ایک بالاخانہ پر مقیم ہیں۔ ایک صاحب "صاحبانہ" مسلک و خیال کے ملنے تشریف لاتے ہیں گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم و آزادی پر چلتی ہے اکبر نے کہا کہ "ہم تو اس زمانہ میں آزاد خیالی کا امام سید احمد خاں کو سمجھتے تھے، لیکن عورتوں کی آزادی انھیں بھی سخت ناپسند تھی" وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے۔ بات کاٹ کر بولے کہ "سرسید کی رائے اس معاملہ میں سخت قابل ترمیم تھی"۔ اکبر نے برجستہ جواب دیا کہ جی، کیوں نہیں۔ ایک اسی معاملہ میں کیا، خدا معلوم کتنے معاملوں میں سخت قابل ترمیم تھی" وہ خود ہی قابل ترمیم تھے دیکھیے، زمانہ نے انھیں کی ترمیم کردی، انھیں اٹھا لیا، اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کر دیا، یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اکبر کی حکیمانہ و ظریفانہ اصلاحی طرز گفتگو کی۔ اصلاح و تبلیغ کے کام میں تو وہ ہمہ وقت لگے رہتے لیکن مجادلہ و مکابرہ کیا معنی، مناظرہ و مباحثہ کی بھی نوبت نہ آنے دیتے۔ اور خشونت تو جانتے ہی نہ تھے بس یوں ہی ہنستے بولتے کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہہ جاتے۔ شعر میں کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں

فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

انکار مذہبی "بحث" سے کیا ہے، بحث و جدال کا رنگ کبھی آنے نہ دیا۔ باقی دھیمے سروں میں، میٹھے بولوں میں مذہب کی تبلیغ تو چپکے چپکے، جیسے ہر وقت کرتے رہتے۔ مجھ سے ایک روز میرے عین الحاد کے زمانے

میں کہنے لگے کہ "کیوں صاحب، آپ نے کالج میں عربی لی تھی نہ؟" عرض کیا "جی ہاں" فرمایا تو پھر اب قرآن آپ کبھی پڑھتے ہیں؟ مذہبی کتاب سمجھ کر نہ سہی اس کی اعلیٰ لٹریری حیثیت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا، کیا ہرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لیے اسے کبھی کبھی پڑھتے رہیے۔ آخر انگریزی بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لیے کوئی قید باوضو ہونے، قبلہ رُخ بیٹھنے کی نہیں، وضو بے وضو جب جی چاہے کچھ پڑھ لیا کیجیے اور جو آیت پسند آجائے، اسے ذرا دو ایک بار دہرا لیا کیجیے جیسے اچھے شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے۔ اور جو نہ پسند آئے اسے سمجھ لیجیے کہ وہ آپ کے لیے نہیں۔" بس یہ حکیمانہ طریق تھا ان کی تبلیغ کا۔

ایک روز اور میرے اسی دورِ الحاد میں مجھ سے فرمانے لگے کہ کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟ اللہ میاں کے مسئلہ کو الگ رکھیے، صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ کو اپنے بندہ ہونے میں تو شک نہیں؟ عرض کیا کہ "نہیں، اس میں تو نہیں"۔ بولے، بس پھر بیڑا پار ہے۔ اپنی بندگی کا احساس کرتے رہیے۔ آپ کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ اللہ کی معرفت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ سب کی نیت بس اپنے اپنے مقام تک رہی ہے میرا ایک شعر سُن لیجیے ؎

درد تو موجود ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو!
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

اپریل ۱۹۱۲ء کی وہ گھڑی، اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں یوم وفات پورے دس برس میرے تعلقات نیازمندی برابر قائم رہے، روز بروز بڑھتے گئے۔ اس مدت میں میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ لیا، اکبر کے کلام سے بھی اور اکبر کی ذات سے بھی خوش نصیب تھا میں کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ کا ملا۔ بدنصیب تھا میں کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ اپنے عقائد و خیالات کی اصلاح میں میں نے حضرت اکبر کا اثر چپکے چپکے غیر شعوری طور پر کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ ابھی زندہ ہی تھے کہ میں بحمداللہ مسلمان ازسرنو بن چکا تھا جب پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ انھیں کے مکان عشرت منزل میں ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اس وقت ان کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کتنی بڑی دولت خود انھیں کو مل گئی ہے! توحید کے عاشق تھے اور غیرت، عشق کا ایک لازمہ ہے۔ توحید کی غیرت اتنی تھی، کہ کوئی دوسرا تذکرہ، یہاں تک کہ اللہ کے پیاروں کا بھی زیادہ دیر تک سن ہی نہ سکتے جھٹ موضوع بدلا، توحید پر آجاتے اور آخر آخر تو فنا اور توحید، یہی دو محبوب موضوع رہ گئے تھے، ۲۰ء و ۲۱ء میں عارف رومؒ کی مشہور و معروف مثنوی کی دھن میرے اوپر سوار

تھی۔ اکبر کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا۔ ایک بار کیا دو بار کیا جب تیسری بار کیا تو تڑسے بول اٹھے کہ اچھا یہ تو فرمایئے اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا رومؔ؟" میں نے کھسیانے ہو کر کہا کہ "اللہ میاں" بولے میں تو آپ کی گفتگو سے یہی سمجھا تھا کہ شاید مولوی روم بڑے ہیں۔ جب سے آپ آئے ہیں، بار بار انھیں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سنا میں تو سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپ کی رہنمائی مثنوی تک کی۔ یا مولوی رومؔ آپ کو اللہ تک لے آئے" انتہا یہ ہے کہ ایک بار جب ذکر رسولؐ شروع ہو تو اسے بھی دو ہی چار منٹ بعد حضرت اکبر نے اپنے اس فقرہ پر ختم کر دیا کہ "جی ہاں، ہمارے اللہ کی قدرت کا کیا کہنا۔ کیا بے نظیر اور بے مثال انسان پیدا کر دیا! —— یہ حد تھی غلبہ توحید کی!

اکبرؔ بڑے پر گو تھے اور بڑے زود گو۔ جو دیوان چھپ چکے ہیں، وہی تعداد میں ایک نہیں تین ہیں۔ اور جو کلام اب تک نہیں چھپا ہے وہ سب چھاپ دیا جائے، تو اگر پوری دو جلدیں نہیں، تو ڈیڑھ جلد تو ضرور ہی اور تیار ہو جائے۔ اکبرؔ کا پیام تقریباً وہی تھا جو اقبال کا تھا یعنی خودی اور خودداری کا سبق مشرقی کو مشرقی۔ اور مسلمان کو مسلمان رہنے کی تلقین، راہیں الگ تھیں، لیکن منزل دونوں کی ایک، ایک چہروں کو ہنساتا ہوا چلا، دوسرا دلوں کو گرماتا ہوا بڑھا اکبر کی زندگی درحقیقت ایک سبق ہے کہ انسان، ظرافت، زندہ دلی، دل لگی، خوش طبعی کی راہ سے بھی کیسی کیسی خدمتیں دین وملت کی انجام دے سکتا ہے!

---

(۱) مرزا رسوا کے قصے

کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے[۱]

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات   تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

جس نے موت کو دعوت ان الفاظ میں ۳۱، ۳۲ سال قبل دی تھی اس کی شمع حیات واقعتہً اکتوبر ۱۹۳۱ء میں گل ہو کر رہی۔ موت کو جب آنا ہوتا ہے جب ہی آکر رہتی ہے۔ شاعر کی طبیعت ممکن ہے حیات سے اسی وقت سیر ہو چکی ہو لیکن خود حیات اس وقت شاعر سے سیر نہیں ہوئی تھی موت تو جبھی آئی جب اُسے آنا تھا۔ اور جب آئی تو بہتوں نے یہ بھی نہ جانا، کہ کس نام کے رسوا اور شعر و ادب کے رسیا کو اپنے ہمراہ لیتی گئی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ بقا نہ کسی شاعر کو ہے نہ شاعری کو، نہ ادب کو، نہ ادیب کو، کیسے کیسے افسانہ گو اور افسانہ نویس آئے اور کیسی کیسی مزیدار کہانیاں سُنانے بیٹھے مگر، ہا دیکھتے ہی دیکھتے خود انھیں کی زندگی افسانہ بن گئی! باقی رہنے والا بس جو ہے، وہی ہے

ذاتِ معبود جاودانی ہے   باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

جو رونقِ محفل ہوتے ہیں وہ ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں لیکن محفل کی رونق جوں کی توں! لسان العصر اکبر کے الفاظ میں ؎

دنیا یونہی ناشاد یوں ہی شاد رہے گی   برباد کیے جائے گی، آباد رہے گی

ناول نویسی کی عمر اردو میں مرزا رسوا کی عمر سے بڑی ہے۔ سرشار اور شرر اور دوسرے حضرات اپنے

---

[۱] تحریر ۱۹۳۱ء۔ نظر ثانی ۱۹۵۳ء

اپنے رنگ میں اس چمنِ کاغذی کی آبیاری شروع کر چکے تھے کہنا چاہیے کہ انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں اور آٹھویں دہے میں انگریزی ناول بھی اردو میں خاصی تعداد میں منتقل ہو چکے تھے جب کہیں جا کر مرزا محمد ہادی مرزا لکھنوی بی۔ اے نے انیسویں صدی کے نویں دہے میں اس کوچہ میں قدم رکھا، آدمی پڑھے لکھے صاحبِ علم شریف خاندان تھے۔ شمار شہر کے متین وثقہ طبقہ اور اہلِ علم میں تھا ناول نویسی کا مشغلہ اُس وقت تک کچھ ایسا معزز نہ تھا، غرض کچھ وضع قدیم کا پاس، کچھ اپنے علمی وقار کا لحاظ، داستان سرائی کرنے بیٹھے تو چہرہ پر "مرزا رسوا" کا نقاب ڈال لیا، حالانکہ یہ نقاب تھا اتنا باریک کہ جو چاہے وہ ایک ایک خطّ وخال ایک ایک بال باہر سے گن لے۔

اُردو میں ناول بہتوں نے لکھے اچھے اچھوں نے لکھے۔ پر اُن کا رنگ سب سے الگ۔ ان کا انداز سب سے جدا، نہ ان کے پلاٹ میں "سنسنی خیزیاں" نہ ان کی زبان میں "غرابت زائیاں" نہ ان کے اوراق میں "برق پیمائیاں" اور نہ "کوہ تراشیاں" نہ ان کے الفاظ "ترنم ریز" نہ اُن کی ترکیبیں "ارتعاش انگیز" نہ ان کی تصویر رزم میں "برق پاشیاں" نہ ان کی داستانِ بزم میں "ابتسام آرائیاں"۔ پلاٹ وہی روزمرہ صبح وشام کے پیش آنے والے واقعات جو آپ ہم سب دیکھتے ہیں۔ زبان وہی گھر اور باہر کی ستھری اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصہ کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو، نہ برلن نہ ٹوکیو۔ بس یہی لکھنؤ، فیض آباد، دہلی و الہ آباد۔ افسانے کے اشخاص نہ لندھور نہ سندباد نہ تاج الملوک نہ ملکہ زرنگار بس یہی حکیم صاحب اور شاہ صاحب، راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب اور مرزا صاحب۔ عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا نیک قدم۔ کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے اس کی نسل آگے نہیں چلتی اپنے طرز کا موجد بھی یہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی۔ مرزا رسوا کا بھی کوئی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا۔

پیش رو اکثر اور معاصرین بیشتر تکلفات میں اُلجھ کر رہ گئے۔ رسوا تصنع سے پاک اور آورد سے بے نیاز۔ ابھی ہنسا رہے تھے، ابھی رلانے لگے۔ مزاح وگداز، سوز وساز، شوخی ومتانت سبھی اپنے اپنے موقع سے موجود، لیکن آمد وبے ساختگی ہر حال میں رفیق۔ شستگی وروانی ہر گوشۂ بساط میں قلم کی شریک! جو منظر جہاں کہیں دکھایا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرصع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا ہے ہر نقل پر اصل کا گمان، ہر عرض میں جوہر کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکا الفاظ کے پردہ میں حقیقت کا جلوہ۔

ناول بہر حال ناول ہی ہوتے ہیں۔ اخلاق کے مسائل اور تصوف کے مقالات نہیں ہوتے۔ اور پھر ناول بھی وہ جو نہ تاریخ ہوں نہ اصلاحی "شریف زادہ" کو چھوڑ کر جسے ناول کہنا بھی درست نہیں باقی ناولوں

امراؤجان، ذاتِ شریف، افشائے راز اور اختری بیگم کا پلاٹ تمام تر معاشی و خانگی ہی ہے۔ اور ناول میں بجز حسن و عشق کے مضامین اور ہجر و وصل کی داستانوں کے اور ہوتا کیا ہے؟ خیال ہوتا ہوگا کہ ان ناولوں میں نوجوانوں کے لبھانے اور نوعمروں کے جذبات نفسانی کے بھڑکانے کا سامان افراط سے موجود ہوگا۔ لیکن توبہ کیجیے فحش و عریانی الگ ہی رکاکت و ابتذال بھی کہیں آنے نہیں پایا اور کہیں دو ایک جگہ جہاں صحیح مصوّری اور سچی عکاسی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا وہاں بھی اندازِ بیان زیادہ سے زیادہ لطیف اشارہ و کنایہ کا رکھا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں کوئی گندی نالی پڑ گئی ہے اور آپ ہیں کہ رومال ناک سے لگائے لپ جھپ لمبے لمبے ڈگ رکھتے اس سے گزرے چلے جا رہے ہیں۔ تقریباً ہر افسانہ شریف گھرانوں میں بار پانے کے قابل پڑھتے جایئے، اور حیاتِ بشری میں درک و بصیرت حاصل کرتے جایئے۔ آپ ادھر افسانہ کی لذت میں محو رہیں گے اور ادھر عبرت و ہدایت کے گھونٹ بلا تکلف حلق سے اترتے چلے جائیں گے۔ کونین کی گولی پر شکر اس طرح لپیٹی ہے کہ بڑے سے بڑے ضدی بچے بھی اسکو دیکھ کر پھسل پڑیں اور مچل مچل کر اس کی طرف لپکیں۔ ناصح کی تلخ نوائیوں کا رونا سب روتے آئے ہیں۔ یہاں حضرت ناصح گھُل مل کر اور رازدار بن جاتے ہیں اور چپکے چپکے سرگوشیوں میں سب کچھ کہہ سن ڈالتے ہیں ـــــ کیا مولیٰ کی کریمی اور کارسازی ہے غالبؔ نے کہا تھا کہ

ع قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

یہاں "ہادی" "رسوا" ہو کر بھی ہادی ہی بنا رہا!

مشاعرے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے ایک مشاعرہ کا نقشہ، مرزا صاحب کا کھینچا ہوا تصوّر کی آنکھوں سے ملاحظہ فرمایئے:

"گرمیوں کے دن تھے مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا کاغذی ہانڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں ڈھکنوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خمے حقّوں کے نیچوں میں پانی پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے چاندنی رات تھی اس لیے

روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک سفید کنول دورے کے لیے روشن کر دیا
گیا تھا آٹھ بجتے بجتے سب احباب، میر صاحب، آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب
پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے پہلے شیر فالودہ کے ایک پیالے کا دور چلا
پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔"

رسمی انکسار کے بعد شعر سنائے جا رہے ہیں اور داد بھی خوب مل رہی ہے اسی انداز سے اور انھیں پچے تلے
لفظوں میں جو مشاعروں کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں بے تکلف احباب ہیں آپس میں نوک جھوک بھی چلی
جا رہی ہے۔ کلام سارے کا سارا خود جناب رسوا کا ہے اسی کو مختلف اصحاب کی زبان سے ادا کرایا ہے،
امراؤ جان کا تخلص ادا رکھا ہے کسی صاحب کے نہ مقطع میں مخمور باندھا ہے۔ افسانہ گوئی کے وقت اپنے کو رسوا
کے پردہ میں چھپاتے تھے شاعری کی دنیا میں اپنا نام مرزا کہہ کر چمکایا ہے خوب خوب شعر نکالے ہیں کچھ ادھر
اُدھر سے ملاحظہ ہوں:

دل میں کھپ جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک	کارگر ہوگا کبھی تیرِ قضا ایک نہ ایک
کوئی حوروں پہ فدا کوئی بتوں پر شیدا	ڈھونڈ ہی لیتا ہے انسان خدا ایک نہ ایک

لطف زبان و لطف مضمون دونوں موجود۔ چھوٹی بحروں میں تو شناوری بہت ہی خوب کی ہے۔

شب فرقت بسر نہیں ہوتی!	نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
شورِ فریاد تا فلک پہونچا	مگر اس کو خبر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا	زندگی یوں بسر نہیں ہوتی!
ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی	کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی
اب کس امید پر نظر میری	شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر	کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی
اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے	دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

بعض مشاعروں میں غزل کا ضمیمہ ہزل بھی ہوتی ہے۔ غزل کا نمونہ آپ نے دیکھ لیا۔ متانت بزم اگر
اجازت دے تو دو شعر ذری ہزل کے بھی سنتے چلیے۔

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر ہو پیدا	ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

یہ کیا خوب دوئی میں وحدت دکھائی ہے اور وحدت سے دوئی نکالی ہے!

کبھی گالی سُنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے ۔۔۔ حکومت کا مزا آئے اگر معشوق ازدل ہو

کسی عاشق نے کبھی کیوں اپنی شرافت کی یہ کفش کاری کی ہوگی!

یقین ہے کہ نہ ایسے قافیے آپ کے سُننے میں آئے ہوں گے نہ مضمون کی یہ نازک خیالیاں!

ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے کہ مرزا صاحب افسانہ نویسوں کے حلقہ میں رسوا تھے اور شاعری کی بزم میں مرزا۔ متعدد نظمیں، مثنویاں وغیرہ افسانوں سے بہت قبل کی کہی ہوئی ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں ایک مستقل منظوم ڈراما 'مرقع لیلیٰ مجنوں' کے نام سے لکھا یہ غالباً پہلی تصنیفی کوشش تھی۔ نومشقی کے آثار جابجا نظر آرہے ہیں، اور سن بھی یقیناً نوجوانی کا رہا ہوگا پھر بھی کلام بحیثیت مجموعی پختہ اور استادانہ ہے لکھنو کی شاعری کا اس وقت عام رنگ کیا تھا؟ اب کس کے منہ میں دانت ہیں جو اسے صاف صاف بیان کرے مرزا کی نے آنکھیں جس فضا میں کھولی تھیں اور نشو و نما جس ماحول میں پایا تھا چاہیے تھا کہ خود بھی آنکھ بند کرکے اسی ڈھرے پر چل پڑتے لیکن خدا کی قدرت کہ جب محفل کے گرمانے کو اٹھے تو گل و بلبل، مہندی و سُرمہ، ڈوپٹہ اور آنچل کے مصنوعی مضامین کی جگہ دل کے جذبات اور قلب کے واردات ہی موزوں ہوکر زبان و دہن سے نکلے ؎

دن رات سیر کرکے سفید و سیاہ کی ؎	تصویر کھینچتے ہیں تیرے جلوہ گاہ کی ؎
کیا کیا کیا ہے نامہ اعمال کو سیاہ	ہم شاعروں کو فکر رہی ہے گناہ کی!
میری غزل دلوں پہ نہ کیوں کر اثر کرے	صورت ہے ہو بہو مرے حالِ تباہ کی!

لیلیٰ مجنوں کا افسانۂ محبت کسے نہیں معلوم ڈراما میں وہی قصہ منظوم ہے جو عام طور پر زبان زد ہے۔ جابجا اپنی غزل بھی سُناتے گئے ہیں۔ قصہ کے اجزاء کا دہرانا یہاں منظور نہیں، سیکڑوں مرتبہ کے سُنے ہوئے پامال قصہ کے دُہرانے میں لطف ہی کیا ہے البتہ مرزا نے آج[1] نہیں آج سے ۴۵ سال قبل جو اصلاح لکھنؤ کے رنگ تغزل میں کردی تھی ذرا اس پر ایک اچٹتی سی نظر کر لیجیے ؎

---

[1] یعنی ۱۹۳۲ء

بے نوائی ہو معتدریں تو کیجیے عاشقی
یہ بہانہ خوب ہے ذلت اٹھانے کے لیے

اپنے صورت گر سے پوچھوں میں اگر مقدور ہو
کیا بنایا تھا مجھے تو نے مٹانے کے لیے

ہجر کی شب کے بنانے میں بھی تھی اک مصلحت
طول آخر چاہیے تھا کچھ زمانے کے لیے

کہیں کہیں بے ساختہ اپنے معاصروں کی بولی بھی بول گئے ہیں۔ مثلاً

عشق کا کل یہ وہ سودا ہے کہ جاتا ہی نہیں
مار سے قید سے زنجیر سے کیا ہوتا ہے

کیا سنائیں تمھیں افسانہ ہجر کا کل
ایسی الجھی ہوئی تقریر سے کیا ہوتا ہے

لیکن عام انداز یہ ہے ؎

دیکھیے عالم تقدیر سے کیا ہوتا ہے
لاکھ تدبیر ہو، تدبیر سے کیا ہوتا ہے

اب سنا ہے کہ جفا سے بھی پشیمان ہیں وہ
اور پھر آہ کی تاثیر سے کیا ہوتا ہے

گوش مشتاقِ سخن دل متمنیٔ وصال
تو ہی کہہ دے تیری تصویر سے کیا ہوتا ہے

کچھ کھٹک سی ہے کلیجہ میں مگر زخم نہیں
کیا بتائیں کہ ترے تیر سے کیا ہوتا ہے

قصے نثر میں ہوں یا نظم میں، ظرافت اور شوخی اگر ان کی جان نہیں تو ان کے لیے عرض لازم سے کم بھی نہیں۔ بلکہ جو ناٹک اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں ان میں تو کامک کا درجہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے اور عاشقانہ مثنویوں میں تو شوخی کے ڈانڈے اکثر عریانی اور فحاشی سے مل مل گئے ہیں۔ مرزا صاحب ظرافت پر آتے ہیں تو ہنساتے ہی نہیں ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے ہیں۔ ایک بازاری منچلا طرار نامے کہ اسٹیج پر آتا ہے اور شرم وحیا کا جامہ اتار، باپ کے سامنے اپنی آشنا خیلا کا نام لیتا ہے اور پھر انھیں والد ماجد سے فرمائش یہ ہوتی ہے کہ ان سے ملوا دیا جائے! زبان، لب ولہجہ، الفاظ سب کے ٹھاٹھ وہی بازاریت اور لچپن کے ہیں کہتا ہے ؎

مجھے خیلا سے ملوا دے ابے باوا ابے باوا
نہیں تو ہاتھ دھو مجھ سے ابے باوا ابے باوا

نہ میں بیٹا ہوں پھر تیرا نہ تو باوا ہے پھر میرا
جو کی پہلو تہی تو نے ابے باوا ابے باوا

جیسی روح ویسے فرشتے۔ پدر بزرگوار آخر ان کے بھی باپ تھے جناب خونخوار خاں صاحب ایک پدرانہ دم خم کے ساتھ تن کر کھڑے ہوتے ہیں اور اگر پسر نتواند پدر تمام کند کے مصداق جواب اسی زبان میں دیتے ہیں ؎

یہ کیا انداز ہیں تیرے، ابے مردک ابے گرگے
یہ کیسے سیکھے ہیں شیوے ابے مردک ابے گرگے

ابے باوا اے باوا یہ کیا بکتا ہے تو مرغے
ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے

سعادت اطوار بلند اقبال، اکڑ اکڑ کر اپنا فخریہ سناتے ہیں ؎

. . . . اڑائے خوب کنکوّے ابے باوا ابے باوا

بڑھیا سات تاری پر تو اکثر تبیلی کاٹی ! دیئے وہ ڈور پر مانجھے ابے باوا ابے باوا

لڑا میدان جب راجہ سے اور نواب ولہاسے نکالے ہم نے بھی لگّے ابے باوا ابے باوا

کبوتر کی ہوا آئی تو لے کر ہاتھ میں چھیپی اڑائے خوب ہی پھٹّے ابے باوا ابے باوا

ہوا جب راگ کا لہرا ملے ہم تان سینجاں سے بڑھائے خوب یارانے ابے باوا ابے باوا

ہوا یاروں میں جب رہنا چرایا ماں کا سب گہنا اُڑائے خوب گلچھرے ابے باوا ابے باوا

خونخوار خاں اب پورے خونخوار بنے ہوئے دانت پیس پیس کر گرجتے ہیں ؎

گھرانے کی مٹائی آبرو کم بخت یوں تو نے ابے تجھ سے خدا سمجھے ابے مردک ابے گرگے

اڑاتا ہے کبوتر تو لڑاتا ہے بٹیریں تو ابے او اُلّو کے پٹھّے ابے مردک ابے گرگے

سُناتا ہے ہمیں کیوں تو ہمیں کیا کام ہے اس سے ابے او مرغی کے بچّے ابے مردک ابے گرگے

ابے کیا کالا پانی پی کے تو آیا بھٹّی سے یہ کیسے آتے ہیں بھبکے ابے مردک ابے گرگے

ابے بیٹا ہے تو کس کا غلط ہے یہ تیرا دعویٰ ہمارا نہ ہم تیرے ابے مردک ابے گرگے

اور مصرعہ تو یہ ارشاد ہوا ہے۔ ؎ ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے !

کسی چمن اور سبزہ زار کی سیر کرتے کرتے دفعتہً آپ کے قدم ایک گندی گلی میں آپڑیں تو آپ بے اختیار یہی چاہیں گے کہ کہیں جلدی سے اتنا راستہ ختم ہو اور آپ پھر کھلی ہوئی خوشبودار ہوا سے اپنے مشامِ جاں کو معطر کرنے لگیں عجب نہیں کہ اس منظر سے بھی آپ کچھ اسی طرح بیزار ہوئے ہوں۔ لیکن یہ محض آپ کے قدیم مشرقی معیار کا اثر ہے جو ایسے منظر تکلیف دہ نظر آئے۔ اِس روئے زمین پر ایسے ایسے ملک بھی آباد ہیں جہاں نہ باپ کا ادب کوئی چیز ہے نہ بزرگوں کا لحاظ بے باکی و بے تمیزی کا نام وہاں کی اصطلاح میں عین آزادی اور آزاد خیالی ہے۔ اور اب بیسویں صدی عیسوی کا وسط طے کر لینے کے بعد خود آپ کا ملک ان منظروں سے ناآشنا کب رہا ہے ؟

مرزا صاحب نرے شاعر یا افسانہ نویس نہ تھے۔ فلسفہ و حکمت کے بھی رازدار تھے اور یہ رنگ بھی اُن کا

کہیں چھپتا نہیں ہے۔ مثنوی ہو یا غزل، ڈرامہ ہو یا افسانہ سب کہیں پھوٹ ہی آتا ہے۔ مجنوں کی حیرانیاں دکھاتے دکھاتے دفعتہً یہ خیال آگیا کہ مجنوں تو مجنوں تھا ہی جو بڑے بڑے ہوشیار اور فرزانۂ روزگار مانے گئے ہیں انھوں نے بھی اس کارخانہ حیرت کے سمجھنے میں کیسے کیسے غوطے کھائے ہیں یہاں تک کہ بعض بعض تو ایسے بہکے کہ سرے سے صانع عالم ہی کے وجود سے انکار کر بیٹھے ان دانشمندوں کی تردید انھیں کی زبان و اصطلاحات میں ملاحظہ ہو ؎

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے
وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دُنیا کیا ہے

تو یہ کہتا ہے ہیولیٰ کے یہ سب ہیں دھوکے
پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکا ہے یہ دھوکا کیا ہے

پھر کہا تو نے کہ دیکھا نہیں خالق کو کبھی!
اِک ذرا غور تو کر جی میں تو کہتا کیا ہے

تو نے دیکھا ہے انرجی و ہیولیٰ کو کبھی
پھر جو قائل ہے تو اس کا تجھے سودا کیا ہے

بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی
تجربہ ہم کو بتا دے کہ بتاتا کیا ہے

مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا!
پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے

اس کا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن
پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

مُرقع کا خاتمہ لیلیٰ کی موت پر ہوتا ہے۔ وفاداری عاشق کی ضرب المثل ہے لیکن یہاں محبوب بھی پیکر وفا ہے۔ نوجوان لیلیٰ ناشاد دلِ ہرادہ دنیا سے رخصت ہو رہی ہے، باپ کا محل کا محل بھرا ہوا ہے اسی محل کے ایک گوشہ میں یہ حسرت نصیب دم توڑ رہی ہے۔ دم واپسیں ہے اور اس وقت یہ بول نوعمر و ناشاد مرنے والی کی زبان سے نکل رہے ہیں۔

ہم نہیں ان میں جو ہیں موت سے ڈرنے والے
اس کا کیا غم، یونہی مر جاتے ہیں مرنے والے

ہے خوشی موت کی خود زیست سے بیزار ہیں ہم
دم ٹھہر جائے، تو ہم کب ہیں ٹھہرنے والے

اب تو ٹھنڈک پڑی جی میں کہ ہوئے ہم برباد
آج تو خوش ہوئے الزام کے دھرنے والے

لو کہے دیتے ہیں۔ ہم قیس پہ دم دیتے تھے
اب کدھر بیٹھے ہیں رُسوا، ہمیں کرنے والے

پاک اُلفت تھی ہمیں اس کا خدا عالم ہے
پاک دل ہوتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے

غسلِ میّت مجھے دیتا ہے مرا دیدۂ تر
دیکھو اس طرح نکھرتے ہیں نکھرنے والے

اُجلا اُجلا وہ کفن اور وہ پھولوں کی مہک
مر کے بھی آہ سنورتے ہیں سنورنے والے

مجنوں دُور سہی اس کا تصوّر تو پاس ہے اس خیالی پیکر سے جو جو وصیتیں ہو رہی ہیں انھیں ذرا دل کڑا کر کے سُن لیجیے ؎

مرے مجنوں کو مرے بعد یہ دینا پیغام | اے محبّت میں مری حد سے گزرنے والے
تجھ پہ لیلیٰ ہوئی قربان تیری جان سے دُور | دیکھ یوں بات پہ مر جاتے ہیں مرنے والے
بیوفا تو تو کہا کرتا تھا ہم کو اے قیس | تو سلامت رہے اے نام کے دھرنے والے
حشر کے دن تجھے اللہ سے لیں گے اے قیس | صبر کر صبر کہ یہ دن ہیں گزرنے والے
تو نہ کڑھنا تجھے میری غم الفت کی قسم | اس کا کیا غم یونہی مر جاتے ہیں مرنے والے

مصنف "عشق مجازی کا قصہ" لکھنے بیٹھا تھا اس کے ختم ہوتے ہی مصنف کو خود اپنے افسانۂ حیات کے انجام کا خیال آجاتا ہے اور آداب افسانہ نگاری بھول بھال بے اختیار ہو ایک ٹھیٹھ مشرقی اور ایک سچے کلمہ گو کی شان سے نظم میں نہیں نثر میں ناظرین سے التجا کرنے لگتا ہے کہ "اے ناظرین والا تمکین میں دعا کرتا ہوں اور تم آمین کہنا کہ جس طرح عشق مجازی میں مجنوں کا انجام ہوا اسی طرح عشق حقیقی میں ہمارا تمہارا خاتمہ بالخیر ہو آمین ثم آمین"۔ —— "ترقی پسند" بالکل معذور ہے اگر وہ ایسے "مُلّانے" کو ڈراما نویسوں میں ادنیٰ درجہ دینے سے بھی انکار کر دے!

لیلیٰ و مجنوں پر فاتحہ تو پڑھیے ان غریبوں کو صدیاں ہو چکیں مرزا صاحب کا اصلی میدان ماضی نہیں حال تھا، پردیس نہیں دیس تھا۔ لکھنؤ آپ کا خوب دیکھا بھالا ہوا ہے آئیے ایک مرتبہ اس کی سیر مرزا صاحب کی رہنمائی میں کریں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ لکھنؤ سنہ ۱۹۵۳ء کا نہیں اس سے ۷۰، ۷۵ سال قبل کا ہے۔ بہر حال اس لکھنؤ کی گلی گلی ان کی چھانی ہوئی ہے۔ ان سے بہتر رہنما یہاں کی سیر کے لیے کون ملے گا۔ سب سے پہلے ایک حکیم صاحب سے نیاز حاصل کرتے چلیے دیکھا آپ نے بھی انھیں بارہا ہوگا۔ تعارف اب مرزا صاحب کرائے دیتے ہیں۔

"میانہ قد گندمی رنگ، الفربہ، ناک نقشے میں کسی قدر بھدا پن، گول چہرہ آنکھیں کسی قدر چھوٹی سن شریف چالیس سے کچھ اوپر اس نسبت سے توند کی استدارت اور ضخامت کو بھی قیاس کر لیجیے مگر اپنی صورت شکل پر حد سے زیادہ نازاں تھے۔ اکثر اوقات آئینہ پیش نظر رہتا تھا۔ کسی قدر شریعت مزاج میں تھی اس لیے داڑھی منڈوائی تو نہ جاتی تھی مگر اس قدر باریک کترواتے تھے کہ اگر خوردبین سے دیکھی جائے تو بھی بمشکل نظر آئے۔ موچھوں میں سفید بال اس کثرت سے تھے کہ ان کو چنتے چنتے حجام عاجز ہو جاتا تھا۔

خضاب کی کئی مرتبہ صلاح دی گئی مگر اس کی نوبت ابھی تک نہ آئی تھی یا تو کوئی مجرب نسخہ دستیاب نہوا تھا یا یہ کہ حکیم صاحب اس کو علامت پیری تصور کرتے تھے اور بالوں کی سفیدی ایک امر عارضی تھا ابھی حکیم صاحب کا سن ہی کیا تھا۔ خوش غلافی میں بھی حکیم صاحب اہتمام مزید فرماتے تھے۔ کپڑوں کی قطع و برید کا بھی اچھا سلیقہ تھا اچھے اچھے درزی ان کے کپڑے بیونتتے ہوئے گھبراتے تھے۔ انگرکھا جس کی چولی نہایت تقاہت اور بانکپن کی وضع میں حد فاصل ہو اس تناسب کو حکیم صاحب سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ یہ سب سامان اس لیے تھا کہ آپ کو مالدار عورتوں کی صیادی کا نہایت شوق تھا آپ کی ہمت مردانہ ہر وقت اس طرف مبذول رہتی تھی کہ کوئی وثیقہ دار بیگم پھنس جائے تاکہ مدت العمر چین سے بسر ہو۔ اکثر جگہ پیغام سلام تھا مگر ابھی تک کوئی سونے کی چڑیا جال میں نہ پھنسی تھی۔"

حلیہ مبارک تو اب غالباً ذہن سے کبھی نہ نکلے۔ لگے ہاتھ جناب حکیم صاحب کے مطب کی بھی زیارت ہوتی چلے اور حکیم صاحب کے احباب اور خدمت گار خاص میاں نبی بخش سے بھی یاد اللہ ہو جائے تو بہتر ہے ایسے موقعے روز نہیں ملا کرتے۔

"ابھی حکیم صاحب گھر سے برآمد ہو کے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں آدمی نے حقہ بھر کے سامنے رکھ دیا ہے حکیم صاحب نے حقہ کے دو ہی ایک کش پیئے ہوں گے کہ دو صاحب اور اپنے اپنے گھروں سے نکل کر بعد معمولی سلام علیک اور مزاج پرسی کے سامنے مونڈھوں پر آ بیٹھے ان میں سے بھی ایک صاحب کے ہاتھ میں ڈیڑھ خمہ حقہ ہے خوب سلگا ہوا۔

حکیم صاحب۔ میر صاحب واللہ آپ کا حقہ تو اس وقت قیامت کر رہا ہے۔

میر صاحب۔ (حقہ حکیم صاحب کے سامنے لا کے) لیجیے ملاحظہ فرمائیے۔

حکیم صاحب۔ جی تو یوں ہی چاہتا تھا تو پھر (اپنے حقہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ حقہ۔

میر صاحب۔ مجھے مرحمت ہو

حکیم صاحب۔ خدا جانے نبی بخش (خدمت گار) کس طرح حقہ بھرتے ہیں ڈیڑھ پہر ہو گیا ابھی تک سلگا ہی نہیں۔

نبی بخش۔ (زیر لب مسکرا کر) اے حضور ابھی تو بھر کے رکھا ہے بھاری تو ہے سلگتے سلگتے سلگے گا لائیے پھونک دوں اگر ایسا ہی جلدی کا شوق ہے تو سلفہ بھروا لیا کیجیے۔ نبی بخش حقہ سے چلم اتار کے

پہلے ہی تھے کہ میر صاحب نے چلم ہاتھ سے لے لی۔

میر صاحب۔ اب کیا حقّہ کو غارت کروگے دیکھو میں درست کیے دیتا ہوں۔

حکیم صاحب۔ آپ نہ تکلیف فرمایئے درست ہو جائے گا (نبی بخش کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا)

نبی بخش پھر چلم لینے کو بڑھے تھے کہ۔

میر صاحب۔ نہیں تم رہنے دو میں دُرست کرلوں گا۔

داروغہ صاحب (دوسرے صاحب جو ابھی تک چپکے بیٹھے تھے) یہ ممکن نہیں اب میر صاحب چلم کی جان نہ چھوڑیں گے۔

حکیم صاحب۔ اس میں تو شک نہیں کہ جیسا شوق حقّہ کا ہمارے جناب میر صاحب کو ہے ایسا بھی کم ہوتا ہے۔

داروغہ صاحب۔ کیوں نہ ہو۔ افیون کے شوق میں جزو اعظم ہے۔

حکیم صاحب۔ اس میں تو شک نہیں افیونی جیسے حقّے کے قدر شناس ہوتے ہیں اور کوئی کم نہیں ہوتا۔

داروغہ صاحب۔ قدر شناس نہ کہیے نبض شناس فرمایئے حقّہ کی دیکھ بھال بھی انھیں کے حصّہ میں ہے۔

مرزا صاحب۔ (اور ایک صاحب جو ابھی آکے سامنے داروغہ صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے ہیں) یوں کہیے کہ حقّہ کے حق میں مسیحا ہیں۔

میر صاحب۔ اے زندہ باش۔

حکیم صاحب۔ (مسکرا کے) درست۔

داروغہ صاحب۔ میر صاحب کے لطیفے بھی قیامت کے ہوتے ہیں یہ مسیحا کے واسطے زندہ باش کیا خوب![1]

فرمایئے یہ آپ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں یا واقعۃً اپنے کو جناب حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھا ہوا پا رہے ہیں؟ ہر تصویر بولتی ہوئی، ہر پیکر بےجان میں جان پڑی ہوئی!

---

[1] یہ حکیم صاحب بھی ایک ہی کا جالینوس تھے۔ ذہانت اور جعلسازی کے معجون مرکب عیاروں کے عیار اور جعلیوں کے استاد۔ شہر کے ایک نامی رئیس کا انتقال ہوا۔ اور آپ نے ان کی ادھیڑ سن بیوہ سے عقد کی ٹھانی بیگم صاحبہ پر نہیں ان کی جائداد پر لٹو ہو کر۔ نفس ناطقہ میاں نبی بخش اس خدمت پر مامور ہوئے کہ ڈیوڑھی پر

جاکر پہلے بی امامن مہری کو گانٹھیں اور ان کے ذریعہ سے نامہ و پیام شروع ہو۔ اور صاحب جائداد بیگم پر ڈورے ڈالے جائیں۔ میاں نبی بخش تقریر کرنے میں بقراط تھے لیکن جوڑ توڑ سوجھ بوجھ میں امامن کے پاسنگ کے برابر بھی نہ تھے۔ مہری حکمت اور فطرت کی پرَ باتھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے خادم اور آقا کو خوب سبز باغ دکھائے۔ حکیم صاحب قبلہ مگن رہے کہ پینگ بیگم صاحبہ سے بڑھ رہے ہیں اور معاشقہ کا لمڈورا ان کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور نکاح ۲۵ ہزار کے مہر پر بالآخر ہو اکس کے ساتھ۔ بیگم کی ایک پیش خدمت چٹھی نویس کے ساتھ! آخر راز کھلتا ہے اور حکیم صاحب کی حکمت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ناول میں دوسرا قصہ بیگم صاحب کے صاحبزادے چھوٹے نواب اور ان کی عشق بازیوں کا چلتا ہے۔ چھوٹے نواب صاحب ہر طرف سے جعلیوں سے گھرے ہوئے ہیں اور شاہ جن کی صاحبزادی سبز قبا پر عاشق ہوئے ہیں۔ لاکھوں کی جائداد دیکھتے دیکھتے تباہ ہو کر رہ جاتی ہے ـــــ "صاحب" کے دیس میں یعنی یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر خدا جانے کتنے واقعات اس طرح کے صبح و شام پیش آتے رہتے ہیں۔ وہاں کے افسانوں کو نہیں روزنامہ اخبارات کی رپورٹوں کو اٹھا کر دیکھیے تو جعلسازی اور حرفت کی داستانیں اس سے کہیں بڑھی چڑھی ہوئی نظر آئیں گی لیکن مشرق اور لکھنؤ کے معیار سے یہی بہت تھا۔ مرزا صاحب نے قصہ کا نام ذات شریف رکھا ہے۔ اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ جہاں تک لکھنؤ کی ذہانت اور زیرکی کے تاریک رُخ کا تعلق ہے انھوں نے مصوری کا حق ادا کر دیا ہے اور جعلیوں کے پورے پورے اعمال نامے مرتب کر دیئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اہل فرنگ کے ہتھکنڈوں پر نظر ہو تو یہاں کے بڑے سے بڑے "ذاتِ شریف" بھی "شریف زادے" ہی نظر آئیں!

لیکن لکھنؤ کی مصوری، مرزا صاحب کے قلم سے بالکل ہی ناقص و ناتمام رہے گی اگر افشاءِ راز کے پردے اُٹھ کر نہ رہیں۔ یہ ناول مرزا صاحب کی ناول نویسی کے ابتدائی دَور کا ہے یعنی ۱۸۹۶ء کا لیکن افسانہ نگار کے کمالات مصوری کا اصلی مرقع، اِسے آپ بیتی کہنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے پردے میں مصنّف اپنا ہی پورا افسانۂ زندگی سُنا دینا چاہتے تھے۔ مگر چند ہی باب لکھنے پائے تھے کہ کسی مصلحت یا مجبوری سے قلم رُک گیا اور پھر مرزا صاحب اور اور کاموں میں پھنس گئے اس طرح جو راز افشا ہونے تھے وہ قیامت تک کے لیے سربستہ رہ گئے۔ مرزا صاحب نے اپنا نام سید محمد ذکی فرض کیا ہے اور صورت قصہ یہ رکھی ہے کہ سید صاحب موصوف کہیں غائب ہو گئے ہیں لیکن اپنی مفقود الخبری سے قبل اپنے ایک دوست مرزا رسوا صاحب سے فرمائش

کر گئے ہیں کہ ان کی سوانح عمری مرتب کر دیں۔ اور اسلوب بیان وغیرہ کے باب میں کچھ ہدایتیں بھی زیب قلم فرما گئے ہیں۔ لکھنؤ کی معاشرت کی اصلی جھلک اس کتاب کے اوراق میں نظر آتی ہے جہاں جو تصویر کھینچی ہے بس وہ عین مین صورت ہی ہے۔ سنتے ہیں کہ نقل کا کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو لیکن اس استاد کے کمال مصوری کو دیکھ کر جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ وہ اصل ہی کیا جو اس نقل کے مطابق نہ ہو! ــــ آپ کو دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہو رہا ہے اچھا تو آیئے مرزا صاحب کی رہنمائی میں نواب سلطان مرزا صاحب کے دولت خانہ کی سیر کر لیجیے۔ سیر ذرا طویل ہو گی لیکن امید ہے کہ منظر کی دلکشی طبیعت کو ملول نہ ہونے دے گی۔

نواب۔ حسین علی

حسین علی۔ حضور

نواب۔ بھئی آج بالی ہے؟

حسین علی۔ جی ہاں

نواب۔ بھئی ہمارے کپڑے منگاؤ۔

حسین علی۔ ڈیوڑھی پہ جا کے (زور سے چلا کے) حسینی نواب صاحب کی پوشاک دے جاؤ۔ "پوشاک"

سُرخ کمخواب کا دگلہ بہت ہی پُرانا جس کی بوٹیوں سے سنہرے تار بالکل جھڑ گئے تھے صرف ریشمی کام باقی تھا وہ بھی گیا ہوا سبز گرنٹ کی گوٹ کی لہریں اڑی ہوئیں۔ گلبدن کا پاجامہ سُرخ شالباف کا نیفہ، کارچوبی مندیل، مگر دادا جان کی وقت کی۔ ٹاٹبافی جوتہ، مقیشی پھندنے، کوئی سال بھر کا پہنا ہوا۔

نواب۔ (مندیل کو دیکھ کے) بھئی یہ درباری ٹوپی کیوں منگوائی دو پلڑی منگوالو۔

حسین علی۔ دیکھیے یہیں ہو گی تکیے کے نیچے۔

نواب۔ ارے بھائی دیکھتے ہو میرے ہاتھ میں بٹیر ہے تمھیں نکال دو۔

حسین علی۔ (پلنگ کے سرہانے جا کے) امراؤ جان لے اُٹھیے نواب صاحب کی ٹوپی ڈھونڈ دیجیے۔

اُمراؤ جان۔ (انگڑائی لے کے آنکھیں مگر نہایت ہی برہم اور اُٹھنے کے ساتھ ہی ایک گھونسا حسین علی کے رسید کر دیا) نگوڑ مارا سونے نہیں دیتا۔ بھاڑ میں جائے ٹوپی میں کیا جانوں ٹوپی کہاں ہے۔

حسین علی۔ لے لو! ناحق بن ناحق کو مارتی ہیں۔ میں نے جانا آپ کے پاس ہو گی۔

امراؤ جان۔ مردے کی شامت آئی ہیں میں ٹوپی کو لے کے سوئی تھی میں کیا جانوں کہاں ہے (یہ کہکر پھر لیٹ گئیں)

لے ذرا لحاف اڑھا دے۔

ٹوپی واقعی تکیہ کے نیچے نہ تھی پلنگ کی پٹّی کے پاس گنوں کے چھلکوں پر پڑی تھی۔

یہ اس کمرے کا ذکر ہے جہاں نواب صاحب بہ نفسِ نفیس مع امراؤ جان صاحبہ کے آرام کرتے تھے۔

نواب۔ حسین علی۔

حسین علی۔ حاضر۔

نواب۔ دیکھو تو کھانا تیّار ہے۔

حسین علی۔ (ڈیوڑھی جا کے پھر زور سے پکار کے) حسینی نواب صاحب پوچھتے ہیں خاصہ تیار ہے۔

حسینی۔ خاصہ تو ابھی نہیں تیار ہے۔ نواب صاحب کو اندر بھیج دو۔

حسین علی۔ (نواب صاحب کے پاس جا کے) حضور محل میں تشریف لے جائیے۔

نواب۔ کیوں کیا کوئی بُلاتا ہے۔

حسین علی۔ جی ہاں بُلایا ہے۔

نواب۔ پوچھو تو کون بُلاتا ہے۔ کیوں بُلایا ہے۔ ڈھیلا سا کھینچ مارا گھر میں جائیے۔

حسین علی۔ (ڈیوڑھی پر پھر جا کے) نواب صاحب پوچھتے ہیں کس نے بُلایا ہے۔

حسینی۔ کہدو بیگم صاحب نے بُلایا ہے۔

حسین علی۔ حضور بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔

نواب۔ یاد کیا ہے۔ میاں تم کو بھی بات کرنے کی تمیز آج تک نہ آئی۔ بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔ بیگم صاحب میری اماں جان ہیں۔ کہ انھوں نے یاد کیا ہے۔ ارے بھئی جو کوئی بڑا بُلاتا ہے تو اُسے کہتے ہیں یاد کیا ہے اور جو برابر والا یا چھوٹا بُلاتا ہے تو اُسے کہتے ہیں بُلایا ہے۔

حسین علی۔ درُست! اب حضور کی صحبت میں رہوں تو سب سیکھ جاؤں گا۔

اتنے میں نواب صاحب کے ایک رفیقِ قدیم حسن خاں صاحب تشریف لائے۔

نواب۔ خاں صاحب ذرا میاں حسین علی کی تمیز داری دیکھئے گا فرماتے ہیں بیگم صاحب نے یاد کیا ہے

خاں صاحب۔ (حسین علی کی طرف نگاہ غیظ سے دیکھ کے) کیوں بھئی!

حسین علی۔ خاں صاحب مجھے کیا معلوم۔ وہ حسینی نے تو یہی کہا تھا کہ بُلایا ہے، میری بے وقوفی میں نے

کہہ دیا کہ یاد کیا ہے۔

نواب۔ یاد کیا ہے! یاد کیا ہے! اماں جان نے یاد کیا ہے (یہ جملہ دو بارہ اس لیے ارشاد ہوا کہ فقرہ چست تھا مگر اس کی داد ابھی تک نہیں ملی تھی حسین علی بدتمیز اس کی نزاکت کو کیا سمجھتا مسکرا کے چُپ ہو رہا تھا اور خان صاحب پُرانے پھندیت یا بقول امراؤ جان پُرانے کھوسٹ تھے)

خاں صاحب۔ (ایک قہقہہ لگا کے) واللہ نواب خوب کہی (اور پھر ایک قہقہہ)

نواب صاحب۔ بھئی خان صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ تمیز داری اب دنیا سے اُٹھ گئی وہ آپ کو یاد ہے ہمارے باوا جان کے وقت کا خدمت گار۔ اجی وہی بھلا سا نام تھا۔

خاں صاحب۔ کریم بخش کہیے۔

نواب۔ نہیں نہیں! کریم بخش نہیں وہ تو اب نوکر ہوا تھا جی وہ بڈھا سا آدمی تھا۔ باہر کا رہنے والا۔ (اس وقت علی حسین اس کمرے میں تھا جہاں امراؤ جان آرام کرتی تھیں کیونکہ اب وہ بیدار ہو چکی تھیں اور حسین علی نے جا کے حقہ لگایا تھا)

امراؤ۔ نواب اس وقت ہیں کہاں؟

حسین علی۔ وہ کیا دالان میں ہیں جہاں مرغوں کے ٹاپے بٹیروں کی کابکیں ہیں۔

امراؤ۔ جبھی اور یہ موا کھوسٹ بھی پہونچ گیا۔ ہاں آج پالی کا دن ہے نا؟

نواب۔ اجی وہی کرم علی بیگ آپ کو یاد ہے نہ؟

خان۔ یہ خوب کہی۔ آپ کو اچھی طرح یاد ہے آپ کا سن ہی کیا تھا اس زمانے میں۔

نواب۔ اور آپ کا سن کیا تھا؟

خان۔ میں جوان تھا۔ داڑھی مونچھیں نکل چکی تھیں۔

نواب۔ تو یہ کہیے آپ مجھ سے بڑے ہیں۔

خان۔ اس میں کیا شک ہے۔ ایسا ہوں کہ آپ کے باوا جان کے پاس نوکر تھا۔

نواب۔ اور نوکر آپ کا ہے میں تھے مشعلچیوں میں؟ نان پزوں میں؟

خان۔ آپ کو یاد نہیں رکاب داروں میں۔ آخر آپ کا عہدہ کیا تھا؟

نواب (ہنسکے) ابے تو بتاتا کیوں نہیں کاہے میں نوکر تھا۔

خان ۔ سبحان اللہ! یہ ابھی خدمت گار کو ادب قاعدہ سکھایا جاتا تھا اور خود نواب صاحب کی زبان
کیا آراستہ ہے یہ لبے تبے کیسی؟ مرد آدمیوں سے یونہی گفتگو کرتے ہیں۔

نواب ۔ تو آپ میرے مصاحب نہیں اتالیق ہیں۔

خان ۔ اتالیق نہ سہی مرد آدمی تو ہیں۔ مرد آدمیوں سے یوں نہیں گفتگو کرتے ہیں۔

نواب ۔ آپ مرد آدمی ہیں، یہ آج ہی معلوم ہوا۔ ابے تو پرانا چڑیمار ہے ہم سے باتیں بنانے چلا ہے
تجھے مرد آدمی کون سمجھتا ہے۔؟

بات یہ تھی کہ خان صاحب کے والد مرغبازوں میں ملازم تھے اور خود ان کا اسم بٹیربازوں میں تھا۔

خان ۔ تسلیم کر کے ۔ یہ آپ کی قدردانی ہے۔

امراؤ ۔ (ذرا چلا کے جس میں نواب صاحب سن سکیں) واللہ خوب کہی!

حسین علی ۔ چڑیمار تو نہیں چمرگد کی اچھی ہوتی ہے (یہ چپکے سے کہا تھا)

امراؤ ۔ (خاں صاحب سے چلا کے) یہ موا چمر بگلا آگیا۔

خان ۔ اور یہ بی چمر بگلی کہاں سے بولیں۔

نواب ۔ رات کو تو پرانا کھوسٹ تھا اور اب الو کی دم فاختہ ہو گیا۔

خان ۔ رات کو تو پرانا کھوسٹ تھا اور اب الو کی دم فاختہ ہو گیا۔

نواب ۔ لیجیے اب آپ بڑھنے لگے اور جو میں اس کا جواب دوں۔

امراؤ جان ۔ خدا کے لیے نواب جواب نہ دینا نہیں تو روٹیوں کو محتاج ہو جائے گا۔

خان ۔ روٹیوں کو کیوں محتاج ہو جاؤ گی کٹنا پا کرنا۔

امراؤ ۔ جی ہاں نواز گنج میں کٹنا پا کروں گی۔

خاں صاحب کچھ نواب والے فقرہ سے جھیپے ہوئے تھے اور کچھ امراؤ جان کے آخری جملہ سے اور
بھی تیہا آگیا تھا اب جو نواب نے اک ذرا شہ دی تو بالکل ہی ہتے پر سے اکھڑ گئے۔ اب امراؤ جان سے
اور ان سے خوب دو دو چونچیں ہوئیں نواب چپکے بیٹھے سیر دیکھا کیے۔

حسن خاں ۔ واللہ اب کبھی تو ان سے بولوں گا نہیں ان کی حقیقت ہی کیا ہے، ہستی ہی کیا ہے ابھی تین
برس کا ذکر ہے میرے بھانجے کی شادی میں مجرے کو گئی تھیں اب نواب کے پاس رہ کر دماغ آسمان

پر چڑھ گیا ہے۔

امراؤ۔ ابے جا۔ میں ایسے گھگھوؤں سے بات کب کرتی ہوں"۔

اتنی دیر کے لطف صحبت کے بعد کہیں یہ نہ کہہ اٹھیے گا کہ یہ ساری سحر آفرینی بول چال کی صفائی اور ساری طلسم بندی روزمرہ کی شستگی کی ہے۔ مرزا صاحب کے روزمرہ کا کیا کہنا لیکن اتنی صحیح اور سچی، اصلی اور گہری نقاشی کہیں محض زباں دانی کے بل بوتے پر اور خالی خولی لطف زبان کے سہارے ممکن ہے؟ جذبات نگاری نرے ایک ادیب کے بس کی بات ہے جب تک وہ ادیب ساتھ ہی حکیم بھی نہ ہو؟

ذکی۔ چودہ سال کی عمر کا ایک بڑا نیک چلن لڑکا ہے اور یہ تو یاد ہی ہوگا بیسویں صدی کے وسط کا نہیں، اس سے بہت قبل کا ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شایق کیا بلکہ عاشق رشتہ کی ایک خالہ ہیں اور ان کی گیارہ بارہ سال کی لڑکی ہے بگّن۔ قبول صورت تک سک سے درست۔ ذکی کی والدہ کے پاس کل یہ خالہ آنے والی ہیں۔ شام کو ذکی کی بوا نیک قدم نے کہیں ذکی سے کہدیا کہ کل تمھاری خالہ اماں آنے والی ہیں ذکی نے کہا کون خالہ اماں؟

نیک قدم۔ ایسے ننھے جیسے یہ جانتے نہیں تمھاری خالہ اماں اور کون جعفری بیگم صاحبہ بگّن صاحبہ کی اماں جان تمھاری ساس!

ذکی نے ہمّت کر کے اتنا اور پوچھ لیا "بوا کیا بگّن بھی آئیں گی؟"

"پوچھنے کو تو پوچھ لیا مگر ذکی ایسے شرما گئے تھے کہ اب اُن سے باورچی خانہ میں نہ ٹھہرا گیا انھوں نے پہلے دالان کی طرف رُخ کیا دیکھا کہ اماں جان اور باوا جان میں کچھ مصلحت سی ہو رہی ہے سمجھے کہ یہی باتیں ہوں گی۔ جی تو چاہتا تھا کہ سنیں، مگر مارے حجاب کے نہ جا سکے پہلے نیم کے نیچے بڑی دیر تک ٹہلا کیے پھر گیندوں کے پاس جا کھڑے ہوئے ایک ایک گیندے کو غور سے دیکھا کیے پھر تھوڑی دیر کنوئیں کی جگت پر بیٹھے رہے"۔

دوسرے دن جمعہ ہے اور وہی دن ذکی کے لیے بگّن کے آنے کا ہے اب میاں ذکی کے دل و دماغ کی سرگزشت مرزا صاحب کی زبان سے سُنیے:۔

"ابھی ایسے لوگ بہت موجود ہیں جنھوں نے مکتبوں میں تعلیم پائی ہے ان سے پوچھو کہ جمعہ کی رات کیا چیز ہے نہ آج رات کو سبق یاد کرنا ہے نہ کل صبح کو سویرے اُٹھ کر مکتب میں جانا۔ نہ مولوی صاحب کی متبرک

صورت دیکھنا نہ پڑھنا نہ لکھنا نہ گھرکیاں نہ قمچیاں۔ کل ہم ہیں اور کنکوا کل ہم ہیں اور چھلی چھلیا، محمد ذکی اُن لڑکوں میں نہ تھا جن کو چھٹی کی زیادہ خوشی ہوتی ہے اس لیے کہ اس کو پڑھنے کا شوق خداداد تھا۔ مگر پھر بچہ تھا اس کو جمعہ کی خوشی کیوں نہ ہوتی تعطیل کی خوشی کس کو نہیں ہوتی اور یہاں ذکی کی جو حالت تھی وہ تو ناظرین قیاس کر سکتے ہیں۔ صبح سے راستہ دیکھنا کیسا یہاں شام ہی سے انتظار ہے، اب رات کے نو بجے ہیں میاں ذکی اپنی پلنگڑی پر رضائی سے منھ لپیٹے پڑے ہیں۔ سوتا کون ہے؟ گو کہ سن ابھی چودہ برس سے کچھ ہی زائد ہے مگر حسن وعشق کے اکثر افسانے دیکھے ہیں ... ... خیالات کچھ نہ کچھ تو ضرور صاف ہو گئے ہوں گے، بگن کو دیکھ ہی چکے ہیں ... ... دل میں کبھی خیال نہ آیا تھا کہ بگنؔ کے ساتھ شادی ہو جائے بلکہ شادی کا شوق بھی آج ہی دل میں پیدا ہوا تھا ... ... کیسی شادی؟ نیک قدم نے یونہی کہدیا ہوگا، غلط! بھلا ایسی بات کہہ سکتی ہیں۔ پرائی بیٹی پر گالی چڑھانا کیا آسان بات ہے اور جو اماں جان سُن لیتیں۔ نہیں اس بات کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے ... ... اے لو کچھ بج رہا ہے ایک، دو، تین، دس۔ دس بج گئے یہاں نیند ہی نہیں آتی۔ اباجان نے آرام کیا، اماں ابھی تک جاگ رہی ہیں پاجامہ کیوں چھپ چھپ سی رہی ہیں، کل خالہ ضرور آئیں گی دیکھیے بگن کو ساتھ لاتی ہیں یا نہیں خالہ تو کل آئیں گی ممکن ہے بگنؔ بھی ساتھ آئے مجھے ابھی سے نیند کیوں نہیں آتی۔ دیکھیے بگن آتی ہے یا نہیں امید و یاس دونوں کے پلے برابر ہیں ... ... آخر تو نیند نہیں آتی ... ... اے لو میں آنکھیں بند کرتا ہوں اب تو نیند آئے گی۔ یا اللہ نیند آ جائے ... ... خدا جانے ذکی کو رات بھر نیند آئی بھی یا اسی اُلجھن میں صبح، ہم تو جانتے ہیں نیند نہیں آئی اس لیے کہ جب میر صاحب نماز کے لیے اُٹھے تو یہ بھی کھٹ سے اُٹھ بیٹھے۔"

آخر عمر میں یاروں نے خدا جانے کیا کچھ خرچ کر کرا، مرزا صاحب کو امریکہ کی کسی خانہ ساز یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری دلا دی تھی اور اس کی بنیاد پر مرزا صاحب کی فلسفیت کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیا تھا، حالانکہ مرزا صاحب کا حکیمانہ مرتبہ اس سے کہیں بالاتر تھا، ان کی فلسفیت کی بہترین اور معتبر ترین شاہد خود ان کی تصانیف ہیں۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تجزیہ جس عنوان سے اپنے افسانوں میں انھوں نے کی ہے وہ ایک حکیم اور فلسفی ہی کا قلم کر سکتا ہے خالی خولی اہل زبان اور اہل انشا نہیں۔

بچپن کے عشق کی مصوری کوئی آسان کام نہیں اچھے اچھے جید اور کامیاب مکالمہ نگار بچوں کی نقالی

کرنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ بوڑھا آدمی آخر بچہ کہاں سے بن جائے۔ اردو کے بعض بڑے نامور افسانہ نویسوں پر ایک نظر کر جایئے لغزشیں بیسیوں اگر ہوئی ہوں گی۔ بچوں کے جذبات اور پھر جذبہ بھی کون سا۔ عشق و محبت کا اور پھر محبت بھی بازاری قسم کی نہیں ایک بالکل کم سن شریف لڑکے کی جائز محبت اپنی منگیتر ایک شریف لڑکی کے ساتھ، اس کی ترجمانی کوئی مُنھ کا نوالہ نہیں۔ مگر دیکھیے مرزا صاحب اس وادی کو بھی اس خوبصورتی سے طے کر جاتے ہیں کہ گویا یہ سارے راستے ان کے خوب دیکھے بھالے پڑے ہیں۔ بگّن جمعہ کو تو نہیں البتہ اتوار کو اپنی والدہ ماجدہ کی معیت میں ذکی کے گھر آتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں آپس میں مل بیٹھ باتیں کرتی ہوتی ہیں اور ادھر انگنائی میں گیندے کا کھیل شروع ہو جاتا ہے ایک طرف چودہ برس کا لڑکا دوسری طرف بارہ برس کی لڑکی اس کھیل میں دستور یہ ہے کہ جب گیند اکسی سے روکا نہیں جاتا اور زمین پر گر پڑتا ہے تو آنکھ سے اُٹھانا پڑتا ہے ایک دفعہ گیندا بگّن کی طرف سے زمین پر گر پڑا۔

ذکی۔ اچھا تو پھر آنکھ سے اُٹھایئے

بگّن۔ ہم تو نہیں اٹھائیں گے۔ واہ کپڑے مٹی میں بھر جائیں گے بڑے آنکھ سے اٹھانے والے۔

ذکی۔ تم کھیل میں دھاندلی کرتی ہو۔ ہم نے ابھی نہیں اُٹھایا تھا؟

بگّن۔ تم اٹھاؤ ہم نہیں اُٹھاتے ہم تو یوں ہی کھیلیں گے تمہارا جی چاہے کھیلو جی چاہے نہ کھیلو۔ اے لو میں جاتی ہوں۔

ذکی۔ اچھا یوں ہی کھیلو پھر ہم بھی اب نہ اٹھائیں گے۔

میاں ذکی کو دستور کی پابندی پر اصرار کرنا مناسب نہ معلوم ہوا پھر کھیل شروع ہو گیا۔

ذکی کے مزاج میں شرارت نہ تھی مگر اتفاق سے بگّن کے گال پر یا کہیں اور پھول جا پڑتا اس وقت عجیب لطف ہوتا تھا وہ بگّن کا جھجکنا وہ جھپ کر اوڑھنی سنبھالنا۔ پھر جھنجھلا کے ذکی کو پھول مار بیٹھنا ذکی کا نشانہ بچا کے ہنسنا بگّن کا کھسیانی ہو کے روٹھ جانا۔

بگّن۔ بھئی (دہی کو بڑھا کے) جاؤ ہم نہیں کھیلتے۔

ذکی کا منانا اچھا خیر جانے دو کوئی ہم نے جان کے پھول مارا ہے پڑ گیا اچھا برا ہوا پھر کھیلو اب ایسا نہ ہوگا۔

بگّن۔ واہ! کس زور سے میرے گال پر پھول پڑا، میں نہیں کھیلتی۔

اور اصل بات یہ تھی کہ بگّن تھک بھی گئی تھی۔

ذکی ۔ کھیلو بھی تم ذرا سی بات میں بگڑ جاتی ہو۔

بگن ۔ ایسی ذرا سی بات، اور جو میری آنکھ میں لگ جاتا دیدہ پھوٹ جاتا تو؟

ذکی ۔ خدا نہ کرے کہیں گیند اکھیلنے میں آنکھ پھوٹ جایا کرتی ہے۔

بگن ۔ اچھا بھلا ہم تو تمہاری آنکھ میں ایک لگائیں۔

ذکی ۔ لگاؤ۔

بگن ۔ اچھا تو ہم نہیں کھیلتے۔

ذکی ۔ کھیلو بھی (سماجت کے لہجہ میں)

بگن ۔ نہیں کھیلتے ۔ نہیں کھیلتے ۔ نہیں کھیلتے۔

ذکی ۔ (اور ایک بڑا گیندا توڑ کے) آؤ تم بھی کیا آدمی ہو اس سے کھیلیں دیکھو کیا بڑا گیندا ہے۔

بگن ۔ دیکھیں (گیندا ذکی کے ہاتھ سے لے کے نوچ کھسوٹ جوتی کے نیچے مل ڈالا۔ گیندا کیا مل ڈالا گویا میاں ذکی کا دل تلوؤں کے نیچے مل ڈالا۔

ذکی ۔ (آزردہ ہو کے) تمھارے مزاج میں بھی کس قدر ضد ہے۔

بگن ۔ (گردن کو ذرا کج دے کے اور بھوؤں کو اوپر چڑھا کے) ہمارے مزاج میں ضد ہے؟ پھر تمہاری بلا سے تمھیں کیا؟ (یہ کہہ کے پھر دل ہی دل میں کچھ سوچ کے) اچھا تو ضد ہی سہی اب تم ہم سے نہ بولنا۔

یہ کہہ کے یہ جاوہ جا دوڑ کے ماں کے پہلو میں جا بیٹھی۔ چلو سارا کھیل ہی بگڑ گیا۔ اب میاں ذکی، کا وہ حال ہے جیسے کوئی لڑکا بڑی مشکل سے ایک چڑیا پکڑے اور وہ دفعتہً ہاتھ سے چھوٹ کر فراٹا مار کے ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھے۔"

یہی نازک مقامات مرزا صاحب کے دعوے عظمت و امتیاز کے روشن دلائل ہیں۔ ان کی نزاکتوں کا سنبھالنا نہ نرے کھرّے فلسفی کے بس کی چیز ہے نہ محض ادیب و انشاپرداز کے۔

افشائے راز افسوس ہے کہ بالکل ناتمام رہی اور راز کا افشاء بالکل کیا معنی تقریباً بھی نہ ہو پایا۔ اس پر بھی مرزا صاحب کی بہترین تصانیف میں ہے، اور جس نے اس کو اور امراؤ جان اور اختری بیگم کو نہیں پڑھا اس نے مرزا صاحب کو جانا ہی نہیں۔ خیر افسانہ تو جیسا ہے سہی ہے افسانہ سے بھی کچھ بڑھ کر دلکش اور

بیش بہا تمہید افسانہ ہے یہاں مرزا صاحب نے فرضی افسانہ نگار یعنی مرزا رسوا کو کچھ ہدایتیں افسانہ کی زبان اور طرز بیان سے متعلق کی ہیں۔ یہ ہدایات کیا ہیں، ہر اردو نویس کے لیے ایک بہترین پند نامہ! آج ۱۹۳۲ء ہے حیرت ہوتی ہے کہ آج سے ایک قرن قبل ۱۸۹۶ء میں مرزا صاحب کی نظر ان نکتوں تک کیونکر پہونچ گئی تھی۔ نقد و تنقید کے یہ گُر ہاتھ آجانے کے بعد آجکل کے بہت سے "رئیس التحریر" بڑے بڑے قلم باز آپ کی نظر سے گر کر رہیں، تو اس کی ذمہ داری اس مقالہ نویس پر نہیں۔

بہر حال اب وہ ہدایتیں خود مرزا صاحب کی زبان مبارک سے سن لیجیے فرماتے ہیں:۔

"لکھیے تو اس طرح لکھیے کہ جس طرح ہم آپ باتیں کرتے ہیں، نہ کہ اس عبارت میں جو کسی انگریزی کتاب کا لفظی ترجمہ معلوم ہو اور وہ بھی ایسا کہ مطلب دل میں اور لفظیں کتاب میں ...... میں انگریزی لفظوں سے چڑھتا نہیں ہوں، شوق سے استعمال کیجیے۔ مگر وہی لفظیں جو اردو زبان میں ایسی کھپ گئی ہیں کہ اب ان کو سب سمجھنے لگے ہیں۔ خیر 'ناول' بھی چنداں ثقیل نہیں ہے ...... قیامت خیز تو یہ لفظیں ہیں ڈیڈی کیشن، انٹروڈکشن، ایسوسی ایشن، سوسائٹی سوشل ریفارم، پولیٹیکل پارٹی، اسٹڈی، ڈیوٹی، بیوٹی...... یہ لفظیں ابھی اور لوگوں کو بولنے دیجیے اور آپ اتنے عرصے تک توقف کیجیے کہ مثل بوتل، کاگ، 'بوتام' گلاس، لمپ، پادری، گرجا، اسٹیشن، ریل وغیرہ کے عام فہم ہو جائیں۔

اور یہ ترکیبیں جو آج کل کے انشاپردازوں نے ایجاد کی ہیں یک قلم نظری کر دیجیے مثلاً

"ایک غمگین کرسی، ایک ہمدرد میز، ایک مسکین چھری، ایک شرمناک تولیا، ایک دلسوز کانٹا، دو ماہر و چمچے، تین بے وفا پلیٹیں۔ ایک موقّر قلم، ایک سنجیدہ دوات، ایک متبسم چاقو، ایک متحرک انگارہ۔ ایک نمکین چلم، ایک فاضل حقّہ، ایک غریب قطرہ۔ ایک غضبناک دریا۔ ایک طرحدار مرغی۔ ایک شیریں ادا بطخ۔ ایک پری تمثال فاختہ۔ ایک مہذّب اُلّو۔ ایک آزاد مینڈک، ایک روشن ضمیر چوہا، ایک متین گدھا۔ ایک حلیم بھیڑ ایک سریلا گیدڑ۔ ایک دلستان کتّا، ایک دلربا بلّی۔ ایک خوش لہجہ جھینگر۔ ایک دُور اندیش مکھی۔ ایک ذخار گڑھیا۔ ایک ہیبتناک سڑک، ایک خوش آہنگ مگر ستم شعار مچھر۔ ایک تکلیف دہ مگر خوشنمائی سے رینگنے والا کھٹمل۔ ایک خفیف الجثہ مگر جگر خراش پسو۔ ایک انوکھا مگر حیرت بخش پھرتی کے ساتھ کودجانے والا بندر۔"

یہ نمونے مرزا صاحب نے اپنی نوجوانی میں دیکھے تھے غریب کو کیا خبر تھی کہ ان کی زندگی ہی میں اور ان کے بعد تو اور بھی ذیل کی ترکیبیں بڑے بڑے اونچے دعوے والوں کے لیے مایۂ نازش و افتخار ہوں گی:۔

"ایک منہمک شام، ایک مؤدب فاصلہ، ایک روشن تھرتھری، ایک مسترحم نشیب، ایک زہرہ گداز تبسم، ایک بینچی غرّاہٹ، ایک ذخار خاموشی، ایک متلاطم سکون، ایک رقیق خرام، ایک ملائم قہقہہ، موٹے موٹے قہقہہ لگاتے ہوئے مچھر، ایک نور پاش خراماں پیکرِ آتش، ایک گلابی رنگ میں ڈوبی ہوئی برق متحرک، مجھ میں اپنے اشارہ مبہم سے ایک انجذاب مضطر پیدا کر رہی ہے" اور میں اس قوت مجہول کی طرف کھنچا جا رہا ہوں، یہ نزہت بار ہستی، گھنگھروؤں کی جھنکار اکبارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں سنپولوں کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔" ہال کے اندر قہقہے دھڑک رہے تھے، ملی جلی باتوں کی تیز تیز چیخیں تھیں اور یہ تمام شور مجموعی طور پر ایک ہیبتناک کراہ کی طرح لرز رہا تھا، ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہستی پر چھایا یہ مصفا ترکیب عناصر میرے وجود کو میری روح لرزاں کو مسحور کر رہا ہے اپنی آنکھوں کے خندۂ سیال سے اپنے بالوں کی بوئے شکستگی سے، اپنے خرام وقار سے،" "وہ آئینہ سیما لڑکی اپنی عفت و شرم میں محافظ رکھتی تھی، تھوڑا سا وقوف یقیناً عقل و فراست کا ایک جز تو ہے جو ایک ستارہ سے دوسرے ستارہ تک اپنا کام کر رہا ہے۔" "اے اوپر والے آسمان اے روشنی کے عمیق غار تجھے دیکھ کر میں آلہانہ جذبات سے کانپنے لگتا ہوں، تیری بلندی کی طرف میرا اپنے تئیں اچھال دینا یہ ہے میرا عمق تیرے ہی آلہانہ امکانات کے لیے میرا صحنِ رقص ہے اور تیری فضا آلہانہ قمار بازی کی کھلی ہوئی بساط،"

لفظوں اور ترکیبوں کے کشت زعفران کی سیر ہو چکی اب ذرا عبارتوں کا لہلہاتا ہوا تختۂ چمن ملاحظہ ہو، عبارتیں پڑھتے جائیے اور جن جن سروں پر یہ ٹوپی ٹھیک آ رہی ہو دل ہی دل میں یاد کر کے انھیں خدا کے حوالے کرتے جائیے پہلا نمونہ:-

"وہ اونگھی کالی بھینس جس کا ٹوٹا ہوا سینگ اگلی بے رحمانہ حکومت کے تاریخی حالات کا ایک بے نظیر فوٹو ہے جس کی ہیئت کذائی ہندستان کے قدیم تاریک جاہلانہ اور حد سے زیادہ بدکاواک مگر نیچرل اور منفعت سے بھرے ہوئے سامان تعیش کا ایک سچا چربا ہے ...... مگر جو افسوس کہ اس آزاد اور سویلائزڈ منصف گورنمنٹ کے عہد حکومت میں بھی کیچڑوں میں پھنس کر بلا مدد اس لاٹھی کے جو کبھی کبھی اس کے پٹھے پر پڑ کر اسے تڑپا دینے والی ہے ہرگز نہیں نکل سکتی۔"

دوسرا نمونہ:-

وہ سفید بگلا جس کے لیے باریک نوکدار حوصلہ مند مگر بے رحم چونچ ایک شور انگیز بھنبھنانے والے شکار

کی بدقسمتی سے ایک نیچرل مگر مضحک انداز کے ساتھ ایک سکنڈ کے لیے کھل کر پھر بند ہو جانے کے قابل ہو جاتی ہے .... اور جس کی طویل ٹانگیں کسی اعلیٰ درجہ کے نیچرل پوئیٹ یا ناولسٹ کے جادو نگار قلم سے نکلنے والے طولانی مگر معنی خیز جملوں یا مصرعوں کی طرح بہت ہی دلچسپ اور موزوں ہیں مگر یہ انٹرسٹنگ اُڑنے والا جانور ایک کثیف ایشیائی مکان کے صحن میں کس بیہودگی کے ساتھ مکھی کی ٹوہ میں دن بھر پھرتا اور کبھی نہیں تھکتا ہے۔

تیسرا نمونہ :-

"وہ اولڈ فیشنڈ انلائیٹینڈ چوہا جو اپنے سنٹر میں بود و باش کے لیے کمپلیکیٹڈ پیسیج بناتا ہے"

"ادب لطیف" اور پھر اس کے بعد "ترقی پسند ادب" کے دُہرے دہرے عذاب اس زمانہ تک اُردو پر کہاں مسلط ہونے پائے تھے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس قسم کے نمونے مرزا صاحب کی نظر سے چھوٹنے پاتے :-

"جب تکوین عالم کی بالکل ابتدا تھی مذاق آفرینش امواج آب سے لاعب نظر آتا تھا، شبستان ناز کے پر لطف دقیقہائے برق کسی کی آرمیدہ مژگان کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں" "ایک پر اسرار قبرستانی سسکی ہوا میں لرزتی ہے، چاندنی ایک موسیقی ہے سہانی، نرم، اور معطر" "زور زور سے چنگھاڑیں مار کر روؤں"

"سید محمد ذکی افشائے راز کے رستم داستان، اسی لکھنؤ کے رہنے والے تھے....... گفتگو میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع نہ تھا نہ یس نہ نو، نہ اومائی گاڈ، نہ ہاؤ ڈو یو ڈو، نہ گڈ مارننگ، نہ ول ڈن، نہ ول کم، نہ تھینکس، بس یہی ہاں، نہ، درست، بجا، قبلہ، حضرت، آیئے، تشریف لائیے، آداب، تسلیمات، مزاج شریف، دعا عرض کرتا ہوں، یہی ان کا روزمرہ تھا"

ان کی اُردو ہی اردو تھی جو لکھنؤ کے شرفا کی زبان ہے خیر وہ اردو تو ان کی ہو ہی نہیں سکتی تھی جس پر انگریزی کا دھوکہ ہو لیکن ساتھ ہی انھیں اس اردو کے لکھنے کا عارضہ نہ تھا جس کے سمجھنے کے لیے اہل زبان کو صراح و قاموس کے ازبر کرنے کی ضرورت لاحق ہو مثلاً اس قسم کی اردو وہ اُن کی ہرگز نہ تھی :-

"ان کی شان ارفع تھی اس سے ارتکاب سرف و زرف اپنے ملابس اور مآکل بلکہ سائر متناولات میں جائز رکھتے"۔

یا یہ کہ "فی الجملہ تشبث و تعصف و تلہف و شطارت و بطارت، و تجشم، و تجاسر، و تمازح غرض کہ تنافر سے ان کو کلیتہً نفرت تھی بلکہ کسی قسم کا استغراب و استعطاف و استعظام، و استنکاف، و استخفاف ان کی شمیت و جبلت و قریحت، و غریزیت میں نہ تھا"

شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے" مگر نہ ایسے اشعار، جیسے ایک مولوی صاحب مرحوم اکثر نظم فرمایا کرتے تھے:-

اڑنے میں طائرانِ ہوا باز کر کے پر   کرتے ہیں بند اپنے زمیں پر اتر کے پر

یا ایسے اشعار جو لکھنؤ میں بعض صاحبوں کے مذاق کے موافق ہیں۔

حاسد نہ میرے ذروۂ تادیب تک گئے   رستہ میں بالِ ققنس اور اک تھک گئے

یا اساتذۂ حال میں سے بعض کے اشعار

سالکِ مسلکِ ایجاد ہوں، مکڑی کی طرح   راہیں سو دل سے نکالوں جو ذرا دل ٹھہرے

یا ایک اور بزرگ فرماتے ہیں۔

سوزاں ترا جو دفن ہو دشت گرم میں   تکمیدِ مومِ سُمِّ غزالانِ چین ہو

یا ایک اور فاضل کا مشہور شعر ہے۔

رات کس کی بزم میں برہم مزاجِ چنگ تھا   شورِ نغمہ کا نمک ریزِ مئے آہنگ تھا

یا پھر دورِ ترقی پسندی کے یادگار اس قسم کے مصرعے:-

(۱) تند ہوائیں بال بکھیرے چیخ رہی ہیں

(۲) کھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں

(۳) رات کے بوجھ سے وہ ہانپتی سی خاموشی

سنتے ہیں کسی زمانے میں وصایائے افلاطون کا مطالعہ فلسفہ کے ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا، بس چلتا تو آج ان وصایائے مرزا اور ان کے جدید ایڈیشن کو ادب کے ہر طالب علم کے درس لازم میں رکھ دیا جاتا کہ اردو غریب کو نئے نئے مجتہدین زبان کی مشق ستم سے کچھ تو نجات ملتی۔

مرزا کی شاعری کے کچھ نمونے اوپر گزر چکے ہیں کچھ اب ملاحظہ ہوں لیکن اس کے قبل کچھ دھندلا سا نقشہ ذہن کے سامنے اس کا بھی لے آیئے کہ جس وقت مرزا صاحب نے غزل گوئی شروع کی ہے اس وقت لکھنؤ کی شاعری اور غزل گوئی کا رنگ تھا کیا۔ جس ماحول میں مرزا صاحب نے آنکھیں کھولیں وہاں دھوم تو کچھ اس طرزِ سخن کی تھی۔

چھینٹے کل آپ جو غیروں سے لڑے پانی کے   پڑ گئے سیکڑوں بس ہم پہ گھڑے پانی کے

میری تربت پر لگایا نیم کا اس نے درخت | بعد مرنے کے مری تو قبر آدھی رہ گئی !!
اُس بُت رشک سلیماں کی کمر | سایۂ مژگان چشم مور ہے
مگر تیری ہے وہ جس نے کمر توڑی ہے چلیتوں کی | تری آنکھوں کے آگے اے پری آہو چکارا ہے
رونے کی تجھے لہر جو اے چشم تر آئی ! | کوسوں نظر آئے گا نہ ٹاپو نہ ترائی !

نام کس کس کے گنے جائیں اچھے اچھے داستانِ باکمال، اور بڑے بڑے شعرائے نامدار اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، مشاعروں میں داد اسی کلام کی ملتی اور محفلوں میں واہ واہ کے نعرے اسی سخنوری پر بلند ہوتے جاننے والے جانتے ہیں کہ وقت کے ادبیات کا رُخ پھیر دینا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ مرزا ہی کا دل و جگر تھا کہ اس فضا میں رہ کر اور اس ماحول میں پل کر شعر کہے تو اس آن بان کے ؎

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے | دیکھیے دیکھیے اک آن میں کیا ہوتا ہے
نالہ رکتا ہے تو سر گرم جفا ہوتا ہے | درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے
بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بد نام | جھیپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے
عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا | دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے
قالب گور پہونچ جاتے ہیں مرنے والے | وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے
آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں ! | ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے
کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں | دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوقِ اظہار اگر ہے تو میرے دل کو نہ توڑ | اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

چھوٹی بحروں میں اور بھی قیامت کرتے ہیں ؎

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی ! | اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی ! | یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی | کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی !
تم جدائی میں بہت یاد آئے | موت تم سے بھی سوا یاد آئی !
لذت معصیت عشق نہ پوچھ | خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا | لے مجھے اپنی دوا یاد آئی !

ایسی زمینوں میں خوب خوب گل بوٹے کھلائے ہیں ؎

روشِ وحشِ وطیور یاد آئی | دشتِ وحشت کی سیر یاد آئی
کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ | پھر وہی راہِ دیر یاد آئی!
زاہدو آج ہم کو پھر وہ شے | جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی!
دیکھ کر مشہد ادا ان کو | لالہ و گل کی سیر یاد آئی!

غالب کی مشہور زمین "بادہ و ساغر کہے بغیر"۔ "دشنہ و خنجر کہے بغیر" میں قافیہ بدل کر کیا کیا گلکاریاں کی ہیں ؎

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ | چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر
وعدہ ہو یا کہ قول وہ ایسے ہیں نادہند | ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کیے بغیر
زاہد سے گفتگو ہو کہ واعظ سے بحث ہو | بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر
ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں | باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر
رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم! | چھوڑوں گا اب نہ میں تمھیں رسوا کیے بغیر

اب ایک غیر مطبوعہ غزل کے تین شعر اور حسن کے اس ورق کو الٹ دیجیے ؎

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم | ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

دوسرا شعر اس سے بڑھکر ہے۔

دیکھ اس طرح بھی مل لیتے ہیں ملنے والے | شمع کا بس نہ چلا بزم میں پروانے سے

اور تیسرا ان دونوں سے بھی بڑھا ہوا ہے ؎

جیتے جی اس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں | لذّتِ غم نہ رہی غیر کے مر جانے سے

یہ کلام جو ابھی تک ملاحظہ میں آیا اس کا بیشتر حصہ امراؤ جان سے منقول ہے لیکن آخر کے یہ دو شعر کہیں چھپے ہوئے نظر سے نہیں گزرے اور اس قصباتی مقالہ نویس کے فخر کے لیے یہ کافی ہے کہ یہ دونوں شعر مرزا صاحب نے اسے لکھنؤ میں اس کے غریب خانہ پر ۱۹۱۹ء میں خود اپنی زبان سے سنائے تھے اور جن تیوروں کے ساتھ دیکھ اس طرح بھی مل لیتے ہیں آخر والا شعر پڑھا تھا وہ آج تک یاد ہیں۔ شعر پڑھتے وقت بوڑھے سے جوان ہو گئے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس کو شعر میں مخاطب کیا ہے وہ سامنے

سرمحفل موجود ہے۔

مرزا صاحب کے افسانوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول امراؤ جان ادا ہے، یہ بیسویں صدی کی بالکل ابتداء کی تصنیف ہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل یعنی واجد علی شاہی دور کی ایک شستہ، نستعلیق باتمیز، خوش گو، خوش فہم، شریف طوائف کی آپ بیتی ہے۔ شریف کے لفظ پر چونک نہ پڑیئے اللہ کی ہر مخلوق کی طرح بازاری کسبنیں بھی کسی درجہ میں شرافت کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں۔ مرزا صاحب کی فرمائش بلکہ اصرار پر یہ بی صاحبہ اپنی آپ بیتی جا بجا سے سُناتی ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے جاتے ہیں اور کہیں کہیں حاشیہ بھی چڑھاتے جاتے ہیں، بچپن سے نوجوانی، نوجوانی سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا ہر دور تفصیل کے ساتھ آئینہ ہو جاتا ہے اور لطف زبان کے ساتھ، تجربہ، عبرت و بصیرت کے سامان بھی بہم ہوتے جاتے ہیں۔ طوائف کے نام سے نفرت و حقارت ہی کے جذبات نہ پیدا ہوں، اور یہ خیال نہ گزرے، کہ جو بھی اس پیشہ میں ہیں وہ بہر حال و بہر صورت ذلیل و ملعون ہی ہیں۔ خدا جانے کتنی شریف زادیاں، اشراف گھرانوں کی بہو بیٹیاں، آفت کی ماریاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں زمانہ کی گردش کسی نہ کسی بہلنے سے اس پیشہ میں لا پھنساتی ہے اور وہ بیچاریاں حالات کے منجدھار میں بہتی ہوئی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی اس ناپاک اور گندی زندگی میں جا پڑتی ہیں، جسم شیطان سے بے غیرتی کے سبق لیتا رہتا ہے لیکن ضمیر کی ملامت کی آواز بھی اندر اندر جاری رہتی ہے۔ امراؤ جان کی قسمت میں نامودی، بدنامی کے راستہ سے لکھی ہوئی تھی، پوری ہو کر رہی۔ مگر وہ کوئی سات پشتوں کی بیسوا نہ تھی فیض آباد میں ایک گھر گرہست خاندان میں پیدا ہوئی نام نہ امراؤ تھا نہ امراؤ جان، ماں باپ نے امیرن کہہ کر پکارا تھا بچپن کی قلمی تصویر ملاحظہ ہو۔ آنکھیں اگر نم نہ ہوئیں جب بھی دل میں گداز تو پیدا ہو ہی جائے گا۔

"شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں، رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے، کچھ بہشتی، کچھ نائی، دھوبی، کہار، میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا، کیا تنخواہ تھی اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ

چھوڑتا تھا۔ ابّا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اُس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ۔ یہ جیسے ہیں
کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابا ابا کر کے دوڑا دامن میں چمٹ گیا، ابّا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں مجھ کو
چمکارا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھا لیا پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے
تھے کبھی دو کٹارے ہاتھ میں ہیں، کبھی تباسوں، یا تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصّے
لگائے جا رہے ہیں اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں وہ کٹارا چھیننے لیے جاتا ہیں
مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں اماں سامنے چھپرل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا اِدھر آکے بیٹھے نہیں
اُدھر میرے تقاضے شروع ہو گئے ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میری پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے
تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سُنار کے ہاں سے بن کے نہیں آیا چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ
بڑھائی ہے بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی، چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی، ہاں میں تو نیا
پہنوں گی، جب اماں کھانا پکا چکیں مجھے آواز دی، میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی دسترخوان
بچھا اماں نے کھانا کھلایا سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا، خدا کا شکر کیا۔ ابّا نے عشا کی نماز پڑھی سو رہے صبح
کو تڑکے ابّا اٹھے نماز پڑھی اسی وقت میں بھی کھٹ سے اُٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابّا! شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔"

بچپن کا بھی کیا معصومیت کا زمانہ ہوتا ہے! لڑکی غریب گھرانے کی تھی مگر اپنے حال میں مست اور مگن،
باپ کی آنکھ کا تارا ماں کے کلیجہ کی ٹھنڈک گناہ کی راہوں سے ناواقف اور بدی کی چالوں سے بے خبر اس غریبی
پر سیکڑوں امارتیں قربان جھونپڑے کو محل سمجھنے والی، اور محل کیا معنی معصوم کے حق میں تو وہی چھوٹا سا گھر
نمونہ جنّت تھا۔

"ہائے کیا دن تھے، کسی بات کی فکر ہی نہ تھی، اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیونکہ
ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں
جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے زیادہ اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کٹھریا یا چھپرل میں رہتے
تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے، صدر کے دالان کے آگے ایک باورچی خانہ تھا، دوسری
طرف کوٹھے کا زینہ کوٹھے پر ایک چھپرل، دو کوٹھریاں، کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے دو چار
دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے، ہمارے گھر میں بھشتی پانی

بھرتا تھا۔ محلہ کی عورتیں خود ہی کنویں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابّا جب گھر سے وردی پہن کے نکلتے تھے لوگ انھیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

بات سگے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ بچپن ہی میں ٹھہر چکی تھی۔ اور اسی سن میں منگنی ہو جانا اس وقت کے رواج میں داخل تھا۔ میں نے اپنے دولھا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا بلکہ ساتھ کھیلی تھی ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے کچھ روپئے کی اور فکر تھی، رجب کے مہینہ میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابّا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں میں چپکے چپکے سنا کرتی۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی واہ میرے دولھا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہمسن تھی) کے دولھا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا ہے میرا دولھا گورا گورا ہے کریمن کے دولھا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے میرے دولھا کے ابھی مونچھیں اچھی طرح نہیں نکلیں ——— کریمن کا دولھا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے، میرا دولھا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا سبز سبز چھینٹ کا دگلہ گلبدن کا پاجامہ مصالحہ کی ٹوپی، مخملی جوتا۔ کریمن کا دولھا سر میں ایک چھینٹا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔"

محلہ کا ایک گنڈا جان اور آبرو دونوں کا خواہاں ہو گیا۔ ایک روز شام دھوکے سے اپنے گھر بلا منہ میں کپڑا ٹھونس، بیل گاڑی پر ڈال، رات کی اندھیری میں روانہ ہو گیا۔ قسمت نے لکھنؤ پہونچایا اور چوک کی ایک مشہور ڈیرہ دار کے ہاں جواب سن اترنے پر نائکہ بن چکی تھی بکوایا۔ اب امیرن قبل اس کے کہ سن تمیز آئے، اور اپنے نیک و بد کی عقل پیدا ہو، امراؤ جان تھیں اور جس چراغ کو کسی اندھیرے گھر کا اجالا ہونا تھا اس کے نصیب میں شمع کی طرح گردش محفل آئی۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ رنگ نکھرا۔ دوکان چلی۔ جنس عصمت بکی نہیں لٹی۔ فتنہ رفتہ رفتہ قیامت بنا۔ نواب زادوں، امیر زادوں کے شہر میں قدر دانوں کی کیا کمی؟ سرکاروں، درباروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پر دل کا کانٹا آخر دم تک نہ نکلا، طبلہ کی تھاپ روح کے زخم کا مرہم نہ بن سکی۔ پازیب کی جھنکار اور موتیوں کے ہار، لٹی ہوئی عزت کے آنسو نہ پونچھ سکے۔ اور میلی اوڑھنی میں مگن رہنے والی لڑکی دل کا چین بھاری بھاری پیشوازیں پہن کر نہ خرید سکی۔ ماں باپ غریب تھے پر عزت دار تھے۔ اشرفیوں کے توڑے ان کے ہاں بیشک نہ تھے پر غیرت کے خزانہ کے مالک تھے۔ نوٹوں کی گڈیاں ان آنکھوں نے کبھی

کیوں دیکھی ہوں گی لیکن یہ آنکھیں وہ تھیں جو شریفوں کے کسی مجمع میں نیچی نہیں ہونے پائی تھیں۔

یہ غریب امیرن امراؤ جان ادا بن کر بے شمار دولت کما کر اور اسی قدر لٹا کر عین اپنے شباب شہرت میں اپنے وطن فیض آباد پہونچی ہیں۔ یورپ ہوتا تو خاک وطن خود ایسی قابل فخر ایکٹریس ایسی مشہور زمانہ "آرٹسٹ" کی بلائیں لینے دوڑتی، پریس کے نمائندے "انٹرویو" کے لیے جھپٹے، خوش آمدید کے تاروں کا انبار لگ جاتا۔ کس دھوم دھام سے استقبال ہوتا۔ کیسی کیسی تصویریں چھپتیں۔ یہاں جو کچھ گزری اسے خود امراؤ جان ہی کی زبان سے سُنیے، اور اگر پہلو میں دل ہے تو دل کو ہاتھوں سے سنبھال لیجیے :-

ایک دن کمرے پر بیٹھی ہوئی ہوں، ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کے دیا حقّہ بھروا دیا حالات دریافت کرنے سے معلوم ہوا بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں مقبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں ۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے ؟

نواب صاحب۔ اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا بالکل نیا انتظام ہے۔

میں۔ اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب۔ ہاں تھے، تم انھیں کیا جانو۔

میں۔ غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی. مقبرہ پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب۔ وہی جمعدار نا جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں ۔ مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے یہ افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب۔ یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں ۔ ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب۔ تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا۔

میں ۔ اس دن ان کے ساتھ تھا۔ ایسی شکلیں ملتے کم دیکھی ہیں بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب۔ جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات کے ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات اِدھر اُدھر کے پوچھے نواب صاحب

نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے بہت محظوظ ہوئے رات کچھ زیادہ آگئی تھی۔ گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرجانے کا حال سُن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آ گیا اس کی تیاری کرنے لگی جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی محلے کا نام یاد نہیں مکان کے پاس بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا، اسی کے نیچے شمگیرہ تانا گیا تھا گرد قناتیں تھیں بہت بڑا مجمع تھا مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل امڈا چلا آتا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے میں نے ان کو کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لیے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو، ایک مکان کے دروازہ کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے، جی چاہتا تھا کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگا لیں گی مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے، باپ بھائی کی عزّت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے پھر جی کہتا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں اُن کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ اِک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں کیا مجبوری ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آ کے پوچھا "تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں۔ ہاں! (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)

عورت۔ اچھا تو اِدھر چلی آؤ۔ تمھیں کوئی بُلاتا ہے۔

میں۔ اچھا کہہ کے اس کے ساتھ چلی، ایک ایک پاؤں من من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ وہ عورت اُس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آ کے کھڑی ہوئیں۔

ایک - لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں - جی ہاں!

دوسری - تمھارا نام کیا ہے -

میں - (جی میں آیا کہہ دوں امیرن مگر پھر دل تھام کے) امراؤ جان

پہلی - تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں - (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں -

پہلی - تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں - (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے بمشکل جواب دیا) جی ہاں -

دوسری - کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں - ذات کی پتریا نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں -

پہلی - (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو آخر کہو تو تم کون ہو؟

میں - (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں - کچھ کہتے بن نہیں پڑتا -

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں اب بالکل تاب ضبط نہ تھی سینے میں دم رکنے لگا تھا -

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منھ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے"۔

دوسری - "ہائے میری امیرن" کہہ کر لپٹ گئی دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں ہچکیاں بندھ گئیں آخر اور عورتوں نے آ کے چھڑایا اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دُہرایا - میری اماں بیٹھی سُنا کی اور رویا کی باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے، صبح ہوتے ہیں رخصت ہوئی - ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی، مگر مجبوری - روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے ڈیرے پر چلی آئی -

دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آ کر کل روپیہ مجرے کا واپس دے دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا - دولھا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا - اس دن دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے

کمرے کے دروازے بند کر دن بھر پڑی رویا کی۔"

اللہ اللہ یہ مشرق کی بیسوا ہے کوٹھوں پر بیٹھنے والی عصمت فروش، یہ غیرت اس کی ہے جس نے ایک عمر بے غیرتی کی روٹی کھائی۔ رویاں رویاں گناہ کی تباہ کاریوں سے خاک سیاہ۔ لیکن دل کی گہرائی میں خشیتِ الٰہی اب بھی زندہ و بیدار! غفلت ہے، بغاوت نہیں، لغزش ہے، سرکشی نہیں۔ ماں بیٹی کی ملاقات کا پُر درد منظر آپ دیکھ چکے، اب بھائی بہن کی یکجائی بھی، اسی طرح کلیجہ تھامے ہوئے ملاحظہ ہو :-

"دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر آیا، میں نے حقّہ بھروا دیا۔ پاندان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں، مَیں ہوں اور وہ ہے۔

جوان ۔ کل تمھیں مجرے کو گئی تھیں، یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔

مَیں ۔ "ہاں" اتنا کہہ کے اس کے چہرہ کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان ۔ (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

مَیں ۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان ۔ ہم تو سمجھے تھے تم مر گئیں، مگر تم اب تک زندہ ہو۔

مَیں ۔ بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان ۔ بیشک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔ کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

مَیں ۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی۔ نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔ اب سہی۔

جوان ۔ اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں۔ اور آئی بھی تھیں تو تمھیں اس محلہ میں مجرے کو آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں؟

مَیں ۔ ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان - اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

مَیں۔ اب کیا ہوتا ہے۔

جوان - (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے، اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھدی) یہ ہوتا ہے۔

اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آگئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے "ائے دوڑو بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے"

جوان - (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی ...."
اتنا کہہ کے داڑھیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی سے رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہونچا تھا اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا، میں بھی رونے لگی، ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارہ سے منع کیا ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں خوب رو چکے

جوان - (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

مَیں - کل چلی جاؤں گی۔ مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان - بس اب دل سے دُور رکھو۔ معاف کرو۔ کل اماں نے تمھیں گھر پر بُلا لیا۔ میں نہ ہوا انہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

مَیں - تم نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہاں تمھاری جان کا خیال ہے تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سُن ہی لیا کریں گے۔

جوان - برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا"

یہ زندہ احساس غیرت و شرافت بگڑے ہوئے لکھنؤ اور نشیمن آباد کا ہے اُجڑے ہوئے اسلامی ہند کا ہے، اس خزاں سے بہار کا اندازہ کرنا کیا کسی کے لیے کچھ بھی مشکل ہے؟

— پیشہ ور طوائف کی آپ بیتی ختم ہو چکی، اور کتاب حیات ختم ہونے پر ہے، اس وقت اس کے منہ سے

جو بول نکلے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ ہم سُنیں، آپ سُنیں، خاک کے پُتلے سُنیں، نُور کے بنے ہوئے فرشتے سُنیں، جنھوں نے کچھ نہیں سُنا ہے وہ سُنیں جو بہت کچھ سُن چکے ہیں وہ بھی سُنیں۔

کفایت شعاری کی وجہ سے اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کر لے جاؤں گی، وہاں کا مالک اللہ ہے، میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں اور حتی الوسع روزہ نماز کی بھی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں مگر پردہ والیوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں، خدا ان کا راج سہاگ قائم رکھے اور دمتی دنیا تک ان کا پردہ رہے اس موقعہ پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں چاہیے کہ وہ اپنے دل پر نقش کر لیں۔ اے بیوقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھکو سچے دل سے چاہے گا تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منھ دیکھ کے دوسرے کا منھ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا، خیر میری تو جیسی گزرنا تھی گزر گئی، اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں، جے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں۔ اب کسی بات کی تمنّا نہیں رہی اگرچہ یہ آرزو کم بخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔ مجھے امید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اب میں اپنی تقریر اس شعر پر ختم کرتی ہوں اور سب سے امیدوار دعا ہوں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی"

آغاز جیسا کچھ بھی ہوا ہو۔ انجام توبہ، انابت، خشیتؔ، رجوع الی اللہ پر ہو رہا ہے اس انجام پر ہم کو، آپ کو کس کو رشک نہ آئے گا؟

---

(۲) اُردو کا واعظ شاعر[1]

آج سے کوئی ۲۵ سال اِدھر کی بات ہے الہلال افقِ کلکتہ سے نیا نیا طلوع ہوا تھا اور ملک کی ساری فضا ابوالکلامی ادب و انشا کے غلغلہ سے گونج رہی تھی، کہ ایک روز اس کے کسی مقالہ کے ذیل میں یہ شعر نظر سے گزرا

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہوگئی، لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا درج صرف شعر تھا شاعر کا نام نہ تھا دل نے کہا اور اس کہنے میں تامل و تذبذب کی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ شعر غالب کا ہے' دیوان غالب میں پڑھا یاد اگر نہیں پڑتا، نہ سہی۔ دیوان مطبوعہ میں اگر موجود نہیں نہ ہو، رہ گیا ہوگا۔ لیکن ہے یقیناً غالب کا اس مسلّم اُستاد کے سوا اور کون ایسا کہہ سکتا ہے؟ غالب کا اتنا پختہ رنگ بجز خود غالب کے اور کہیں مل ہی کہاں سکتا ہے؟۔

حاضری اسی درمیان میں ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی (اکثر ہوتی ہی رہتی تھی) ذکر اس شعر کا آیا، ارشاد ہوا کہ غالب کا نہیں حالی کا ہے۔

ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر؟ بے چارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی، روکھے پھیکے۔ اشعار کے ناظم، انھیں غزل اور پھر غزل کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور اُستاد غالب کے تخیل وہی، بندش وہی، زبان وہی، حالی کے کلام میں نہ حُسنِ بیان، نہ لطفِ زبان، نہ یہ رُوح، نہ یہ جان، نہ تخئیل میں رعنائی، نہ طرز و ادا میں زیبائی! غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہی رہتی ہے، دیوان حالی اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود!

کون حالی؟ وہی جن کے تغزل و تشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں، بس شروع سے یہ

---

[1] تحریر جنوری ۱۹۳۶ء۔ نظر ثانی ۱۹۵۳ء۔

خیال جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں اور رنگین بیانیوں سے انھیں واسطہ کیا، ایک خشک نظم نویس، کلام میں عاشقانہ مضامین کا قحط، بندشیں سست۔ خدا غریق رحمت کرے دورِ اول کے اودھ پنچ[1] کو اور بھلا کرے اس کے تعاقدان فن اور شہسواران سخن کا۔ یہ اسی کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں، پختہ کاروں، لائق فائق زباں دانوں کے دل میں بس یہی رچا ہوا تھا۔ اِدھر حالی کا نام آیا اُدھر کلام کی بے نمکی، بے اثری، روکھے پن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی!

بات دل سے نکلتے ہی نکلتے نکلتی ہے، اس ایک شعر سے کیا ہوتا ہے۔ شعر کیسا ہی باعزہ سہی، بہرحال ہے تو ایک ہی ——— اور دو ایک باعزہ شعر کس کے ہاں نہیں ملتے؟ مشق کرتے کرتے معمولی شاعر بھی دو چار شعر تو اچھے سے اچھے نکال ہی لاتا ہے ——— اچھا تو آج کی صحبت میں یہی نہو، کہ ہم آپ مل کر دیوان حالی کے اوراق اُلٹ پلٹ، اِدھر اُدھر سے دیکھ ڈالیں، عجب نہیں کہ کچھ اور چیزیں بھی ہاتھ آجائیں۔ اور یہ گھنٹہ پون گھنٹہ کی محنت محض رائیگاں نہ جائے۔ دیوان کھولیے ردیف الف میں ایک مطلع یہ ملے گا ؎

فطرت میں تری صوفی، گر نورِ صفا ہوتا!   تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

اس غزل میں فرماتے ہیں ؎

ہم وقتِ وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت   رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

وداع و رخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے لیکن حسرت و یاس کی جو تصویر اس رونے میں نہیں، ہنسی میں دکھادی گئی ہے اس کا بھی کوئی جواب ہے؟

اور پھر فرماتے ہیں ؎

جو جان سے در گزرے، وہ چاہے سو کر گزرے   گر آج نہ تم آتے، کیا جانیے کیا ہوتا

عاشق کی جانبازی کے افسانے بھی سب دُہراتے چلے آئے ہیں لیکن اس "کیا جانیے کیا ہوتا" کے کنایہ کے اندر جو بات ہے وہ کسی تصریح کے بعد بھی پیدا ہونی ممکن ہے؟

---

[1] انیسویں صدی عیسوی کے آخری حصول میں لکھنؤ کا بہت مشہور و ممتاز ادبی اور ظریفانہ ہفتہ وار۔ ظرافت اس دور میں شخصی تعریفیں، تمسخر اور کسی کو "بنانے" کے مرادف تھی۔

ناصح اور عاشق کی مڈبھیڑ دنیائے شاعری کی بڑی پرانی حکایت ہے حالی بھی ایک بار ملتے ہیں؟

جو دل پہ گزرتی ہے، کیا تجھکو خبر ناصح   کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تو نے کہا ہوتا

حالی نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے، ایک آہ سرد بھر کر صرف اتنا کہتے ہیں اور کہکر چپکے ہو جاتے ہیں کہ ؎

کچھ ہم سے سُنا ہوتا، پھر تو نے کہا ہوتا

ناصح کو بے درد، بے حس، سب نے مانا ہے یہاں عاشق کو اپنی داستان درد کی درد انگیزی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کے خیال میں وہ ناصح کے دل پر اثر کیے بغیر رہ نہیں سکتی، پتھر آخر کیسے موم ہو کر نہ رہے گا کوئی فولاد اتنا گرم ہو بھی تو۔

نشان نہ تھا، گمان نہ تھا، اس زمین میں خوب خوب گُل بُوٹے کھلائے ہیں ؎

آتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام   گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں   طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی   مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

کہیے خشک نظم نگاروں کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے؟ اور آگے چلیے ؎

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا!   پوچھنا کیا تیری زیبائی کا!

بدگمانی کے لیئے غیر کا سایہ پڑ جانا بھی کافی ہو جاتا یہاں عین بزمِ رقیب میں رونقِ محفل بنا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ کمال دل ربائی ہے کہ جی پھر بھی نہ ہٹا۔ کمال اپنا نہیں، اپنے وفورِ عشق کا نہیں، تمام تر انھیں کا، انھیں کے حُسنِ بے پایاں کا "پوچھنا کیا تیری زیبائی کا" گویا جمال بھی انھیں کا اور کمال بھی انھیں کا۔

غالبؔ کا مشہور مطلع ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہی زمزمہ ذرا حالی کی زبان سے سُنیئے اور واہ واہ کرتے رہ جایئے ؎

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں!   ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

تجلیاتِ حق کہاں نہیں؟ دکھائی نہ دیں تو قصور اپنی نظر کا ہوا یا حُسنِ نامحدود کا؟

شعر یہ کہا ہے اور اپنی ساری متانت و ثقاہت کے باوجود، حضرت زاہد کے دامن پر چھینٹے ڈالتے چلے گئے ہیں ؎

جانی نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

زاہدوں کی قسمت میں تو مژدہی مژدہ ہے۔ محض رحمتِ حق کا نزول ظاہر ہے کہ انھیں پر ہوگا جو اپنی سیہ کاریوں کے باعث حقدار زرا سے بھی اس رحمت کے نہ ہوں گے؟

شوخی اور طرّاری، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور ظرافت کے لیئے یہ ہرگز ضروری نہیں، کہ اس کے ڈانڈے عریانی و فحاشی سے مل مل جائیں۔ حالی شریف ہیں اور متین۔ اول میں بھی متین آخر میں بھی متین، ذہانت، شوخی، ظرافت، طنز، موجود ان کے ہاں سب کچھ لیکن متانت کی شان سب پر غالب گویا حضرت اکبرالہ آبادی کا پورا جواب۔ یہاں ہر منظر پر ذہانت کا پردہ پڑا ہوا وہاں ہر چہرہ پر ظرافت کا غازہ لگا ہوا۔ اُن کا یہ رنگ کہ روتے ہوؤں کو بھی گدگداتے جائیں۔ ان کا یہ ڈھنگ کہ ہنسی آئے بھی تو پہلے منہ پر رومال رکھا دیں۔ ایک کے ہاں تمامتر شوخی و رنگینی، دوسرے کے ہاں ایک ذرا اداسی اور غمگینی! ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کا شور، دوسرے کے ہاں ادب لحاظ اور قاعدہ کا زور۔ ایک کی مجلس طرب افروز، دوسرے کی صحبت سبق آموز۔ ان کے میز پر شراب و کباب، ان کے دواخانہ میں بید مشک اور عرق گلاب۔

باتیں سب عاشقوں والی کہے جاتے ہیں لیکن وہی

نالہ رکتا ہوا، تھمتی ہوئی فریاد رہے!

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے نیچی نظروں، شرمیلی نگاہوں کے ساتھ۔ لغزش مستانہ کے بجائے، ہر قدم سلامت روی کی تصویر، لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جایئے اور دل ہی دل میں مزے لیتے جایئے ؎

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائیگا سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

مطلع تو معمولی ہے لیکن آگے گلکاریاں ملاحظہ ہوں ؎

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جایگا

بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتے ہیں ؎

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

ذرا ان بزرگ کی کم سخنی ملاحظہ ہو۔ کچھ نہ کہنے پر سب کہہ جاتے ہیں، رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے، وعدہ

تھا کس سے اور پورا جاکر کہاں ہوا وہی "کجا می نماید کجا می زند" کی پرانی داستان، کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو کھل کھیلتا اور "معاملہ" کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کرجاتا۔ ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی، کسی اشارہ کے بھی روادار نہیں، وہی نیچی نگاہیں اور زبان پر صرف اس قدر کہ ع

پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

پھر آگے کہتے ہیں ؎

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر   کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

یہاں استاد مومن کا بھی ایک مطلع یاد کر لیجیے ؎

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے   کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

خاکساری کے مضامین آپ نے بارہا سنیں گے، کیسی کیسی نازک خیالیاں اس میں صرف ہو چکی ہیں اور تعلّی تو ہمارے شاعر حضرات کی گویا جاگیر رہی ہے، اب ذرا دیکھیے کہ اردو کا واعظ شاعر ان دونوں اضداد کو کس بلاغت سے جمع کرتا ہے اور ایک مختصر سے شعر کے اندر کس نادر اور اچھوتے انداز سے تعلّی سے خاکساری پیدا کر رہا ہے اور خاکساری سے تعلّی نکال رہا ہے۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا   خاکساری اپنی کام آئی بہت!

بیت الغزل سن چکے تو اب مطلع اور ایک آدھ شعر اور بھی ملاحظہ میں آجائیں ؎

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت   پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت!

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے   مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا   دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کہیے اب بھی حالی دہلی کے نرے کھرے "واعظ" رہے؟ وہی خشک اور بے مزہ پھیکی اور بے اثر نظم کہنے والے رہے؟

اور پھر اس غزل کے بعد یہ غزل ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت   نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل   کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے   یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں   دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

مقطع سے متعلق ایک لطیفہ، مولانا شبلی کی زبان سے سُنا ہوا عرض کرنے کی اور اجازت دیجیے۔ علی گڑھ کے طالب علموں کی شوخیاں سارے زمانہ میں مشہور ہیں حالی کی یہ غزل جب اول بار شائع ہوئی تو کالج کے ایک نوجوان، داؤد احمد امروہوی مرحوم کو اس پر تضمین کی سوجھی سننے کے قابل مقطع کا بند ہے ؎

چاہیے جبکہ ارادہ کرے کوئی انساں　　　دیکھ لے خوب کہ ہے شوق وہ اس کے شیاں

سُن کے لوگوں سے کہ آئے تھے وہ داؤد کے ہاں　　　ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں!

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعزیر جرم عشق والا شعر شروع مضمون میں عرض ہو چکا اب دو شعر اور اسی غزل کے پیش ہیں ؎

گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا　　　آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر　　　بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

عاشقی میں بجز رسوائی اور بدنامی کے اور رکھا کیا ہے۔ عاشق کا کمال یہ ہے کہ اس زمانہ بھر کی رسوائی سے مغموم نہیں ہوتا۔ بچنا نہیں چاہتا، الٹا خوش ہوتا ہے اور اس کی طلب و تلاش میں نکلتا ہے!

معرفت کے رنگ میں یہ مطلع چھوڑتے نہیں بنتا ؎

ہے یہ تکیہ تیری عطاؤں پر　　　وہی اصرار ہے خطاؤں پر!

اکبر نے بھی ایک مصرعہ میں یہی مضمون ادا کیا ہے۔ ع

اسی کی عظمت سے کوئی خائف، اسی کی رحمت پہ کوئی غافل!

شاعر اردو کے تھے لیکن کہیں کہیں عربی مصرعے اس بے تکلفی سلاست اور برجستگی کے ساتھ لگائے ہیں کہ جیسے شعر اپنی ہی زبان میں کہہ رہے ہیں۔

یاد میں تیری سب کو بھول گئے　　　کھو دیئے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھیے تو بھی خوش ہے یا ناخوش　　　اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض!

کہتے کہتے، کہتے ہیں ؎

لَا اُبَالِی بِاَنْ یُعَاتِبُنِی　　　کُلُّ نَاسٍ وَّاَنْتَ عَنِّی رَاضٍ

یہ وہی مضمون ہے جسے محمد علی جوہر اپنے رنگ میں یوں باندھ گئے ہیں ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیئے ہے

ایک اور عربی مصرعہ اسی غزل میں ع

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
هَل لَنَا فِی نِزَاعِنَا مِن قَامٍ

لیجیے، دیوان کی جلدی جلدی ورق گردانی کرتے کرتے ہم آپ، ردیف میم تک پہونچ گئے ایک غزل پر نظر جم کر رہ گئی۔ معاملہ بندی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ ساتھ، یہ متانت، یہ احتیاط، یہ ضبط حالی ہی کا حصہ ہے ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھکو زندگیٔ جاوداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

یہ شعر اگر حالی کے دیوان سے نکل کر، مومن یا شیفتہ کے دیوان میں لگا دیئے جائیں تو کسی کو کچھ پتہ بھی چلنے پائے گا؟ "گرانیاں" "کہانیاں ہیں" والی غزل اس زمانہ کی ہے جب حالی شاعر۔ حالی واعظ کے قالب میں آچکے تھے، اس پر بھی ذیل کے دونوں شعر دیکھیے، شعر کی زمین ہے کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہے ؎

کہتے ہیں جس کو جنّت وہ ایک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں!

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہونچی اب ناتوانیاں ہیں

غزلوں کے متفرق اشعار کثرت سے گزر چکے، اب ایک پوری غزل نمونہ کے طور پر ملاحظہ میں آجائے۔ کہ انتخاب اشعار میں رورعایت کا شبہ نہ رہے، فرماتے ہیں اور ہر ہر شعر پر پڑھنے والے سے داد وصول کیے جاتے ہیں ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بہ خیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیان کسل و رنج راہ کا !	خط کا میرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر	اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور	عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب	آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

غزل تو شعر کی ہے، مراتب کا فرق یقیناً ان کے درمیان ہے لیکن فرمایئے کہ اس میں پست و لغو شعر، نکال ڈالنے کے قابل کون سا ہے؟ کلام کی خشکی، اگر اسی کا نام ہے تو آخر 'تری' کے نمونے کہاں ملیں گے؟

ردیف 'رہے' میں دو مختصر غزلیں 'گمان رہے'، 'نشان رہے' کی زمین میں ہیں اس زمین کے دو ایک شعر ایسے صاف، رسجل، اور گویا سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں کہ بے تکلف زبان پر چڑھ گئے ہیں،

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے	بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا	اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا	ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام	کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حُسنِ قبول اگر ایسے کلام کو حاصل ہو جائے۔ تو اس پر حیرت ہی کیوں کی جائے۔ مخرومغنی سے قطع نظر سلاست، شستگی، روانی، بے ساختگی کسی حیثیت سے بھی یہ کلام کسی بلند سے بلند نمونہ سے پست ہے؟

کہنے والوں نے کہا ہے کہ حالی جب تک قدیم رنگ پر قائم رہے، اچھی اچھی غزلیں کچھ نہ کچھ بہرحال نکالتے ہی رہے مگر جب سے جدید رنگ میں پڑے اپنی شاعری کو غارت کر کے رکھ دیا۔ یہ قول کسی حد تک تو شاید صحیح ہو لیکن تمام تر صحیح تو یقیناً نہیں ابھی ابھی جو نمونے کلام کے گزر چکے، ان میں دس شعر اگر دور قدیم کے تھے تو چار دور جدید کے بھی۔ دونوں میں کوئی فرق و امتیاز محسوس ہوا؟ ۔ کلام جدید کے بہت سے نمونے اوپر گزر چکے، اب دو چار شعر اسی دور کی ایک اور غزل کے ملاحظہ ہوں ؎

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے	قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو	وہ صرف تمنا ہوا چاہتا ہے

ندرت قافیہ ملاحظہ ہو۔

وفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک	دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

غمِ اشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم! ‏ سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں ‏ درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

خشکی اگر متانت بیان ہی کا دوسرا نام ہے تو یقیناً یہ اشعار بھی خشک ہیں۔ لیکن اگر متانت بیان عیب نہیں ہنر ہے، تو خدارا کوئی بتائے کہ خشکی کا اطلاق ایسے کلام پر کس طرح کیا جائے؟

غزلیات کا حصہ اب اچھا خاصا ہو چکا، عجب نہیں کہ اہلِ بزم، مقالہ نگار کی آشفتہ بیانی و ژولیدہ نگاری سے افسردہ و ملول ہو چلے ہوں۔ اس لیے اب صرف ایک غزل اور اسی دورِ جدید کی سن کر یہ ورق الٹ دیجیے ؎

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے ‏ آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
اے دل اب آزمائش کا ہے وقت ‏ وہ امتحان بر رخش و شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے ‏ ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز ‏ دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے
دل لیکے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ ‏ گویا کہ اِک جہان کو تسخیر کر چکے
حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں! ‏ بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اور تو جو کچھ ہے، خیر ہئی ہے، خود شوخی کے نمونوں سے یہ کلام کب خالی ہے؟ تیسرے شعر کے اندر لطیف شوخی کی جو کیفیت ہے، اسے لفظوں میں کوئی کیونکر بیان کر دے؟ بس بات کیا ہے وہی کہ نرم مخملیں پنجہ، آہنی دستانہ کے اندر چھپا ہوا۔ شوخی حدودِ متانت سے قدم باہر نہیں نکال سکتی۔ اور اپنی لطیف ترین صورتوں ہی میں محدود رہ جاتی ہے۔

قلم کا مسافر، اب ذرا دم لے۔ شعر اب ایک آدھ نہیں رہا۔ دس بیس بھی نہیں سو پچاس شعر ہو چکے کوئی تیر کوئی نشتر۔ اب بھی اس کلام سے وہی بدگمانی چلی جائے گی کہ خشک اور نرا واعظانہ ہے؟ خیال اب بھی یہی قائم رہے گا کہ حالی غزل گوئی میں ہیٹے ہیں؟ غالب اور مومن اور شیفتہ آسمانِ شعر کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں۔ انھیں کے معیار پر کسیے، جانچ لیجیے پرکھ لیجیے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن اس پر بھی حالی کا اصلی میدان غزل کا میدان نہیں ان کی شاعری 'واہ' کی نہیں 'آہ'

کی نہیں، جوش وولولہ کی نہیں، حزن وحسرت کی ہے۔ نوعمری میں جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو گل وبلبل کے افسانے چھوڑ اور زلف وابرو کے جنجال سے نکل، بس قوم، کے ہو رہے تھے اور اب وہ تھے اور قوم کے اقبال کا ماتم۔ ساز کوئی سا بھی ہوتا، نغمہ یہی ایک نکلتا۔ کسی بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان، چہیتا بیٹا، آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو، اس وقت باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ منہ قہقہوں کے لیے کھلے گا یا آہ وبکا کے لیے؟ زبان پر حسرت ویاس کے کلمے ہوں گے یا کوئی نئی پھبتی سوجھے گی؟ —— بس جو حال ہمارا آپ کا، ساری دنیا کا، بیٹوں کے لیے، بھائیوں کے لیے رہتا ہے حالی کا وہی حال ساری اُمت اسلامیہ کے لیے، ساری ملت کے لیے۔ ساری قوم کے واسطے تھا۔ یہی حال ان آنکھوں نے بعد کو مشہور قومی لیڈر محمد علیؒ جوہر کا دیکھا، فرق یہ تھا کہ محمد علی کے ہاں طبیعت میں غضب کی تیزی تھی۔ حالی کے ہاں آہ سرد بھی آئین و ضابطہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ ایک کے ہاں تمام تر جوش اور شوریدگی، دوسرے کے ہاں ضبط وتحمل سے ملی ہوئی سنجیدگی۔ محمد علیؒ جدھر سے گزرتے، ایک عالم تہ وبالا کر دیتے، حالی دلوں میں اندر ہی اندر حزن وغم کی پھانس چبھو کر رہتے۔ محمد علیؒ چیخیں مار مار کر خود روتے ہیں، اور دوسروں کو رُلا مارتے ہیں۔ حالی سر جھکائے اداس صورت بنائے چپکے چپکے بیٹھے کلمہ شریف کا ورد کر رہے ہیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتے جاتے ہیں، اور جب آنکھیں بے اختیار نم ہونے لگتی ہیں تو جھٹ رومال نکال آنسو پونچھ ڈالتے ہیں۔ طبیعت پر حسرت، اُداسی اور غمگینی مستقل طور پر غالب ہو گئی تھی۔ جو بات بھی مُنہ سے نکلتی درد کی کسک سے خالی نہ ہوتی دہلی کے طبیب اعظم، حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ تو لگے بجائے فرد کے قوم کا ماتم کرنے۔ غم نصیب سانحہ زدہ بوڑھیوں کو آپ نے دیکھا کہ دل پر جب تازہ داغ کھاتی ہیں۔ تو ساتھ ہی پچھلے داغ بھی تازہ ہو جاتے ہیں اور بین اپنے آج ہی پر نہیں گزرے ہوئے کل، اور بھولے بسرے ہوئے پرسوں پر بھی کرنے لگتی ہیں۔ حالی کا سینہ بھی داغوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ محمود خاں کے مرثیہ کے آخری بند ملاحظہ ہوں۔ اپنے اصل مذاق طبیعت کی مصوری خود ہی کر دی ہے۔ پڑھتے جائیے، اور دل اگر درد مند ہے تو سرد آہیں بھرتے جائیے ؎

شاید اب پہونچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال	ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال	ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے ہمال
ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا	مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا
سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی	تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

داستاں کوئی بیان کرتا تھا حسن و عشق کی — اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ — گہ قصیدہ پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم — راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم — کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا — ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

"ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" اس ایک مصرعہ میں واعظ شاعر کی پوری آپ بیتی آگئی —

یہ نہ تھا کہ ظرافت نہیں آتی تھی، طنز تو ایسا کر جاتے اور اس کثرت سے کر گئے ہیں کہ کوئی اگر طنزیات حالی کو یکجا کرنے پر آجائے تو طنزیات و مضحکات کا اچھا خاصہ مشتمل رسالہ تیار کرلے جائے لیکن وہی متانت کا طبعی رنگ ظرافت پر بھی چھایا ہوا۔ کھلکھلا کر ہنسنا تو جانتے ہی نہیں۔ جب دوسروں کو ہنسانا چاہتے بھی ہیں تو خود محض زیر لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں —— گورے اور کالے کی قسمت کے فرق کا تماشا اپنے وطن کی سرزمین پر آپ بارہا دیکھ چکے ہوں گے، اب ذرا ایک یہ منظر مرقع حالی میں بھی دیکھتے چلیے ۔

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا! — دوسرا پیدل مگر پہلا سوار راہوار!
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں — کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت، — کوکھ میں کالے کی ایک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہونچا جس سے تلی کو بہت سنگین کی — آکے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی، — چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس! — ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگزشت! — تہ کو جا پہونچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض — اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکّے سے مرے — کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند — کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے گورے سے جو فوراً مر نہ جائے — آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

اب کون ایسا بے انصاف ہوگا۔ جو اس کے بعد بھی حالی کی خشک نگاری کا شکوہ سنج رہے چلا جائے گا؟

مشاعرے کی محفل گرم ہے۔ کاملین فن جمع ہیں۔ دہلی کے دور آخر کے اُستادوں کا مجمع ہے لوگ منتظر ہیں کہ غالب و شیفتہ کے شاگرد رشید کی زبان سے کوئی پھڑکتی ہوئی مزیدار سی عاشقانہ غزل سننے میں آئے گی رندی و ہوسناکی کی رُوح تازہ ہو جائے گی۔ شاعر کا منھ کھلا تو یک بیک یہ معلوم ہوا کہ مشاعرہ نہیں مجلس عزا ہے اور غزل نہیں نوحہ پڑھا جا رہا ہے۔ اگلے عزیز و رفیق سب ایک ایک کر کے یاد آ رہے ہیں اور نام لے لے کر دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے۔ نوحہ آج بھی اور کاغذ پر چھپا ہوا دل والوں کے لئے مُوثر ہے۔ ساٹھ سال پیشتر کیسا کچھ رقت انگیز رہا ہوگا! خصوصاً جس وقت قدر دانوں کے بھرے مجمع میں شاعر کی زبان سے اُن کے پُر اثر لہجہ کے ساتھ ادا ہوا ہوگا ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

صحبتیں اگلی مصور، ہمیں یاد آئیں گی!
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز!

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو!
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

آج اگر ہمارے آپ کے آنسو نہیں ٹپک پڑتے تو ہمیں "دہلی مرحوم" کے مرحوم ہونے کا احساس ہی کب ہے؟ آنکھوں میں تو اب "نئی دہلی" بسی ہوئی ہے، "شاہجہان آباد" جانتا کون ہے؟ اسمبلی ہال کے سامنے، لال قلعہ کو جھانکنے بھی کون جاتا ہے؟ افسانۂ ماضی کو تو ہم ماضی کے حوالے کر ہی چکے، اب رونا آئے بھی تو کس بات پر؟ بھائی اور بیٹے کی تازہ میت پر سب روتے ہیں، بھولے بھالے ہوئے دادا پر دادا کی موت کے ذکر پر آنسو نکلتے کس کے دیکھے ہیں؟

مسدس مدو جزر اسلام فرط شہرت سے محتاج نہ کسی تعریف کا نہ کسی تعارف کا نہ کسی نئی مدح و توصیف کا، نہ کسی جدید نقد و تبصرہ کا۔ ایک مسلسل داستانِ درد شروع سے آخر تک ہے، آخر میں بہ طور ضمیمہ ایک قصیدہ لگا ہوا ہے۔ شاعر مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے، اسلام اور مسلمانوں کا حال زار، دربارِ رسالت میں عرض کر رہا ہے، اس عرض و معروض میں اللہ اکبر کس قدر اخلاص ہے اور کس قدر نیاز، کس درجہ تعلق خاطر ہے اور اصلاح حال کے لیے کس درجہ بے قراری!

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

۱۵، ۲۰ شعروں میں اپنے حال کا عبرت انگیز مقابلہ اپنے ماضی سے کرتے چلے گئے ہیں، اس کے بعد کہتے ہیں ؎

گو قوم میں تیرے نہیں اب کوئی بڑائی پر نام تیری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر مدت سے اُسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

آگے پھر وہی مدو جزر اقبال و زوال کی داستان سرائی ہے، لیکن پھر سنبھلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں شکوہ کس کا اور شکایت کس کی؟

اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے

اس متن کی تھوڑی سی شرح کے بعد پھر متوجہ ہوتے ہیں ؎

برتاؤ ترے جبکہ یہ اعدا سے ہیں اپنے اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے

اُمّت میں تیری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

اُمت کا جو تعلق رسولؐ کے ساتھ ہے، اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی تعلق کر سکتا ہے؟ ؎

جو خاک تیرے در پہ ہے جاروب سے اُڑتی — وہ خاک ہمارے لیے داروئے شفا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف — اب تک وہی قبلہ تیری اُمت کا رہا ہے

جس شہر نے پائی تیری ہجرت سے سعادت — کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

آخر میں گویا دل چیر کر سامنے رکھ دیتے ہیں ؎

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے — نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں — پر فکر تیرے دین کی عزت کا سدا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری — اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں — اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

اس منزل پر پہنچ کر معاً یاد پڑ جاتا ہے کہ موقع نازِ یوسفی کا نہیں، نیازِ یعقوبی کا ہے۔

ہاں حالیؔ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے — باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

ہے یہ بھی خبر تجھکو کہ ہے کون مخاطب — یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ دل کی شاعری اُس کی تھی، جس کے محض ایک خشک وعظ گو ناظم ہونے کا ڈھنڈورا کس بیدردی اور نا انصافی کے ساتھ ایک عالم میں پٹ گیا تھا۔

واعظ شاعر کی عام وعظ گوئی اور عام شاعری کے نمونے آپ نے دیکھ لیے۔ غزلیات کے حصّہ کو چھوڑ کر باقی شاعری ایک مسلمان شاعر کے دل کی آواز تھی۔ ماتم تمام تر زوال امت اسلامیہ کا، مصوری تمام تر جذبات ملی کی۔ اب ختم صحبت پر ایک اچٹتی سی نظر حالی کی آفاقی شاعری پر بھی ہو سکے تو بہتر ہے، آفاقی شاعری اسلامی شاعری سے الگ اور متغائر کوئی چیز نہیں، اس کے بلند ترین مقام کا نام ہے۔ بندہ اور پروردگار کے تعلق سے بڑھ کر وسیع و عالمگیر تعلق اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ شاعر نے جب براہ راست رب العالمین سے آہ و فریاد شروع کر دی، اور شاعری میں قیود و تعینات کی جگہ وحدت نے لے لی، بس وہیں سے آفاقی شاعری ہو گئی۔ اور یہ ہیچمدان تو یہ عرض کرے گا کہ حالی نے عمر بھر بجز ایک "بیوہ کی مناجات" کے اگر کچھ نہ کہا ہوتا، تو ان کے لیے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ دونوں میں بس تھی، باتیں اتنی سچی اور ایسی روح کی گہرائیوں سے

نکلی ہوئیں کہ آسمان کے فرشتے بھی سُن کر سر دھنیں۔ بول اتنے میٹھے کہ خود معصومیت بڑھ کر بلائیں لینے لگے۔ ذرا سُنیے اور دل تھام کر سُنیے،

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے بالا ہر بالا تر سے — چاند سے سورج سے آمبر سے
سب سے انوکھے سب سے نرالے — آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھ سا نہیں کوئی — تجھ سے سب ہیں تجھ سا نہیں کوئی
بید، نراسے، بیماروں کا — گاہک مندے بازاروں کا
سوچ میں دل بہلانے والا — بپتا میں یاد آنے والا!

حمد باری صدہا بار آپ سُن چکے ہیں گے۔ اتنی سادہ اتنی معصومانہ، ساتھ ہی اتنی مؤثر حمد کا کوئی جواب اردو کے خزانے میں کہیں ہے؟

اے اٹکل اور دھیان سے باہر — جان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا — بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
کھیتی ایک کی ہے لہراتی! — ایک کا ہر دم خون سُکھاتی
حال غرض دنیا کا یہی ہے — غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا — تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

مناجاتیں آپ نے بہتوں کی سنی ہوں گی۔ بڑے بڑے عابدوں زاہدوں کی سُنی ہوں گی، اب فریاد اس بیکس و بے بس بے آس اور نامراد دکھیاری کی بھی سُنتے چلیے ؎

یہاں نہیں بنتی رنج سہے بن — رنج نہیں سب ایک سے لیکن
تو ہی کر انصاف اے مرے مولا — کون ہے جو بے آس ہے جیتا
خواہ دکھی ہے خواہ سُکھی ہے — جو ہے اک امید اس کو بندھی ہے
کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی! — آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینھ کی

ایک ہے اس امید پہ جیتا | اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
پر نہیں اُٹھ سکتی وہ ہے مصیبت | آئے گی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہوا اس رہگیر کا کیا دل | مر کے کٹے گی جس کی منزل
ان اجڑوں کو کل پڑے کیونکر | گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر

آگے بڑھنے سے قبل، اگر خدانخواستہ آپ کے حلقہ میں کوئی بپتا کی ماری نوجوان بیوہ ہو تو اس کا تصوّر ذہن میں جمالیجیے۔ نو عمری کا زمانہ، شوخی و شرارت کا ہونا کھیلنا کھانا، دوڑنا، بات بات پر ہنسنا ہنسانا، ماں باپ نے بیا؟ کس شوق کس خوشی سے رچایا۔ ہاتھوں پیروں میں مہندی لگی، نئے نئے بھاری جوڑے، نئے نئے زیور گہنے طرح طرح کی رنگینیاں، نت نئی شوخیاں، دل میں کیسے کیسے ارمان بھرے ہوئے، نظروں میں کیا کیا نقشے جمے ہوئے! اتنے میں یک بیک یہ سب غایب۔ سارا منظر محض خواب و خیال۔ یہ ہاتھ اب عمر بھر چوڑیوں کو ترسیں گے۔ یہ کپڑے اب کبھی خوشبو سے آشنا نہ ہوں گے خوشبو کیسی رنگین کپڑے تک اب نصیب نہ ہوں گے۔ دنیا اپنے عیش کے کاروبار میں مصروف، محلہ اور برادری میں شادیوں کی دھومیں، خاص اپنے گھر میں برسات کی ملاریں جھولے پڑ رہے ہیں، کھیل پر کھیل ہو رہے ہیں۔ ساتھ کی کھیلنے والیاں ساتھ کی مانگی بیاہی ہوئیں نئی نئی ساڑیاں باندھے شوخ رنگ کے بلاوز پہنے، کیسے کیسے طرحدار دوپٹے اوڑھے، آنکھوں کے سامنے کوئی ہنس رہی ہے کوئی دوڑ رہی ہے اور ایک یہ مصیبت کی ماری ہے کہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے ؎

آئیں بہت دنیا میں بہاریں | عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے | ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں! | برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی! | وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی!
آس ہی کا یاں نام ہے دنیا | جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
حکم سے تیرے پر نہیں چارا | کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں | بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور تو نوازے! | پڑی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں | تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

سہیلیاں زیوروں سے لدی ہوئی ہیں، کس شوق سے کس چاؤ سے ایک دوسرے کو اپنے اپنے زیور دکھائے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں میں مہندیاں رچی ہوئی ہیں۔ پھولوں کے گہنے سر اور گلے کو زینت دیئے ہوئے ہیں۔ نازک نازک بنڈے عطر کی خوشبوؤں سے مہک رہے ہیں۔ کہیں ذکر میاں کی چاہ پیار کا ہو رہا ہے، کہیں تذکرے سسرال کی ناز برداریوں کے ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی پر فقرے کسے جا رہے ہیں۔ قہقہوں کا غل ہے رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ ادھر ایک بیچاری اللہ کی بندی ایسی ہے جس کے ہاتھ بھی ننگے اور کان بھی جسم رنڈاپے کی سفید چادر سے چھپا ہوا سن اُس کا بھی آخر وہی ہے، کیا اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں رہا ہے؟ اس کا قلب اُمنگوں سے، حوصلوں سے ولولوں سے خالی بنایا گیا ہے؟ کیا اس دکھیاری کا جی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کا بھی ناز بردار ہوتا؟ یہ بگڑتی اور کوئی مناتا۔ یہ فرمائشیں کرتی اور کوئی دل و جان سے انھیں پوری کر کے دیتا؟ روتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے ؎

اے میرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری! — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو روؤں کہاں تک
دن بھیانک اور رات ڈراؤنی — یوں گزری ساری یہ جوانی!
بہنیں اور سہیلیاں میری — ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے — خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ — جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر — گھل گئی جان اندر ہی اندر
تہواروں کا آئے دن آنا! — اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں — وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں! — وہ ارمان بھری برساتیں

کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں — خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں
رہ گیا دے کر چاند دکھائی — چاند ہوا پر عید نہ آئی!
رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا — بادل گرجا اور مینہ نہ برسا
ریت میں ذرے دیکھ چمکتے — دوڑ پڑی تیں جھیل سمجھ کے

حسرت نصیب اپنے دن رین کو دیکھتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتی ہے، پھر بلک بلک کر اپنے اسی مالک و مولیٰ سے کچھ عرض کرنے لگتی ہے، ۔ جو کسک اس کی آواز میں ہے وہ عابدوں اور زاہدوں کو بھی کہاں نصیب؟ عمر بھر کے مجاہدے ایک طرف، اور ایک گھڑی کی یہ شکستگی، یہ بے چارگی، یہ اپنی بندگی کا مشاہدہ دوسری طرف۔ کہتی جاتی ہے اور سننے والوں کے دل ہلائے لرزائے دیتی ہے ؎

اے دین اور دنیا کے مالک — اے راجا اور پرجا کے مالک
سب پہ کھلا ہے در رحمت کا — برس رہا ہے مینہ نعمت کا
سب کو تیرے انعام تھے شامل — میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
اگر کچھ آتا بانٹ میں میری — سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نون کو ترسی میں سانبھر میں
پھر دن یہ سوچتی ہوں جی میں — آئی تھی میں کیوں اس نگری میں
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں
قسمت نے جب سے منہ موڑا — آدمیوں کا ہو گیا توڑا!
تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی!
کوئی نہیں لاگو اب میرا — باپ نہ بھائی ساس نہ سسرا

شاعر کی تخیل آرائی نہیں ہے واقعات لکھ رہا ہے اپنے زمانے کے واقعات و مشاہدات کہتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو جھوٹ کو سچ بنا کر دکھائے حالانکہ شاعری کا سب سے بڑا کمال واقعہ نگاری ہے، مشاہدات سے واقعات سے بڑھ کر مؤثر اور کون شئے ہو سکتی ہے ؎

روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے

ہنسئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو　　کیونکر الٰہی کاٹئے غم کو

مہندی میں نے لگانی چھوڑی　　پٹی میں نے جمانی چھوڑی!

کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی!　　عطر نہیں میں بھول کے ملتی

سُرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی　　بال نہیں برسوں گندھواتی

دو دو چاند نہیں سر دھوتی　　اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی!

کان میں پتے ہاتھ میں کنگن　　پہن چکی سب جب تھی سہاگن

آپ کو یاں تک میں نے مٹایا　　پر دنیا کو صبر نہ آیا!

وہم نے ہے اک ایک کو گھیرا　　جب دیکھو تب ذکر ہے میرا

ان دکھیاریوں پر جو ظلم ابھی ایک نسل اُدھر تک عام تھے بلکہ کہیں کہیں اب بھی جاری ہیں" کس ادھیڑ سن والے کے علم میں نہیں؟ کن پرانی آنکھوں نے وہ جگر خراش منظر نہیں دیکھے ہیں؟ اُس وقت کے کس کان نے وہ فریادیں نہیں سُنی ہیں؟ یہ دور وہ تھا، جب کسی بیوہ کے عقد کا نام لینا ہی ہمسایہ قوم کی دیکھا دیکھی، خود مسلمانوں میں خاندان کی ناک کٹ جانے کے مُرادف قرار پا چکا تھا۔

آن پر مٹ جانے والی شرافت پر جان دے دینے والی، کمسن، بیوہ، اپنی عزت پر گواہ آسمان کے چمکتے ہوئے تاروں اور گھر کے دروں دیواروں سب کو لاتی ہے ؎

اے امبر کے چمکتے ہوئے تارو　　اے گھر کے در اور دیوارو!

اے جانی پہچانی راتو!　　تنہائی کی ڈرانی راتو!

ایک دن اس گندی دنیا سے　　جانا ہے مالک کے آگے

جب وہاں پوچھ ہو میری تیری　　تم سب دیجو گواہی میری

میں نیکی کا دم نہیں بھرتی　　پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی!

پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی　　منہ پہ یہ آئے بن نہیں رہتی

خواہ بُری تھی خواہ بھلی میں　　بات سے اپنی نہیں ٹلی ہیں

ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا　　اور نہ خدا کے عہد کو توڑا

اے ایمان کے رکھنے والے　　اے نیت کے پرکھنے والے

میں نہیں رکھتی کام کسی سے　　چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر میں　　چین سے کرتی عمر بھر میں
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی　　مرضی غم خواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے　　قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
جان کسی کی جائے تو جائے　　آن میں اپنی فرق نہ آئے
تجھ پہ ہے روشن اے میرے مولیٰ　　وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
آن سنبھالے جان تھی جاتی!　　جان بچائے آن تھی جاتی
طے کرنے تھے سات سمندر　　حکم یہ تھا ہاں پاؤں نہ ہو تر
جان نہ سمجھا جان کو اپنی　　دیا نہ جائے آن کو اپنی!
اے اچھے اور برے کے بھیدی　　کھوٹے اور کھرے کے بھیدی
بھیدوں کے جاننے والے　　پاپ اور پن کے چھاننے والے
عیب اور گن سب تجھ پہ ہیں روشن　　پاپ اور پن سب تجھ پہ ہیں روشن
کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو　　جن جن پر تھا یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا　　سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
روک کے اور یوں تھام کے آیا　　میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا
تو ہے مگر اس بات کا دانا　　میں نے کہا دل کا نہیں مانا
تھامنا دل کا کام تھا میرا　　اور تھامنا کام تھا تیرا
پکڑے اگر تو دل کی خطا پر　　میں راضی ہوں تیری رضا پر

اپنی تو خیر جیسی بھی گزری گزر گئی، اب دھیان ہے تو اس کا کہ اور بہت سی بہنوں پر بھی یہی وقت پڑا ہوا ہے، ان بیچاریوں کی تو مشکل کسی طرح آسان ہو، بندی اپنے چاہنے والے مالک اور مولیٰ سے کہتی ہے ؎

اے غم خوار ہر ایک بیکس کے　　حامی ہر عاجز بے بس کے
ہے اپنے عاجز بندوں پر　　پیار تیرا ماں باپ سے بڑھ کر

جس نے گلی میں تجھ کو پکارا — سامنے تیرے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے — گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
گھر بسنے کی آس نہ رہنی — ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے — بپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے — یا جس پر گزری ہو وہ جانے
اے خاوند خداوندوں کے — مالک خداوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خداوندی کا — صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو — کسی کو بے وارث مت کیجو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا — کر اسے تو پیوند زمیں کا
یا عورت کو پہلے بلالے — یا دونوں کو ساتھ اٹھالے

اس سوز دل سے نکلی ہوئی دعائیں کہیں رائیگاں جاسکتی تھیں ؟ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے اس ۵۰، ۶۰ سال کے عرصہ میں ہندوستان میں رانڈوں کی بپتا تقریباً دور ہو گئی ہے اور کچھ اصلاح بڑی حد تک ہمسایہ قوم میں بھی ہو کر رہی ہے۔

خاتمہ پر واعظ شاعر نے وہی کہا ہے جو آج تک سارے واعظ اور سارے حقیقی شاعر برابر کہتے چلے آئے ہیں کیسی بیوگی اور کہاں کا سہاگ نہ اس کو قیام نہ اُس کو ثبات، ساری لذتیں فانی اور سارے عیش آنی۔ کسی کی پھولوں کی سیج پر لیٹ لیٹ کر گزری تو کیا اور کسی نے کانٹوں پر لوٹ لوٹ کے کاٹی تو کیا بشریت کا تقاضا تھا جو زبان پر اتنی بھی حکایت و شکایت آگئی، پیار ہو تو اسی من موہن کا جسے کبھی فنا نہیں، دل میں لگن ہو تو اسی ایک کی جس کا عہد کبھی ٹوٹنے والا نہیں، جس کی خداوندی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ بیوہ کی یہ مناجات واعظ شاعر کی وعظ گوئی اور شاعری دونوں کا نچوڑ ہے ؎

دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا — سکھ پہ ہے یاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی — سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی
آنی جانی چیز ہیں خوشیاں — چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں

منگنی بیاہ برات اور رخصت | میل ملاپ سہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے | آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا | اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے | اس نگری کی ریت یہی ہے
خواہ ہو رانڈ اور خواہ سہاگن | موت ہے سب کی جان کی دشمن
ایک ہے گو آج ایک سے بہتر | مر گئیں جب دونوں ہیں برابر
اور کوئی گر انصاف سے دیکھے | مر کے اسے نسبت نہیں اس سے
عیش گئی وہ چھوڑ کے یاں کے | قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کو پڑی کل اُس کی گئی کل! | یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل

شاعر کا آخری پیام وہی ہے جو عارفوں کا ہمیشہ رہا ہے، یہ سوز بھی اگر کسی دل میں آگ نہ سکے تو یقیناً وہ دل نہیں ہے پتھر کا ٹکڑا ہے۔

تیرے سوا یاں اے مرے مولیٰ | کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
پڑی تھی سونی جب یہ نگریا! | تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
چاہتی ہوں اک تیری محبت | اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ اک ایسا مجھکو پلا دے | تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں | کوئی رہے ارمان نہ جی میں
دل میں لگن بس اپنی لگا دے | سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
وہاں سے اکیلی آئی ہوں جیسی | ویسی ہی یاں سے جاؤں اکیلی
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا | کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشاں پیاروں کا مٹا دوں | پیار کے مُنہ کو آگ لگا دوں
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر | مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے ایک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

یہ مناجات تو وہ ہے کہ اگر مناسب ماحول میں پڑھی جائے تو عجب نہیں جو درو دیوار بھی جھوم جھوم کر اپنی بولی میں اس پر "آمین" کہہ اٹھیں پھر انسان کا دل تو آخر انسان ہی کا دل ہے!!

---

(۳) پریم چند[1]

الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کے دورِ اقبال کا آفتاب جب غروب ہونے کو آیا اور بوستانِ خیال اور طلسم ہوشربا کے دفتر جب زمانے کے ہاتھوں "داخل دفتر ہونے لگے تو "صاحب" کے قدموں کی برکت سے ایک نئی دنیا دلوں اور دماغوں کی خیالات اور جذبات کی سرزمین ہند میں آباد ہونے لگی۔ اور اس دیس کے لوگ ایک نئی چیز، اور نئے نام "ناول" سے آشنا ہونے لگے، "طلسمات" کی جگہ اب سین اور سینری" کوہ قاف" کی جگہ شہر کی گلیاں اور بالاخانے "شہباز فکر" کی جگہ پلاٹ، دیووں اور شہزادوں کی جگہ "ہیرو" اور پریوں اور شہزادیوں کی جگہ ہیروئن!

شاگردِ رشید نے استاد کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ گرہ میں باندھ لیے اور خود بھی وہی بولنا اور وہی سوچنا وہی لکھنا اور وہی پڑھنا شروع کر دیا جس کے سبق اسکول اور کالج میں پڑھے تھے اردو میں ناول چھپنے لگے اور بکنے لگے، لکھے جانے لگے اور پڑھے جانے لگے، اور ناول بھی ہر رنگ کے ہر ڈھنگ کے۔ کوئی تاریخی اور کوئی محض خیالی۔ کوئی معاشرتی اور کوئی اصلاحی، پیسہ اخبار[2] اسٹریٹ کی طرف جا نکلیے تو "جاسوسی" بھی اور ادبِ لطیف کے ضلع میں آجایئے تو "قاموسی"[3] بھی! شرر و سرشار اپنے اپنے فن میں استاد ناول نویسوں کے لشکر کے علمبردار اور پیچھے چلنے والوں کی تعداد بے شمار!

---

[1] تحریر ۱۹۳۶ء۔ نظرِ ثانی ۱۹۵۳ء

[2] لاہور کا ایک پرانا اور اپنے زمانہ میں بہت ہی مشہور و مقبول اخبار پیسہ اخبار تھا اس نے جاسوسی ناول بھی کثرت سے اور بڑے ارزاں شائع کیے تھے! [3] "ادبِ لطیف" جب اوّل اوّل اردو میں چلا ہے، تو اس میں لغات کی خوب بھرمار رہتی تھی قاموسی ایں

بات میں بات نکلتی ہے اور شاخ سے شاخ۔ بڑے ناول تو کتابی صورت کے لیے مخصوص رہے۔ ان کے ولیعہد، مختصر افسانے پیدا ہوئے اور وہ رسالوں اور ماہناموں میں نکلنے لگے بازار میں ان کی مانگ بھی خوب رہی اور ناول اور مختصر افسانے علم و ادب کی شاخ تو کسی ایک ہی آدھ کے لیے رہے البتہ ایک پُرمنفعت تجارت اور کامیاب کاروبار بہتوں کے لیے بن گیا ـــــ لیکن ان سب میں ہوتا کیا تھا؟ ناول ہو یا "شارٹ اسٹوری" عام ذہنوں کے سامنے ان کا مفہوم تھا کیا؟ وہی حُسن و عشق کی پُرانی داستان وہی لیلیٰ و مجنوں شیریں فرہاد کی ہزار ہا مرتبہ کی دُہرائی ہوئی کہانی جو لاکھ پُرانی ہونے پر بھی اب تک پُرانی نہیں ہوئی ہے ع

یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پُرانا ہرگز

بس یہی کہ فلاں کی آنکھ فلاں سے لڑگئی۔ فلاں فلاں کے ساتھ نکل گئی۔ اس کی عصمت یوں لُٹی اُس کی آبرو یوں بچی۔ کسی کے لب پر آہ سوزاں کسی کے جگر میں زخم پیکاں۔ یہ اس پر مفتوں۔ وہ اس کے لیے مجنوں۔ ایک اپنی آرزوؤں اور تمناؤں میں کامیاب ہوگیا۔ دوسرا ناشاد و نامراد دنیا سے کوچ کرگیا۔ گویا ہر داستانِ حیات، داستان نل و دمن۔ اور ہر افسانۂ زندگی افسانہ شیریں و کوہکن! ناول کی دلکشی کا راز عشق و عاشقی کی گھاتوں میں، اور ناول نویس کے قلم کا اعجاز جوانی کی راتوں میں!

کہتے ہیں افسانہ نام ہے ایک مکمل زندگی کی حکایتی مصوری کا لیکن یہاں زندگی مترادف تھی صرف ہجر و وصال کے، صرف رُخ و خال کے گویا انسانی زندگی اپنی ساری رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوجود کیا تھی؟ تھیٹر کے اسٹیج کی ایک آہ اور دنیائے عمل اپنی ساری وسعت و پہنائی کے باوجود کیا تھی؟ محفلِ مشاعرہ کی ایک واہ۔

یہ رنگ تھے اور کچھ ایسے ہی ڈھنگ کہ ایک گوشہ سے چپکے سے پریم چند نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کی کایا پلٹ کر گئے۔ آئے دبے پاؤں خاموشی سے، آتے وقت نہ شور ہوا نہ ہنگامہ لیکن جب گئے تو یارانِ بزم کا انداز ہی کچھ سے کچھ تھا۔ جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے نہ کسی سے اُلجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ۔ بات چیت کرتے تو سادہ تر پاتے۔ بس یہ معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبہ کے معمولی سے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اور زیادہ کرید اگر آپ نہ کرتے تو یہ بھی نہ پتہ چلتا کہ ہیں کس مذہب کے۔ رہے اب تک تو یوں رہے اور گئے تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھ کر، صاحب طرز ہو کر، یا "صاحب" کے محاورہ میں اپنا ایک مستقل "اسکول" چھوڑ کر

یہ نہیں کہ پریم چند سے پہلے کسی کو عام ڈھرّے سے ہٹنے کا خیال ہی نہ آیا ہو مستثنیات کس کلیہ میں نہیں ہوتے! اردو میں بھی بعض باکمال یقیناً ایسے گزر چکے تھے جن کا قلم ان بے اعتدالیوں اور عریانیوں سے بالکل بچ بچ کر چلا۔ اور جو

زندگی کو زندگی سمجھے۔ شاعری کا مترادف نہیں سمجھے لیکن ان کی کوششوں اور کاوشیں بس انھیں کی ذات تک محدود رہیں۔ دریا میں پتھر اگر گرا چکر بنا، تلاطم ہوا، لیکن آناً فاناً سب غائب اور ذری دیر میں سطح برابر ——— دھارے کا رُخ پھیرنا وہ جتنا بھی سہی، پریم چند ہی کے نصیب میں آیا۔

پریم چند خود تو اپنی اردو کتابوں میں بازارِ حسن کو نمبر اوّل پر رکھتے تھے۔ لیکن اس کم سواد بے استعداد کا خیال ہے کہ سب سے بڑھ چڑھ کر ان کی ضخیم کتاب دو جلدوں اور ایک ہزار صفحہ والی چوگان ہستی ہے کہیں سے بھی کھول لیجیے یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے۔ ختم کیے بغیر جی ماننے کا نہیں۔ آورد اور تصنع کہنا چاہیے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ جو بھی صفحہ الٹ کر دیکھیے سادگی، بے ساختگی آمد کے لحاظ سے خطّہ گلزار۔ جس حصّہ کا بھی انتخاب کیجیے دل کشی، دلآویزی اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونۂ بہار۔ جان سیوک نامے بنارس کے ایک دیسی "صاحب" عیسائی مذہب کے شخص ہیں پکے دنیادار۔ نوجوان لڑکی "سوفیا" کا رجحان ہندو مذہب کی جانب ہو جاتا ہے، ایک موقع پر ماں بیٹی سے دو بدو گفتگو ہو پڑتی ہے، اور درمیان میں لڑکی کے بوڑھے دادا، اور جہاں تک محض ظاہری احکام کا تعلق ہے بڑے دیندار مسیحی ایشور سیوک آجاتے ہیں۔ سب کی سیرتیں ملاحظہ ہوں :-

"سوفیا۔ میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات کو نہیں مانتی۔

مسز سیوک۔ میں تجھکو اپنی اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی یہ کہکر وہ سوفیا کے کمرے میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینکدیں اسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جاکر مسٹر ایشور سیوک سے بولیں،

پاپا آپ سوفی کرناحق بلا رہے ہیں وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔

مسٹر ایشور سیوک۔ ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے، کیا کہا سوفی! حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ سوفی؟

مسز سیوک: ہاں ہاں سوفی کہتی ہے مجھے ان کے معجزوں ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے۔

ایشور سیوک: (ٹھنڈی سانس کھینچکر) یسوع! مجھے اپنی دامن میں چھپا اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا! ہے سوفی! مجھے اس کے پاس لے چلو میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور

سے منور کر۔ میں اس کے پیروں پر گروں گا اس سے منتیں کروں گا اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا مجھے اس کے پاس لے چلو!

مسز سیوک۔ میں سب کچھ کر کے ہار گئی اس پر خدا کا قہر ہے میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک۔ بیٹی ایسی باتیں نہ کرو وہ میرے گوشت کا گوشت میرے خون کا خون میری جان کی جان ہے! میں اُسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسوع نے کافروں کو سینہ سے لگایا تھا سیہ کاروں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی وہ میری "سوفیا" پر ضرور رحم کرے گا یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اُٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے "سوفیا" کے کمرے کے دروازے پر آکر بولے، بیٹی سوفی کہاں ہے؟ ادھر آ بیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں ہمارا یسوع خدا کا دلارا بیٹا تھا، غریبوں کا مددگار کمزوروں کا محافظ مفلسوں کا دوست ڈوبتوں کا سہارا گناہگاروں کا شافع دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا۔ بیٹی! ایسا اور کون سا نبی ہے جس کا دامن اتنا وسیع ہو جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں ساری برائیوں کے لیے جگہ ہو وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو کافروں کو گناہ گاروں کو نجات کا مژدہ دیا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لیے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچانے والا کون تھا؟ یہ کہتے کہتے انھوں نے "سوفیا" کو گلے سے لگا لیا۔"

یہ ساری گفتگو اوّل سے آخر تک کتنی سچی اور کیسی مطابق واقعہ ہے صرف آخری ٹکڑے میں ذری سی لغزش ہو گئی ہے جہاں حضرت مسیح کو ایک مسیحی کی زبان سے خدا کا نبی کہا ہے۔ یہ عقیدہ اسلامی ہے، مسیحی نہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک تو خدا کے اکلوتے بیٹے کو نبی کہنا اس کو توہین کرنا ہے لیکن ایسی خفیف لغزشیں افسانہ میں اور بھی محض ضمناً قابل اعتنا نہیں۔

انھیں "مس سوفیا" پر ضلع کے انگریز نوجوان کلکٹر مسٹر کلارک کا دل آجاتا ہے اور کورٹ شپ شروع ہو جاتی ہے۔ صاحب بہادر معہ سوفیا کے ایک بڑی ریاست جسونت نگر میں مہمان ہیں۔ یہیں جیل میں مشہور محب وطن اور رئیس زادہ ونے سنگھ، "سوفیا" کا دل سے چاہنے والا قید ہے۔ سوفیا بھی حقیقتاً دل سے اس کی طرف مائل ہے۔ کلکٹر کے ساتھ محض مصلحتاً نباہ کر رہی ہے، دیوان ریاست سردار نیل کنٹھ مہمانداری کی خدمات کے لیے وقف ہیں —— سوفیا جیل میں ونے کو دیکھ اپنا اشتیاق پورا کرنا چاہتی ہے اور اس لیے جسونت نگر میں ابھی اور ٹھہرنا ضروری ہے اس کے بعد اصل گفتگو اب خود سُنیئے:-

"شہر کا گشت کر کے سوفیا مسٹر کلارک۔ سردار نیل کنٹھ اور دو ایک اعلیٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہو گئے۔ میز پر چائے لائی گئی مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنھیں شراب کی بو سے نفرت تھی کھسک کر سوفیا کے پاس جا بیٹھے اور بولے ـــــ جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

سوفیا۔ نہایت پُرفضا مقام ہے پہاڑیوں کا منظر نہایت و دلفریب ہے شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی سے جی خوش ہو گیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں۔

نیل کنٹھ ڈر گئے ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُرامن رکھا جا سکتا ہے مگر مہینے دو مہینے تک کسی طرح بھی بالکل ناممکن ہے کہیں یہ لوگ ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہو جائے گی نہ جانے اس کا کیا انجام ہو بولے یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آئیے آب و ہوا بہت خراب ہے آگے جا کر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے:

سوفیا۔ کچھ ہی ہو میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی کیوں ولیم تمھیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک ۔ تم یہاں رہو تو میں دفن ہو جانے کو تیار ہوں۔

سوفیا۔ لیجیے سردار صاحب ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

سوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

نیل کنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب و ہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں۔

سوفیا۔ جب تو ہمارا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سنی گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لیے ان سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے سوفیا سے انھوں نے یہ بات بے خوف ہو کر کہدی تھی۔ اس کی منکسر مزاجی سے انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میری نذر و نیاز نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ کچھ بے تکلف ہو گئے تھے یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں التجا کے لہجہ میں بولے:۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ریاست پر

موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتی الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بد امنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا یا یوں کہیے کہ زہر کے قطرے سنہرے برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے والنٹیروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جا سکتی ہے مگر سادھوؤں سے نہیں۔ رضا کاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بیوقوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اتارنے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا نہایت شریر طبیعت کا آدمی ہے ہم لوگوں کی نیند حرام ہو گئی ہر لمحہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی وہ نے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہو گیا مگر اس کے دیگر رفقاء ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے کئی بار وہ نے کو جیل سے نکال لے جانے کی کوشش کی جا چکی ہے اور ملازمین کو ہمیشہ اپنی جانوں کا خوف بنا رہتا ہے ـــــ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا۔ میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز نہ دوں گا اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے ؟

سوفیا نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا ـــــ واقعی حالت اس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہو گا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائم مقام ہو کر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں۔ کیوں ولیم تمھیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔

مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کر سکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا وہ تمھارا کام ہے۔

نیل کنٹھ۔ میری آپ سے مؤدبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لیے کچھ اور وقت دیجیے، آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لیے مضر ہو گا۔"

اقتباس طویل ذرا زاید ہو گیا۔ لیکن باہنر مصوّر کی ہنرمندی کے نمونے دکھانے میں بخل بھی کہاں تک روا رکھا جائے، ریاستوں کی بے بسی، میم صاحب کی ذہانت و ذکاوت اور سب سے بڑھکر صاحب بہادر کے بے پناہ اختیارات کی ہمہ گیری، ہر شئے ان میں سے اپنے اپنے موقع پر کیسی جڑی اور کیسی جڑی ہوئی ہے! اسی کا نام ہے قلم کی مرصع کاری!

بات ذرا الگ ہوئی جاتی ہے، لیکن کلکٹر صاحب کی اس خدائی پر اکبر کا ایک شعر بے ساختہ یاد آگیا۔ اپنے ہم مذہبوں کے سامنے، خدا تعالےٰ کی قدرت کا وعظ فرماتے فرماتے کہتے ہیں۔ کہ موضوع کو طول کہاں تک دوں، بس یہ سمجھ لو، کہ خدا تعالیٰ کو وہ اختیارات حاصل ہیں، جو صاحب کلکٹر بہادر کو ہوتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

اس کی قدرت کا کہاں تک میں کروں تم سے بیاں

میں تو اللہ تعالےٰ کو کلکٹر سمجھا

"کہاں تک" کی بلاغت قابل داد ہے شاعر بیان کرتے کرتے تھک گیا ہے آخر میں مختصر اور جامع مثال اسے کلکٹر ہی کی نظر آتی ہے۔

شہری زندگی کی نقاشی بہتوں نے کی ہے اسکول اور کالج میں، پارک اور چمن میں، کچہری میں اور اسٹیشن پر سب ہی گھومے پھرے ہیں۔ کھیت کی مینڈوں پر کوئی کم ہی چلا ہے۔ دیہات کے چوپالوں میں، امیروں اور بھرجیوں کی جھونپڑیوں میں کم ہی کسی کے قدم گئے ہیں۔ پریم چند کے قلم کا اصلی جولانگاہ یہی ہے فن کے دوسرے لوازم میں تو ان کے نظیر مل بھی جائیں گے۔ لیکن جہاں تک دیہاتی زندگی کی مصوری کا تعلق ہے اب تک تو پریم چند کے جوڑ کا کوئی نظر نہیں پڑا۔ دیہات کے جس جس منظر کا سماں دکھلاتے ہیں اسے دور سے بتلاتے نہیں گویا اٹھا کر وہیں پہونچا دیتے ہیں۔

ایک گاؤں ہے اور برسات کا موسم کہ اتنے میں موضع کے زمیندار ٹھاکر صاحب وہاں دورہ فرماتے ہیں۔ گاؤں کی لہلہاہٹ اور ٹھاکر صاحب کی قہرمانی دونوں ملاحظہ ہوں:۔

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نویلی دلہن بنی ہوئی تھی اور فاقہ کش کمہار بارات کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے ٹپکتی ہوئی چھتیں ان کے نگاہ کرم کی منتظر۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت ان کے دست شفقت کے محتاج جسے چاہتے تھے بساتے تھے جسے چاہتے تھے اجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولے لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پرمزہ شغل تھا، نالے پُرشور، ندیاں اتھاہ، چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت کا حُسنِ بسیط انھیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں

آئے، ایک سجی ہوئی بارات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور ساز و سامان، لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ! گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کرّ و فر دیکھا تو سہمے سہمے ہوش اڑ گئے گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور گنڈے گلیوں میں۔"

دوسرا منظر:

"دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رشک گلزار بنا ہوا تھا۔ بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیئے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے،

سال بھر اور گزرا جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالیوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اگل دیا تھا، عورتیں خوش تھیں کہ ابکے نئے نئے گہنے بنوائیں گے، مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے، اور داروغہ جی کی مسرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آیند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے وہی تزک و احتشام وہی لٹھیتوں کا رسالہ وہی گنڈوں کی فوج! گاؤں والوں نے ان کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا لکڑی کے انبار لگا دیئے دودھ کے حوض بھر دیئے ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہونچے تو پورے ایک سو آدمی ان کی پیشوائی کے لیے دست بستہ کھڑے تھے۔"

چوگان ہستی میں اگر کمال یہ تھا کہ پلاٹ کی بندش، اتنی طوالت و ضخامت کے باوجود کہیں سے سُست نہیں ہونے پائی۔ اور دل آویزی میں خلل پڑنے کا کوئی لمحہ نہ آنے پایا تو یہ چھوٹے چھوٹے افسانے بھی جن کے مجموعے کا نام پریم پچیسی ہے اور اس کی بھی دو جلدیں ہیں اور اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملوں میں عجیب موہنی ہے ہر ہر فقرہ گویا موتیوں کی لڑی! فریب نظر کی حد یہ ہے کہ آپ خود اپنے متعلق دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ "یہ یاد نہیں رہ جاتا۔ کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے اور آپ کسی کی سرگزشت پڑھ رہے ہیں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ یہ تو خود ہمارے ہی اوپر سب گزرتی چلی جا رہی ہے بچے" بھی ہمیں۔ بوڑھے بھی ہمیں۔ ہمیں ظالم ہمیں مظلوم

ابھی ہنس بھی ہم ہی رہے تھے ابھی رونے بھی ہم ہی لگے
تماشائی کی حیثیت غائب، تماشا ہم خود

شرافت ان کی تحریر کی جان ہے اور پاکیزگی ان کے قلم کا ایمان۔ منظر کیسا ہی گندہ ہو ان کی نظر انتخاب

ہمیشہ انھیں عنصروں کو چُن لیتی ہے جو نفس کو نہیں روح کو تڑپائیں جذبات کے سفلی نہیں علوی حصے کو گرمائیں اور بدی کی نہیں نیکی کی قوت کو حرکت میں لائیں۔

سُمن ایک شریف ہندو گجادھر پرشاد کی بیوی ہے پڑوس میں رام بھولی ایک بازاری عورت آکر رہتی ہے بچپن کی بات سُمن کی کان میں پڑی ہوئی ہے کہ بیسواؤں کا پیشہ ہی ذلیل ہے اور کوئی بھلا آدمی ان کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔ اب اپنی آنکھ سے جو کچھ دیکھتی ہے اس پر اسے اچنبھا ہو کر رہ جاتا ہے اور نفس کی نظروں میں اگر بدی سرتاسر خوشنما نہیں نظر آنے لگتی ہے تو کم از کم بیشتر کی سی بدنما اور گھناؤنی تو یقیناً نہیں باقی رہ جاتی۔

"سُمن کے مکان کے سامنے بھولی نام کی ایک طوائف کا مکان تھا۔ بھولی نت نئے سنگار کرکے اپنے بالاخانے کے جھروکے پر بیٹھا کرتی پہر رات تک اس کے کمرے سے نغمۂ خوش آیند کی صدائیں آیا کرتیں کبھی کبھی وہ فٹن پر سوار ہو کر ہوا کھانے جایا کرتی سُمن اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ سُمن نے سن رکھا تھا کہ طوائفیں بہت ذلیل اور بدکار ہوتی ہیں وہ اپنے ناز و انداز سے نوجوانوں کو اپنے دام محبت میں پھنسا لیا کرتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی ان سے بات چیت نہیں کرتا محض شوقین لوگ رات کو چھپ کر ان کے یہاں جایا کرتے ہیں بھولی نے کئی بار اسے چق کی آڑ میں کھڑے دیکھ کر اشارہ سے بلایا تھا، پر سُمن اس سے بولنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی میں غریب ہی سہی پر اپنی عصمت پر تو قائم ہوں کسی شریف آدمی کے گھر میں میری روک تو نہیں ہوتی کتنا ہی عیش و آرام کرے پر اس کی کہیں عزّت تو نہیں ہوتی بس اپنے کوٹھے پر بیٹھی اپنی بے شرمی اور اپنی بے حیائی کا سوانگ دکھایا کرے لیکن سُمن کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اسے حقیر سمجھنا میری غلطی ہے!

اساڑھ کے دن تھے گرمی کے مارے سُمن کا دم گھٹ رہا تھا شام کے وقت اس سے اندر نہ رہا گیا اس نے چق اٹھا دی اور دروازے پر بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی تو کیا دیکھتی ہے کہ بھولی بائی کے دروازے پر کسی تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں بہشتی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے صحن میں ایک شامیانہ تانا جا رہا تھا شیشہ آلات ٹھیلوں پر لدے چلے آتے تھے فرش بچھایا جا رہا تھا بیسوں آدمی اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اتنے میں بھولی کی نگاہ سُمن کی طرف اٹھی قریب آکر بولی آج میرے یہاں مولود ہے دیکھنا چاہو تو پردہ کرا دوں؟ سُمن نے بے پروائی سے کہا "میں یہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لوں گی"

بھولی۔ دیکھ تو لوگی پر سُن نہ سکو گی ہرج ہی کیا ہے اوپر پردہ کرا دوں؟

سُمن۔ مجھے سُننے کی اتنی خواہش نہیں ہے۔

بھولی نے اس کی طرف اک نگاہ ترحم سے دیکھا اور دل میں کہا یہ گنوارن شاید دیہات سے آئی ہے اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھے بیٹھی ہے۔ اچھا تو دیکھ لے کہ میں کون ہوں۔ اس نے زیادہ اصرار نہ کیا رات ہو رہی تھی چولھے کی صورت دیکھ کر سمن کی روح کانپ رہی تھی۔ پر طوعاً و کرہاً اٹھی چولھا جلایا۔ کھچڑی ڈالی اور پھر دروازے پر آکر تماشا دیکھنے لگی آٹھ بجتے بجتے شامیانہ گیس کی روشنی سے گنبد نور بن گیا پھول پتوں کی آرائش سونے پر سہاگہ تھی تماشائی چاروں طرف سے آنے لگے کوئی بائیسکل پر آتا تھا کوئی ٹم ٹم پر کوئی پیدل تھوڑی دیر میں دو تین فٹنیں بھی آپہنچی ایک گھنٹہ میں سارا صحن بھر گیا اس کے بعد مولانا صاحب تشریف لائے۔ ان کے چہرے سے اک جلال برستا تھا اور وہ آراستہ تخت پر مسند لگا کر آبیٹھے اور مولود شروع ہو گیا۔ کئی آدمی مہمانوں کی تواضع و تکریم کرنے لگے کوئی گلاب چھڑکتا تھا کوئی خاصدان پیش کرتا تھا سمن نے شرفا کی ایسی مجلس کبھی نہ دیکھی تھی۔

نو بجے گجادھر پرشاد آئے سمن نے انھیں کھانا کھلایا گجادھر کھانا کھا کر اسی مجلس میں شریک ہو گئے اور سمن کو تو کھانے کی سدھ ہی نہ تھی گیارہ بجے رات تک وہ وہیں بیٹھی رہی پھر شیرینی تقسیم ہوئی اور بارہ بجے مجلس ختم ہو گئی گجادھر گھر میں آئے تو سمن نے کہا "یہ سب کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے"؟

گجادھر۔ میں سب کو پہچانتا تھوڑے ہی ہوں، بھلے برے سبھی ہونگے شہر کے کئی رئیس بھی تھے۔

سمن ۔ کیا یہ لوگ ایک طوائف کے گھر آنے میں اپنی توہین نہیں سمجھتے؟

گجادھر۔ توہین سمجھتے تو آتے ہی کیوں؟

سمن ۔ تمھیں تو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی ہوگی!

گجادھر۔ جب اتنے شرفا بیٹھے تھے تو مجھے شرم کیوں آنے لگی، وہ سیٹھ جی بھی آئے تھے جن کے یہاں میں شام کو جایا کرتا ہوں۔

سمن نے پر خیال انداز سے کہا "میں سمجھتی تھی کہ ان عورتوں کو لوگ بہت ذلیل سمجھتے ہیں،

گجادھر۔ ہاں ایسے لوگ بھی ہیں پر گنے گنائے۔ انگریزی تعلیم نے لوگوں کو آزاد بنا دیا ہے بھولی بائی کی شہر میں بڑی عزت ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ہوا بالکل بند تھی گجادھر پرشاد دن بھر کے تھکے ہوئے تھے چارپائی پر جاتے ہی سو گئے پر سمن کو نیند نہ آئی، دوسرے دن شام کے وقت جب وہ پھر چق اٹھا کر بیٹھی تو اس نے

بھولی بائی کو چھجے پر بیٹھے دیکھا۔ وہ برآمدہ سے نکل کر خود بھولی سے بولی "رات تو آپ کے یہاں بڑی دھوم تھی۔"
بھولی سمجھ گئی کہ میری فتح ہوئی مسکرا کر بولی۔ تمھارے لیے شیرینی بھیج دوں حلوائی کی بنائی ہوئی ہے اور برہمن لایا ہے۔"

سُمن نے شرماتے ہوئے کہا "بھجوا دیجیے گا۔"

ہماری معاشرت جس طرح شیطان کی اعزازی ایجنٹ بنی ہوئی ہے اس کی تصویر اس سے بڑھ کر لطیف بھی اور پُر درد بھی اور کیا ہوگی؟ لوگ قصّے کہانیوں کو محض لطف و تفریح کے لیے پڑھتے ہیں لیکن اس لطف کے ساتھ ہی ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو، بدی کی مخفی راہوں کا علم، شیطنت کا خفیہ چالوں کا احساس، وطنیت کا صحیح جذبہ، اور ایثار، اخلاص، اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار کُنین پریم چند ہی کے دواخانہ میں دستیاب ہوگی۔ اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کے آئندہ مورخ کو جس طرح گاندھی، نہرو، محمد علی، ابوالکلام، کی تحریروں کی ایک ایک سطر کی چھان بین ناگزیر ہوگی اسی طرح پریم چند کے بھی افسانوں کو اُلٹ پُلٹ کیے بغیر کام نہ چلے گا۔

---

(۴) نیا آئین اکبری[1]

آئین اکبری تو وہی ایک ہے سب کا جانا ہوا خوب سا پہچانا ہوا۔ شہنشاہ اکبر کے انتظامی خط و خال کے آئینہ اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کرے گا پرانے کو نیا کوئی کیونکر بنائے گا اور اطلس میں گزی گاڑھے کا پیوند کہاں سے لا کر لگائے گا؟ —— لیکن اکبر اکیلے ایک شہنشاہ ہند ہی کا تو نام نہیں ہوا ہے اقلیم سخن کا بھی ایک تاجدار اسی نام کا گزرا ہے صدیوں قبل نہیں ابھی حال میں۔ اور کہیں بہت دور نہیں آپ کے شہر سے نزدیک الہ آباد میں! وہ قدیم آئین اکبری تھا اقلیم ہند کے ایک فرماں روا کا کوکبۂ جلال۔ یہ آج کا جدید آئین اکبری ہے اقلیم معانی کے ایک تاجدار کا پرتو جمال! البتہ وہاں داستان گو تھا ایک نام کا ابوالفضل، اور یہاں عرض پرواز ہے ایک سراپا جہل! —— خیر نمائش کے عجائب زار[2] میں ایک عجوبہ کا اضافہ اور سہی! ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں سخن گویوں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد قصباتی کی جسارت اللہ اکبر! بس یوں سمجھیے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کی لگ رہی ہوں وہیں ایک گوشہ میں ایک نعلبند بھی کیل کانٹے سے لیس، اپنا تھیلا لیے موجود!

ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے گہری نقاب بھی۔ یہ بالکل صحیح کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا اور ان کی شہرت کو تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح

---

[1] تحریر ۱۹۳۷ء۔ نظر ثانی ۱۹۵۳ء۔

[2] یہ مقالہ اول بار ہندستانی اکیڈمی کانفرنس کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اُس وقت لکھنؤ میں ایک بہت بڑی سرکاری نمائش ہو رہی تھی اور اکیڈمی کانفرنس کا اجلاس اسی نمائش گاہ کے اندر ہو رہا تھا۔

کہ دنیا انھیں محض دل لگی باز سمجھ ان کے لطیفوں پر مٹی رہی ان کی شوخیوں پر ہنستی مسکراتی، ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی، ادھر نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں، کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے! یہ سب نے دیکھا کہ ایک پیر مرد شکر لپٹی ہوئی گولیاں سب کو تقسیم کرتے جاتے ہیں اور کھانے والے ہیں کہ فرط لذت وحلاوت سے ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں یہ کسی نے نہ پوچھا کہ گولیاں جراثیم کش کیسی زبردست ہیں اور ان میں تریاقیت کس غضب کی ہے!
دستانے اگر نرم اور گداز مخمل کے ہیں تو کسے پڑی ہے، جو یہ ٹٹول ٹٹول کر دیکھے کہ اندر پنجہ گوشت پوست کا نہیں فولاد کا ہے!

صاحب مثنوی مولوی معنوی رح کے اس رمز سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ وہ "سر دلبراں" "حدیث دیگراں" میں ادا کرتے جاتے ہیں۔ حضرت اکبر رح نے بھی کچھ سوانگ اسی طرح کا بھرا۔ اور جو کچھ زمانہ کے کڑے تیوروں کے لحاظ سے کھل کر نہ کہہ سکے اُسے قہقہوں کے شور اور تالیوں کی گونج میں سُنا گئے اور عذر خواہی یہ کرتے گئے ؂

سرد موسم ہے، ہوائیں چل رہی ہیں برفبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے ہیں۔ مذہب اور روحانیت، اخلاق اور معاشرت، تعلیم اور سیاسیات کوئی گوشہ ان کے دائرۂ التفات سے باہر کب رہنے پایا ہے۔ اس ساری داستان کے دہرانے کی قوت کس میں ہے؟ اور اگر کوئی ہمت کر بھی جائے تو سُننے والوں کو اتنی فرصت کہاں؟ لیکن اکبر اپنا ایک مخصوص پیام بھی لے کر آئے تھے، ہر پھر کر، الٹ پلٹ کر، منادی اسی کی کرتے رہے، کوئی سُنے یا نہ سُنے یا سُنے اور سُنکر بھی نہ سمجھے، بہر حال اپنا پیام انھوں نے سنا سب کو دیا۔ اسی پیام کا نام اگر آئین اکبری رکھدیا گیا تو کچھ بیجا ہوا؟

پیام کچھ دقیق و پیچیدہ نہیں۔ کوئی غامض فلسفہ نہیں، سیدھی سادی سی بات صرف ایک لفظ میں ادا ہو سکتی ہے پیام "خودداری" کا ہے مشرق سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ، ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی ہی بنا رہ، مسلمان کے لیے تلقین ہے کہ خبردار اسلام سے نہ ہٹ —— اس ایک ترانہ کو خدا جانے کتنے دلکش نغموں میں کتنے دل آویز سُروں میں بے شمار بار دُہرایا ہے۔ نو آموز مشرقی کو دانش گاہ فرنگ میں داخل ہوتے ہی پہلا سبق جو ملتا ہے وہ بے حیائی اور بے ناموسی کا ہے جس کا نام "اُستادوں" کی اصطلاح میں ہے

"حرّیت نسواں"۔ "صاحب" اور "میم صاحب" کے کھلے خزانے میل جول کو پردہ اختلاط کو دیکھ وہ کہنے لگتا ہے کہ ہماری زندگی بھی اب تک کوئی زندگی رہی ہے گھریلو زندگی بھی کوئی زندگی ہے وہی صبح سے شام تک ماں باپ کی اطاعت، بڑوں کی رضاجوئی، بھائی بہنوں سے میل جول، نماز اور قرآن، مسجد اور گھر کی انگنائی! زندگی نام ہے آرٹ کا "فنون لطیفہ کا" "پکچر گیلری کا" "ڈرامہ کا، سینما کا، اپیرا ہاؤس کا، ریڈیو کا، گانے کا، ناچنے کا، اپنی بیوی کو دوسروں کے پہلو میں بٹھلانے کا، دوسروں کی بیویوں کے ساتھ خود رقص کرنے کا۔ اب پردہ اس کے نزدیک سب سے بڑی "قید" ہے اور سب سے پہلے اسی قید سے وہ اپنے اسیروں کو رہا کرتا ہے نتائج و عواقب کی تلاش اکبرؔ کے کسی کلیات میں نہ کیجیے انھیں تو آپ روزمرہ اخبارات کے صفحات میں، عدالتوں کی کارروائیوں میں اور خود اپنے گرد و پیش براہ راست و بلاواسطہ مشاہدہ فرمالیں۔ اکبرؔ ایک اسی قسم کے منظر سے متعلق صرف ایک سوال کر کے رہ جاتے ہیں ؎

کیا گزری جو ایک پردہ کے عدو رو رو کے پولس سے کہتے تھے
بیوی بھی گئیں، عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، زیور بھی گیا

اس بے نقابی اور بے حیائی کو عقل و فہم سے جس حد تک تعلق ہے، غیرت و حیا کے یہ جہاں تک موافق ہے اکبرؔ اس پر کوئی ناصحانہ خطبہ نہیں ارشاد فرماتے، کوئی فلسفیانہ مقالہ نہیں سناتے، ایک رباعی میں ایک چبھتا ہوا سا فقرہ خود انھیں بیویوں کی زبان سے کہہ جاتے ہیں۔ فقرہ کو حسن قبول وہ عطا ہوتا ہے کہ اس ۵۰، ۶۰ سال کے اندر بیشمار بار زبانوں پر آچکا ہے، محفلوں کو گرما چکا ہے۔ بوڑھے تو بوڑھے بچوں میں بھی کم ایسے ہوں گے جو نہ سُن چکے ہوں ؎

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیبیاں! اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سیلاب بے عصمتی کے مقابلہ میں ہمارے آپ کے بزرگوں، مذہب و اخلاق کے رہنماؤں نے جو سب سے زیادہ مضبوط بند باندھا تھا وہ خود عورت کی شرافت کا تھا۔ اپنے ہاں کی شریف زادیوں کی، اپنی بہو بیٹیوں، حیا و غیرت کی ہم قسم کھایا کرتے تھے اور مگن تھے اس خیال میں کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ان حیا کی پتلیوں کا آنچل بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟ اور اس محال کو ممکن اگر فرض بھی کر لیا جائے تو ان کے بھائی اور باپ اور بیٹے اور شوہر انھیں زندہ کیوں چھوڑنے لگے؟ یہ ہمارے مردانہ خون کی گرمی ہے کس دن کے لیے؟ آنکھ اگر بے جا اٹھی تو آنکھ ہی نہ پھوڑ

کر رکھدی جائے گی؟ پیر اگر بے جا پڑا تو پیر ہی نہ کاٹ کر پھینکدیا جائے گا؟ —— لیکن صاحبانہ "تہذیب" کا لشکر جب حملہ آور ہوا تو پہلی گولہ باری ہمارے انھیں قلعوں اور بُرجوں پر ہوئی اور آن کی آن میں "صاحب" کے اقبال سے ہمارے یہ سارے دمدمے اور دمدمے مسمار! اسکولوں اور کالجوں میں تو سبق ہی اس کا ملا، کہ اب تک جن نظاروں پر اپنا خون کھولاتے تھے ان پر فخر کرو، انھیں اپنے حق میں نعمت سمجھو نعمت۔ ناز کرو اپنی اس خوش بختی پر کہ بام ترقی کے زینہ پر قدم رکھنے کا شرف نصیب ہو گیا ؎

خُدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

اس دربار دُربار میں تو عزّت و تقرب کا معیار ہی یہ ہے کہ خود بھی ناچیے اور جو کل تک گھر کی ملکہ تھی اسے بھی چار دیواری سے باہر لا دوسروں کے ساتھ نچلیئے ؎

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
"سر" ہو گئے تو "بال" کا بھی شوق ہو گیا

یہ "سر" اور "بال" کی مناسبت کیا خوب!

زنانہ اسکول اور کالج اکبرؔ کے زمانے میں اچھے خاصے کُھل چکے تھے۔ اپنی قوم کی صاحبزادیوں کو "چراغ خانہ" سے "شمع محفل" بنتے اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے لیکن مادی و مالی ترقی کے آثار تو اب بھی کوئی نہ تھے مذہب اور روحانیت کے تخیل کو الگ رکھیے کم از کم یہ تو ہوتا، کہ دنیا جنت بن گئی ہوتی، عقبیٰ چلی تو چلی، دنیا ہی ہاتھ آجاتی مشاہدہ اس کے برعکس ؎

ترقی کی نئی راہیں ہم پر چڑھاکیں | گھٹا کی دولت اپیچیں بڑھاکیں
رہیں ہر پھیر کے آیا بی نصیبن | وہ گو اسکول میں برسوں پڑھاکیں

یہ نقش اوّل تھا کلیات حصّہ اول میں۔ نقش ثانی کلیات حصّہ سوم میں ملاحظہ ہو۔ مرقع وہی آب و رنگ پیشتر سے زاید ؎

اک پیر[1] نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا | اک پیر[2] نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

---

[1] یہاں "پیر" سے کھلا ہوا اشارہ سر سیّد کی جانب ہے۔
[2] یہاں "پیر" سے اشارہ جسٹس سید کرامت حسین (الہ آباد) کی جانب انھوں نے الہ آباد سے آکر لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا سرمایہ ۴۰

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے بال[۱] میں رقصاں

وہ تو ہاتھ سے یوں بے ہاتھ ہوئے اور غیروں میں جذب ہو کر رہے ع

باقی جو تھے گھر اُن کا تھا افلاس کا مارا

بیرہ وہ بنا کمپ میں یہ بن گئیں آیا

مصرعہ کے الفاظ سُن چاہے خوب ہنس لیجیے۔ معنی پر خیال کر کے عجب نہیں جو رونے پر طبیعت آمادہ ہو جائے ع

بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا

انجام ؎

دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ　　آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا !

ایک مسلمہ نہیں ہندو خاتون کو نصیحت کر رہے ہیں (اور نصیحت کرتے وقت ہنستے نہیں) کہ کہیں سرے سے لکھنے پڑھنے ہی سے روک دینا تھوڑے ہی منظور ہے مقصود تو فرنگن بننے سے روکنا ہے۔ ع

پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

اور یاد رکھو کہ۔

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے　　مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب　　آج اس کا خوشنما ہے مگر ہو گا کل خراب

یہ کونسل اور اسمبلی اور ڈسٹرکٹ بورڈ آف میونسپلٹی میں عورتوں کی ممبری کا "حق" تو اب حاصل ہوا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں "ترقی" کی رو یہاں تک کہاں پہنچنے پائی تھی لیکن نگاہ دور رس نے بہت سی آگے کی باتیں بھی دیکھ لی تھیں، پچیس تیس سال ادھر ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خودداری پر قائم رہنے والی نسل اب کہاں باقی ع

چل بسے وہ جنھیں مقدور تھا خودداری کا

اب تو دور دورہ ان کا ہے جو خود ہی بُری طرح مغرب زدہ ہیں ع

---

۵۵ لنگر مسلم گرلز اسکول قائم کیا تھا (جو بعد کو کالج بن گیا) حضرت اکبرؒ انھیں "پیر نسواں" کہا کرتے تھے شعر میں بھی لائے ہیں ؎　ترقی پر خدا کے فضل سے ہے بزمِ رنداں بھی　　فقط پیرِ مغاں تھے آگئے اب "پیر نسواں" بھی

[۱] انگریزی ناچ جس میں مرد عورت ہم بغل ہو کر ناچتے ہیں۔

شرمِ مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

ان کی ہنسی اور ان کی خوشی تک 'صاحب' کی ہنسی اور 'صاحب' کی خوشی کے تابع۔ ع

رمضان ساعت کرکٹ ہی تھیٹر[1] میں ہے عید

نئی تہذیب نئی راہ نیا رنگ جہاں　　دورِ گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

نتیجہ یہ نکلا کہ،

زہرہ ممبر ہوئیں، ووٹر تھیں جنابِ خورشید

اس پر ؎

دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب　　کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید

آپ کے مردوں ہی کے کون سے کارنامے ہیں کہ اب آپ عورتوں کو بھی اسٹیج پر لانے لگے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار　　کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

اس دقیانوسیت کو اس زمانہ میں برداشت کون کر سکتا تھا ع

نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور ع　　لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریقِ تائید

دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ　　ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ کہا ہے نظم بھر کی جان ؎

خود تو گٹ پٹ کے لیے جان دیے دیتے ہیں　　ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآنِ مجید

ڈراما کا آخری پردہ ؎

اکبر افسردہ شد از گرمیٔ این طرزِ سخن　　شیخ بگریخت و در صومعۂ خویش خزید

آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں کی زبان پر ترانہ مسرت ؎

کھل گئے در نہ رہا شاہدِ مشرق کو حجاب　　غل مچا ہرّے کا بول اٹھے یہ مغرب کے مرید

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست　　آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

---

[1] اکبر نے یہاں اردو میں اصل انگریزی تلفظ رکھا ہے تھی اے ٹر

آج زندہ ہوتے تو اس وقت تک کے واقعات کو دیکھ دیکھ خدا جانے کیا کیا کہہ گئے ہوتے! اس وقت بھی قطعات میں رباعیات میں، تو بہت کچھ کہہ ہی گئے ہیں۔ غزلیں تک اس پیامی شاعری سے خالی نہیں ایک پرانی غزل ہے بیبیاں کب تک پتلیاں کب تک، اس زمین میں بھی یہ گلفشانی موجود —— اک صدائے درد ہے کہ چین نہیں لینے دیتی کسی نہ کسی پہلو سے لب پر آہ بن کر آ ہی جاتی ہے ؎

بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک	بٹھائی جائیں گی پردہ میں بی بیاں کب تک
تو منھ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک	جو منھ دکھائی کی ہے رسم پر مصر ابلیس

انجام جو ہونا ہے وہ آغاز ہی سے ظاہر ہے ؎

مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کبتک	سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ

غزل ۱۸۹۱ء کی ہے یہ ۱۹۳۷ء، ۴۶ سال قبل کا یہ کشف! اللہ اکبر!

خیال نہ گزرے کہ "آئین اکبری" کی یہی ایک دفعہ یا اہم ترین دفعہ، آزادیٔ نسواں کا بے پناہ طوفان ہے۔ اس آئین کا مرکزی نقطہ تو وہی خودداری ہے، اپنی شرافت کا تحفظ، اپنے تمدن کا تحفظ، اپنی آن بان کا تحفظ، جس مورچہ سے بھی انھوں نے اغیار کو حملہ آور ہوتے دیکھا بس اسی سمت انھوں نے اپنے الہامی پیادوں کے پرے جما دیئے ہیں۔

پڑھ لکھ کر کون اپنے محلہ کے کھنڈروں میں پڑا رہا ہے؟ "ولایت دیدہ" اور "صاحب رسیدہ" ہونے کے بعد کس نے مسجد میں جا کر نماز با جماعت پڑھی ہے؟ یہ تعلیم اپنوں سے چھڑانے والی ہوتی ہے یا اپنوں کو اور زیادہ اپنانے والی؟ اکبر اس منظر کو دیکھتے ہیں مگر کن آنکھوں سے ؎

ترقی پا کے بس مل جاتے ہیں برگڈ کے گلوں میں	نہ مسجد میں نظر آئے نہ رہتے ہیں محلّوں میں

اگلی سادگی اور اخلاص مندی اور مرکزیت کی جگہ قدم قدم پر خود غرضی، ذاتی نمود، اور نفسی نفسی کا زور، اور زبان پر قومی ہمدردی کا نمائشی وظیفہ!

نہ وہ گل ہیں نہ وہ گلشن نہ وہ سبزہ نہ ہوا	نہ وہ مسجد نہ جماعت نہ وہ طاعت نہ دعا
جاہ و ثروت کی تمنّا میں گرفتاری ہے	نہ قناعت نہ توکل نہ وہ خودداری ہے

سب سے پہلا پھندا مشرق کی گردن کے لیے یہ تیار ہوتا ہے کہ خط غلامی لکھنا پڑے تو بلا سے لیکن ایسی بابرکت

سراپا رحمت، سرکار بھی دیکھنے میں آئی تھی؟ یہ ریل، تار، ڈاک، عدالتیں، کونسلیں، یہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی ایجادیں پہلے کبھی خواب میں بھی نظر آئیں تھیں؟ اس کا عکس اکبرؔ کے جام جم میں ملاحظہ ہو ؎

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش راج ‌ ‌ کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے ‌ ‌ تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہیں

عطا ہوئی ہے وہ اسپیکروں کو آزادی! ‌ ‌ کہ حاکموں میں ہے قال تو یاں اقول بھی ہے

محلِ صلِّ علیٰ ڈاک و تار کی ہے روش ‌ ‌ اگرچہ دل میں نہاں عظمتِ رسول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی! ‌ ‌ جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی ‌ ‌ کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن ‌ ‌ کہ جس کو دیکھ کے حیراں چشم غول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ ‌ ‌ تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

یہی رنگ آگے چل کر اور زیادہ نکھر جاتا ہے اور کاغذ کے پھول خوش رنگ اور خوشنما تو پہلے ہی سے تھے لیجیے اب خوشبو بھی دینے لگے ؎

کیوں نہ اپنے دل کو ہو ان سے ملاپ ‌ ‌ لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ

ان کی بڑھتی سب مناتے ہیں یہاں ‌ ‌ خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ

ہر طرف ساماں ہیں آرام کے ‌ ‌ کھل گئی ہے ہر طرف ہر شے کی شاپ

ہو گئے روشن حدود آسماں ‌ ‌ علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ

ساری دھرتی دب گئی سائنس سے ‌ ‌ لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ

حضرت واعظ ہیں راضی رقص پر ‌ ‌ دے رہے کیا اب پڑے طبلہ پہ تھاپ

اپنی اصل اور اپنی نسل پر شرمانے والے بھائی بند آپ کی نظر سے بھی بارہا گزرے ہوں گے۔ بس کی بات نہیں ورنہ یہ اپنے چہرہ کے رنگ کو چھیل کر پھینک دیتے اپنے ماں باپ کا نام بدل ڈالتے، اپنی قومیت وطنیت سب دیسی سے ولایتی کر لیتے۔ اکبرؔ کی نگاہ سے کہاں بچ سکتے تھے۔ اکبرؔ کی نظر انسانیت کے ان مسخ شدہ نمونوں پر پڑتی ہے ان بیچاروں کی مغرب زدگی پر وہ ترس نہیں کھاتے کچھ زیادہ غصہ بھی نہیں کرتے مسکرا کر رہ جاتے ہیں اس تبسم کی جگمگاہٹ دیکھنے کے قابل ہے ؎

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے | چارہ ہی مگر کیا تھا فطرت جو یہاں جن دے
جو جس کے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا | یاروں کے لیے عہدے، چڑیوں کے لیے پھندے

مسکراہٹ کی جلوہ نمائی ہو چکی۔ اب ذرا ہنسی کی کھِلکھِلاہٹ ملاحظہ ہو، معنی کی طرف جایئے تو تمام تر رشیت اور محض ظاہر تک رہیے تو ظرافت ہی ظرافت مدت کی بات ہے، امیر خسرو دہلوی کبھی کوئے محبوب میں گدائی کے لیے نکلے تھے اور ایک صدا لگاتے چلے گئے تھے۔ اکبرؔ نے بھی وہی پرانا خرقہ نکال کر جابجا پیوند لگا، پہن لیا، ہاتھ میں کشکول گدائی وہی، لب پر صدائے فقیرانہ وہی، لیلائے تہذیب پر جان واری اور ایمان نثار کرنے چلے ہیں۔ اور الاپتے جاتے ہیں ؎

اے شوق وضع مغربی در ما فگندی ابتری | ہر چند مشقت میکنم لیکن توزاں بالاتری
شیئم شہید جلوہ ہا افتادہ در کمپ شما | باشد کہ از بہر خدا سوئے شہیدان بنگری
سحر نگاہت ناز من مرکوز طبیعت راز من | ہر نغمہ ات بر ساز من حقا عجائب دلبری
تو سینہ گشتی دل شدم ٹیچر شدی پیوپل شدم | تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
ہر چند باتو بستہ ام از طعن اکبرؔ خستہ ام | للہ لطفِ خاص کن پیدا بحق نیچری

شرابِ طہور، کا مزہ کہتے ہیں کہ اسی دنیوی شراب کا سا ہوگا، یہی تیزی، یہی جوش و خروش۔ اثرات اس سے بالکل الگ نہ کسی قسم کا نشہ نہ زوال عقل نہ خمار نہ گرانی —— اکبرؔ کے خمخانہ میں اس شراب طہور کے جام پر جام جتنے چاہیے چڑھاتے چلے جایئے۔

خودی کی بقا خودداری کے تحفظ کے لیے جو کچھ کہنا ہے محض مسلمانوں ہی سے بطور سرگوشی نہیں کہتے۔ ہندوؤں مسلمانوں کے بھرے مجمع میں سب کو سنا کر کہتے ہیں اور بعض دفعہ تو رُخ بالکل ہندوؤں ہی کی طرف پھیر کر کہتے ہیں ؎

ہوٹل سے بھلا پرہیز تمھیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

اور کبھی ہندو بھائی بندوں میں ایسا گھُل مِل جاتے ہیں کہ ان کے غیر معلوم ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے اپنے ہی نظر آنے لگتے ہیں ؎

زبان سنسکرت اس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے
کہ اچھا ہے مری الفت تمھارے دل میں رہتی ہے

میں خوش ہوں گی بلاشک تم اگر مجھکو جلاؤ گے
مگر وسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے؟

خوب جانتے ہیں کہ دربار فرنگ میں قدر نہ مسجد کی نہ مندر کی پرسش نہ ملّا کی نہ برہمن کی اس سرکار میں تو ایک ہی اعزاز ہے: خلعت غلامی! اور اس رجسٹر میں تو قومیت کا ایک ہی خانہ ہے: نیٹو یا کالا آدمی! وہ تمام تر عیش منائیں ہم آپ صرف ہل چلائیں۔ وہاں تمامتر خواجگی و حکومت یہاں سرتاسر شکستگی و عبودیت۔ ادھر افراط تنعم سے مدہوشی، ادھر نیم فاقہ کشی سے غشی، ان کی کوٹھیوں میں زرو جواہر کے خزینے، اپنی جھونپڑیوں میں، افلاس و فقر کے پسینے! یہ منظر ہم آپ سب ہی ہر روز دیکھتے رہتے ہیں۔ اکبر کی زبان سے سُنیئے تو یہی ٹریجیڈی کامیڈی بن جائے۔ اور حزینہ گھڑی بھر کے لیے طربیہ میں تبدیل ہو جائے ؎

سمجھا رہے تھے مجھکو کمٹ کی وہ گردشیں	خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے	میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ	اُلجھا رہے ہیں مجھکو ستاروں کی دم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی	میں نے کہا یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقائے سگانِ درِ حضور!	کل "تو" سے "تم" ہوئے تھے ہوئے آج "تم" سے "آپ"
ہنس کر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق	گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

یہ کونسل، اسمبلی، الکشن، ووٹ کے رنگا رنگ و خوشنما کھلونے اس بڑی تعداد میں اب نکل پڑے ہیں۔ لیکن ان کی اچھی خاصی کھیپ اکبر کے زمانہ میں بھی ولایت سے آچکی تھی اور ہندستان بہت سی بازیوں کے بعد اس نئی بازی کی بساط پر جھکا ہوا کھیل میں غرق دنیا و آخرت دونوں کو بھول چکا تھا۔ اکبر ان کھلونوں سے دل لگاتے تو کیا، البتہ جی بہلایا ان سے خوب ہی۔ جو کچھ اپنی عینک سے دیکھتے دوسروں کو بھی دکھانا چاہتے یہ اور بات ہے کہ دیکھتا کون؟ یہاں سرے سے دیدۂ بصارت ہی غائب ہو چکا تھا ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا	اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ	اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی	سلف گورنمنٹ آگے آئی!
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی	ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

یہی راگ ایک دوسری دُھن میں ہے

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہلچل — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں، کہ موٹر! — جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر
شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے — آخر کیا شئے یہ ممبری ہے
نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج — کونسل تو ہے ان کی ہی جن کا ہے راج
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں — اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل نہ دین ہے نہ دنیا — پنجرے میں پھدک رہی ہے مینا

یہی تصویر ایک اور رُخ سے ہے

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے — خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

باتیں کہتے تو سب ہی کے کام کی، لیکن قدرتاً اپنی جماعت اور قوم (مسلمانوں) کا غم اور زیادہ کھائے جاتا، اپنی آنکھوں سے ہر وقت دیکھتے کہ کیا سے کیا ہوئے جارہے ہیں قدم بجائے کدھر کے کدھر پڑتے جارہے ہیں دل روتا۔ چہرہ ہنستا ہوا بنائے غم کی گھٹن کو شش تھی کہ قہقہوں کی گونج میں دب کر رہ جائے۔ لکچروں میں ترقی کا شور سُن خود بھی اپنے ہم قوموں کو ترقی کے طریقوں پر ایک طویل لکچر دینا شروع کر دیتے ہیں ہے

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ — خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم — تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے
یورپ میں پھریئے پیرس و لندن کو دیکھیے — تحقیقِ ملک کا شغر و شام کیجیے
ہو جایئے طریقۂ مغرب پہ مطمئن — خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے
الفاظ کفر و فسق کو بس بھول جایئے — ہر ملّت و طریق کا اکرام کیجیے
رہیے جہاں میں وسعت مشرب سے نیک نام — مجھ کو مُرید ہندوؤں کو رام کیجیے
رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر — دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے
سامان جمع کیجیے کوٹھی بنایئے — با صد خلوص دعوتِ حکام کیجیے
یارانِ ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے — تکمیلِ شوقِ پستہ و بادام کیجیے

نظارۂ مسان سے تر و تازہ رکھیے آنکھ ! تفریح پارک میں سحر و شام کیجیے

زنجیر فقہ توڑیئے کہکر خلاف شرع مضمون لکھئے دعوئ الہام کیجیے

اور شعر یہ کہا ہے ؎

مذہب کا نام لیجیے عامل نہ ہو جیے جو متفق نہ ہو اسے بدنام کیجیے

اس کے بعد قدرتاً بس یہی کہنا رہ جاتا ہے ؎

لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے مردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجیے

درد آشنادلوں سے پوچھیے کہ اس تصویر میں کچھ بھی مبالغہ ہے؟ اس شاعری میں کہیں سے بھی "شاعری" ہے؟ آج ہمارے علم، ہمارے ادب، ہماری زبان، ہمارے مذہب، ہماری شرافت، ہماری تاریخ، کسی کی کچھ بھی وقعت ہے، عزّت ہے، اہمیت ہے، جب تک کہ "صاحب کا" کا صداقت نامہ بھی ساتھ ساتھ نہ ہو؟ بس ایک "صاحب" کی بات بالا، اور اس کے علاوہ سب کچھ ہیچ۔ اکبر اپنی اس بے چیزی کو خوب ہی محسوس کرتے ہیں ؎

دور فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں تفرقہ دیکھیے ذرا ہم پہ پڑے عجیب دن!

جان سپرد ڈاکٹر، مال سپرد آنجناب عقل سپرد ماسٹر، روح سپرد ڈارون

زندگی کا کوئی ایک شعبہ ہو، تو کہا جائے یہاں تو ساری کی ساری زندگی اسی غلامانہ ذہنیت یا جدید علمی اصطلاح میں اسی Inferiority complex کی نذر! فرنگستان کی باٹا کمپنی معزز! اپنے ملک کا بڑے سے بڑا موچی بھی محض موچی! ہوٹل لٹا ہوا بھی اس کا کارندہ بہر حال منیجر! مسرا برٹی سے بڑی بھی ہو، اس کا مالک بیچارہ محض بھٹیارا! گلّی ڈنڈے کا نام آئے تو آپ شرما جائیں، کرکٹ اور ہاکی ٹیم کی کپتانی کا عہدہ پیش ہو تو چہرے فخر و مسرّت سے جگمگا اٹھیں۔ فقیہ ہونا کٹھ ملائیت کے مترادف، ایڈوکیٹ اور بیرسٹر ہونا اعزاز و مرتبہ کا پروانہ۔ غرض اپنی اعلیٰ و ادنیٰ بڑی اور چھوٹی ہر چیز اسی دماغی مرعوبیت کا شکار، اسی ذہنی غلامی کی پیداوار! حضرت اکبر خودداری کے اس قحط کو، اغیار کے اس ہمہ گیر تسلّط کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں لیکن کمال ضبط یہ ہے کہ دل کی دکھن کو بھی ظرافت کی پھلجھڑی بنا کر پیش کرتے ہیں ؎ مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اور پھر ردیف و قافیہ اور وزن بدل کر ؎

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں

مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

(صاحب) کی زبان سے ملنے بارہا مل چکے تھے، کہ ہندی طلبہ سب کچھ لکھ پڑھ چکنے کے بعد بھی وہ کلچر، وہ آزادگی خیال اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں، جو فرنگی زادوں میں گھر گھر موجود ہے۔ اس طنز کے محققانہ اور سنجیدہ جوابات تو بارہا ہو چکے ہیں اس وقت ایک لطیف جواب اکبرؔ کی زبان سے سُنیئے یہ طرز جواب حصّہ ہے اکبر کا ؎

کر چکا کالج میں جب تکمیلِ فن! | تب یہ بولے مجھ سے مسٹر مارسین
گو کہ شہرت ہے تمھاری دور دور | مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور

اُستاد کے طعن کے جواب میں شاگرد عرض کرتا ہے کہ قصور معاف، یہ خطا کس کی ہے شاگرد کی یا اُستاد کی ؟

آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے | اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

مغربی استادوں کی زبان سے چند الفاظ ہم نے سیکھ لیے ہیں، کچھ بے معنی سے زبانوں پر وہی رٹا ہوا آموختہ رہتا ہے اور دل انھیں مقاصد لایعنی کی دھن میں سرگرم، تعلیم، اعلیٰ تعلیم، جبری تعلیم، ترقی، روشن خیالی، ارتقا و بس یہ چند منتر ہیں جن کے مسحور کن اثر سے کون واقف نہیں ؟ اکبرؔ نے ان میں سے دو لفظ "چندہ" اور "اسکول" انتخاب کر لیے اور انھیں ایک مخمس کی ٹیپ بنا۔ اُن سے خوب خوب کام لیے ہیں ؎

بکری کو ساگ پات کا سودا نہیں رہا | بنگالیوں کو بھات کا سودا نہیں رہا
چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہیں رہا | اور شاطروں کو مات کا سودا نہیں رہا

اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر اک

بنیوں کو اخذ سود کی فرصت نہیں رہی | منعم کو داد و جود کی فرصت نہیں رہی
لڑکوں کو کھیل کود کی فرصت نہیں رہی | کودن کو غنت ربود کی فرصت نہیں رہی

اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر اک

اسی طرح برابر ٹیپ پر ٹیپ جماتے چلے گئے ہیں اور خاتمہ پر فرماتے ہیں ؎

پنڈت پراجما کے بنارس پہ آ رہے | مرکٹ کے شیخ شہر بھی تو یس پہ آ رہے
حالی غزل کو چھوڑ مسدس پہ آ رہے | ہم فرد تھے سو ہم بھی مخمس پہ آ رہے

اور اک اگر صحیح رہتا تو پھر بھی امید اصلاح تھی لیکن جب سرے سے ادراک ہی غلط ہو جائے سفید، سیاہ اور سیاہ سفید نظر آنے لگے اور تعلیم، قلب کی قلب ماہیت کر دے اور اکبرؔ ہی کی پیشگوئی،

طلبہ بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

واقعہ بن کر آرہے، تو پھر علاج کس کے بس میں رہ جاتا ہے؟ اکبرؔ کو حیرت بار بار اسی الٹی سمجھ پر ہوتی ہے اور دعوت وہ اسی کی دیتے ہیں کہ صحیح غور و فکر کرنا سیکھو، اور اندھیرے میں وہم کو حقیقت کا درجہ نہ دے بیٹھو۔ یہ سارا دلفریب منظر ترقی محض سراب ہے یا حقیقتاً جوئے آب؟

تہذیب نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبرؔ — دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے

نقشوں کو تم نہ جانچو، خلقت سے مل کے دیکھو — کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے

دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

شاعر، ظریف شاعر بھی بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔ دل میں ناسور پڑ چکے ہوں تو بُشرہ کو ہنستا مسکراتا ہوا کب تک رکھا جا سکتا ہے۔ دل کی کسک آخر اپنے زور کے ساتھ زبان پر آکر رہے گی۔ خودداریوں کا خون روزانہ اپنے گرد و پیش ہوتے ہوئے دیکھ کر شاعر کا دل خون ہو چکا ہے اپنے عشرت کدہ کے کھنڈروں پر آکر رُکتا ہے اور در و دیوار کی گری ہوئی ایک ایک اینٹ حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے دل بھر آتا ہے لب پر آہ سرد ہے اور زبان پر دھیمے سُروں میں یہ مرثیہ ہے ؎

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا — وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائے گا جوبن پیدا

وہ تو پیدا نہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر — ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

اب اس مرثیہ کے سلسلے میں پھر کہتے ہیں ؎

پستیٔ قوم کے جب آ گئے دن اے اکبرؔ — اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا

باپ کے خون سے ہو گی جو حمیت زائل — ہوں گے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا

صورت برگ خزاں دیدہ پھریں گے اُڑتے — نہ بہار آئے گی پھر ہو گا نہ گلشن پیدا

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ — کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا

بس یہ کہتا ہے کہ ملت کے معانی کو نہ بھول — راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

قوم قوم آٹھ پہر سنتے ہیں ہم قوم کہاں — تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا

مذہبی شاخ فقط ہے تیری قومی ہستی — یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

سلف رسپکٹ کا پھر یاد رہے گا نہ سبق — پھر نہیں ہونے کی یہ بحث تو من پیدا

بزمِ تہذیب سے ہو جائیں گے قطعاً خارج — حس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہو شیون پیدا

آئینِ اکبری کا آغاز آپ دیکھ چکے اب انجام ملاحظہ ہو۔ بچپن کی شوخیاں بڑھاپے کی جھریوں سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟ شادیانوں کی دھوم مچ چکی اب نوحہ کے بول بھی کان میں پڑ جائیں۔ آج ۱۹۳۷ء میں ہم کو اور آپ کو جو کچھ بہ چشمِ شہود نظر آ رہا ہے شاعرِ امت اور حکیمِ ملت کی نگاہِ کشفی نے اسے ۳۰، ۳۵ سال قبل ہی صفائی کے ساتھ پڑھ لیا تھا۔ آنکھیں نم ہوئی جاتی ہیں دل کچھ بیٹھا سا جاتا ہے۔ اور جو کچھ خود دیکھ رہے تھے دوسروں کو دکھاتے جا رہے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنواں سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی یہ پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
عقاید پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ — بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

انقلابِ دہر اپنے وقت پر بہر حال آیا وہ دن آگیا کہ غم کھانے والا اکبرؔ نہ رہا اور وہ دن آ رہا ہے کہ خود اس نئے آئینِ اکبری کو سنانے والا بھی نئے سے پرانا ہو کر مٹ مٹا کر نسیاً منسیاً ہو چکا ہوگا۔

---

(۵) موت میں زندگی[1]

"موت ایک دفعہ آتی اور جان ایک روز جانی ہے لیکن خوش نصیب ہے وہ عورت جو شوہر کی آنکھوں کے سامنے زندگی کو رخصت اور دنیا کو وداع کرے۔ میرا اصرار ماں کی محبت اور میری شفقت کا اظہار تھا ورنہ میں جانتا ہوں مجھے علم ہے، میرا عقیدہ ہے کہ سسرال کے پتھر میکے کے پھولوں سے، شوہر کی نفرت باپ کے پیار سے اور اپنے گھر کے چنے ماں کے گھر کے قورمے سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہیں۔" (نوحۂ زندگی ص۲۴)

خط باپ کا ہے، بیاہی ہوئی بیٹی کے نام۔ شوہر صاحب دوسرا نکاح کر چکے ہیں، اور یہ بیٹی دل و دماغ کے سخت عذاب اور جسم کے شدید آزار میں مبتلا ہے، باپ کو بیٹی کی قسمت پھوٹ جانے کی اطلاع پہونچتی ہے اور لخت جگر کے ساتھ اپنے دل کے ٹکڑوں کو خط کے خوان میں یوں لگا کر پیش کرتا ہے:۔

"ہم تو آج کیا اس دن سے تم کو رو چکے جب تم ہمارے گھر سے رخصت ہو کر سسرال پہونچیں۔ تقدیر اچھی ہوتی خوش خوش رہتیں۔ آباد رہتیں، مقدر درست نہ تھا پھولوں بھری سیج کانٹوں سے اور موتی بھرا تھال کنکروں سے پٹ گیا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ سوچنا یہ کہ اب کیا کرنی ہے۔ زندگی بھلی یا بری جیسی گزرنی تھی گزر گئی۔ اب موت ایک اور زندگی شروع کرے گی ضرورت ہے کہ وہ زندگی خوشگوار ہو اور وہ شوہر جس کی دلہن بننے والی ہو اور جس کی سیج جنگل بیابان کی قبر ہو گی

---

[1] تحریر ۱۹۳۶ء۔ نظر ثانی ۱۹۵۳ء

تم سے خوش رہے۔ سسرال کے لوگ فرشتے اور حوریں تمہاری ہستی سر آنکھوں پر رکھیں اور تم آئندہ نسلوں کے واسطے ایسا سبق چھوڑ جاؤ کہ دنیا تمہارے نام پر فخر کرے اور بیویاں تمہارے قدموں کی خاک کا سرمہ بنائیں .... آزمائش کا موقعہ اور امتحان کا وقت یہی ہے سینہ پر آرے کلیجہ پر چھریاں اور زخموں پر تیر چلیں مگر زہر کا ہر گھونٹ شہد اور تلخی کا ہر قطرہ شربت ہو۔" (صہ۱۴۰-۱۴۱)

لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ اردو افسانوں میں بجز بے حیائی کے رکیک جذبات کے اور رکھا کیا ہے لیکن کہنے والے دیکھیں کہ کلیہ میں استثناء بھی کس پایہ کا ہے جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ اردو میں افسانہ اگر اسی کا نام ہے تو کاش ہمارا سارا سرمایۂ ادب افسانہ ہی ہوتا!

خط ابھی ختم نہیں ہوا ہے آخری سطریں بھی پڑھ لیجیے :-

"بیٹی یاد رکھنا! عورت کی مصیبت اس کی شرافت کی کسوٹی ہے کوشش کرنا کہ باپ دادا کی آبرو میں فرق نہ آنے پائے اس دنیا کو خیر باد کہو اور اب ادھر کی لو لگاؤ جہاں ہمیشہ رہنا اور سدا سہنا ہے۔ ساجدہ! منزل کڑی اور راستہ ٹیڑھا ہے خدا کا نام لو، بسم اللہ کرو اور اب اس منزل میں قدم رکھو" (صہ۱۴۱)

بحث یہاں افسانہ کی زبان سے، پلاٹ سے۔ کردار نگاری سے، اس کے کسی "فنی" پہلو سے نہیں۔ ان سارے پہلوؤں کو چھوڑیئے۔ سوال یہاں صرف اس قدر ہے کہ اگر آپ صاحبِ اولاد ہیں اور اتفاق سے کسی لڑکی کے باپ بھی تو خود بتلایئے کہ خود پر کیا گذر رہی؟ "زندگی" میں "موت" کا سماں کس نے اس طرح دکھایا ہے؟ افسانہ اور رومان کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر کس نے آخرت سے اس اس طرح ڈرایا ہے؟ شادی ایک مسلمان گھرانے میں ایک لڑکی کی ہو رہی ہے والدین ماشاءاللہ عبادتوں کے لحاظ سے اچھے خاصے دیندار لیکن رسم و رواج کی زنجیروں میں گرفتار، ساچق کے دن سگی بیوہ پھوپھی شامت کی ماری وہاں آ نکلیں جہاں سات سہاگنیں دلہن کو چڑھاوا چڑھا رہی تھیں۔ عین شگون کے وقت ایسی بدشگونی! بیوہ ہو کر سہاگنوں میں آ ملی، اور پہونچی وہاں جہاں رسم و رواج کی شریعت، اس کے سایہ کے بھی پہونچنے کی روادار نہ تھی بس کچھ نہ پوچھئے کیا غضب برپا ہو کر رہا۔ بھرے مجمع میں برادری کے جمگھٹے میں بھاوج اور بھائی اور تنہا یہی دونوں کیوں یہ کہیے کہ ساری محفل اس گنہگار پر بپھر پڑی۔

"منجھلی آپا، غضب خدا کا یہ ستم ڈھایا ایسی بھائی اور بھاوج سے دشمنی اور بھتیجی سے عداوت تھی، تو زہر دے دیا ہوتا، ہٹو یہاں سے خبردار جو زیور کو ہاتھ لگایا یا کپڑوں کو چھوا۔ جہاں آرا کو اس وقت اپنی بیوگی کا احساس ہوا جس قدر مہمان جمع تھے ان میں ایک ایسا نہ تھا کہ اس کی بے گناہی کو تسلیم کر لیتا۔ ہر عورت فیروزہ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور کہتی تھی کہ

ایسی ڈائن پھوپھی اور ناگن بہن آج تک دیکھی نہ سُنی، اوّل تو یہ غضب کہ شگون کے وقت اپنا چہرہ دکھایا۔ اس پر یہ ستم کہ سہاگنوں میں آملیں دونوں پر طرہ یہ کہ دیکھ بھال کر اور سمجھ بوجھ کر زیور کو ہاتھ لگایا کہ توبہ توبہ لڑکی رانڈ ہو جائے.....

یہ وہ وقت تھا کہ آدھی رات کو ایک بیوہ عورت حقیقی بھتیجی کی شادی میں ایسی سنگین خطاؤں کی ملزم تھی تمام مہمان اور بھائی بھاوج اس کے خلاف تھے اور چاروں طرف سے بوچھار اور لعن طعن پڑ رہی تھی۔ جہاں آرا کی زبان خاموش تھی اس کی آنکھیں اپنی بے گناہی کا عذر کر رہی تھیں وہ ایک ایک کی طرف دیکھتی تھی مگر کوئی اتنا نہ تھا کہ اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی کہدیتا یہاں تک کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دالان کے باہر نکال دیا گیا" (صـ۱۵)

اسی شب میں یہ رواج کی بندی ریت رسموں کی پوجا کرنے والی فیروزہ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ مرحومہ ساس آئی ہیں اور اپنی قسمت کی ہیٹی بیوہ بیٹی کو سینہ سے لگا بھوسے کہتی ہیں :۔

"بیوہ کی آہ میں، اس آہ کی آگ میں، اس آگ کے دھوئیں میں جو دونوں میاں بیوی نے ہنس ہنس کر اور کھِل کھِل کر سُلگائی اور بھڑکائی، خدا کا غضب اور قہر پوشیدہ ہے جو اس دھویں کو برباد نہیں کر رہی ہے فرشتے اس کی گود میں اور حُوریں اس کو سینہ سے لگا رہی ہیں۔ زبان نے الفاظ کو چھُری بنا کر رانڈ بہن کا دل زخمی کیا زخم کی اذیت، آہ میں تبدیل ہوئی۔ آہ کا دھواں اس مالک حضور میں حاضر ہوا جو ظالم اور مظلوم دونوں کا مالک ہے وہاں پہونچ کر فنا ہونے اور مٹ جانے والا نہیں ایک دوسری صورت اختیار کرے گا اور خدا کا قہر بن کر اس طرح نازل ہوگا کہ کلیجہ مسوس کر رہ جائے گی، فیروزہ! بیوہ کی آہ بھڑکا چکی اب اپنی آگ ٹھنڈی کر اور یقین کر کہ یہ دھواں خالی جانے والا نہیں رنگ لانے اور مصیبت ڈھانے والا ہے" (صـ۱۹)

یہ آپ افسانہ پڑھ رہے ہیں کہ کسی شیخ کامل کے حلقہ میں بیٹھے خشیت الٰہی کا درس لے رہے ہیں ؟ اور خدا شناسی نہ سہی، خود شناسی کی منزلیں تو بہرحال طے کرتے ہی جا رہے ہیں۔

شعر و شاعری کو اسلام نے سخت ناپسند کیا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ اور اَلشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ وغیرہ نصوص قرآنی کی تصریحات موجود ہیں لیکن قرآن ہی میں آخر یہ استثناء بھی موجود ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ اور خود رسول اللہ صلعم نے اسلام کے ہجو گویوں کے جواب میں حسان رضؓ سے نظمیں کہلائی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ شاعری بھی، بعض حالات میں جائز ہونا کیسا ؟ عین عبادت بن جاتی ہے اور جب یہ اصل مسلّم ہو چکی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اردو میں راشد الخیری کی افسانہ نویسی اپنی جگہ پر ایک عبادت و موعظت نہیں۔

ہاں تو وہ قصہ رہا جاتا ہے۔ بیوہ کی آہ کا دھواں بالا بالا نہ گیا۔ سیدھا عالم بالا کو پہونچا۔ مرزا قدیر کا جوان پالا پوسا لڑکا ظہیر بیمار پڑا، اور ایسا کہ چارپائی سے لگ گیا۔ مامتا کے مارے ہوئے ماں باپ نے دوائیں۔ تدبیریں آخر سب ہی کر ڈالیں۔ لیکن نہ ٹلنے والا وقت آکر رہا۔

"سکرات شروع اور اس کے ساتھ ہی ماں باپ کھڑے اور پڑے پیٹنے لگے۔ ظہیر سامنے لیٹا دم توڑ رہا تھا اور قدیر الگ کھڑا سر پھوڑ رہا تھا، کبھی اندر جاتا کبھی باہر آتا۔ آدھی رات کے وقت اپنے کمرہ میں آ خاموش بیٹھ گیا۔ آنکھیں کچھ بند تھیں کچھ کھلی، خدا معلوم عالم خواب تھا یا بیداری اور واقعہ تھا یا تخیل ایسا معلوم ہوا کہ جہاں آرا اپنے دونوں معصوم بچوں کے ساتھ ہے اور ان کی انگلیاں پکڑے سامنے کھڑی ہے۔" صہ ۶۴

یہ وہی چند سال پیشتر والا منظر ہے۔ سگی بیوہ بہن اپنے دو یتیم بچوں سمیت محض ایک جاہلانہ و مشرکانہ رسم کے توڑنے کے جرم میں ذلت خواری کے ساتھ دھکّے دے کر نکالی جارہی ہے اور چلتے چلتے کہتی جارہی ہے۔

"بھیّا کوئی گھر ہمیشہ شادی کا نہیں رہتا جہاں آج شادی کے جلسے ہیں وہاں کل موت کا بَین ہے جہاں آج خوشی کے نقّارے ہیں وہاں تھوڑی دیر کے بعد ماتم کے تاشے، جس دالان میں سمدھنیں اور براتی ہیں اس میں تعزیت اور عیادت والے بھی شریک ہونے والے ہیں۔ بیرن! یہ گھر حشمت کی شادی سے بھرا پُرا نہ رہے گا یہاں ظہیر کا ماتم بھی ہوگا آج میری اور میرے بچوں کی موت سے تیری تیوری پر بل نہ آئے اور تینوں موتیں تو ہنس کر ٹال دے مگر اس دروازہ سے ان تین کے بعد ایک ایسی لاش نکلے گی جو تیرے ہوش و حواس باختہ کردے گی!"

عالم غیب کی یہ پیشین گوئی عالم شہادت میں حرف بہ حرف پوری ہو کر رہی اور جہاں تک اس قصہ کا تعلق ہے نوحۂ زندگی کا تعلق ہے نوحۂ زندگی کا خاتمہ نوحۂ موت پر ہو کر رہا ——— آخرت کی فتح دنیا پر "کل" کی فتح "آج" پر روحانیت کی فتح مادّیت پر!

خیال نہ گزرے کہ کتاب کا موضوع ہی غم کی مصوّری ہے۔ "نوحۂ زندگی" نام ہی نوحہ و شیون کا ہے، اس لیے اگر اس میں موت کا ذکر بار بار آگیا اور آخرت کے خوف سے سطر سطر میں ڈرایا گیا، تو بات کچھ ایسی داد و فخر کی نہیں۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے زندگی کے جس شعبہ کو بھی ہاتھ لگایا ہے اسے فنا و مکافات عمل کے رنگ سے رنگ دیا ہے۔ نسوانی زندگی کی ایک کامل سرگزشت اور مکمل روئداد چار جلدوں میں "صبح زندگی"، "شام زندگی" اور "شب زندگی" (دو حصے) کے نام سے لکھ ڈالی ہیں۔ اس میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے سارے دور، عورت کی زندگی کے آگئے

ہیں خصوصاً "صبح زندگی" کے تو ہر ہر صفحہ سے زندگی ہی کی کرنیں طلوع ہو رہی ہیں اور بڑے سے لے کر چھوٹا شاید ہی کوئی مرحلہ نسوانی زندگی کا چھوٹنے پایا ہو، کہیں بچی کو لیے گود میں کھلا رہے ہیں اور کہیں انگلی پکڑ کے اسے ٹہلا رہے ہیں کہیں برسات میں جھولا جھلا رہے ہیں کہیں اس کی توتلی زبان میں اس سے کہانی کہہ رہے ہیں۔ مکتب میں اسے حساب کے پہاڑے یاد کرا رہے ہیں اور ابھی جانماز پر بیٹھے اسے مناجات بر زبان یاد کرا رہے ہیں۔ کہیں انگنائی اور دالان میں جھاڑو دلا رہے ہیں اور کہیں باورچی خانہ میں سالن بگھارنے اور حلوہ پکانے کی ترکیبیں بتا رہے ہیں۔ ابھی بنیوں سے مول تول، بازار کے سودا سلف کی گفتگو ہو رہی تھی، ابھی انگشتی پیچک لیے ہوئے سلائی، کترائی، کٹائی بخیہ کے بقچے کھولے بیٹھے ہیں۔ غرض ہر طرف زندگی ہی زندگی کی بہار ہے لیکن بہار کی اس گرما گرمی میں بھی زندگی کی خزاں کی یاد دیدۂ دل کے سامنے سے ہٹنے اور نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔

"تکاثر ایک خوش حال خاتون ہے، دنیا پرمٹی ہوئی، آخرت کو بھولی ہوئی۔ بدمزاجی کے باعث محلہ بھر ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ یتیم خانہ کی لڑکی معصومن قبضہ میں ہے، سارا غصہ اسی کی جان ناتواں پر ٹوٹتا ہے۔ دوپہر کے وقت ایک روز لڑکی کو بخار چڑھا جاڑوں کے دن تھے دھوپ میں بیٹھی کپکپا رہی تھی۔ تکاثر نے پٹاری منگوائی زبردست کے بسوے بیس اٹھی اور لائی چھ سات برس کی جان۔ بخار میں جھلسی۔ پکا پانسیر تانبا ہاتھ میں، پاؤں پھسلا اور دھم سے گری بیمار کا گرنا تھا تکاثر جھلا کر اٹھی پٹاری کو تو وہیں چھوڑا اور معصومن کا ہاتھ پکڑ کر بید ردی سے گھسیٹتی ہوئی لائی بخار زدہ معصومن کی حسرت آمیز نظریں تکاثر جلاد سے رحم کی ملتجی تھیں اور بے گناہی کا اظہار کر رہی تھیں۔ مار پڑنی شروع ہوئی جب طاقت ضبط نہ رہی تو رو کر کہنے لگی بیگم صاحب اب معاف کر دیجیے، پھر کبھی نہیں گراؤں گی بے بس لڑکی کی منت و زاری کا تکاثر پر کیا اثر ہوتا مارا جتنا مار سکتی تھی مار چکی تو ایسا دھکا دیا کہ اوندھے منہ جا کر تخت پر گری۔ کنپٹی میں کیل چبھی خون کی نلکی بندھی سارا چہرہ لہولہان ہو گیا۔"

(صبح زندگی ص ۱۴۹)

مظلوم کی آہ کی رسائی کے لیے عرش الٰہی تک کے راستے بے روک ٹوک کھلے ہوئے ہیں بہت جلد ہی خبر نکل آئی:۔

"قبولیت کی گھڑی عام آدمیوں کے واسطے کوئی خاص ہو تو ہو مظلوم کے واسطے تو حاکم حقیقی کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے معصومن کی التجا دکھے ہوئے دل کی آہ تھی کلیجہ سے نکلی زبان پر آئی، زبان سے نکلنے کی دیر تھی آسمان اور زمین دونوں کانپ گئے، حاکموں کا حاکم بادشاہوں کا بادشاہ مظلوموں کا والی، معصومن کا وارث جس کے حضور میں

اتنی دیر گڑگڑائی اس فریاد کو سن رہا تھا۔"

(صبح زندگی ص۱۵۱)

تکاثر اسی شام کو بڑی گردن میں پھوڑا نکلا آدھی رات تک تو کچھ سوئی اور کچھ جاگی مگر آدھی رات کے بعد تو پلک جھپکانی حرام تھی منہ اور گردن دونوں سوج کر کپّا ہو گئے بڑی مشکلوں اور مصیبتوں سے چیخ پیٹ رات کاٹی نماز دم خالہ نانی کو بلوایا چچی پھوپھی کو ڈولی بھیجی غرض جس نے دیکھا دم بخود رہ گیا، ڈاکٹر، جراح، حکیم، طبیب سب ہی آئے اور گئے مگر تسکین کی صورت نہ نکلی۔ ایک چیخ آسمان اور ایک زمین میں تھی۔ جس شخص نے پیسہ تو پیسہ سوکھی روٹی تک کسی کو نہ دی ہو بھر بھر مٹھیاں روپے دے رہی تھی دنیا بھر کے جتن کر ڈالے مگر آرام وافاقہ کیسا بیس سے انیس بھی نہ ہوا کس قیامت کی کھولن اور کس غضب کی جلن تھی کہ کسی کروٹ بھی چین نہ پڑتا تھا مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دوسری رات پہلے سے بھی بدتر گزری ایک زخم تھا جس پر کوئی کچوکے دے رہا تھا۔ صبح جراح نے آگر چیر دیا، دوپہر کو بخار چڑھا، غفلت شروع ہوئی گھڑی دو گھڑی بعد ہوش آجاتا تھا تو ایسی بلبلاتی تھی کہ سننے والوں تک کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، شام کو بخار ذرا ہلکا ہوا مگر پھوڑے کی تکلیف بدستور تھی۔ پلنگ باہر بچھوایا انگنائی میں آکر لیٹی۔ یہ عمر بھر میں پہلا ہی دن ہوگا کہ تکاثر ارحم الراحمین کے رحم کی ملتجی تھی اور اس کو یاد کر رہی تھی۔ عشاء کا وقت تھا کہ ایک فقیر نے دروازہ پر آکر صدا لگائی:۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

بیماری کی حالت، رات کا وقت، مضمون درد انگیز، فقیر خوش الحان، دفعتہً تکاثر کو عاقبت کا خیال بندھا سوچنے لگی کہ بس زندگی کے دن پورے ہو گئے اور ایک آدھ روز یا دو چار گھڑی دنیا کی ہوا کھا رہی ہوں لے لیا جو لینا تھا اور کر چکی جو کرنا تھا (ص۱۵۱)

اتنے میں ایک آواز کان میں آئی جو کہہ رہی تھی۔

تجھ سے زیادہ نا عاقبت اندیش کون ہوگا۔ مسافر بن کر گئی، گھر والی بن کر بیٹھی پردیس کو وطن سمجھا۔ سرائے میں ڈیرے ڈالے اور اس بات کا کبھی خیال نہ آیا کہ جو کچھ کر رہی ہوں حرف بحرف لکھا جا رہا ہے اور یہ دفتر ایک دن کھلتا ہے۔ کیوں تکاثر کال کے دن مٹھی بھر دانوں کے لالے اور تیرے ہی جیسے مظلوم و معصوم بندے دور دور سے آس لگا کر تیرے پاس آئیں اور تو منہ پھیر لے! دکھیاریاں مصیبت کی ماریاں بھوک کی پیاسی تیرے در پر آکر پڑیں اور تو ان کا زیور تک کے تیس تیس چالیس چالیس روپے کی رقمیں محنت کی بنائی مصیبت کی جوڑی دس دس

پندرہ پندرہ روپے میں ہتھیائیں اور کبھی رحم نہ آیا۔ یتیموں کے مال مارے۔ وقت پڑوں کے زیور چھینے رانڈوں کے دل توڑے بچوں پر ظلم کیے۔ کسی کا مکان دبایا۔ کسی کی دکان اُڑائی مگر او بیوقوف وہ سب وہیں تک کا تھا۔ اور وہیں کا وہیں رہا۔ آج تیرے ساتھ ان میں سے تو کچھ نہیں مگر ہاں مظلوموں کی آہیں اور دکھے ہوئے دلوں کی بد دعائیں تیرے ساتھ ضرور ہیں۔ نکاتر! وہ ظلم وستم اور غرور وتمکنت سانس ہی تک کا تھا۔ اب ختم ہوا۔ اب تو ہے اور ان کرتوتوں کا پھل جو کیا وہ بھر جو بویا وہ کاٹ۔ یاد ہے یا بھول گئی آدھی رات کا وقت، پانی کا طوفان اور وہ بن ماں باپ کی بچیاں رات کی رات تیرے گھر پر رہنا چاہیں۔ منتیں کریں خوشامدیں کریں اور تو اس کان سُنے اور اس کان اُڑا دے"۔ ان کا کچھ نہ گیا تو نے آخرت برباد کی، وہ دن رات کچھ بھی نہ رہا۔ مگر تیرا عمل باقی رہ گیا۔ جس پر اتنا گھمنڈ کیا۔ وہ سدا رہنے والا نہ تھا۔ نکاتر آج اس گھر میں اُلّو بول رہے ہیں۔ اور کوئی اتنا نہیں کہ چراغ جلا کر بیٹھ جائے کس برتے پر تتا پانی کس بات پر بھولی، اور کیا سمجھ کر پھولی، جو کچھ کرتی اور جو دیتی وہ سب تیرا امانت ہوتا اور آج ہم تجھ کو تیری امانت دوگنی اور تگنی واپس کرتے، دیتے اور اتنا دیتے کہ تو خوش ہو جاتی مگر تو تو ہمارے نام سے ایسی بیزار ہوئی کہ مرگئی اور ہم کو جھوٹوں یاد نہ کیا۔

کچھ معصومن کے برتاؤ کا دھیان ہے؟ آج ہم وہی برتاؤ تیرے ساتھ کریں گے تو نے اس کو بیٹی کی طرح رکھنے کا وعدہ کیا تھا اور اس کا ننھا سا دل باغ باغ تھا مگر اے سنگ دل تو نے اس کی بڑی مٹی پلید کی اور ذرا سے کلیجہ پر بڑے بڑے داغ دیئے۔ اس ایک معمولی سی پھنسی میں تو نے محلہ کا محلہ سر پر اُٹھا لیا اور وہ بخار میں ہلہلاتی آفت زدہ بچی جو تیرے حکم پر پان سیر کا بوجھ اٹھا کر لائی، صرف پاؤں پھسل جانے پر اس سزا کے قابل تھی کہ، وہ کمزور لہولہان ہوجائے، وہ بھی تو تیری طرح جان رکھتی۔ صرف اتنا فرق تھا کہ تو زبردست تھی وہ کمزور تو اختیار والی تھی، وہ مجبور، مگر اس وقت تو ایسی عدالت میں موجود ہے جہاں کا حاکم تجھ سے زیادہ زبردست اور جس کا فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔ معصومن کا دل مجروح اس بارہ میں تجھ سے زیادہ پیارا ہے اور یہ اسی سات برس کی لاوارث بچی اور تیری دست نگر لونڈی کی خاطر ہے کہ تو اس سخت عذاب میں پڑی ہے۔ اُٹھ اور جو کیا اس کو بھگت" (صبح زندگی ص۱۵۵-۱۵۶)

نصوح کا خواب توبۃ النصوح میں جو لوگ پڑھ چکے ہیں اُمید ہے کہ اسے بھولے نہ ہوں گے۔ اتنے موثر خواب کوئی بھلا دینا چاہے بھی تو بھلانا آسان نہیں ہے ——— کون جانتا تھا کہ خواب آخرت کے اس نقش اوّل کا نقش ثانی تیس پینتیس سال کے عرصہ میں نزیر احمد ہی کے خاندان کے ایک رکن کے قلم سے نکل آئے گا؟ تقابل و موازنہ یہاں منظور نہیں بتانا صرف یہ، اور جتانا صرف اس قدر ہے کہ مشرق کے افسانہ نویس کی "صبح زندگی" بھی میدان حشر

کہ کیسے کیسے مؤثر مناظر اپنے دامنوں کی تہ میں رکھتی ہے! شعر و ادب، افسانہ و محاضرت اِس دنیا اور اس ملک کے اور جس حصہ میں بھی افیون کی گولیوں کا کام دیتے ہوں "تیری" گھرانے کے ایک مرد "راشد" کے ہاتھ میں آکر تو وہی زہر عین تریاق بن جاتا ہے اور جس پر دھوکا بربطِ غفلت کا تھا وہی صورِ بیداری نکلا!

جس روداد حیات کی "صبح" کے مناظر یہ ہوں اس کی شام کے مناظر کیا کچھ نہ ہوں گے؟ نصیرہ ایک خوشحال گھرانے کی بیگم ایک ڈپٹی صاحب کی بیوی ہے، لڑکے کا ختنہ کیا، عین دھوم دھامی تقریب کے دن، سوتیلے لڑکے کو ڈپٹی صاحب کے ہاتھوں بالکل بلا وجہ و بے قصور بے انتہا مار کھلا چکی اور جنگل میں پھینکوا چکی ہے۔ لڑکا بھی کون؟ سگی بہن کا لڑکا۔ اپنا سگا بھانجہ جس کی ماں ڈپٹی صاحب کی پہلی بیوی تھیں اور لڑکے کا سن یہی کوئی چھ برس کا۔ رات اندھیری جنگل میں بارش زور شور کی ہو رہی ہے، آدھی رات کے سناٹے میں ایک سانپ آکر معصوم بچے کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے، اب اس کے آگے کا قصہ۔ قصہ نویس کی زبان سے سُنیئے:-

"یہ وہ وقت تھا جب نصیرہ بیگم کا گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھر رہا تھا۔ میراثنیں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ نصیرہ دن بھر کی تھکی ہاری، دو دن کی جاگی اس خیال سے کہ ذرا کمر سیدھی کر لوں اپنے پلنگ پر جا لیٹی لیٹتے ہی سامنے کی دیوار پر روشنی میں ایک انسانی صورت دیکھی گھبرا کر اٹھی، ڈری اور پوچھا "کون"؟

روشنی = میں تیری حقیقی بہن ذاکرہ بد نصیب کی رُوح ہوں، اور مظلوم و معصوم ساجد کی ماں، تجھکو یہ عیش کی گھڑیاں مبارک، تیرے لال کے کھیڑے بسیں، تیرا سہاگ ہمیشہ قائم رہے تو دودھوں نہائے، پوتوں پھلے، مگر نصیرہ میری محبت اور خدمت اس کی مستحق نہ تھی جو تو نے میرے لال کے ساتھ کیا۔ تو بیگم ہے اس گھر کی مالک ہے۔ مجھے تجھ سے کچھ کہنے کا حق نہیں، میں اپنی زندگی پوری اور اپنی دنیا طے کر چکی، میرا نمونہ تیرے سامنے ہے میں ہمیشہ مظلوموں سے ڈری معصوموں سے جھکی یتیموں سے ملی رانڈوں سے جُلی، غرض میری زندگی کا مقصد صرف بندگانِ خدا کی خدمت اور حاجت مندوں کی اعانت رہا۔ پھر بھی میں سدا خوف سے کانپی اور موت سے لرزی، میرے پاس مغفرت کا کوئی سامان نہ تھا۔ دوزخ کے شرارے اور آگ کی لپٹیں مجھے جُھلسنے کو تیار تھے، قبر اپنا منہ کھولے مجھے نگلنے کو موجود تھی تم سب عزیزوں نے مجھے نہلا دُھلا کر رخصت کیا اور میری تمام محبت ختم کر دی۔ مردوں نے مجھے سپرد زمین کیا اور اپنا منہ موڑا۔ بڑا نازک وقت تھا۔ میں تھی اور عمرِ گزشتہ کے ہر فعل کی جوابدہی، ہر عمل کی بازپرس، ہر کام کی ذمہ داری، ہر قول کی جانچ پڑتال نمازیں دکھاوے کی تھیں۔ اکارت گئیں، روزے زبردستی کے تھے بیکار نکلے۔ ہاں اس آڑے وقت میں جب کوئی یار و مددگار نہ تھا کچھ یتیم لڑکے۔ کچھ معصوم بچے، تھوڑی سی رانڈیں، چند مظلوم بعض محتاج

جن کو آج دنیا حقارت سے دیکھتی اور نفرت سے رکھتی ہے، میری مدد کو دوڑ پڑے یہ پاک روحیں عالم بالا میں راج کر رہی تھیں۔ ملک عدم میں ان کا سکّہ چل رہا تھا اور اس جہان کی بادشاہی ان کے قبضہ میں تھی۔ یہاں یہ میرے دست نگر تھے وہاں میں ان کی محتاج قادر ذوالجلال کی پاک ذات ان میں شامل تھی انھوں نے میرے سلوک کا معاوضہ اور میرے رحم کا بدلہ دیا۔ دوزخ ان کے اثر سے خاک اور شعلے ان کے اشارے سے ٹھنڈے ہوئے قبر میرے واسطے گلزار بنی اور میری گنہگار روح جنت الفردوس میں جا پہنچی۔ آج مجھے حکم ہوا تھا کہ میں اس نابکار دنیا کی کیفیت دیکھوں اور اپنے پیارے ساجد کی روح کے استقبال کو آؤں میں نے جو کچھ کیفیت دیکھی بیان نہیں کر سکتی آج تیرے بچّہ کی شادی ہے اور تو بیگم بنی بیٹھی ہے نوکر تیری ہوں پر حاضر ماما ئیں تیرے اشارے پر موجود اور شوہر تیرے اشارہ پر تیار ہے لیکن بیوقوف بیگم! خدا کی ایک مخلوق، ایک بھولا بھالا بچّہ، بن ماں کا لال بے وارث معصوم اور تجھ جیسی با اختیار عورت کا غلام تیرے چلتر سے باپ کے ہاتھوں جنگل بیابان میں دم توڑ چکا، کیوں بیگم؟ حقیقی باپ اور سگی خالہ یوں عیش کرے اور ساجد آدھی رات کے وقت سنسان جنگل میں اس قیامت خیز بارش میں اکیلا پڑا ہوا دنیا کو الوداع کہے، تیرا بچہ اکیلا دالان سے باہر نہ نکلے اور میرا بچہ تیرے ہاتھوں زندگی کی آخری رات اس طرح بسر کرے، تیرے دولھا کے واسطے یہ سیکڑوں آدمی موجود ہوں اور ساجد کے مردے پر کوئی دو آنسو گرانے والا بھی نہ ہو۔ دیکھ یہ میرے ہاتھ تیرا اعمال نامہ ہے، جہاں مظالم کے سوا ایک بھی نیکی نہیں اِدھر دیکھ یہ موت تیرے واسطے مُنہ چیرے کھڑی ہوئی۔ نصیرہ بیگم جو ہونا تھا سو ہوگیا، ساجد کی روح جنّت میں جا پہونچی۔ اب تیرا اس کا فیصلہ حاکم حقیقی کے سپرد ہے، اور وہ وقت دور نہیں جب دنیا تجھ جیسی ناشاد، نامراد، ظالم و مکار عورت کو اپنے سے جُدا کردے اور تو اس کا نتیجہ بھگتے،

(شام زندگی ص ۵۷-۵۹)

اقتباس یقیناً طویل ہوگیا لیکن کون دل والا ہے جو اکتا کر ایسی طوالت کو ختم کرنا چاہے گا؟ —— اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں اُس انشا پرداز کے قلم پر جس نے یوں گدگدا گدگدا کر رلایا۔ کتنے بگڑے ہوئے گھر انھیں تحریروں سے سدھرے ہوں گے اور ظلمت کدوں میں انسانیت اور خدا ترسی کی شعاعیں انھیں روزنوں سے پہنچی ہوں گی۔ اور افسانہ نویس کے اجر بے حساب کا حساب اور مزد بے اندازہ کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

اُردو میں لکھنے والے، ناول اور افسانہ لکھنے والے بھی، ایک سے بڑھ کر ایک اب تک ہو چکے ہیں۔ کسی نے کردار نگاری کا حق ادا کیا، کسی نے لطف زبان کا سماں باندھ دیا۔ کسی نے ہنسایا، کسی نے ڈرایا، لیکن اگر دائرۂ انتخاب کو محدود

کر کے سوال یہ کیا جائے کہ زندگی کی منظر نگاری میں موت کی مصوّری اور آخرت کی عکاسی کس نے سب سے زیادہ کی؟ تو جواب کئی نہیں ہوں گے صرف ایک ہوگا زبانوں پر نام متعدد نہیں صرف ایک ہی راشد الخیری کا آئے گا۔

موت کے کیسے کیسے نقشے اس عبرت نگار قلم نے زندگی میں دکھا دیئے؟ نہیں یہ وصف بھی غلط بیان ہوا۔ کہنا چاہیے کہ موت میں کس کس طرح زندگی پیدا کر دکھائی، اور جو موضوع تمام تر خشک و بے مزا سمجھا جاتا تھا اس میں کس درجہ لذّت، درد و چاشنئ غم کوٹ کوٹ کر بھر دی! روتے روتے سسکیاں بندھ جائیں اور پھر کتاب چھوڑنے کو جی چاہے اور نہ ورق اُلٹے اُلٹا جائے اسے اگر بندہ کا اعجاز اور مولیٰ کا افضال نہیں تو اور کیا کہیے؟

لکھنے والے نے ہزارہا صفحہ لکھ ڈالے اور کوئی درد و عبرت کے منظروں کا استقصاء کرنے بیٹھے تو صدہا صفحات بھی اس کے لیے کافی نہ ہوں گے۔ اور یہ یہاں مقصود نہیں۔ اس وقت مقصود تو مصوّر غم کی مصوری پر ایک سرسری تبصرہ اور اس کا اجمالی تعارف تھا۔ موتیں آپ نے بہت سی دیکھی ہوں گی صحبت برخاست ہونے سے قبل، آیئے ایک موت مصورِ غم کی معیت و رہبری میں بھی دیکھتے چلیں۔

نسیمہ ایک نیک دل بیوی ہیں۔ خالق کی فرماں بردار اور مخلوق کی خدمت گزار، صبح زندگی، شام زندگی، شبِ زندگی سب انھیں خاتون کی زندگی کی "صبح" و "شام" و "شب" کی ایک مسلسل داستان ہیں۔ ۵۵ برس کے سن میں ان کا وقت آخر ہو رہا ہے دیکھیے مسلمان کی موت بھی کیسی حیات بخش ہوتی ہے البتہ تجہیز و تکفین میں ذرا دیر لگے گی طبیعت اس انتظار میں ملول نہ ہو۔ مرنے والی نیک دل بیوی کو موت کا یقین ہو چکا ہے سب عزیزوں، قریبوں، کو پاس بُلا کر بٹھاتی ہے اور زبان کہنا چاہیے کہ آخری بار یوں گویا ہوئی ہے:۔

آج یہ ہاتھ پاؤں جن پر گھمنڈ تھا بیکار ہیں۔ اور عمر جس پر ناز تھا ختم ہو گئی ہے مگر اس کی یادگار آج ندامت و پشیمانی میرے پاس ہیں اور اب رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں اماں جان کی فضیحتیاں میں نے سُنیں ابّا جان کے حکم بارہا میں نے ٹالے بہن بھائیوں پر شفقت مجھ سے نہ ہوئی بڑوں کی طاعت میں نے نہ کی، آہ عمر گزشتہ! اس کٹھن رستہ میں جہاں ایک ایک قدم اُٹھنا مصیبت ہے تو نے عتاب کا ایسا انبار سر پر رکھ دیا کہ کسی طرح ہلکا نہیں ہوتا ماما ئیں مجھ سے ناخوش، لونڈیاں مجھ سے نالاں، نوکر مجھ سے پریشان۔ الٰہ العالمین! الاماں الاماں! اس وقت نسیمہ کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور بیویوں میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جو نہ رو رہی ہو کچھ ضبط کیا اور پھر سلسلہ شروع کیا۔ کل کی بات ہے کہ پھوپھی جان نے مجھ کو پالکی میں سوار کرایا اس وقت بیلیوں عورتیں سفید بالوں والی نے رخصت کرنے میں شریک تھیں۔ آج وہ سب قبروں میں جا سوئیں اور میرا سارا سر سفید ہو گیا یہ انقلاب قدم قدم

پر مجھے موت کا سبق دے رہے تھے لیکن غفلت کی انتہا، بے خبری کی حد کہ کبھی بھولے سے بھی موت کا خیال نہ آیا پندرہ برس کی بیاہی آئی چالیس برس اس محلہ میں رہ چلی، مگر ایک کو بھی پوری طرح خوش نہ کر سکی، اماں جان اللہ غریق رحمت کرے کون کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے خوش گئیں یا رنجیدہ، رابعہ، ہاجرہ دونوں نندیں میرے سپرد تھیں مگر ان کا حق خدمت کچھ بھی ادا نہ ہوا بے موقعہ گھرکا، بلا وجہ ڈانٹا، بے سبب خفا ہوئی۔ خواہ مخواہ بگڑی اب دیکھتی ہوں تو اس غصہ میں اصلاح کا خیال کم اور نفسانیت زیادہ تھی مگر مجھے ان بچیوں کی سعادت مندی سے اُمید ہے کہ یہ مردہ بھاوج پر عذاب نہ ہونے دیں گی اور عند اللہ میری غلطیوں کو معاف کر دیں گی"

نندیں یہ سُنتے ہی چیخیں مار کر بھاوج کے قدموں پر گر پڑیں اور کہا خدارا بھابھی جان! یہ نہ فرمائیے آپ نے ہماری ماں کو ہمارے دل سے بُھلادیا آپ نے ہم کو انسان بنایا، اور ہم آپ ہی کی بدولت دنیا میں رہنے کے قابل ہوئے دونوں نندوں کو نسیمہ نے گلے لگالیا - اور پھر کہنا شروع کیا۔ کنبہ کی ایک دو نہیں بیسیوں اللہ کی بندیاں میرے رحم کی مستحق تھی، محلہ کی بہت سی مخلوق بھوکی سوئی اور میں نے پیٹ بھرے۔ مسافر میرے در سے خالی گئے یتیم میری چوکھٹ سے ناکام پھرے۔ رانڈوں نے اس بند ہونے والی زبان سے جھڑکیاں سُنیں بڑی بوڑھیوں نے میرے طعنے سہے، نوکروں نے میرے غصے اٹھائے ہائے اللہ گناہوں کی گٹھری اتنی بڑی!! رحم آقا رحم!! ایک متفقہ آواز نکلی،

"اے بیگم، تیرے روئیں روئیں میں خدا جان دے ہم کو بے کس نہ چھوڑ یتیموں کا باپ تو رانڈوں کی وارث تو، اپاہجوں کا سہارا تو، مفلسوں کا گزارہ تو اے بیگم تو"

نسیمہ اس کے بعد کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر تکان زیادہ ہوئی بخار شدت سے چڑھا اور بولنے کی ہمت نہ رہی بیویوں نے اس کی بلائیں لیں بچوں نے اس کو دعائیں دیں شام قریب تھی بیویاں روتی دھوتی اپنے گھروں کو سوار ہوئیں دوسرے دن رات کے ۹ بجے بخار کچھ ہلکا ہوا تو نسیمہ نے قسیم کو اپنے پاس بُلایا اور کہا:-

خوش نصیب ہوں میں بیوی کہ تمھارے ہاتھوں پیوند زمین ہوتی ہوں، جس چہرہ سے گھونگھٹ اٹھایا تھا اس کو اپنے ہاتھ سے خاک میں چھپا دینا سیاہ بال تمھارے گھر میں سفید ہوئے، اور جوانی تمھارے سامنے بڑھاپے سے بدل گئی، تم آقا تھے میں کنیز تھی تمہارا رتبہ زیادہ اور حق بڑا تھا۔ مگر ہزاروں مرتبہ بگڑی ہوں اور بُرا بھلا کہا ہے آج اپنے بچوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں اپنی عنایت سے اس کو معاف کر دینا تاکہ خدا کے حضور میں تمھاری گنہگار نہ ہوں، قسیم بیوی کی زبان سے اتنا سُنتے ہی بیتاب ہوا۔ روتا ہوا اُٹھا اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے

اور کہا تم جیسی بیوی دنیا چراغ لے کر ڈھونڈھے تو نہ ملے گی تم نے وہ کیا کہ میرا دل تم کو دعائیں دے رہا ہے تم نے مجھکو پچاس روپیہ کی نوکری سے صدر الصدور بنایا۔ اور جس گھر میں کتے لوٹتے تھے تمھارے دم سے آج گلزار بنا ہوا ہے۔ میرا منہ نہیں کہ تمھارا شکریہ ادا کرسکوں ہاں میں تم سے نادم ہوں۔ اور اس خیال سے جو شروع میں میں نے کیا میری روح کانپ رہی ہے۔ نسیمہ بیگم! اپنے بچوں کا صدقہ! مرے ہوئے وسیم کا صدقہ اب مجھے معاف کردو۔" نسیمہ نے شوہر کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا، اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا خدا مجھے برحق تم کو معاف کرے میں پہلے ہی معاف کرچکی ہوں۔ اب پھر کہتی ہوں میں نے معاف کیا۔ اب میں تم سے اس قدر اور کہتی ہوں اگر میرے بعد ضرورت تم کو دوسرے نکاح پر مجبور کرے تو بیشک کرلینا میں منع نہیں کرتی، لیکن دو معصوم بچیاں تمھاری محتاج چھوڑتی ہوں لڑکے سیانے ہیں اور کماتے ہیں مگر یہ بھولی چڑیاں سوتیلی ماں کے قبضہ میں نہ جائیں تسنیم ان کی پرورش کرلے گی ماں کا پکھوا چھوٹنے کے بعد تسنیم سے بہتر رفیق ان کا کون ہوگا وہ دشمنی میں ان کی دوست اور بدخواہی میں ان کی بہترین خیر خواہ ہوگی۔ تمھاری تنخواہ میں سے جو کچھ بچ کر آج تک جمع ہوا ہے وہ یہ دس ہزار کے نوٹ ہیں جوان دونوں کی شادی کے واسطے محفوظ تھے اور اب تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ بچے ہوشیار ہیں مگر میرے بعد دیوار سے سر پھوڑیں گے ان کو کلیجہ سے لگا کر رکھنا اگر میدان حشر میں ملاقات ہوتی ہے تو تم سے اپنے بچوں کے دکھ کا مواخذہ ضرور کروں گی۔" (شام زندگی ص ۱۳۹-۱۴۳)

نسیمہ کے جسم و روح پر جو کچھ گزری اس کا اصل حال تو اللہ جانے یا اس کے فرشتے باقی شاعر کی طرح افسانہ نگار کو بھی کبھی کبھی الہام ہوتا رہتا ہے۔ اور عجب نہیں کہ ایک مومنہ کی وفات کی منظر نگاری کے وقت مومن راشد پر بھی الہامی لمحوں کی بارش ہو رہی ہو۔

"نسیمہ پر جس وقت مرض الموت کی بے ہوشی طاری ہوئی اور دماغ نے یادِ وسیم کے سوا تمام تعلقات کو خیرباد کہا اور خیال کی تمام قوت اسی لال کی طرف ڈھل گئی جس کی تصویر کھاتے پیتے سوتے جاگتے آٹھوں پہر دن اور رات آنکھوں کے سامنے رہتی تھی تو کانوں نے شوہر کے آخری، الفاظ سنے اور زبان نے یہ جواب دے کر کہ "میرے لال کی روح میرے استقبال کو آئی" بیس اکیس سال کے واسطے کو جو بالآخر فنا ہونے والا تھا ختم کردیا اب ان بیجوں کے پھل جو دنیا میں بوئے ان معاملات کے نتیجے جو تعلقات میں برتے ان کاموں کے انجام جو زندگی میں کیے آنکھ کے روبرو تھے روح جس کی بدولت جسد خاکی اچھل کود رہا تھا رگ رگ سے وداع ہو رہی تھی بنڈلی بنڈلی سے لپٹ رہی تھی ہاتھ سے ہاتھ چمٹ رہا تھا اور موت جس کو زندگی بھول کر یاد نہیں کرتی اس مہین کپڑے کی طرح جو

خار دار جھاڑی پر ڈال کر گھسیٹا جائے نازک جسم سے جان نکال رہی تھی۔ کتنا نازک وقت تھا۔ کہ بچے جو ماں کے نام کے عاشق تھے معذور کھڑے اس کا دم واپسیں اور شوہر جو بیوی کی صورت کا پروانہ تھا مجبور بیٹھا اس کی مفارقت ابدی دیکھ رہا تھا۔ گھر کا کونہ کونہ اور زندگی کا ذرہ ذرہ باآواز صدا دے رہا تھا کہ کنوار پنے کی آزمائش اور سسرال کے امتحان کا نتیجہ آج برآمد ہوتا ہے، زندگی فنا ہوتے ہی کانٹوں سے پٹا میدان یا پھولوں بھری سیجیں پیش کر دے گی اور یہ راحت ابدی یا مستقل عذاب دوسروں کے واسطے عبرت یا سبق بن کر چند لمحہ میں ختم ہوگا۔ پیشانی پر بل آئے، اذیت کی آوازیں نکلیں مگر یہ عارضی تکلیف قطع تعلق کا اثر تھا روح نکلتے ہی دیکھتی کیا ہے کہ دونوں کلیجے کے ٹکڑے نسیم اور وسیم جن کے مکھڑوں کو آنکھیں ترس گئی تھیں اور جو سفید کفن میں لپٹے لپٹائے ماں کی آنکھوں سے رخصت ہوئے جھلا جھلی کپڑے پہنے ہشاش بشاش گردن جھکائے کھڑے ہیں آنکھیں جن صورتوں کو تلاش کرتی تھیں دل جن پیاروں کو ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا تھا جو آنکھوں کے سامنے جاندار سے بے جان ہو کر گہری گوروں میں سو چکے تھے جن کی ہڈیاں تک گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ جن کی قبریں تک دھنسنی شروع ہو گئی تھیں ان کا اس وقت نظر آنا موت کی پہلی کامیابی تھی ٹھٹکی اور گُم صُم کھڑی ہو گئی کہ ملک الموت نے کہا۔

خالق کے احکام کو سچے دل سے بجا لانے والی مخلوق! تیرے لال موجود ہیں۔ بیتاب ہو کر آگے بڑھی نسیم دوڑ کر ماں کے قدموں میں لپٹا اور وسیم نے اپنی گردن ماں کے سینے سے لگا دی دونوں کو کلیجہ سے لگالیا اور سجدہ میں گر پڑی۔ اب فرشتۂ موت آسمان کی طرف اُڑا نسیمہ قدم قدم پر خدا کی رضامندی کے آثار پا رہی تھی۔ وہی در و دیوار جو قبل از رحلت اس کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے پھولوں نے اس کی زندگی سراہی پتوں نے اس کے اعمالنامے سنائے، بلبل نے اس کے کام پر وجد کیے اور طوطی نے اس کے نام کا کلمہ پڑھا چشم زدن میں یہ منظر ختم ہوا اور اب وہ وقت آیا کہ نسیمہ بیگم کی پاک روح خالق الموجودات کے حضور میں حاضر ہو لطیف رُوح غسل کی محتاج نہ تھی ایک حور سامنے آئی اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رضائے الٰہی کا ایک بے بہا جوہر اس کے ماتھے پر لگا اُلٹے قدموں پلٹ گئی اب فرشتۂ موت جگمگاتی رُوح کو لیے ہوئے دوسرے مقام پر پہونچا یہاں حوروں کی صفیں قطار در قطار استقبال کو موجود تھیں سب نے بالاتفاق خوش آمدید کا نعرہ لگایا۔ ایک ممتاز حور سامنے آئی اور سر سے پاؤں تک ہیرے جواہرات کے زیور پہنانے شروع کیے وہ پہناتے وقت باآواز بلند کہتی تھی کہ یہ جڑاؤ گلوبند شوہر کی رضامندی کا صلہ ہے اور ہیرے کے کنگن اس لیے ان ہاتھوں میں پہنائے جاتے ہیں کہ یہ اپنے جسم سے زیادہ مخلوق کے کام آئے۔ والدین کی فرمانبرداری اور بزرگوں کی تعظیم کا انعام یہ موتیوں کی مالا ہے۔" (شب زندگی حصّہ اول ص ۳۲-۳۴)

نسیمہ کے پیکرِ خیالی پر جو کچھ نوازشیں ہوئیں انھیں تو مصوّرِ غم کی نگاہِ کشفی نے دیکھ لیا لیکن خود اس مبصرِ الم کی جو کچھ سرفرازیاں اس دربار میں ہو رہی ہوں گی جہاں نہ کسی کی مخالفانہ تنقید کا اثر پہنچ سکتا ہے اور نہ کسی کی معاندانہ تنقیص کا ان کا احاطہ کس بندۂ خاکی کا تصوّر، کس بشر کا تخیل کر سکتا ہے؟

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ○ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ○

جو شخص بھی دنیا میں بن دیکھے خدائے رحمٰن کی خشیت رکھتا ہو گا اور قلبِ منیب (رجوع ہونے والے دل کے ساتھ حاضر ہو گا۔ اس کو حکم ہو گا کہ داخل ہو جاؤ اس جنت میں امن و راحت کے ساتھ اور یہ یومِ عیش لازوال ہے جس کے ختم ہو جانے کا اندیشہ نہیں ایسوں کے لیے سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس تو ان چیزوں سے بھی بڑھ کر نعمتیں ہیں۔

دنیا والے تو اس کو منتہائے فکر سمجھتے ہیں کہ جو مانگو وہ مل جائے یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ یہاں اس منتہائے فکر سے بھی آگے کچھ مل کر رہے گا۔ جہاں تک ذہن رسا کی بھی رسائی نہیں ہوتی وہ سب کچھ بھی انھیں مرحمت کر دے گا!

اللہ اللہ! یہ کن کو؟ ہاں ان کو، جو قلبِ منیب رکھتے ہوں جن کے دل میں خشیتِ الٰہی ہو اور پھر اس بندہ کے انعام و اکرام کا پتہ نشان کون بتائے۔ اس کا اندازہ و حساب کون لگائے جس کی خشیت لازمی سے بڑھ کر متعدی ہو یعنی صرف اپنے ہی قلب میں نہیں رہی، بلکہ اس لئے وہ دوسروں کے قلب میں بھی پیدا کر دی اور جس کے قلم نے "موت" میں "زندگی" پیدا کر دی!

---

(۶) ایک بزمِ مشاعرہ کی غیر شاعرانہ صدارت[1]

بزمِ مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اس کا صدر ایک دیہاتی! اور دیہاتی بھی کیسا زبان و ادب کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر و سخن کے باب میں محض غبی! داد بانیٔ مشاعرہ کی خوش طبعی کی دیجیے۔ سبحان اللہ! کیا خوب نظرِ انتخاب پڑی ہے! ان کی قلمی ظرافت سب پر روشن و آشکار، لیکن حقیقت میں آج کی عملی ظرافت ان کا شاہکار! دنیا کی نظر میں وہ محض ایک ظریف لیکن میرے حق میں تو ستم ظریف! یہ صدارت کیا ہے قحط الرجال بلکہ نیرنگیٔ دہر کا ایک کھلا ہوا نشان اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانہ کا گمان! بلکہ یوں کہیے کہ فسانۂ عجائب کا کوئی ظریفانہ ایڈیشن اگر صاحبِ "کائنات"[2] کی سرپرستی میں طبع ہو تو اس کے لیے ایک موزوں عنوان!

صدر اور صدارت کا نام آتے ہی ذہن منتقل ہوتا ہے "خطبۂ صدارت" کی جانب بلحاظ ضخامت طویل و عریض، بلحاظ ادب و انشا فصیح و بلیغ، و بلحاظ معانی و مطالب عمیق اور بلحاظ تحقیق فن دقیق۔ سامعین با تمکین مطمئن رہیں کہ اس قسم کی بحرِ طویل میں کوئی فکرِ سخن ان کی خدمت میں ہرگز نہ پیش کی جائے گی اور نہ دو چار منٹ سے زائد انھیں تکلیف دی جائے گی۔ نہ شاعری کی کیفیت و ماہیت پر ہومر اور کالی داس کے حوالوں سے کوئی فاضلانہ

---

[1] یہ مشاعرہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو شب کا دفتر حق و صدق (لکھنؤ) میں ملک کے مشہور مزاحیہ نگار شوکت تھانوی کی دعوت و تحریک پر ہوا تھا۔ [2] ایک ماہنامہ جو شوکت تھانوی کی ادارت میں اس وقت لکھنؤ سے نکل رہا تھا۔

تبصرہ اور بنا اُردو شاعروں کا ولی دکھنی کے زمانہ سے شروع کر کے کوئی ناقدانہ تذکرہ! یہ مختصر سی سامعہ خراشی جو کی جارہی ہے وہ بھی محض اس ارشاد کی تعمیل میں کہ خطبۂ صدارت کے نام سے کچھ نہ کچھ ہو ضرور! گویا یہ بھی فرض ہے کہ بلبلوں کی نوا سنجیوں سے قبل کچھ دیر زاغ آشفتہ نوا سے بھی لطف اُٹھالیا جائے۔

یارانِ بزم! محفلِ مشاعرہ اور تقویم مسیحی کی بیسویں صدی! اور اردو شاعری کی پُرانی دھرانی بزم، اس ترقی و تجدد کے زمانہ میں! یہ وقت ہے سنیما کا، ٹاکیز کا، آپیرا ہاؤس کا، ریڈیو کا، میوزک ہال کا، کارنیوال کا، یا آپ کے فن عروض کا، قصائد حمد و نعت کا، منقبت کا، مناجات کا؟ آپ کے مشاعرہ غریب کی پرسش آج ہے کس سرکار میں؟ آپ کے شاعروں کے لیے عزّت کی کرسی اس وقت ہے کس دربار میں؟ مشرق کے خلاف جو بغاوت خود مشرق سے کرائی گئی ہے اور آپ کے گھر میں جو آگ گھر والوں کے ہاتھ سے بھڑکائی گئی، وہ ناتمام اور ادھوری رہی جاتی تھی اگر اس کا رُخ مشرقی شاعر کے بھی خلاف نہ ہوتا۔ آپ باغی بنائے گئے اپنے آبا و اجداد سے، اپنی تہذیب و معاشرت سے، اپنی وضع و لباس سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنے دین و اخلاق سے، اور اگر سب سے بڑھ کر نہیں تو اور کسی شعبۂ زندگی سے گھٹ کر بھی نہیں اپنے شعر و ادب سے! آپ کی شاعری فرنگیت کے پیمانے سے ناپنے لگی۔ اسی میزان میں تلنے لگی اور فیصلہ یہ صادر ہوگیا کہ اردو شاعری میں رکھا کیا ہے؟ بجز ہزل اور تخریب اخلاق کے اس میں ہے کیا؟

گویا بائرن انگریزی کا نہیں اُردو کا شاعر ہوا ہے اور شکسپیر نے "لکریشیا" فرنگستان میں نہیں دہلی یا لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھی ہے، مکالے اور مکالے کے بعد آنے والوں نے ہمارے ادب سے متعلق جو گہر افشانی کی ہے کیا ہم اسے بھول گئے ہیں؟ اور آہ کہ ان بیگانوں کے ساتھ اپنوں کی بھی زبانیں جس طرح اپنی زبان، اپنے ادب، اپنی شاعری پر کھلی ہیں، اُسے ہم بھلانا چاہیں بھی تو کیونکر بھلا سکتے ہیں؟

آج جبکہ نہ دلّی کی سرکار ہے، نہ اودھ کا دربار۔ اور شاعروں کی قدر اس کی آدھی و چوتھائی بھی نہیں جتنی ناٹک کے گویوں اور سازندوں اور سنیما کے بھانڈوں اور نقالوں کی ہے؟ آفریں ہے آپ کی ہمّت پر جواب بھی آپ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کی یاد کو سینہ سے لگائے، کلیجہ سے چمٹائے ہوئے ہیں اور بجلی کے قمقموں کے دَور میں اپنی شمع کافوری جلائے ہوئے ہیں۔ زندگی کے حقائق و معارف کی ترجمانی، ہر ہر دَور میں فارسی اور اردو کے شاعروں اور استادوں سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ شاعروں سے مراد جماعت کے حقیقی باکمال افراد ہیں۔ ورنہ ننگ جماعت افراد کس طبقہ میں نہیں ہوتے؟ کون ایسا چمن ہے جس میں گل بغیر خار کے ہوں؟ آپ کے فخر کے لیے آپ کے بلند پایہ اسلاف معنوی کے کارنامے کافی ہیں۔ بلکہ کافی سے بڑھ کر وافی۔ کوشش کیجیے کہ ہر قدم انھیں کے نقش قدم پر پڑے۔

بلکہ حقیقت سنجی میں، حقیقت بینی میں، حقیقت گوئی میں ان سے کچھ آگے ہی بڑھ کر رہے، اور اوراق لیل و نہار پر اپنی یہ تاریخ ثبت کرا جایئے۔ کہ آپ کے ہاں فیضی اور عرفی اس وقت بھی برابر پیدا ہوتے رہے، جب دربارِ اکبری مدّت ہوئی برخاست ہو چکا تھا!

---

(۷) ایک مختصر سا پیام[1]

فیض آباد کے "اُردو ڈے"[2] منانے والوں کے نام

جو شہر "آباد" ہی "فیض" سے ہو زبان اس کے فیض سے کیسے محروم رہ سکتی ہے؟ اُردو کا تعلق فیض آباد سے آج کا نہیں، نسلوں اور قرنوں کا ہے۔ فخرِ لکھنؤ میر انیس اسی خاک کے تھے، نازش مثنوی میر حسن اسی سرزمین سے اُٹھے چکبست چمکے لکھنؤ جا کر، لیکن پیدا تو یہیں ہوئے تھے۔ پھر آپ کا شہر دارالحکومت بھی تو ملک اودھ کا رہ چکا ہے اور یہ معلوم ہے کہ زبان کی سرپرستی حصہ تھا ہمارے بادشاہوں کا اور اُردو زبان کی تراش خراش نوک پلک حصہ رہ چکی ہے شاہی بیگمات کی ـــــ حق تھا کہ آپ کا شہر اُردو کی نشر و اشاعت کا علم بلند کرے، اور اُردو کی خدمت میں کسی دوسرے شہر سے پیچھے نہ رہے!

لیکن آپ کا فرض اس پر ختم نہیں ہو جاتا ہے کہ سال میں ایک بار جلسہ کی چہل پہل دکھادی، باہر سے شاعروں ادیبوں کو بلالیا، جلوس گشت کرادیا، کچھ نعرے لگادیئے، کچھ تقریریں سُن لیں۔ یہ تو ادائے فرض کی صرف تمہید ہوئی کتاب کا محض دیباچہ ہوا عمارت، کی محض نیو ڈالی گئی۔ اصل شئے ہے صالح لٹریچر یا "ادب شریف" کی تیاری، فراہمی،

---

[1] جنوری یا فروری ۱۹۶۳ء [2] یوم اُردو کے بجائے اس وقت تک "اُردو ڈے" چلا ہوا تھا۔ یہ اُردو ڈے فیض آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے طلبہ منا رہے تھے۔

ترویج واشاعت، ادب شریف سے مراد ہیں نثر اور شعر کی وہ ادبی خدمات جنھیں شریف مرد اور شریف بیویاں، شریف بچّے اور شریف بچیاں ہر ملت اور ہر قوم کی پڑھ سکیں، پڑھا سکیں، سُن سکیں، سُنا سکیں، شریف سے مراد وہ نہیں جن کے باپ دادا شریف تھے، مراد وہ ہستیاں ہیں جن کی ذات و شخصیت پر خود شرافت کو ناز ہو، بلحاظ ان کے اقوال، اعمال، اخلاق، اطوار، رفتار وگفتار کے۔

بدمذاقی کو مٹایئے۔ صفائی کو، ستھرائی کو، پاکیزگی کو پھیلایئے۔ گندگی کے سیلاب میں بہنے سے، اپنے کو اور دوسروں کو بچایئے۔ اُردو کا کتب خانہ قائم کیجیے۔ اچھے اچھے خوش مذاق اہلِ قلم کی کتابیں دیکھیے۔ شرافت کی رُوح ان کتابوں کے مطالعہ سے بیدار ہو۔ آپ کی جوہر شناسی کی ہر طرف پکار ہو۔

اُردو کو مسلمان اپنی زبان کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ان کی تو یقیناً ہے، لیکن ان کی ہی یقیناً نہیں، ایک اعتبار سے اگر اُن کی ہے تو دوسرے اعتبار سے ہندوؤں کی ہے زبان کے اسم اگر بہت سے عرب و ایران سے چل کر آئے ہیں تو اس کے فعل اور حروف ربط کہنا چاہیے کہ سب کے سب اسی دیس کے ہیں اور زبان کی ترکیب میں اسماء سے بھی کہیں بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں یہی افعال وحروف ربط اور پھر اسم بھی سب کے سب باہر کے کہاں؟ خاصی بڑی تعداد تو ان کی بھی اسی دیس کی ہے۔

بس اس حقیقت کو خود بھی سمجھ لیجیے اور دوسروں کو بھی سمجھا دیجیے، ملک کی سب سے بڑی اُردو انجمن کے صدر آج بھی ایک ہندو ہی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو۔ خالص اُردو، پندرہ روزہ پرچہ ہماری زبان کے ایڈیٹر بھی ایک ہندو ہی ہیں۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ یوپی کے رسالوں میں اردو کا سب سے پرانا اور سنجیدہ خادم ایک ہندو ہی کے ہاتھ میں رہا اور اب بھی ہے۔ یعنی زمانہ (کانپور) اردو شاعروں کا سب سے بڑا ضخیم ومفصل تذکرہ ایک ہندو ہی کے قلم کا رہینِ منت ہے، لالہ سری رام، ایم۔ اے دہلوی کا۔ چندر بھان برہمن، رتن سنگھ زخمی، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، نوبت رائے نظر، جوالا پرشاد برق، دوارکا پرشاد افق، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، دیا نرائن نگم، پریم چند، جذب حیدرآبادی، برج نرائن چکبست، بشیشور ناتھ منوّر، گوپی ناتھ امن، امرناتھ ساحر، آنند نرائن ملا، کرشن سہائے دہشتی وغیرہ وغیرہ —— نام کوئی کہاں تک گنائے چلا جائے؟ ان کی خدمات اُردو کو نظر انداز کرنا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے، اور یہ نام تو صرف نمونہ کے طور پر پیش کردیئے گئے پوری فہرست سنانے پر کوئی آئے تو آپ یقیناً پکار اُٹھیں کہ یہ "اُردو ڈے" ہے یا "ہندو ڈے"!

آج اہل سیاست اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہندو و مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدۂ اتحاد ہو جائے

لیکن یہ اُردو زبان تو خود ایک بنا بنایا مشترک پلیٹ فارم چلا آرہا ہے، نسلوں سے، قرنوں سے، صدیوں سے! اس زبان کا نفس وجود ہی ایک مستقل معاہدہ ہے ہندو مسلم اتحاد کا، ہر جہتی اشتراک کا کاغذی معاہدوں سے کہیں زیادہ پائدار اور سیاسی دستاویزوں سے کہیں زیادہ جاندار! جب ملک بھر کی زبان ایک، تو سبھی کچھ ایک، جب سارا ملک "ہم زبان" "یک زبان" تو اب اور رہ ہی کیا گیا؟ زبان ٹھہری دل کی ترجمان، زبان ایک تو دل ایک۔

خوب ہو جو اس "دلی" اور "زبانی" معاہدہ کی یاد ہر سال منائی جائے، بھولے ہوؤں کو حقیقت کی یاد دلائی جائے۔ اُردو کی محبت دلوں میں رچائی جائے۔ اور جو آگ ادھ بجھی سی ہو رہی ہے، وہ پھر سے بھڑکائی جائے۔

اُردو کی خدمت بھی کیسی؟ ٹھوس اور قیمتی، بڑی اور اونچی! بس یہی ایک، قوم کی ہے، ملت کی ہے؛ اور خدمت بھی کیسی؟ ٹھوس اور قیمتی، بڑی اور اونچی! بس یہی ایک پیام ہے جو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ایک گمنام گوشہ نشیں۔ آپ تک پہونچا رہا ہے، آپ کا ہم "ضلع" نہ سہی آپ کا "ہم قسمت"[۱] تو بہر حال ہے۔

---

[۱] قصبہ دریاباد فیض آباد ہی کی کمشنری "(قسمت)" میں ہے۔

(۸) مرزا ثاقبؔ[1]

بات ۱۹۱۴ء کی ہے جب اپنی طالب علمی ہی کہنا چاہیے کہ پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کہ لکھنؤ کے خوش ذوق رئیس چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقہ دار گڑھی بھلول نے رقعہ لکھ کر مجھ سے دریافت کیا کہ ایک ادبی حلقہ میں ذیل کے دو ہم مضمون شعروں سے متعلق بڑی بحث چھڑی ہوئی ہے محاکمہ آپ کیجیے شعر دونوں یہ ہیں۔

(۱) شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو
سر یہ ٹکرایا کہ در کر دیا، دیواروں کو !

(۲) شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

کم عمری میں بادی النظر میں اور پہلی دفعہ پڑھنے میں شعر پہلا ہی اچھا معلوم ہوا۔ لیکن ذرا سوچنے سمجھنے اور ایک نکتہ سنج دوست سے مشورہ کرنے کے بعد ترجیحی رائے دوسرے شعر کے حق میں قائم ہوئی اور یہی میں نے چودھری صاحب کو جواب میں لکھ بھیجا۔ پہلے شعر میں لفظوں ہی کا زور ہے ورنہ اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے قید خانہ کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ کر محض در کی طرح کھلی رہ جائیں حدِ فطرت سے بڑھا ہوا ہے، اور پھر جب زنداں کی دیواریں ہی باقی نہ رہیں تو خود زنداں کا وجود

---

[1] روزنامہ تنویر مرحوم (لکھنؤ) ۵ ر دسمبر ۱۹۴۶ء۔

کب باقی رہ گیا۔ قیدی آزاد ہو کر نکل ہی نہ بھاگیں گے۔

دوسرا شعر بے عیب ہے بلکہ "کچھ کچھ" نے انتہائی حسرت وبیکسی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ تاریکی اس بلا کی ہے کہ قیدی کو یہ خفیف سی روشنی بھی بہت غنیمت معلوم ہو رہی ہے۔ پھر اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے دیوار میں کچھ ہلکا سا رخنہ پیدا ہو جائے حدود فطرت سے اس درجہ بعید بھی نہیں۔

غرض یہی رائے لکھ کر بھیج دی اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ پہلا شعر کس کا ہے اور دوسرا کس کا چودھری صاحب تو خیر خوش ہوتے ہی دو ایک روز بعد دیکھتا کیا ہوں کہ جناب مرزا ثاقب صاحب غریب خانہ پر تشریف لا رہے ہیں (میں اس وقت تک گویا لکھنؤ ہی میں تھا) آئیں؟ یہ مرزا صاحب کہاں؟ ان کی تو نازک مزاجی (نازک خیالی ہی کی طرح) مشہور ہے، یہ تو بڑے بڑوں کے ہاں نہیں آتے جاتے مجھ غریب طالب علم کے ہاں (کالج میں نے اسی زمانہ میں چھوڑا تھا) کہاں قدم رنجہ فرمانے لگے! میں تو دوسرے راستہ گلی میں بس ان کی صورت دیکھ لیتا تھا کبھی بڑھ کر ملنے کی بھی ہمت نہیں پڑی تھی۔ چہ جائیکہ انھیں اپنے گھر پر دیکھتا!

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

خیر بیٹھے تو فرمایا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں، چودھری صاحب نے آپ کا وہ خط مجھے دکھایا، آپ نے نقادی اور انصاف کا حق ادا کر دیا ورنہ وہ شعر تو میر ...... صاحب مرحوم ومغفور کا ہے ان کے سامنے بھلا مجھے کون پوچھتا!

میں نے یہ سن اپنے دل میں کہا کہ چلو اچھا ہوا اپنے کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ کون شعر کس کا ہے ورنہ بہت ممکن تھا کہ میر ----- صاحب کا نام سن کر مجھ پر بھی رعب پڑ جاتا اور انھیں کے شعر کو ترجیح دینے لگتا ــــ

یہ دل تو نے کہا باقی زبان یہی الفاظ ادا کرتی رہی کہ محض آپ کی عزت افزائی ہے میں کس لائق ہوں مجھے تو لکھتے ہوئے شرم آرہی تھی کہ آپ حضرات اہل زبان کے معاملہ میں نہ جانے کیا لکھوں۔

بس اُس روز سے ثاقب صاحب مہربان ہو گئے لکھنؤ کے شاعروں میں عزیز صاحب تو پہلے ہی سے مخلصانہ کرم فرماتے اور وہ تھے بھی طبعاً متواضع ومنکسر مزاج۔ محشر صاحب وآبر صاحب سے حضرت اکبر الہ آبادی کے طفیل میں سرسری نیاز حاصل ہو گیا تھا۔ صفی صاحب، ظریف صاحب، اور سب سے بڑھ کر مرزا رسوا صاحب بھی عنایت فرماؤں میں تھے یہ ثاقب صاحب کا مہربان ہو جانا ان سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔

اسی صحبت میں خوش ہو کر اپنا کلام بھی زبانی سنایا۔ غزل کا مطلع کیا ہے دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں

کے اندر حسن و عشق کی پوری داستانِ رنگین سمیٹ لی ہے ؎

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے   جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

اور پھر جو ایک شعر ظالم نے پڑھا۔ اس نے تڑپا ہی دیا ؎

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ   ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شعر بلا ترنم کے تحت اللفظ پڑھتے لیکن ہاتھ اور چہرے کے اشاروں سے مضمون کی تصویر بھی کھینچتے جاتے۔ دوسرا مصرعہ جب پڑھا ہے تو آنکھیں ذرا بند کر کے سر کو ایک طرف اس طرح جھکایا، اور ہاتھ کو اس کے نیچے اس طرح لائے کہ جیسے سچ مچ تکیہ پر سر رکھ کر سو ہی تو گئے ہیں! —— اس ہیچمدان نے شعر کی تکرار اس کثرت سے دوستوں کے سامنے کی اور اپنی تحریروں میں اتنی بار استعمال کیا کہ اب وہ شعر بے تکلف سب کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔ ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت اس میں موجود ہی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم و مغفور (یاد کر لیجیے کہ وہ الفاروق کے مصنّف تھے) شہر کے شیعہ اہل سخن و ارباب ادب سے تعلقات اچھے خاصے رکھتے تھے، بلکہ عزیز صاحب کا تعارف اس خاکسار سے انھیں نے کرایا تھا۔ ثاقب کے بھی ان سے مراسم تھے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ہنگامۂ مسجد کانپور پیش آیا۔ پولیس نے مجمع پر گولی چلائی اور بڑے بوڑھوں کے ساتھ کچھ لڑکے بھی ہلاک ہوئے۔ شبلیؒ نے متاثر ہو کر ایک ماتمی نظم کہی اس میں اس موقع پر کہ ان مقتول لڑکوں کے والدین رات کو ان کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں، اور ان کے قتل سے بے خبر ہیں ایک مصرعہ تھا۔

یہ لڑکے ہیں بہت جلد ان کو سو جانے کی عادت ہے

نظم ثاقب کو سنائی ثاقب نے داد دی مگر یہ کہا کہ یہ مصرعہ لکھنؤ کی زبان میں نہیں مولانا نے کہا بسم اللہ اصلاح ارشاد ہو، بولے یوں ہو جائے تو بہتر ہے ع

یہ بچہ ہیں سویرے ان کو سو رہنے کی عادت ہے

مولانا نے انصاف پسندی کے تقاضہ سے جو اہلِ کمال کا خاصہ ہے بے تکلف اس ترمیم کو قبول کر لیا —— ثاقب صاحب اصل باشندہ لکھنؤ کے نہیں اکبرآباد (آگرہ) کے تھے لیکن لکھنؤ کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے کسی لکھنوی سے نہ ہیٹے تھے نہ پیچھے ——

اس نیازمند سے حسن ظن آخر تک قائم رکھا کئی سال کا ذکر ہے کہ پہلے خط لکھ کر اور پھر لکھنؤ میں خود

مل کر زبانی فرمائش کی کہ "دیوان مرتب ہو گیا ہے اس پر مقدمہ تم ہی لکھ سکتے ہو لکھ دو" اب اتنی فرصت کہاں نصیب تھی بہت دب دب کر اور لچ لچ کر معذرت کرنی پڑی۔

افسوس ہے کہ یہ شمع سخن ۲۲ر نومبر ۱۹۴۶ء ۲۷ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ یوم جمعہ کو گل ہو کر مجلس ادب سونی کر گئی۔

---

(۹) پیام نوجوان علیگڈھ کے نام[1]

نوجوان علیگڈھ ایک بار پھر اُردو کی خدمت پر آمادہ ہوا ہے۔ نو عمری کا جوش، کام کا حوصلہ، کارگزاری کا ولولہ۔ خدا ہمت میں بلندی اور ارادہ میں استقامت نصیب کرے۔ علم و حکمت کا درس جاری، ادب و انشاد کی گرم بازاری، قلم شوخ نگاری پر آمادہ، زبانیں شگفتہ بیانی پر آمادہ ، یاران زندہ دل کی مجلس آراستہ، ایک گوشہ نشین، مردہ دل دہقانی کو حکم پہونچتا ہے کہ اپنے عزلت کدہ سے نکل کر اس بزم میں حاضری دے!

زبان حیران کہ کس موضوع پر کُھلے! تاہم اگر فرست عنقانہ ہوتی تو دل میں تھا کہ خود علیگڈھ ہی کی بھولی بسری کہانی چند کو ہنسلانے والی اور بہتوں کو رُلانے والی، اور یونیورسٹی اور کالج کی داستان پاستان، کسی کے دل میں جوش پیدا کرنے والی اور کسی کے تیور پر بل ڈالنے والی، دانش گاہ کے دیرینہ سال بزرگوں اور کمسن خوردوں، سکھانے والے استادوں اور سیکھنے والے شاگردوں سب کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور اُکھڑے اُکھڑے فقروں میں سنا دی جاتی۔ ممکن تھا کہ کہانی سنتے سنتے کوئی سو جاتا اور ممکن تھا کہ کسی کی نیند اُڑ جاتی! لیکن فرصت عنقا۔ مجبوراً محض معذرت نامہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ مختصراً صرف دو لفظ کہہ دیئے ہیں۔

سید احمد خاں (اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے) کی دینی و سیاسی تحریکات سے متعلق بڑا اختلاف

---

[1] زمانۂ تحریر، آخر ۱۹۲۵ء۔ انجمن اردوئے معلیٰ (مسلم یونیورسٹی) کے سہ ماہی رسالہ سہیل (مرحوم) کے پہلے نمبر میں۔

رہا ہے اور شاید آئندہ بھی رہے لیکن ان کی ایک خدمت ایسی ہے جس میں شاید کسی کو اختلاف کی گنجائش نہ ہو اور وہ ان کی خدمت ادب و زبان اُردو ہے۔

ان کی ادبی تحریک نے اُردو نثر و نظم دونوں میں اصلاح ہی نہیں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور آج ادبیات اُردو کا جو کچھ سرمایہ نظر آ رہا ہے ذرا مبالغہ نہیں کہ وہ بہت بڑی حد تک سید اور ان کے رفیقوں ہی کی کوششوں کا ممنون کرم ہے۔ سرسید کے مضامین و تصانیف نے کہنا چاہیے کہ رفتار اُردو کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ اور جو زبان پہلے تکلف، تصنع و آورد کی ایک چیستان تھی اسے سادہ سلیس، بے تکلف، روزمرہ میں ڈھال دیا۔ سرسید کے زمانہ کے قبل کی اُردو تصانیف کو پڑھا جائے اور پھر ان کے بعد کے آنے والوں محمد حسین آزاد، نذیر احمد حالی، شبلی، شرر کی تحریروں سے مقابلہ کیا جائے تو بیّن فرق ہر شخص کو نظر آ جائے گا اور اس کا اجر اگر سارے کا سارا نہیں تو کم از کم اس کا ایک بڑا حصہ یقیناً میکدۂ علیگڈھ کے اسی پیر مغاں کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ علیگڈھ کا سب سے بڑا کارنامہ اور سید احمد خاں کا سب سے بڑا ورثہ احقر کے نزدیک یہی ہے، مبارک ہیں وہ فرزندان علیگڈھ جنھیں اس ورثہ کو حاصل کر کے، اس میں اضافہ کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

لیکن یہ یاد رہے کہ علیگڈھ سب سے پہلے "مسلم" "کالج" اور اسلامی" دارالعلوم ہے۔ اور "مسلم" کا کام محض لفاظی و لفظ تراشی نہیں، مسلم کی زندگی کا مقصد اقلیم معنی کو سر کرنا ہے۔ ہم وہ ہیں جن کو تعلیم یہ ملی ہے

ع لفظ بگذاری سوئے معنی بروی

الفاظ قالب و پوست ہیں، یہ نہ ہو کہ ہم قالب و پوست کی جانب اس درجہ منہمک رہیں کہ مغز ہاتھ سے جاتا رہے، معنویت و حقیقت ہی ہمارا اصل مقصد حیات و مطلوب ہے۔ الفاظ اس مطلوب کے لیے محض لباس و پوشش کا حکم رکھتے ہیں۔ لباس کی خوشنمائی و دلآویزی بھی بجائے خود ضروری ہے۔ لیکن اسی حد تک کہ جسم زیر لباس کو اذیت نہ پہنچنے پائے۔

عجمی و فرنگی قافیہ پیمائیاں بہت کچھ وقت ضائع کر چکیں۔ ضرورت ہے کہ حجازی حقیقت سنجیوں کی جانب پھر رجوع کیا جائے۔ دنیا میں شاعر و ادیب اب تک بیشمار پیدا ہو چکے ہیں لیکن قومیں اور اُمتیں زندہ لفظ تراشیوں اور لفظ پرستیوں سے نہیں، معنویت کی روح سے رہتی ہیں اور ملّیت کو غذا ہزل سے نہیں ادب صالح اور شریف لٹریچر سے ملتی ہے سرسید کی دُور رس نظر اس نکتہ پر تھی، اور یہی زندگی کا راز آپ کے لیے بھی ہے

---

(۱۰) سیّد جالب مرحوم[1]

عمریں ختم ہوتے کیا دیر لگتی ہے! ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ جالب صاحب سے اوّل اوّل ملاقات ہوئی تھی۔ پھر تعلقات بڑھے تھے۔ مشورہ تھے، بحثیں تھیں، لڑائیاں تھیں۔ ہمدم اپنے بامِ عروج پر پہونچا تھا جالب کی شخصیّت کی اہمیت تھی۔ "میر صاحب" کا نام زبانوں پر اور جالب صاحب کے تذکرے بزم و انجمن میں تھے کہ یک بیک مشیّت کا رُخ پلٹا۔ جو زبان گویا تھی خاموش کردی گئی، جو شمع اُجالا پھیلا رہی تھی بجھادی گئی۔ جو افسانہ لکھا کرتا تھا خود افسانہ بن گیا۔ جو دوسروں کے نوحہ سنایا کرتا اور ماتم نامہ چھاپا کرتا تھا، غفلت کے بندو! آؤ آج خود اس کے جنازہ کو کاندھا دیں اور ہوسکے تو اس کے لاشے پر درد و حسرت کے دو ایک آنسو بہائیں! خلقت کس ذوق و شوق کے ساتھ داستان سننے میں محو تھی کہ لیجیے داستان گو صاحب خود ہی نیند کے خرّاٹے لینے لگے۔ رہے نام اللہ کا!

غالباً ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے کہ سید جالب دہلوی کا نام اوّل بار کان میں پڑا تھا، شاید پیسہ اخبار (لاہور) کے سلسلہ میں۔ اس کے دو تین برس کے بعد مکتوباتِ آزاد[2] پر انھیں سید جالب کے قلم کا دیباچہ نظر پڑا۔ اس

---

[1] روزنامہ حقیقت (لکھنؤ) ۱۳ جولائی ۱۹۳۰ء [2] یعنی شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم صاحب آبِ حیات'

کے بعد دن اور تاریخ تو یاد نہیں، مگر خیال ایسا پڑتا ہے کہ ۱۴ء کا موسم برسات تھا، جب دفتر ہمدرد کوچہ چیلان دہلی میں پہلی بار مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ ہمدرد اور کامریڈ دونوں اس وقت اپنے شباب پر تھے۔ میں اپنی ایک ذاتی ضرورت سے مولانا محمد علی سے ملنے دہلی گیا تھا۔ ایڈیٹوریل آفس کے ایک کمرہ میں سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری سے باتیں کر رہا تھا کہ وہیں جالب صاحب اور قاضی عبدالغفار کے علاوہ خدا معلوم اور کون کون تھے اور انھیں میں ایک یہ جالب بھی تھے۔ چند ہی روز کے بعد سرکار کی برق غضب محمد علی پر گری۔ ہمدرد بند اور مالک ہمدرد نظر بند ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی کا چارٹر سرکار کی من مانی شرائط پر مسلمانوں کے سر منڈھ دیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اس برات کے دولہا ہز ہائنس سر آغا خان تھے۔ ۱۹۱۵ء میں یہ سہرا راجہ صاحب محمود آباد کے سر رہا۔ احرار کی مٹھی بھر جماعت آخر دم تک مخالفت پر قائم رہی۔ اس شوریدہ سر جماعت کے علمبرداروں میں ایک ہستی جالب صاحب کی بھی تھی۔ اس وقت سید جالب آف ہمدرد کا نام بار بار اخبارات میں آیا اور آتا رہا۔ اور جس زمانہ میں ہمدرد بند تھا اور مالک ہمدرد (مولانا محمد علیؒ) چھندواڑہ میں نظر بند، ہمدرد مرحوم کی روایات آزادی کو بڑی حد تک جالب ہی کی شخصیت نے زندہ رکھا۔

ہمدرد اور زمیندار کے ختم ہو جانے کے بعد اردو پریس میں سناٹا تھا مسلمانوں کے ہاتھ میں کہنا چاہیے کہ کوئی روزانہ اخبار تھا ہی نہیں۔ گدیہ (ضلع بارہ بنکی اودھ) کے تعلقدار، لکھنؤ کے بیرسٹر اور صوبہ کونسل کے ممبر شیخ شاہد حسین قدوائی مرحوم کو اردو روزنامہ نکالنے کی دھن سوار ہوئی۔ لکھنؤ کیا معنی سارے صوبہ متحدہ کے مسلمانوں کے لیے اردو روزنامہ ایک نئی چیز تھی۔ یہ جولائی ۱۶ء کا ذکر ہے، ادارت کے لیے قرعۂ انتخاب جالب پر پڑا اور یکم اکتوبر کو پہلا پرچہ خود جالب صاحب ہی کے الفاظ میں "جملہ محاسن وقائع نگاری وانشا پردازی کے ساتھ" عالم شہود میں آیا۔ ایک ہونہار نوجوان گریجویٹ، جو اس وقت خود ایک روزنامہ کے مالک و مدیر ہیں[1]، اس وقت بیچارے تلاش معاش کی دشواریوں میں مبتلا تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جالب صاحب کی خدمت میں تعارف نامہ لکھ دیا۔ گئے اور خوش خوش آئے۔ ہمدم کے اسٹاف میں اسی وقت لے لیے گئے اور مجھ سے اور جالب صاحب سے واقعتہً اسی وقت سے تعلقات قائم ہو گئے۔

---

[1] یعنی انیس احمد عباسی بی اے کاکوروی ایڈیٹر روزنامہ 'حقیقت' (لکھنؤ)

نمونہ کے ایک پرچہ کے بعد پہلا نمبر بڑے اشتیاق و انتظار کے بعد بڑی آب و تاب سے نکلا پہلے ہی نمبر میں ایک طویل مضمون خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر (اٹاوہ) کے جواب میں میرے قلم سے تھا۔ اور جالب صاحب کا پہلا مقالہ افتتاحیہ اسی مضمون کی تائید میں تھا ــــــ وہ دن اور ادارت ہمدم کا آخری دن، شاید ہی ہمدم کے متعلق کوئی اہم مرحلہ ایسا پیش آیا ہو جس میں ہمدم کے مدیر شہیر مرحوم نے اپنے اس نیاز مند کو شریک مشورہ نہ فرمایا ہو۔

ہمدم جب نکلا ہے تو اس سے طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں۔ شاہد حسین مرحوم کی ذات اور ملت میں نہایت درجہ بدنام تھی۔ یورپ کی پہلی جنگ عظیم زور شور سے جاری تھی اور ترک جرمنوں کی طرف سے شریک جنگ ہو چکے تھے۔ سرکار انگریزی کی نازک مزاجی قدرۃً اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آزادی کی ایک سانس لینا بھی دشوار۔ پھر جالب مرحوم لکھنؤ کے رہنے والے نہیں، مقامی حالات سے ناواقف اور جوار کی ہمدردی سے محروم۔ دہلی سے چلے چلے آرہے تھے۔ کسی کو امید نہ تھی کہ پرچہ کچھ بھی کامیاب ہو سکے گا۔ خدا کی قدرت کہ پرچہ نکلتے ہی وہ رنگ جما کہ مایوسیاں دور، بدگمانیاں کافور۔ لکھنؤ میں ایک ایک کی زبان پر ہمدم تھا۔ ہمدم لکھنؤ کا ہمدم تھا اور لکھنؤ ہمدم کا ہمدم۔ اور لکھنؤ سے کہیں بڑھ کر صوبہ کے باہر۔ اودھ والوں کے حلقوں میں ہمدم کی مانگ تھی۔ کلکتہ اور بمبئی دہلی اور حیدرآباد میں اودھ والوں کے پاس ہمدم پہونچتا تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اخبار آیا ہے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وطن سے کسی عزیز کا خط آیا ہے۔ یہ جاذبیت، یہ دلکشی تمامتر "میر صاحب" کی شخصیت کا نتیجہ تھی۔ جالب صاحب محض ایڈیٹر ہی نہ تھے لکھنؤ کی سوسائٹی کا جزو بن گئے تھے، اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھنے پر اصرار تھا لیکن حقیقۃً اب وہ دہلوی سے زیادہ لکھنوی تھے۔ شہر میں انجمن اردو کے جلسہ ہوں یا مسلم اکادمی کی کمیٹیاں، قیصر باغ کی گارڈن پارٹیاں ہوں یا فرنگی محل کی دعوتیں، میلاد کی محفل ہوں یا محرم کی مجلسیں، ادبی مشاعرے ہوں یا سیاسی مظاہرے، نخاس کے کباڑخانہ ہوں یا امین آباد کی دکانیں، "میر صاحب" ہر جگہ ایسے گھلے ملے ہوئے تھے جیسے شربت کے گلاس میں شکر۔ جالب صاحب اب لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ ان کا تھا!

۱۶ء سے ۲۸ء تک بارہ تیرہ سال کی مدت میں ہمدم پر خدا معلوم کتنے دور گزرے،

کتنے انقلابات آئے۔ "احرار کا مقاطعہ" لاٹ صاحب کی خفگیاں، پروپرائٹر کا انتقال، ملکیت کی تبدیلی، شعبۂ ادارت پر احتساب، عام ملکی فضا کے شدید تغیرات مسلمانوں کے قومی مزاج کے آثار چڑھاؤ، وقس علیٰ ہذا۔ مرحوم ہر تیر اپنے ہی سینہ پر روکتے رہے۔ ایک سے زائد بار عارضی علیحدگی کی بھی نوبت آئی پھر بھی مستقل تعلق کسی حالت میں نہ چھوڑا اور جب جب علیحدہ ہوئے اپنے ہمراہ ہمدم کی رُوح بھی لیتے گئے۔ اور اپنے پیچھے جسد بے رُوح چھوڑ گئے۔ آخر میں جب مجبوراً مستقل طور پر علیحدہ ہونا پڑا تو اس کا اُن کے قلب کو سخت صدمہ ہوا۔ کون باغبان ایسا ہے کہ زمین وہ تیار کرے، درخت وہ بٹھائے، پانی وہ دے اور جب پودے لہلہانے لگیں تو باغ سے نکال کر باہر کیا جانا ہنسی خوشی گوارا کرے؟ پروپرائٹر کی طرف سے قدردانی کا یہ نرالا ثبوت اور اپنی جان توڑ خدمات کا یہ انوکھا صلہ پا کر ان کا دل ٹوٹ گیا اور اس صدمہ و دل شکستگی کا مستقل اثر ان کی صحت پر پڑا۔ چند ہی روز کے بعد لکھنؤ سے اپنا ذاتی روزنامہ ہمت نکال کر گو انھوں نے اپنی حیرت انگیز بلند ہمتی کا نمونہ دکھایا لیکن جس بے سروسامانی کے عالم میں انھوں نے اتنی بڑی ہمت دکھائی اس کا حال کچھ ان کے مخلص احباب ہی جانتے ہیں۔ روزنامہ کے لیے جن مصارف کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے چلانے کے لیے جو مستعدی اور قوت عمل ناگزیر ہے، جب ایک طرف ان پر اور دوسری طرف مرحوم کی حبیب اور سن وسال پر نظر جاتی ہے تو بس ایک قدرت خدا نظر آتی ہے۔ اس کے پروپرائٹر، ایڈیٹر، رپورٹر، کنولیسر، منیجر سب کچھ خود ہی تھے۔ ہمت کی خدمات ابھی سب کے سامنے ہیں۔ اس کی خامیاں جو کچھ بھی ہوں حیرت اس پر ہے کہ اتنی خوبیوں کے ساتھ سوا برس سے پرچہ زندہ کیونکر ہے۔[1]

مرحوم کی درسی و باضابطہ قابلیت کسی علم و فن میں کچھ زائد نہ تھی لیکن کتب بینی کے ذوق و شوق اور مطالعہ کی وسعت و ہمہ گیری نے ان کو خاصا عالم بنا دیا تھا۔ کتاب کے کیڑے تھے۔ جس علم و فن کی جو کتاب جہاں کہیں اور جس طرح بھی ہاتھ لگ جاتی کوشش یہی کرتے کہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیں۔ پرانے رسالوں کے عاشق تھے۔ دن کو موقع کہاں مل پاتا، پیرانہ سالی اور بینائی کی کمزوری کے باوجود رات میں پڑھا کرتے تھے۔ اُردو تو خیر مادری زبان تھی ہی، پھر دہلی کی پیدائش، اہل زبان کے درمیان نشوونما، مولانا حالی مرحوم سے ابتدائی صحبتیں، داغ کی

---

[1] افسوس ہے کہ اس کے کچھ ہی دن بعد ہمت بھی بند ہوگیا۔

شاگردی یہ سب مستزاد۔ خاتمی امعہ انگریزی کی استعداد اچھی خاصی تھی۔ جو چیز ایک مرتبہ دماغ کے اندر پہونچ گئی بس پتھر کی لکیر ہوگئی۔ اِس دَور میں ایسا قوی حافظہ مسلمانوں میں تو بعد مولانا محمد علیؒ اور دیوبند کے مولانا انور شاہ کشمیری کے انھیں کا دیکھنے میں آیا۔ دماغ کیا تھا متفرق معلومات کا ایک حیرت انگیز خزانہ تھا۔ جو چیز بس ایک بار پڑگئی نکلنا گویا جانتی ہی نہ تھی۔ کوئی سا بھی موضوع مشکل سے ایسا ہوگا جس کے متعلق انھیں واقفیت نہ ہو۔ لیکن مخصوص ذوق کی چیزیں ادب اور تاریخ تھیں۔ تاریخ میں بھی تاریخ ہند پر گہری نظر رکھتے تھے۔ روزانہ اخبار کی مصروفیتیں اتنا موقع ہی کب دیتی تھیں ورنہ تاریخ سے متعلق مرحوم متعدد یادگاریں یقیناً چھوڑ جاتے پھر بھی اپنی وفات سے سال دو سال قبل پانی پت کے آخری معرکہ خونین پر جو بسوط مقالہ سپرد قلم فرما گئے ہیں وہ اب بھی اہل نظر کے لیے قابل ملاحظہ ہے۔

مرحوم کی وسعت معلومات وقت کے اکثر ایڈیٹروں کے لیے باعثِ رشک تھی۔ تقریباً ہر مسئلہ پر وہ تیار اور پوری طرح تیار رہتے تھے۔ خدا معلوم کتنے اہلِ قلم اور اہلِ سیاست آآکر اس خرمن سے خوشہ چینی کرتے اور اس ایک چراغ سے خدا معلوم کتنے چراغ جلتے تھے۔ لیکن ان کمالات کے باوجود جالب صاحب موجودہ 'جرنلزم' کے اہل نہ تھے۔ نہایت بامروّت اور بڑے وضع دار تھے سخت کلامی اور دشنام نگاری جانتے نہ تھے۔ دھمکا دھمکا کر اور ڈرا ڈرا کر تحصیل زر کے فن سے بیگانۂ محض تھے۔ مزاج میں سادگی تھی۔ تکلفات سے بری تھے طبیعت کے بھولے تھے۔ بزرگوں کا ادب ولحاظ اور چھوٹوں کے لیے شفقت و محبت دل میں رکھتے تھے۔ جن کے دوست ہوتے حاضر و غائب یکساں اس کے ہوا خواہ رہتے۔ بڑے ہو کر چھوٹوں کا مشورہ قبول کرلینا گناہ نہیں سمجھتے تھے۔ مشرقی معاشرت اور اسلامی آداب کے دلدادہ تھے۔ بیسویں صدی کی "چلت پھرت" اور روشن خیالیوں سے عاری تھے۔ غرض فن صحافت جدید کے جو جو ہنر سمجھے جاتے ہیں ان سب سے قطعاً و یکسر کورے تھے۔

انسان کی سیرت کا اصلی جلوہ حالت موافقت میں نہیں، مخالفت کے وقت نظر آتا ہے۔ ۲۵ء کی آخری سہ ماہی میں نجد و حجاز کے مسئلہ میں راقم سطور سے اور جالب صاحب سے شدید اختلاف رہا۔ لکھنؤ بلکہ ملک کا سارا اسلامی پریس اس وقت دو بالکل ہی مخالف کیمپوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے پرانے ملنے والوں اور دوستوں کے خوب خوب تجربے ہوئے۔ جالب صاحب اپنے رنگ میں سب سے مستثنیٰ ثابت ہوئے۔ شدید اختلاف مسلک کے باوجود کسی ایک موقع پر بھی تہذیب و متانت کے حدود سے باہر نہ ہوئے۔

اور نہ ذاتی تعلقات میں کوئی فرق آنے دیا، اس شرافت وضعداری کو بڑی حد تک اپنے ہمراہ ہی لے گئے۔ اخبار نویسی میں اپنے شاگرد شاید بیسیوں کی تعداد میں چھوڑے ہیں، ۱۰، ۱۲ کا تو مجھی کو علم ہے۔ ان میں سے بعض "سعادت مندوں" نے خوب خوب چرکے دیئے۔ لیکن مرحوم کا اخلاق ہر ایک کے ساتھ بدستور قائم رہا۔ حسن سلوک و مدارات میں کسی کے ساتھ فرق نہ آنے دیا۔

دنیا کی منزلیں ختم ہو گئیں۔ آخرت کی منزلیں شروع ہو چکیں۔ خلق سے سابقہ ختم ہو چکا خالق سے سابقہ شروع ہو گیا ارحم الراحمین اپنی امداد و توفیق سے یہ بیڑا پار لگائے۔ جگ بیتی کے چھاپنے میں عمر صرف کر دی۔ اس وقت آپ بیتی کے دفتر کھلے ہوں گے۔ سوال یہ نہیں ہو رہا ہوگا کہ چین نے کیا کیا اور روس میں کیا ہوا سوال اپنی ہی ذات کے متعلق ہو رہے ہوں گے اور جواب اس کے مانگے جا رہے ہوں گے کہ خود کیا کیا۔ اور خالق و مخلوق کے حقوق کہاں تک ادا کیے۔ یہ وقت سب کو پیش آنا ہے اور سب کے یاد رکھنے کا ہے۔ آج جو بڑھ بڑھ کر اور اپنی ذمہ داری کو بھلا بھلا کر دوسروں پر رائے زنی کر رہے ہیں اور ساری دنیا جہان کے مقدمات کا فیصلہ اپنے قلم سے کر رہے ہیں اس وقت کو نہ بھولیں جو عنقریب آنے والا ہے اور جب خود ان کا مقدمہ حاکم اعلیٰ کی عدالت میں پیش ہوگا۔ جب خود ان کے خلاف گواہیاں گزریں گی اور جب خود ان پر جرح اور بحث قائم ہو گی۔ اللہ ہر مومن کی یاوری اس نازک وقت میں کرے۔ جالب مرحوم صاحب ایمان تھے عقائد کے پختہ تھے۔ مسلمان تھے مسلمانوں کے رب کے پرستار تھے۔ مسلمانوں کے رسولؐ کی شفاعت کا آسرا لگائے ہوئے تھے۔ رب آمرزگار و خدائے غفار انھیں اپنی رحمت و مغفرت کی بارشوں سے سیراب کرے۔ اور جنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات ان کے نصیب میں لائے!

ایک جشن جبلی

جھونپڑے والوں نے محلوں کے خواب دیکھنے شروع کیے اور ایک مشرقی، نیم دینی ادارے نے بھی پر پرزے نکال بالآخر اپنی پنجاہ سالہ جبلی منا ڈالی۔ اسی دھوم دھام اسی ہجوم و اژدھام، اسی تزک و احتشام سے۔ جس سے جبلیاں منائی جاتی ہیں۔ مشت خاک نے ارتقا کے زور سے آندھی کا مقام پالیا۔

اپنا خادمانہ تعلق اس ادارے سے اسی دن سے قائم ہے جس دن سے کہ اس کی بنیاد شبلی اور ان کے دو شاگردان رشید کے ہاتھ سے پڑی۔ اور ممبری کے لحاظ سے اتنی طویل العمر تو اب دو ہستیاں اس عالم آب و گل میں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک مولوی مسعود علی ندوی سام دھمال۔ اور دوسرا مجھ سا ناکارہ۔ اور سید صاحبؒ کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد سے مجلس عاملہ کی صدارت کا بار بھی اس دوش ناتواں پر رکھ دیا گیا ہے۔ ان گوناگوں نسبتوں اور ذمہ داریوں کے تقاضے سے تو اپنا فرض درجہ اوّل میں میزبانی کا تھا۔ لیکن ادائے فرض کی توفیق زندگی کے دوسرے اور اہم تر شعبوں میں کب ہوئی ہے جو اسی ایک جزئیہ میں ہوتی —— غرض دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ خود بھی مہمانوں کا ایک مہمان بنا ہوا ۱۹ر کے سہ پہر کو اعظم گڑھ پہونچا۔ جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اور صرف ع

پردہ اٹھنے کی منتظر تھی نگاہ!

جبلی بہر حال جبلی تھی۔ اس کے لوازم ایک ایک کر کے پورے ہوتے تھے اور پھر صدر منتخب کے نام کا جادو! ان کی ذاتی شخصیت اور ان کی منصبی وجاہت! خلقت امنڈ آئی۔ ادھر ندوہ کے اکابر۔ ادھر علیگڑھ کے نمائندے۔ یہ جامعہ ملیہ وہ جمیعتہ العلماء۔ یہاں جماعت تبلیغی کے نقیب۔ وہاں جماعت اسلامی کے امیر۔ کہیں دیوبند کے ارباب بصیرت و بینش۔ کہیں دوسری دانش گاہوں کے اہل خرد و دانش۔ شبلی اکاڈمی اور شبلی کالج دونوں کے لق و دق میدانوں میں کیمپوں کا ایک شہر آباد۔ ساری عمارتوں کے کمرے مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے۔ عوام کے ساتھ خواص بھی مخلوط۔ بڑے نام کی کشش بھی بڑی ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ بھوپال پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر مملکت سعودی کے سفیر۔ یوپی کے دو دو وزیر اور خود وزیر اعلیٰ (چیف منسٹر) سب موجود۔ سب کی بارگاہیں سجی ہوئی۔ رات کے وقت ہر در و دیوار پر بجلی کے قمقمے یوں جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے کہ جیسے یہ رات دیوالی کی ہے۔

چندہ ملا، اور خوب ملا' توقع اور اندازے سے زیادہ۔ اور بڑی بات ہے کہ سب سے بڑا عطیہ خود گورنمنٹ کی طرف سے رہا ——— ۵۰ ہزار سرکارِ ہند کی طرف سے اور ۱۰ ہزار سرکار یوپی کی طرف سے! اور اسی کو کہتے ہیں۔ ع

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

ورنہ خبریں تو ان اونچی بارگاہوں میں پہونچائی گئی تھیں۔ پھیلائی گئی تھیں، یہ کہ ادارہ اردو کا۔ اور پھر مسلمانوں کا (بہ قول شخصے کریلا اور نیم چڑھا) پاکستان کی خفیہ امداد سے چل رہا ہے! پاکستان نے ابکی بھی مدد کی لیکن چوری چھپے نہیں۔ کھلے خزانہ۔ بینک کے ذریعہ سے ۲۵ ہزار کی قیمت کی کتابوں کا آرڈر دے کر۔

تقریریں ہوئیں۔ مقالے پڑھے گئے۔ جلسہ کی کارروائی تلاوت قرآن سے شروع ہوئی۔ اور "دینی" ادارہ کی لاج رہ گئی۔ نمازوں کے وقت مسجد میں ہجوم قابل دید رہا۔ جلسہ کی بہترین تقریر خود صدر صاحب کی تھی۔ ادبی و معنوی حیثیتوں کو جامع۔ ایک اور قابل ذکر تقریر ایٹ ہوم کے موقع پر۔ ریاست کی وزیر علیا کی رہی۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اس میں ہر مذہب وملت۔ اور ہر کلچر (تہذیب و ثقافت) کے ساتھ پوری ہمدردی پوری رواداری کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ وہ ۲۶ جنوری کے بعد ملک کی "راجیہ بھاشا" اور ریاست کی ناقابل فہم سرکاری زبان میں نہیں بلکہ ملک کی راشٹر بھاشا اور ریاست کی عام فہم زبان شستہ اردو میں تھی۔ حالانکہ دنیا باخبر ہے کہ یہ مسز کرپلانی رہنے والی یوپی کی نہیں بلکہ بنگال کی ہیں۔ اور ان کے شوہر نامدار بھی یوپی کے نہیں بلکہ سندھ کے ہیں! موصوفہ کسی اور کی نہیں۔ خود اپنی زبان کو اگر ریاست کی علاقائی زبان قرار دے دیں تو اس سے یہی نہیں کہ گاندھوی حق پرستی کا ثبوت دیں گی۔ بلکہ ملک کے سارے اردو والوں کا دل اپنے ہاتھ میں لے لیں گی۔

ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان افضل اقبال صاحب ہندستان کے علمی حلقوں کے لیے اجنبی نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی کے ایم اے ہیں۔ مولانا محمد علی کی دو انگریزی کتابیں انھیں ایڈٹ کرکے عرصہ ہوا شائع کی تھیں۔ اور اب صاحب مثنوی مولانا رومیؒ کا تعارف انگریزی خوانوں سے کرا رہے ہیں۔ اپنی طالب علمی کا دور میں۔ اور ایک بار اس کے مدیر صدق کے قصباتی وطن کو نواز چکے ہیں۔ ابکی ملاقات کا اتفاق سالہا سال کے بعد ہوا انگریزی کے اچھے بولنے والوں میں ہیں۔ رات کے جلسہ میں سمینار میں حصہ لیا۔ اور اسلامیت سے لبریز ایک اچھی خاصی تقریر کردی۔ نئے ملاقاتیوں میں دو ہستیاں قابل ذکر ہیں۔ ایک شاعر رنگین نوا جگن ناتھ آزاد۔ جسم و قالب کے لحاظ سے یقیناً ہندستانی ہیں۔ بلکہ سرکار ہند میں ایک ذمہ دار عہدہ پر مامور۔ لیکن قلب و باطن کے لحاظ سے اب تک پاکستان کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ شرافت وانسانیت کی یہ دولت خدا سب کو نصیب کرے

دوسری ہستی ایک اور رنگینی میں نہ سہی۔ اپنا رنگا رنگی میں فرد۔ مالک رام ایم اے۔ غالب کے پرستار۔ اور ایک معروف اہل قلم و مضمون نگار ذہن میں ان کا نقشہ کچھ اس طرح کا تھا کہ گران ڈیل پنجابی ہوں گے۔ بول چال کے کھرے، تیوروں کے کڑے۔ دیکھا تو بالکل دوسرے نظر آئے۔ اور آنکھوں کو یقین مشکل سے ہی آیا۔ جسم دھان پان، دہلوی نفاست لکھنوی نزاکت مشرقی شرافت۔ باتوں میں کھلے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مالک رام نہیں۔ عبدالمالک بول رہا ہے۔ قرآن و حدیث پر نظر ہی نہیں بلکہ ان کے احترام سے بھی گوشۂ قلب منوّر! اسلامی تہذیب و ثقافت اختیار کیے ہوئے اور اسلامیات کی قدر کرنے والے اور مسلم علوم و فنون پر نظر رکھنے والے بہت سے غیر مسلم ہندوستانی میری نظر سے گزرے ہیں۔ خصوصاً کایستھوں میں اور کشمیری پنڈتوں میں۔ لیکن یہ مثال سب سے انوکھی۔ سب سے چوکھی...... لیکن تو چیزے دیگری کے مصداق۔ جھلکیاں ایمان کی دکھاتی ہوئی۔ خوشبوئیں عرفان کی سنگھاتی ہوئی۔

ڈاکٹر سید محمود (صدر مجلس انتظامی دارالمصنفین) اللہ ان کی عمر، صحت و سعادت میں برکت دے۔ بیچارے اب سماعت و بصارت کے علاوہ چلنے پھرنے میں بھی خاصی معذوری محسوس کرنے لگے ہیں لیکن ماشاءاللہ ایمانیات میں مضمحل نہیں۔ خوب چاق و چوبند اور جسمانی اور دماغی کام میں قابل رشک حد تک مستعد۔ اور رہے صدر محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب تو ان کی شرافت نفس کے اتنے اور نئے اور تازہ نمونے دیکھنے میں آئے کہ دل اگر ان پر کوئی نکتہ چینی کرنا چاہے تو بھی اس کی ہمت کہاں سے لائے اور زبان اس پر کیونکر کھل پائے۔

دارالمصنفین اب تک غریبوں کی جھونپڑی تھی۔ اب ماشاءاللہ شبلی اکیڈمی کا قصر و ایوان تیار ہو رہا ہے امتحان کا اصل محل یہی ہوتا ہے۔ جاہ و ثروت کی تاک میں نفس و شیطان لگے رہتے ہیں اور پیسہ ہاتھ میں آجانے کے بعد اچھے اچھوں کے قدم پھسل جاتے ہیں۔ یہ وقت تمام تر خوش ہو جانے اور مطمئن ہو جانے کا نہیں اللہ سے دعا کرنے کا ہے کہ قدم ہم سب کارکنوں اور خادموں کے رشد و سعادت کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں۔ دلوں میں عجب و پندار کا زنگ نہ لگنے پائے۔ طبیعت بے قابو ہو کر دنیا پر نہ گرنے پائے۔ طرح طرح کی ترغیب و تحریص کا شکار نہ ہونے پائے اور شبلی و سلیمان کی ڈالی ہوئی راہ جو خدمت دین و علم کی ہے۔ اس سے قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً۔

شبلیؒ[1]

انسان، مصنف، مصنف گر

پچاس سال! پچاس سال۔ اور وہ بھی ہجری نہیں، عیسوی۔ نصف صدی، اور وہ بھی قمری نہیں شمسی، مدت کچھ تھوڑی ہوئی! اللہ اکبر! عمریں بیت گئیں۔ ایک نہیں دو دو پشتیں گزر گئیں۔ نچے بوڑھے ہو گئے۔ اور جوان بوڑھے پھوس ہو کر رہ گئے۔ جو کنوارے تھے وہ پوتوں والے ہو گئے۔ اور جن کے قد تیر کی طرح سیدھے تھے وہ جھک جھکا کر کمان بن گئے۔ تاریخ اور جنتری سے پوچھیے تو یہ جواب پایئے۔ اور حساب پایئے۔ لیکن غفلت کی تھپکیوں میں اگر آجایئے اور بھروسا محض اپنی یادداشت پر رکھیے۔ تو ایسا لگنے لگے کہ جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ ۱۴ء و ۱۵ء کو دن ہی ابھی کے گزرے ہیں۔ کل رات ہی کا تو خواب ہے! وہ دیکھیے دارالمصنفین کا خاکہ تیار ہو رہا ہے۔ دستور العمل بن رہا ہے۔ مجلس انتظامی کے رکن ملک بھر سے چھانٹ چھانٹ کر لیے جا رہے ہیں۔ ہونہار اور نوعمر رفیق چنے جا رہے ہیں۔ علم و قلم کی بساط پر ایک نئی مجلس مرتب ہو رہی ہے۔ تحقیق و تصنیف کی مسند پر جلوہ آرا ہو رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی یا ایک ہیچمدان کی زبان میں سلیمان اعظم اور انتظام عمارت، طبع و اشاعت کے میر شکر بنے ہوئے ہیں۔ انھیں کے رفیق و صدیق، ہم دم و ہم قدم مولوی مسعود علی ندوی یا ایک بے ادب کی زبان میں سالار مسعود غازی! کیا زمانے تھے، کیا، جوش تھا اور کیسے بلند جذبات تھے! کیا کیا حوصلے، کیا کیا ولولے! اور سب سے بڑھ کر ایک عزم صمیم۔ کام کی دھن۔ خدمت کی لگن!

اور یہ ساری آگ لگائی ہوئی اور روشنی پھیلائی ہوئی کس کی تھی! ایک بڑے میاں کی۔ جو نشر اور دانشی کیا معنی ابھی ساٹھ برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ "بڑے میاں" بن گئے تھے۔ ابھی اپنی بھرپور جوانی ہی میں تھے

---

[1] یہ وہ مقالہ تمام و کمال ہے جو ۱۲ر فروری کو دارالمصنفین کی طلائی جبلی میں پڑھ کر سنایا تھا۔

کہ ملک بھر میں اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ اور علامہ کہلانے لگے تھے۔ اور علوم و معارف کی مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے ہزاروں دماغ روشن کر چکے تھے۔ تو ذرا ۲۰، ۲۵ منٹ کا وقت نکال کر اسی مرد خدا کی داستان حیات کی کچھ سطریں پڑھ ڈالیے۔ داستان کچھ اس کی شخصیت کی اور کچھ اس کی کارگزاری کی۔ اس کی کاریگری کی۔ کہانی ناتمام سی، ادھوری سی، سرسری سی، بلکہ یوں کہیے کہ آڑی ترچھی سی۔

(۱) شخصیت

اپنے ہوش کی آنکھیں ابھی کچھ کھل ہی چلی تھی اور زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے ختم اور بیسویں صدی کے شروع ہونے ہی کا تھا کہ کانوں میں نام مولانا شبلی کا عظمت و توقیر کی راہ سے پڑنے لگا۔ اکثر حالی کے ساتھ عطف ہو کر، اور کبھی ان سے ہٹ کر، بلکہ کبھی کٹ کر بھی۔ شہرت یہی سننے میں آئی کہ مولانا علم و فضل کے پیکر ہیں۔ اور ایک ہمہ دان اور تاریخ کے بحر بیکراں نثر کے تاجدار، تو نظم کے بھی شہسوار۔ کچھ اور تمیز آئی تو الندوہ باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ اور اس نے مولانا کے علم و فضل کا نقش دل پر اور گہرا کر دیا۔ ۱۹۰۸ء میں والد ماجد کے ہمراہ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کے جلسہ دستاربندی میں شرکت کی۔ اور وہیں پہلی بار مولانا کی زیارت کے ساتھ دو کتابیں بھی مولانا کی خرید کر لیں۔ ایک ان کی معروف متکلمانہ کتاب الکلام۔ دوسری تاریخی رسائل شبلی۔ نویں درجہ کے اسکولی طالب علم اور ۱۴، ۱۵ کے سن کے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی۔ کتابیں پڑھیں اور تھوڑی بہت سمجھیں۔ تو آنکھیں کھل گئیں۔ اور ایک عالم ہی دوسرا نظر آنے لگا۔ الکلام میں علمی، کلامی، فلسفیانہ بحثیں وجود باری، رسالت، معجزات، عقیدہ آخرت پر تھیں۔ اور رسائل میں بعض بڑے معرکے کے تاریخی مسئلوں کا حل تھا۔ مضمون اس کے سارے ہی اہم تھے۔ لیکن یہ تین مقالے تو دل کی گہرائیوں میں اتر گئے اور دماغ پر نقش ہو گئے۔ ایک کتب خانہ اسکندریہ، دوسرے حقوق الذمیین تیسرے جزیہ کی تحقیق۔ دونوں کتابوں کے لکھنے والے سے عقیدت گہری سی گہری پیدا ہو گئی۔ اور اب الندوہ کا انتظار ہر مہینے بے تابی سے رہنے لگا۔ اور رنگ زیب عالمگیر پر الندوہ میں قسط وار مضمون سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ سوتے جاگتے شبلی ہی کا خیالی پیکر نظر کے سامنے رہنے لگا۔ سال ہی ڈیڑھ سال بعد کالج میں پڑھنے کے لیے لکھنؤ منتقل ہو آیا۔ اور اخیر ۱۹۰۹ء کی دوسری ششماہی کی کوئی تاریخ ہو گی، جب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

اف وہ پہلی اصالتہً حاضری[1]! کتنی مودبانہ، کتنی عقیدت مندانہ اور کیسی پرستارانہ تھی! نام بتانے اور معمولی

---

[1] اصالتہً اس لیے کہ والد ماجد کے ہمراہ تبعاً تو ۱۹۰۸ء میں حاضری ہو چکی تھی۔

سے سوالوں کا جواب دینے میں زبان لڑکھڑانے لگی، ہمت جواب دے دی گئی۔ خیر اس پہلی ملاقات کے بعد راہ کھل گئی۔ اور شروع شروع تو آمد و رفت، رُک رُک کر کئی کئی دن بعد ہوتی رہی۔ اور پھر جلد ہی جلد ہونے لگی کبھی تنہا اور کبھی اس وقت کے رفیق خصوصی مولوی عبدالباری ندوی کے ساتھ۔ ملاقات کا عام وقت سہ پہر کا تھا۔ اِدھر سہ پہر ہوا، اور اُدھر قدم خود بخود آستانِ شبلی کی طرف اُٹھ گئے۔ اس وقت مولانا کی حیثیت گویا پیر و مرشد کی تھی۔ سیاست ہو یا مذہب، شاعری ہو یا ادب، تاریخ ہو یا فلسفہ، علم و فن کے ہر شعبہ، ہر شاخ میں مرجعیت انھیں کو حاصل۔ وہ امام ہیں مقلد وہ رہنما میں مسافر، وہ طبیب میں مریض۔ مولانا کا قیام اپنی وفات (نومبر ۱۴ء) سے کچھ قبل تک عموماً و بیشتر لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی لمبی مدت کے لیے وہ بمبئی، حیدرآباد وغیرہ بھی آتے جاتے رہے۔

اسی درمیان میں ایک دَور وہ بھی آیا۔ جب مغربیت کے اثر سے میرے اوپر نشۂ الحاد کا سوار ہو گیا۔ اور مل، اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کے بھرے میں آکر میں مذہب ہی سے فرنٹ ہو گیا۔ فخر بجائے اسلام کی حلقہ بگوشی کے "ریشنلزم" یا عقلیت اور لاادریت پر کرنے لگا۔ اور مذہب پر کچھ زور نہ چلا، تو ساری جھنجھلاہٹ شبلی کی الکلام ہی پر اتاری قلم چلانے کی الٹی سیدھی مشق مولانا ہی کے فیض سے ہو گئی تھی۔ پہلا ہاتھ انھیں پر صاف کیا۔ کئی کئی نمبر الکلام کی رد و قدح میں لکھنؤ کے ایک ماہ نامہ میں چہرہ پر "ایک طالب علم" کا نقاب ڈال کر لکھ ڈالے۔ حاضری کے معمول میں فرق تو کچھ اسی زمانہ میں قدرۃً آیا۔ لیکن بہت زیادہ اس زمانے میں بھی نہ آنے پایا۔ یہ نیازمندی اِدھر سے تھی اُدھر مولانا کی بزرگانہ شفقت تھی، کہ "لکھنے والے کا نام جان لینے کے بعد بھی نہ ہٹی، نہ گھٹی۔

مولانا نے مکان اس درمیان میں کئی بدلے، کم سے کم دو تو لہ گنج ہی کے آس پاس۔ اور پھر جب امین آباد میں گھنٹہ گھر پارک تیار ہو گیا، غالباً ۱۱ء میں تو اسی بالاخانہ نمبر ۵۳ پر منتقل ہو آئے۔ سیرت نبوی کا جب مستقل کام ۱۲ء میں شروع کیا تو ضرورت ایک چلتے ہوئے انگریزی مددگار کی ہوئی۔ جو انگریزی ماخذوں سے معلومات تلاش کر کے اور ترجمہ کر کے پیش کرتا رہے۔ اس خدمت پر تقرر گھنٹے دو گھنٹے روزانہ کام کے لیے ماہانہ معاوضہ پر اسی خاکسار کا کیا (بی اے کی سند اسی سال حاصل ہوئی تھی) اور اس تقریب سے حاضری اور ہم نشینی کے موقع اور زیادہ ملنے لگے۔ اور وقت کے علاوہ بے وقت...... بلکہ ناوقت بھی۔ اور جب مولانا سفر میں تشریف لے جاتے تو مراسلت بھی پابندی سے جاری رہتی۔ جلوت کی صحبتوں کے ساتھ خلوت میں بھی بیٹھنے اُٹھنے کے موقع ملنے لگے۔ اور انگریز حکام سے مولانا کی جو خط و کتابت ہوتی رہتی۔ اس خدمت کا بھی اہل اس نااہل کو سمجھ لیا گیا۔ ندوہ کے معاملات میں دوسروں سے جو نوک جھونک چل جاتی، اس میں بھی ایک حد تک دخیل اپنی طالب علمانہ حدود کے اندر ہو گیا —— صیغۂ متکلم کے بار بار اور سامعہ خراش استعمال سے عجب نہیں کہ طبیعت اکتا چلی ہو تو غرض اس

ساری درازنفسی سے یہ ہے کہ علامہ کی شخصیت پر جو گزارش پیش ہو رہی تھی۔ اس کی بنیاد نہ سنی سنائی باتیں نہ واسطہ در واسطہ روایتیں بلکہ بہت کچھ دیکھا سنا ہوا ہے۔ اور "شنید" سے بڑھ کر "دید" کا حصہ ہے۔

اس زمانے میں مولانا تجرد کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اہل خانہ وفات پا چکی تھی۔ اور صاحبزادے کہیں اپنی ملازمت پر تھے۔ مکان کے مکین بس مولانا خود تھے۔ اور ایک افیونی قسم کے خدمت گار کہ وہی کھانا بھی پکا دیتے تھے۔ اور کھانا پکتا ہی کیا تھا۔ بڑے کم خور تھے۔ جوانی میں سنا ہے کہ شہ زور تھے عجب نہیں کہ خوش خور بھی ہوں۔ مگر اب تو غذا بہت ہی قلیل رہ گئی تھی۔ معمولات روزانہ یہ تھے کہ رات میں سویرے ہی سو جاتے اور ادھر بہت تڑکے منھ اندھیرے اٹھ بیٹھتے۔ صبوحی چائے کا معمول اسی وقت کا تھا۔ خدمت گار صاحب کو یہی ڈیوٹی ٹھل کر رہتی۔ مولانا چائے کے رسیا تھے۔ اور چائے سے بھی بڑھکر شکر کے۔ شکر دان میں دانہ دار شکر رکھی ہوئی ہے اور مولانا اسی سے شغل فرماتے جاتے ہیں قلم میں شیرینی چاہے کچھ اسی شکر خوری سے آگئی ہو لیکن بھوک پر تو بڑا ہی برا اثر شکر اور چائے کی افراط کا پڑتا ہی تھا۔ ابھی کچھ اندھیرا ہی ہوتا کہ لیمپ جلا کر بیٹھ جاتے اور لکھنے کا کام صبح ہی کے دو گھنٹے کے اندر کر ڈالتے دن کا بڑا حصہ کتابوں کے اوراق کی الٹ پلٹ کی نذر ہوتا۔ مطالعہ کے شوقین نہیں حریص تھے، دن کا کھانا اول ہی وقت کھا لیتے۔ شام کے کھانے سے اخیر زمانے میں مغرب سے پہلے ہی فراغت کر تے۔ اکثر ہم بیٹھنے والوں کے سامنے ہی اور کھانا ہوتا کیا؟ امین آباد کے چٹپٹے کباب بس ایک دو سے زیادہ نہیں۔ اور پھلکے وہ بھی بس ایک ہی آدھ۔ رساول خوب میٹھی کھاتے۔ اور ایک رساول کیا ہر مٹھائی خوب ہی تیز چاہتے۔ ریل کے سفر میں اسٹیشنوں سے مٹھائی خرید خرید کر تناول فرماتے۔

مزاج جذباتی تھا۔ سردی گرمی دونوں کا احساس بڑا نازک رکھتے۔ سردی کی راتوں میں معمولی رضائی، کمبل، لحاف ناکافی ثابت ہوتے لیکن پانی غیر معمولی طور پر ٹھنڈا چاہتے۔ ایک بار کیا ہوا کہ ۱۳ء کے آخری ہفتہ دسمبر میں لکھنؤ میں شب کو غریب خانہ کھانے پر تشریف لائے۔ ایک دوست کی فرمائش پر عزیز لکھنوی اور شہر کے دو نامور ہندوؤں کو بھی بلوا دیا تھا۔ ایک پنڈت برج نارائن چکبست شاعر، دوسرے پنڈت بشن نرائن بیرسٹر اور کانگریس کے سابق صدر۔ کھانے پر مولانا نے پانی طلب فرمایا۔ اور جب پیش ہوا تو بولے "برف نہیں ہے" اتنے کڑکڑاتے جاڑے میں رات کے وقت کسی کو خیال بھی برف کا ہو سکتا تھا۔ اور اس وقت تو تلاش سے امین آباد میں بھی نہ ملتی۔ میں شرمندگی سے پانی پانی ہو کر رہ گیا مزاج میں بھی حدت و شدت اسی مناسبت سے تھی۔ اور شاید اس لیے رفیقوں سے اکثر ان بن رہتی۔ غم و صدمہ کا اثر بھی قلب بہت محسوس کرتا۔ چھوٹے بھائی اسحاق مرحوم تو خیر سگے بھائی ہی تھے۔ ان کی وفات نے تو مولانا کی کمر توڑ دی۔ ان کا مرثیہ تو وہ مضطر و بیقرار ہو کر کہتے ہی باقی غیروں کے مرثیے جو انھوں نے کہے ہیں۔ ان میں سوز و گداز چھپا پڑتا ہے میرے

والد مرحوم کا انتقال ۱۲ء کے اخیر میں مکہ معظمہ میں ہوا۔ میں نے ایک ٹوٹا پھوٹا ماتمی مضمون اس وقت کے ہفتہ وار مشرق (گورکھپور) میں لکھا۔ مولانا نے اسے پڑھا اور نومشقی کی ساری خامیوں کے باوجود مضمون کی داد اس کی غم انگیزی کی حیثیت سے دی۔ خواجہ حسن نظامی اور پریم چند کے افسانوں میں جو رقت انگیز ٹکڑے آجاتے تھے مولانا کے آنسو ان پر نکل پڑتے تھے۔ میرانیس کے مرثیوں سے اتنا تاثر بھی اسی رقیق القلبی کا اثر تھا۔ محسن الملک مرحوم، جسٹس سید محمود مرحوم کی وفات اور مدار المہام رامپور جنرل عظیم الدین خاں کے واقعہ قتل سے قلب نے بڑا اثر لیا تھا۔ اور اس کا اظہار زبان یا قلم سے، نظم میں یا نثر میں ہو کر رہا۔ اپنے معاصرین میں حالی کے بڑے معترف رہا کرتے۔ میں علامہ کے اور کمالات کا قائل تو تھا ہی لیکن ان کی سخن فہمی کو اپنا جزو ایمان بنائے ہوئے تھا۔ اور معمول کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ جب کوئی شعر پسند آجاتا تو اسے کسی نہ کسی بہانے مولانا کے کان تک ضرور پہونچا دیتا۔ اب اگر کہیں انھوں نے داد دے دی یا میرے انتخاب پر صاد کر دیا، تو جیسے مجھے سب کچھ مل گیا۔ لیکن اگر کہیں انھوں نے خاموشی یا بے رُخی برتی تو معاً وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا —— ایک بار اپنے دل کی یہی بات بے تکلف گوش گزار کر دی۔ بولے کہ "خیر میرے لیے تو یہ محض حسن ظن ہے۔ البتہ مولانا حالی کا درجہ سخن فہمی میں واقعی ایسا ہی ہے۔ میں ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھتا تھا" عالی ظرفی کی ایک متعین مثال اس سے اُونچی سُنیے۔

ثاقب اکبر الہ آبادی ثم لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے اہل زبان میں تھا۔ ۱۳ء میں مولانا نے مسجد کانپور کے مشہور حادثہ سے متعلق ایک نظم کہی۔ مضمون ایک جگہ پولیس کی گولیوں سے بوڑھوں اور بچوں دونوں کی شہادت کا تھا۔ ایک شعر موزوں یوں ہوا تھا ؎

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ لڑکے ہیں بہت جلد ان کو سو رہنے کی عادت ہے

ثاقب ملنے آئے۔ تو انھیں سُنایا۔ ثاقب نے کہا کہ دوسرے مصرعہ میں اگر دو ایک الفاظ بدل دیئے جائیں تو مصرعہ اور چست ہو جائے۔ "لڑکے" کی جگہ "بچے"۔ "بہت جلد" کی جگہ "سویرے" اور "سو رہنے" کی جگہ "سو جانے" مولانا نے بلا تامل اس مشورے کو قبول کیا۔ اور اب مصرعہ یوں ہو گیا۔ ع

کہ بچے ہیں، سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

معاصر کی عظمت کا اعتراف بھی کوئی آسان بات نہیں۔ چہ جائیکہ اس کی اصلاح کو قبول کر لینا۔ پھر خصوصاً جب وہ معاصرین میں بھی اپنے سے چھوٹا ہو۔ اور شہرت میں بھی کمتر ہو' یہ انصاف پسندی اور یہ عالی ظرفی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ دینی غیرت مندی کے پُتلے تھے۔ خود عبادات میں چاہے ڈھیلے ہوں۔ بعض عقائد کی تاویل میں بھی چاہے عقل پرستوں

کی صف میں جا ملے ہوں۔ لیکن جہاں تک دین کی حمیت و غیرت کا سوال ہے۔ ان کے قدم کسی بڑے سے بڑے منقولی بزرگ سے پیچھے نہ ہوں۔ اور آریہ ہوں یا عیسائی، ملحد ہوں یا مستشرق، طنز و تعریض کی زد کسی سمت سے بھی اسلام پر پڑتے دیکھ برداشت نہ کر سکتے اور فوراً جواب کے لیے بے چین ہو اٹھتے ——— سر سید سے سیاسیات میں سخت اختلافات رکھتے۔ لیکن ذاتی طور پر ان کے بڑے مداح تھے۔ ان کی سیرت و کردار کی پختگی، ان کی اصول پرستی، ان کے ایثار اور ان کے حب اسلام کی داد برابر دیتے رہتے۔ خود بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کتنی تجویزیں سوچتے رہتے کتنے منصوبے بناتے رہتے۔ اور جہاں تک بس چلتا ان پر عمل بھی کر گزرتے۔

طبیعت حسن پرست پائی تھی، فارسی شاعری میں کھل کھیلتے اور معاملہ بندی کو بڑے لطیف انداز میں سرستی کی حد تک پہونچا دیتے۔ بمبئی اور جنجیرہ کی تلمیحوں کو تو یار لوگ لے اڑے اور بدگمانی اور مبالغہ کے زور سے سوئی کو بلم بھالا بنا دیا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ بات سرے سے بے اصل ہو۔ اور مولانا کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ عمل ہی میں نہیں بلکہ خیال اور دماغ میں بھی انھیں بے نفس اور معصوم تسلیم کر لیا جائے۔

مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا مشغلۂ علم تھا۔ کتب بینی ان کی غذا تھی اور مطالعہ ان کا اصلی ذوق انھیں کتب خانہ دے دیا جاتا تو بس اب انھیں نہ کھانے پینے کی پروا تھی نہ سونے کی۔ ان کا سب سے بڑا راحت کدہ ان کا کتب خانہ ہی تھا۔ یہ ذوق ان کی اصل طبیعت و سرشت بن گیا تھا اور چونکہ یہ حال تھا، محض قال نہ تھا۔ آمد تھی آورد نہ تھی اور تکلف و تصنع کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لیے ان کا یہ ذوق متعدی بھی تھا۔ اور دوسروں کو قوت کے ساتھ متاثر کرتا رہتا اور جو ان کی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود بھی اگر مصنف نہیں تو مضمون نگار تو بن ہی گیا ——— جمال ہم نشین در من اثر کرد" کی تصدیق۔

(۲) مصنف

شخصیت کی جھلکیاں آپ دیکھ چکے۔ اب ذرا مصنف پر بھی ایک سرسری، اچٹتی، نظر ہو جائے۔

مولانا اپنی جگہ بولنے والے بھی بہت اچھے تھے۔ اور ملک کے اونچے خطیبوں، مقرروں میں گنے جاتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی جوہر کمال خوش تقریری نہیں، خوش تحریری تھا۔ اور ان کی شہرۂ آفاق عظمت کا نقیب زبان نہیں قلم تھا۔ مصنف اردو میں اور بھی اچھے اچھے پیدا کیے ہیں۔ کسی نے تاریخ نگاری میں نام پایا۔ تو کسی نے ادب و

انشاء کا جادو جگایا۔ ایک نے دینیات میں اللہ ورسول کے فرمان سُنائے۔ تو دوسرے نے قصّے کہانیوں کے چونچلے دکھائے۔ تنوّع یا ہر نگارنگی کی دولت شبلی ہی کی نصیب میں آئی۔ تاریخ ہو یا سوانح نگاری، شعر ہو یا نقدِ شعر، کلام ہو یا فلسفہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔ اب چاہے وہ چھوٹا سا مقالہ ہو یا بڑی سی کتاب، لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مستقل کتابیں لکھیں تو وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اتنی الگ جیسے ایک طرف شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر، دوسری طرف سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الغزالی اور سوانح مولانا روم اور سب سے بڑھکر سیرۃ النبی۔ تیسری طرف الکلام اور علم الکلام اور چوتھی طرف متفرق مقالے۔ جیسے جزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین اور مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ بیسوں کیا پچاسوں کی تعداد میں، پانچویں طرف الندوہ میں برسوں تک لکھے ہوئے نوٹ اور شذرے۔ اور سالہا سال تک لکھے ہوئے شاگردوں، عزیزوں، دوستوں کے نام خط، چھٹی طرف عربی میں لکھا ہوا جرجی زیدان کی تنقید و تردید میں الانتقاد۔ چھ سمتوں کے بعد اس شش جہت میں کوئی سمت باقی نہیں۔ اس سارے ضخیم دفتر میں جہاں سے جس نوشتہ کو بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے، مصنفی کے اونچے معیار سے گرا ہوا آپ نہ پائیں گے۔ اور مصنف کی زبانِ حال یہی صدا لگاتی ہوئی سُنائی دے گی۔

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

موضوع جو کچھ بھی ہو۔ تصنیف و تالیف بجائے خود ایک فن ہے جس کے اپنے قاعدے ہیں۔ ضابطے ہیں، اُصول ہیں، فروع ہیں شبلی کو یکتائی فنِ تصنیف میں حاصل تھی۔ رزم ہو یا بزم، دونوں کا سماں یکساں صحیح کھینچ دینے میں طاق، موزوں لفظ، مناسب فقرے متناسب ترکیبیں لانے میں مشاق۔ کوئی استدلال کریں گے، تو ایسا معقول کہ پہلے ہلّہ میں تو آپ کا دماغ ان کے ساتھ ہی ہی جائے گا۔ رنج کا نقشہ کھینچیں گے تو ایسا کہ آپ پر بھی جذبہ غم طاری ہوئے بغیر نہ رہے۔ مقام مسرت کی مصوری کریں گے تو ایسی کہ آپ کے دل کا کنول آن کی آن میں کھل ہی جائے۔ کسی شعر کی گرہ کھولیں گے تو ایسی کہ آپ کا بھی وجدان جھوم جھوم اُٹھے۔ معرکہ حرب وضرب کی تصویر دکھائیں گے تو ایسی کہ خود آپ کی رگ شجاعت جوش میں آجائے!

قلم پر یہ قدرت۔ وہ بھی ایسی ہمہ گیری، اس جامعیت کے ساتھ کمتر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آتی ہے۔ پڑھنے والے گویا موم کی گڑیا ہیں کہ لکھنے والے نے جب اور جدھر چاہا ان کی ناک موڑ دی اور انھیں پتہ بھی نہ چلنے پایا۔

تصنیف و تالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا تو آرٹسٹ یا فن کار کے لیے لازم ہے کہ اسے ناظرین یا تمکین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو، عبارت دقیق ہو۔ ثقیل نہ ہو، سادہ ہو پھیکی نہ ہو، سلیس ہو، سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو، عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو، رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو، ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو، مگر دور کرنے والی نہ ہو، پر زور ہو مگر پر شور نہ ہو۔ شبلی اسلوب بیان کی ان باریکیوں کے اور لطافتوں کے نزاکتوں کے محرمِ راز تھے۔

ہر جگہ انھیں خوب برتا ہے۔ اور ان حقیقتوں کو بار بار پرکھ کے دکھایا ایسے ایسے چٹکلے تو گویا ان کی جیب میں رہتے تھے۔ پھر موضوع پر عبور اور اس کے لیے پوری تیاری، یہ تو گویا فن کی ابجد ہے۔ شبلی جو کچھ کہنا چاہتے پہلے اس کے متعلق خوب پڑھ لیتے۔ اس کے مالۂ و ما علیہ کو نظر کے دائرہ میں لے آتے۔ جب جاکر کہیں قلم اٹھاتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی تحریر میں خوددار و مخلص تھے۔ وہی لکھتے جو اُن کی فہم و بصیرت میں آچکا ہوتا۔ جسے ان کا ضمیر قبول کیے ہوتا۔ اپنے قلم کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ کرایہ کا ٹٹو بن کر رہ جائے اور جس کا جو جی چاہے فرمائش کر کے اُن سے لکھوا لے۔

علمی مضمون کو ادا کرنے میں شبلی کے قلم کو اپنے معاصرین میں کاملیت کا شرف حاصل ہے اور یہ ان کا امتیاز خصوصی ہے اس کی ابتداء بے شک سرسیّد نے کی۔ لیکن فن کا بانی عموماً فن کا خاتم نہیں ہوا کرتا۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد ان سے چند قدم آگے بڑھے۔ اور سماوات اور مبادی الحکمۃ میں فلکیات اور منطق کے ہفتخواں خاصی حد تک سر کر ڈالے۔ لیکن اسے حد کمال پر پہونچانے کا شرف شبلی ہی کے لیے اُٹھ رہا تھا۔ کوئی سا بھی علمی مضمون ہو شبلی کے ہاں عبارت میں کہیں سے بھی جھول نہ ملے گا۔ اور نہ کہیں سے اناڑی پن کھلنے پائے گا۔ اور یہ شرف معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب علم اہل زبان گزرے ہیں۔ ناول اور افسانے میں انھوں نے واقعی قلم توڑ دیئے ہیں۔ لیکن انھیں کا کوئی علمی مضمون، فلسفہ و ریاضی وغیرہ پر اٹھا کر دیکھیے صاف نظر آجائے گا کہ اس میدان میں آکر وہی قلم فصاحت رقم شگفتگی سلاست، حلاوت، فصاحت کی جگہ کیسا تعقید و اغلاق کے دلدل میں پھنس گیا ہے۔ شبلی اس حیثیت سے اپنی بس آپ ہی نظیر گزرے ہیں۔ اب ان کے زمانے کو بھی اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اتنے دنوں میں زبان کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ محاورے بدل گئے، ترکیبیں نئی نئی چل پڑیں لیکن شبلی کے طرز اسلوب پر اوس اب تک نہیں پڑنے پائی، کہنا چاہیئے کہ وہی کس بل، وہی دم خم، تازگی لیے ہوئے وہی نمونہ اب بھی خاصی بڑی حد تک موجود و محفوظ۔

اور ہاں لیجیے ایک بات تو کہنے سے رہ گئی۔ مذہبیت مولانا کی تصنیفی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ شعر ہو، ادب ہو، تاریخ ہو، سوانح عمری ہو، کچھ ہو، مولانا متکلم سب سے پہلے تھے اور کچھ اور بعد کو۔ شعر العجم ایک خاص علمی، ادبی کتاب ہے، ظاہر ہے کہ شعر عجم کی اس تاریخ و تبصرہ کو مذہب سے کیا واسطہ؟ لیکن نہیں ذرا ملاحظہ ہو کہ گریز سے قبل اس قصیدۂ ضخیم کو تشبیب میں مولانا کا قلم کس رنگ کا موتی پروتا ہے:-

> "اسلام ایک ابر کرم تھا۔ اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا۔ لیکن فیض بہ قدر استعداد پہونچا جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی۔ اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی ——— جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا۔ ترک شجاع تھے۔ شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے

تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے۔ اسلام نے ان کو ممتاز کر دیا۔"

نثر کے ساتھ نظم بھی شبلی کی قلمرو میں داخل تھی۔ اور اس میں بھی درجۂ اوّل میں شامل ہونے کی منتظر ان کی فارسی غزلیں ان کے فارسی قصیدے اور دوسری فارسی نظمیں ہیں۔ لیکن قسمت نے اس باب میں جس طرح غالب کو، خواجہ عزیز لکھنوی کو اور دوسرے ہندوستانی فارسی گویوں کو محروم رکھا، شبلی کے ساتھ بھی انصاف نہ کیا۔ ایران میں ان کے کلام کی پرستش نہ ہو سکی۔ اور پرستش کیوں کیسے کہ وہاں تک اس کی رسائی ہی نہ ہو سکی۔ اور یہ کام اب ہماری یونیورسٹیوں کے شعبۂ فارسی کا ہے کہ وہ جس طرح بھی بن پڑے شبلی کے فارسی کلام کو تو ایرانی دانش گاہوں تک پہونچائیں۔

اردو میں مولانا کی چند، گنی گنی غزلیں ہیں۔ وہ ان کے ابتدائی زمانے کی ہیں اور ان کی فارسی غزلوں کی ٹکر کی نہیں پھر ایسی بھی نہیں کہ، سرے سے قابل ذکر ہی نہ ہوں۔ گنتی کے چار شعر جو زبانی یاد رہ گئے، ان سے رنگ کلام کا اندازہ کر لیجیے۔

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو کچھ ہو جائے ۔۔۔ تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں!

پاس ادب سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر ۔۔۔ میں کیا کہوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا!

تڑپنے کو ہمارے عرصۂ حشر ۔۔۔ بھلا ہوتا ہے کیا اتنی زمین سے

شبلیؔ کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے ۔۔۔ محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی

آخر زمانے میں مولانا نے "کشاف" کا نقاب چہرے پر ڈال نظمیں بہت ساری کہہ ڈالی۔ سب کی سب سیاسیات اور وقت کے چلتے ہوئے مسئلوں سے متعلق۔ اور یہ مولانا ابوالکلام کے ہفتہ وار الہلال کے افق پر طلوع ہوتی رہیں۔ زیادہ تر مزاحیہ رنگ میں ہیں اور کچھ طنزیہ بھی ہیں۔ اپنی نوعیت میں سب کی سب خوب! ایک مشہور نظم جنگ بلقان کے سلسلہ میں ہے اور ایک دردناک مرثیہ اپنے بھائی کی وفات پر ہے۔ کچھ اور نظمیں مذہبی، اخلاقی عنوانوں پر اس دور سے بہت پہلے کی ہیں۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام کی ایک قومی مسدس بھی ہے۔ تیسرے درجہ کی چیز ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ لیکن مولانا کے اردو سرمایہ میں سب سے قیمتی ان کی ایک مثنوی مختصر سی کل ۲۰ صفحہ کی۔ صبح امید کے نام سے ۱۸۸۴ء یعنی مولانا کے ابتدائی دور کی کہی ہوئی۔

بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر کی ایک چمکیلی مثال۔ مثنوی کا مضمون نہ فاسقانہ ہے نہ عاشقانہ تمامتر قومی یا ملّی ہے لیکن موضوع کی اس سنجیدگی کے باوجود ایسی بانکی، ایسی سجیلی، ایسی البیلی کہ گلزار کی اہم ادا۔ اور ترانہ شوق[1] کی ہم نوا۔ سر سید

---

[1] شوق سے مراد احمد علی شوق ہیں۔ جن کی یہ مثنوی ترانۂ شوق علیگ اس زمانہ میں نکلی تھی اور اس وقت ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔ گو آج گمنام ہو چکی ہے۔

اور ان کو تحریک اصلاح پر ہے اور مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں ہے۔ یہ دھن اس وقت چلی ہوئی تھی اور مولانا اس مثنوی کے خصوصی قدر دانوں میں تھے۔ زیادہ سنانے کا موقع نہیں لیکن دس پانچ شعر تو اِدھر اُدھر سے سُن ہی لیجیے۔ مولانا کے ترنم میں نہیں۔ محض تحت اللفظ۔ قوم مرحوم کا تعارف کراتے ہیں ؎

وہ قوم کہ جان تھی جہان کو — جو تاج تھی فرق آسمان کو
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال!
گل کر دیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کو چلا کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھویں اُڑا دیئے تھے — اٹلی کو کنویں جھنکا دیئے تھے

ماضی یہ تھا، رفتہ رفتہ ملکوں اور اقلیموں کے ساتھ علوم و فنون کی دولت بھی اس قوم کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور اب حال یہ ہو گیا تھا کہ ؎

معقول کو فقہ کو ادب کو — ہم ہاتھ سے کھو چکے ہیں سب کو
بیہودہ فسانہائے پاریں!! — زلف و خط و خال کے مضامین
وہ نوک دمژہ کی نیزہ بازی — وہ ترک نگہ کی فتنہ سازی
یہ طرز خیال تھا ہمارا! — یہ فن یہ کمال تھا ہمارا!
جغرافیۂ وجود سارا — ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
کی سیر ہی گرچہ بحر و بر کی — لیکن نہ خبر ملی کمر کی
نالوں کے جب دکھائے تماشے — گردوں کے اُڑا دیئے پرخچے

یہ عالم یاس تھا کہ ایک طرف سے رہبر کی آواز آئی ؎

دیکھا تو وہاں بہ جاہ و تمکین — آیا نظر ایک پیر دیریں!
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی!! — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم

کلام میں کچھ مزہ اگر آیا ہو، تو یہ بے مزہ حقیقت بھی سُن لیجیے کہ آگے چل کر مولانا اس مثنوی سے

ایسا بیزار ہوئے کہ اسے اپنی تصنیفات کی فہرست ہی سے خارج کر دیا۔ عجب نہیں کہ جب عقیدت سرسید سے گھٹی تو رفتہ رفتہ یہ مثنوی بھی نظر سے گر گئی۔ بہرحال وجہ یہ ہو، یا کچھ اور۔ ماننا یہ پڑتا ہے کہ شاعر یا نقاد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے حق میں انصاف ہی کرتا رہے۔ ناانصافی اور سخت ناانصافی کبھی وہ اپنے کلام سے بھی کر بیٹھتا ہے۔

(۳) مصنف گر

مولانا کی عظمت کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اردو کے عظیم ترین مصنفوں میں سے ایک ہوئے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مصنف تھے۔ ایک مجسم ٹکسال تھے۔ جس سے مصنف اور اہل قلم ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے۔ جن جن کو ان کی اتالیقی اور دست شفقت نے تصنیف و تالیف کی اونچی کرسی تک پہونچا دیا۔ ان کی مکمل فہرست کوئی تیار کرنا چاہے تو اسے خاصی طوالت سے کام لینا پڑے۔ لیکن چند نام لے دینے تو بہرصورت واجب ہیں اور چند کیا معنی جو نام سرفہرست ہے وہ ایک ہی ایسا ہے۔ جو شاگرد کے ساتھ خود استاد کے بھی نام چمکا دینے کو کافی ہے۔ اس ایک سے مراد آپ خود سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا سید سلیمان ہیں جو حقیقی جانشین شبلی اعظم کے رہے۔ ندوہ اور اس کے دار العلوم ہی کے سیاق میں نہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اور پھر آگے چلیے تو نام مولانا عبد السلام ندوی مرحوم اور مولانا عبد الباری ندوی سلمہ اللہ اور ضیاء الحسن علوی مرحوم اور مولوی اکرام اللہ سید ظہور احمد وحشی مرحوم اور حاجی معین الدین احمد مرحوم اور پروفیسر عبد الواجد مرحوم کے بے ساختہ یاد پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ اگر باضابطہ شاگردی کی قید اڑا دیجیے تو مولانا ابو الکلام مرحوم اور مولانا عبد اللہ عمادی کے سے بزرگوں کے نام بھی اس صف میں آسکتے ہیں اور اس مقالہ نویس کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ اس بے علمے کو جو کچھ بھی الٹا سیدھا لکھنا لکھانا آیا وہ بس اسی آستانہ کا فیض ہے۔ پہلے تو انھیں حضرت کے مضمون اور کتابیں پڑھ پڑھ کر ان کی نقالی میں کمال پیدا کر کے یہاں تک کہ ان کی خاص خاص ترکیبیں اور لفظ ازبر ہو گئے تھے۔ اور پھر اسی زندہ بساط کے ادنیٰ حاشیہ نشین بن کر۔

اور لیجیے یہ سارے نام تو صرف ندوہ کے سلسلے کے ہوئے باقی ۱۶ سال مولانا نے علی گڑھ میں بھی تو گزارے اللہ جانے کتنے اہل علم و اہل قلم اس علی گڑھ کے دور میں اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہوں گے۔ سید سجاد حیدر،

خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی، مولوی محمد عزیز مرزا، حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں، اور غالباً میر محفوظ علی بھی سب سے آخر میں نام وہ یاد پڑا جسے سب سے پہلے یاد آنا چاہیے تھا۔ یعنی بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق! اسے یہیں ٹانکے دیتا ہوں۔

شبلی جس پایہ کے سخن گو تھے۔ اس سے بڑھکر سخن فہم تھے۔ تنقید کا فن جتنا بھی ترقی کر جائے شبلی نے کلام فارسی پر جو بہترین تبصرے اپنی شعر العجم میں کر دیئے اور اردو کی رزمیہ شاعری اور فن بلاغت سے متعلق جو مبصرانہ نکتے۔ موازنہ انیس و دبیر میں سپرد قلم کر دیئے ہیں ان سے کوئی طالب علم چاہے ادبیات فارسی کا ہو یا ادبیات اردو کا شاید ہی مستغنی ہو سکے۔ اور طالب علم تو خیر، منتہی ہو جانے کے بعد بھی طالب علم ہی رہتا ہے۔ ان موضوعوں پر جو اچھے منجھے ہوئے اہل قلم ہیں۔ وہ بھی ان کتابوں سے روشنی ہی حاصل کرتے رہیں گے۔ اس طرح جو فلسفہ اور عقلیات پر لکھنے لکھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے بھی مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ الکلام وغیرہ کو دلیلِ راہ بنائیں اور پھر اس جڑ کو پکڑ کر اس میں پھل پھول جتنے بھی چاہیں پیدا کر لیں۔ واقعاتِ نگاری کے لحاظ سے الفاروق نمونہ کا کام دیگی۔ اور سیرۃ النبی کی تو بعض عبارتیں (خصوصاً ولادت مبارک کے سلسلے میں) اپنی دل کشی دلآویزی اثر انگیزی کے لحاظ سے کلاسیکل یا معیاری ہونے کا درجہ پا چکی ہیں۔ سلاست بیان، تحریر کی ان ساری قسموں میں قدر مشترک ہے اور حُسن ترتیب کا جہاں تک تعلق ہے شبلی نے دماغ ایسا پایا تھا۔ جیسا شاہجہاں نے تعمیر کے لیے تاج محل کا تو خیر کہنا ہی کیا، باقی جامع مسجد دہلی مسجد اجمیر وغیرہ جس شاہجہانی عمارت کو نظر میں لایئے اس کا نقشہ کتنا سڈول اور کیسا سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آئے گا۔ شبلی بھی شاید نقشہ اسی طرز و انداز کا اپنی ہر تحریر کا چھوٹی ہو یا بڑی اپنے دماغ میں تیار کر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ یہ چیز ان کے لیے امر طبعی بن گئی تھی۔ کسی خاص غور و فکر سوچ بچار کی ضرورت ہی انھیں نہ پڑتی۔ خود بخود وہ ڈھلا ڈھلایا خاکہ ان کے ذہن میں آجاتا۔ اور آگے قلم روانی سے چلنے لگتا۔ ہر تحریر کی جان حسن ترتیب ہوتی ہے۔ شبلی کے ہاں اس کی کمی نہیں افراط تھی۔ ہر بات ایسی نفسیاتی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے کہ سیدھی دل میں اُتر جاتی، ذہن پر بار کہیں سے نہ پڑتا اور پڑھنے والا کم سے کم پہلے دھلہ میں تو نیم مسحور سا ہو کر ان کا ہم خیال بن ہی جاتا۔ شرافت اور متانت یہ دو وصف تو جیسے شبلی اپنے قلم کو ساتھ لیے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ ہزاروں صفحہ ان کی تحریروں کے پڑھ جایئے۔ اور ان میں تحریریں ہر دور کی اور ہر موضوع پر نہ کہیں کوئی لفظ مبتذل ملے گا۔ اور نہ کہیں کوئی ایسا محاورہ یا ایسی ترکیب۔ جس کا بولنا ثقہ زبانوں پر بار ہو۔ جس کا سُننا شریفوں کے لیے باعث عار ہو۔

شبلی، روح پر فتوح والے شبلی! تو خوش ہو کہ آج تیری یاد منانے کے لیے ملک و ملت کے اتنے چیدہ و منتخب خوش مذاق علم دوست، بوڑھے اور جوان تیرے مزار پر اور تیرے تصنیف کدہ پر جمع ہوئے ہیں۔ تو جو چراغ جلا گیا۔

اسی سے بے شمار چراغ آج تک جل چکے ہیں۔ اور آئندہ بھی برابر جلتے رہیں گے۔ رحمت کے فرشتے ان کی عقیدت مندانہ سرگرمیاں تجھ تک پہونچا دیں گے تو مصنف ہی نہ تھا۔ معنف گر بھی تھا۔ عالم ہی نہ تھا ------ معلم بھی تھا۔ تاریخ نگار ہی نہ تھا، تاریخ ساز بھی تھا۔ تجھے حق تھا کہ دارالمصنفین سا ادارۂ تصنیف و تالیف تو نے قائم کر دیا۔ اور دارالمصنفین کا حق ہے کہ وہ تیری یاد کی شمع روشن رکھے اور تیری ہی راہ پر چل کر ملت و ملک دین و علم کی خدمت اسی طرح بجا لاتا رہے۔

تبصرہ

امراؤ جانؔ ادا کا نیا ایڈیشن

امراؤ جان ادا۔ از مرزا محمد ہادی رسوا ۳۶۰ صفحہ قیمت چھ روپے، پتا: مکتبۂ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی۔

اصل کتاب چھپے ہوئے ۷۰، ۲۷، سال گزر چکے اور کتاب مسلّم طور پر اردو کے کلاسکی ادب میں داخل ہو چکی۔ اگلی سطروں میں جو تعارف و تبصرہ ہوگا۔ وہ نفس کتاب سے زیادہ اس کے نئے ایڈیشن کا۔ اس کی ترتیب و تہذیب کے ذمہ دار کتاب کے تعارف نگار ڈاکٹر محمد حسن صاحب (استاد اردو دہلی یونیورسٹی) ہیں۔ سب سے پہلی بحث مصنف کے نام کی ہے۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر مرزا محمد ہادی رسوا، لکھ کر آیا ہے حالانکہ اس کے مصنف اب تک صرف مرزا رسوا تھے"۔ مرزا محمد ہادی تو کہنا چاہیے کہ مرتب کی دریافت ہے لیس نام کی صراحت وہ اپنے دیباچہ یا تعارف میں ضرور کر سکتے تھے۔ اور انھیں کرنا چاہیئے بھی تھی لیکن سرورق پر دڑانہ اور بے تحاشا اس کتاب کو ان کی جانب منسوب کر دینا شاید بے تکلفی کی حدود سے بھی تجاوز کر جانا ہے مصنف کو اپنے نام کا اخفا ہی مقصود تھا پھر میں یا آپ اُن کی مصلحت کا خون کرنے والے کون؟ —— خافی خان نے جو تاریخ اورنگ زیب اپنے کو گمنام کر کے لکھی ہے کیا آج کسی کو حق ہے کہ اس پر بجائے خافی خان کے ان کا اصل نام درج کر دے! لکھنؤ میں شریفوں کا ایک طبقہ انیسویں صدی کے آخر تک ایسا موجود رہا جو ناول نویسی کو (شاید وہ چونکہ مغرب کی راہ سے آئی تھی) اپنی ثقاہت و شرافت کے منافی سمجھتا تھا (حالانکہ شاعری میں بیٹا باپ کے سامنے بے تکلف اپنا عاشقانہ بلکہ فاسقانہ کلام پڑھ ڈالتا تھا) مرزا صاحب نے اسی مصلحت سے رسوا کا ایک نقاب اپنے لیے تیار کر لیا۔ اور ناول نگاری کے گورا بازار میں جب آئے نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے۔ کوئی پہچانے، کوئی نہ پہچانے رسوا تخلص شاعرانہ نہ تھا، شاعری کی دنیا میں وہ مرزا تھے مشاعروں میں غزل سناتے تو اسی تخلص سے۔

میرے سامنے تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۳ء کا چھپا ہوا موجود ہے۔ اس تک میں وہ صرف "مرزا رسوا" ہیں۔

غنیمت ہے کہ دوسرے ایڈیشنوں کے برخلاف اس اڈیشن میں مصنف کے ڈاکٹر آف فلاسفی کے قصہ کی تشہیر نہیں کی گئی ہے، یہ بوگس ڈگری مرزا مرحوم کے لیے ہرگز باعث فخر نہ تھی۔ محض بعض یاران طریقت کی اُپج تھی۔ امریکا کی ایک ڈگری فروش دکان جو نہ سرکاری حلقوں میں معتمد تھی نہ علمی حلقوں میں مستند محض مرزا صاحب کی نظر میں اسے ایسا اچھالا، چمکایا کہ اُن کی جیب سے ایک رقم اگلوا ایک برائے نام مقالہ کے عوض یہ ڈگری منگا دی۔ مرزا صاحب کی خودداری اُن اشتہاری بلکہ تشہیری ہتھکنڈوں کے ہتھے چڑھ گئی البتہ اتنی احتیاط رکھی کہ خود اپنے قلم سے میرے علم میں اس ڈگری سے کبھی کام نہ لیا[1]۔

کتاب کا تعارف دس صفحہ کا بہت اچھا اور سلجھا ہوا ہے مصنف کی شخصیت اور فن دونوں پر حاوی اور تحلیل و تجزیہ کا جامع۔ جو کچھ کور کسر رہ گئی ہے۔ وہ صرف اس کا نتیجہ ہے۔ کہ غالباً مرتب کو مصنف کے ذاتی قرب کا موقع نہیں ملا۔ دو چار معلوماتی باتیں محض اطلاعاً و مشورۃً ذیل میں عرض ہیں۔ کان میں پڑی رہیں شاید کہ کبھی آیندہ ایڈیشن میں کام آجائیں۔

(۱) مرزا صاحب عملاً جیسے بھی وارستہ مزاج ہوں عقیدۃً بڑے مذہبی تھے۔ پختہ شیعہ تھے۔ اثبات شیعیت میں ایک بڑی ضخیم کتاب تیار کر رہے تھے۔ کئی طویل و عریض جلدوں کے مسودہ کی شکل میں میں نے دیکھی تھی۔ ساتھ ہی نفس اسلام کے بنیادی عقاید، توحید و رسالت کے بھی بڑے مضبوطی سے قائل تھے۔ وہ اسی سے الحاد و دہریت کے ابطال میں کام لیا کرتے تھے۔ کہیں کہیں ناول اور ڈرامے میں بھی۔ ماہ نامہ الحکم (اسے حکم "بالضم پڑھیے) میں جو مکالمہ "آزاد" و "ہادی" کے درمیان ہوا تھا۔ وہ قابل دید تھا۔

(۲) بعض زمانے بڑی عُسرت کے گزارے ہیں۔ اُمراؤ جان ادا کی تصنیف کا زمانہ بھی ایسا ہی تھا۔ روایت مشہور یہ بھی کہ ضرورت سے مجبور ہو کر ساری کتاب ایک رات میں لکھ ڈالی تھی۔ اور دوسری صبح کو پبلشر مہادیو پرشاد دورما کے ہاتھ مسودہ بہت ہی قلیل قیمت پر بیچ ڈالا تھا، افسوس ہے کہ روایت کی تحقیق کا خیال نہ کبھی مرزا صاحب سے آیا نہ ورما صاحب سے۔

(۳) سلاست، شگفتگی، دلکشی، مرصع نگاری، سحر نگاری جو کچھ بھی ہے سب ان کے ناولوں تک محدود ہے اور امراؤ جان میں تو حسن انشا ان کا کمال شباب پر پہنچا ہوا ہے، لیکن علمی ترجموں اور مقالوں کو

---

[1] مرزا صاحب کی افراط مروت، بلکہ خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ایک مہربان نے جب اُن کے بی اے کے ڈپلومے کے بعض حصوں کو چھیل کر اپنا لینا چاہا تو مرزا صاحب نے عدالت میں جا کر گواہی ایسی گول مول دی کہ عدالت سے وہ کرتب باز زرگر صاف چھوٹ گئے۔

اٹھا کر دیکھیے تو عالم ہی دوسرا نظر آئے گا۔ اور چھوٹے منھ سے بڑی بات کا سننا اگر گوارا ہو تو بعض خشکی کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور ترجمہ میں لفظی پابندی حد سے بڑھی ہوئی۔

(۴) عثمانیہ یونیورسٹی کے کلاس تو غالباً ۱۹۱۸ء میں کھلے سررشتہ تالیف و ترجمہ ایک سال پہلے ۱۹۱۷ء میں قائم ہو گیا تھا۔ فلسفہ کے مترجم کی حیثیت سے مترجمین کی پہلی کھیپ میں طلبی اس خاکسار کی ہوئی تھی۔ سال بھر بعد جب میں نے استعفا دیا تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ اپنی حد سے تجاوز کر کے اپنی جانشینی کے لیے نام بھی تین پیش کر دیئے تھے۔ ان تینوں میں نمبر اوّل پر نام مرزا صاحب کا تھا۔ ان کا تقرر غالباً ۱۹۱۹ء ہی میں ہوا۔

(۵) سنہ غالباً ۱۹۱۷ء تھا۔ لکھنؤ (رفاہ عام) میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا جلسہ زور و شور سے ہو رہا تھا۔ اہل سُنّت کے خلاف گرما گرمی پر خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنی تقریر میں ٹوکا ایک مشہور مجتہد صاحب کو طیش آگیا۔ اپنی کرسی سے نیم خیز ہو کر فرمایا کہ "میں ایسی تقریر کا سننا حرام جانتا ہوں" خواجہ صاحب کسی سے دبنا کیا جانیں اسی ردیف و قافیہ میں جواب دیا کہ "میں ایسے جلسہ میں شریک رہنا حرام جانتا ہوں" یہ کہا اور جلسہ سے نکل آئے۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ جلسہ میں کم سے کم ایک مرد حق آگاہ اور موجود تھا اس نے خواجہ صاحب کا ساتھ دیا۔ اور وہ بھی باہر نکل آیا۔ یہ شخصیت انھیں پروفیسر مرزا محمد ہادی کی تھی۔

کتاب کا زمانہ تصنیف انیسویں صدی کا بالکل اخیر ہے۔ ۷۰، ۷۲ سال تو ہو ہی گئے۔ یہ کہانی جس زمانے کی ہے وہ اس سے بھی ۶۰، ۶۵ سال قبل کی، ظاہر ہے کہ معاشرت کا ڈھانچہ بدل گیا۔ اور زندگی کا سانچا ہی کچھ ہو گیا۔ لالٹین اور لیمپ اور چمپنی کے دور سے پہلے، اور گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں کے دور سے بہت پہلے روشنی پھیلانے والے آلے چراغ اور ڈیوٹ اور شمع دان۔ چراغ داں اور فتیل سوز مشعل اور فانوس اور کنول اور جھاڑ اور مردنگ تھے۔ انھیں اب کوئی کیسے سمجھے؟ اسی طرح سائیکلوں، ٹراموں اور موٹر سائیکلوں اور ریل اور انجن اور ٹراموے اور بسوں سے بہت پہلے قبل روایتی سواریاں شکرم اور بگھی اور فٹن اور ٹم ٹم اور ہوادار تھیں اور زنانی سواریاں ڈولی اور فینس اور چوپہلا تھے۔ اور دیہاتی سواریوں میں بہلی اور رتھ اب ان کو جاننے والے پہچاننے والے کتنے باقی رہ گئے ہیں! اور یہی حال معیشت اور معاشرت کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ کا ہے کوڑی اور گنڈے اور دھیلا الگ رہے۔ آنے اور پائی کا مفہوم بھی آج کے نوجوانوں کے دماغ میں کیسے اتار دیا جائے! ضرورت تھی کہ اس قبیل کے سارے لفظوں پر جواب نامانوس اور غریب ہو کر

رہ گئے ہیں۔ مفصل نہیں تو مختصر ہی تشریحی نوٹ ہوتے۔ اگر ہر صفحہ پر تحت اللفظ نہ ہوتے تو آخر میں بہ صورت فرہنگ تو ضرور ہی ہوتے۔ اور اس سے بھی زیادہ ضرورت قدیم محاوروں اور ترکیبوں کو روشن کرنے اور جو لفظ مطبعی غلطی سے یا کسی سبب سے بھی صریح غلط یا مشتبہ و مشکوک رہ گئے ہیں۔ ان کی تصحیح کی تھی ـــــ کہنے کو ایک فرہنگ کتاب کے آخر میں اب بھی موجود ہے۔ لیکن کل چار صفحہ کی! حالانکہ ایسی کلاسیکی ادب کی کتاب، فرہنگ چار صفحہ کی نہیں چالیس صفحہ کی مانگ رہی تھی ـــــ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے حسن ظن سے کام لے کر شاید ناظرین کو بھی اپنا ہی جیسا ماہر اردو سمجھ لیا۔ اور سب کچھ ان کی فہم و استعداد پر چھوڑ دیا!

فرہنگ نامکمل ناتمام اور ناقص تو ہئی ہے۔ جتنی اور جیسی بھی ہے وہ بھی غضب یہ ہے کہ تمام تر معتمد و مستند نہیں۔

اسم ہونا کے تحت لکھنا تھا کہ یہ محاورہ اب متروک ہے۔

بھاؤ بتانا - یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ یہ فن رقاصی کی اصطلاح ہے اور ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں کا تعلق محفل مشاعرہ سے نہیں۔

بینڈ - یہ بھی اب تقریباً متروک ہی ہے۔ یہ تو جس زمانہ میں سفر عموماً پیدل کیا جاتا تھا۔ مسافر کمر تک کپڑے سے کس لیتے تھے۔ اور اس میں روپیہ پیسہ رہتا تھا۔

اُودماتی (یا اودماتی جیسا کہ فرہنگ میں درج ہے) صحیح ترجمانی جوش شباب یا مستی سے ہو سکتی ہے۔

این مین - دوسرے ادیبوں کے یہاں اس کا املا کہیں عین مین ملتا ہے اور لغت کی کتابوں میں بھی یہی ملا۔

برق انداز - اس پر بھی حاشیہ دینا تھا کہ اب یہ تقریباً متروک ہے پہلے سپاہی کے مرادف تھا۔

تکلیف مالایطاق "تکلیف" یہاں اردو مفہوم میں اور اذیت کے مترادف نہیں بلکہ عربی معنی میں ہے یعنی ذمہ داری اور مسئولیت

پاسی "غریب کسانوں کا ایک قبیلہ" نہیں۔ نیچ اور اچھوت ہندوؤں کے ہاں ایک ذات ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہ لوگ سور پال لیتے ہیں۔ کاشتکاری اور چوکیداری کا کام دیتے ہیں۔

پاپوش جوتیاں بہ صیغۂ جمع نہیں۔ صیغۂ واحد میں "جوتی" ہونی چاہیے۔

جیوڑا اس کا "معشوق" کے مرادف ہونا یوں بھی بہت مشکوک ہے۔ کم سے کم اس کتاب میں اس معنی کا

تو کوئی قرینہ نہیں۔

چوپہلا (نہ کہ "چوپہلے") قصباتی زبان میں اسی کو میانہ کہتے ہیں۔

ڈیرہ دار طوائف۔ فرہنگ نویس کو لفظ "ڈیرہ" سے سخت دھوکہ ہوا۔ مراد وہ طوائفیں نہیں جو مختلف شہروں کے دورے پر رہتی ہیں بلکہ اونچی معزز طبقہ کی طوائفیں مراد ہیں۔ جو عموماً کسی کی ملازم یا پابند ہو جاتی ہیں۔

گنڈہ پیسہ کا مترادف نہیں بلکہ چار پیسے یا چار کوڑیوں کا مرادف ہے۔

مانگ چوٹی گرفتار۔ ایسی عورت کے لیے آتا ہے جو اپنی الجھنوں میں برابر پھنسی رہتی ہو۔ (صاحب فرہنگ اثر نے ایک باریک فرق اس میں اور ناک چوٹی میں گرفتار" میں دکھایا ہے)۔

یوسف۔ محض "مشہور پیغمبر" ان کے تعارف کے لیے کافی نہیں حسن و جمال کے لیے ضرب المثل" کا اضافہ ضروری تھا۔

کتاب کے بالکل خاتمہ پر مرتب کی طرف سے درج ہے:۔

"بد قسمتی سے ناول کا کوئی ایڈیشن چھٹے سے پہلا دستیاب نہ ہو سکا اس کے لیے اس کے مطابق مسودہ شایع کیا جاتا ہے۔"

یہ معذرت نہ کچھ زیادہ صحیح اور نہ دقیع۔ اوّل تو پرانے ایڈیشن ابھی ناپید نہیں ہوئے ہیں۔ اردھ کے اکثر پرانے کتب خانوں میں کوئی نسخہ ضرور نکل آتا بلکہ اگر جامعہ کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا تو عجب نہیں کہ کچھ اللہ کے بندے اپنے نسخے پیش کر دیتے۔ اور پھر پہلا ایڈیشن جیسا غلط سلط چھپا کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ اور پچھلے ایڈیشن والے اس کو بجنسہ چھاپتے اور مکھی پر مکھی مارتے چلے آئے۔ کسی نے اتنی سی بھی محنت گوارا نہ کی، کہ موٹی اور صریحی غلطیوں کو تو درست کر دیا ہوتا! —— مجرم سب سے بڑھ کر میں خود ہوں کہ مرزا صاحب کی زندگی میں اتنی مدت تک موقع پانے کے باوجود بھی مشتبہ ، مشکوک عبارت کے سلسلے میں کبھی ان سے رجوع کی توفیق نہ ہوئی۔

اب آخر میں کچھ اور گزارشیں اس سلسلہ کی ملاحظہ ہوں:۔

(۱) کہیں کہیں کوئی فقرہ مکرر چھپ گیا ہو۔ اس کی تصحیح ضروری تھی۔

(۲) جو لفظ اور ترکیبیں زنانی بولی کے ساتھ مخصوص ہیں ان پر نوٹ دینا ضروری تھا۔

(۳) صنہ؟ پر ختم کے قریب لفظ 'سلام' مونث استعمال ہوا ہے "لوگ جھک جھک کر سلامیں

کرتے تھے"۔ اسی طرح کتاب میں دو جگہ یہ فقرہ درج ہے" دوزخ کے کندے پڑتے ہوں گے"۔ دوزخ کے کندے ہوں گے۔ یہ ترکیب تو عام طور پر مستعمل ہے لیکن کندے "پڑنا" نامانوس معلوم ہوا ــــ اگر یہ اغلاط محض مطبعی ہیں تو انھیں دُرست ہو کر آنا تھا ــــ اگر یہی الفاظ مصنف کے ہیں تو انھیں تفردات مرزا میں شمار کرنا ہوگا۔ (ہر امام فن کے کچھ اپنے تفردات بھی ہوتے ہیں۔ ان میں وہ اپنے ہم عصروں سے الگ ہوتا ہے۔

(۴) بیگم کے ساتھ تعظیمی لفظ "صاحبہ" کتاب بھر میں بیسیوں بار آیا ہے لیکن اسی کثرت سے "صاحب" بھی۔ میرے کان میں آواز پڑی ہوئی ہے کہ اہل زبان کے روزمرہ میں لفظ بیگم کے ساتھ صرف "صاحب" "صاحبہ" نہیں ــــ کتاب سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک دونوں یکساں جائز ہیں۔

(۵) اشتعال سے الگ اور اس کے عام معنی سے ایک جگہ "اشتعالک" ایک زنانی آواز میں "ترغیب" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس پر نوٹ ضروری تھا۔

(۶) "ایک ہی لکھا بیسوا تھیں"۔ ملک آئین کے ایک صدر الصدور کے صاحبزادے "یہ بڑا قابوچی ہے"۔ اگر کچھ زیادہ بڑبھس کریں گے تو انھیں کوتوالی کا چبوترہ دکھاؤں گی"۔ بیسویں فقرے، محاورے روزمرہ تلمیحات کتاب بھر میں مشتبہ صورت میں پھیلے ہوئے ہیں ان سب کو آج کا پڑھنے والا بغیر کسی تحقیق و توضیح کے کیا سمجھے گا۔

(۷) صـ۸۴ کے شروع میں ایک فقرہ ہے" مشاعروں میں ڈریا لے گئے"۔ یہ لفظ ڈریان "اپنی کم استعدادی سے نہ سمجھ سکا اور نہ لغت سے اس کا پتہ چلا سکا ممکن ہے کہ یہ بھی تفردات مرزا میں داخل ہو۔

(۸) صـ۲۱۲ پر ایک فقرہ ہے" دوسرے کی مثال ہے جیسے فریاد رس الٰہی" اب آج اس تلمیح کو کون سمجھے گا۔ اور منتہی طلبہ بلکہ استادوں میں بھی کتنے اس تلمیح کے سمجھنے والے نکلیں گے!

(۹) صـ۱۱۴ پر فقرہ ہے" ان کو کوتوالی کا چبوترہ میں دکھاؤں گی"۔ اس 'کا' پر دل کھٹکا۔ عجب نہیں کہ یہ محض کوتوالی چبوترہ ہو۔ چبوترہ تو پرانی اردو میں تو خود کوتوالی کا مترادف ہے۔

(۱۰) صـ۱۳۰ میں یہ لفظ "خاگینہ" جس سیاق میں آیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس سے مراد اس کا معلوم و معروف مفہوم یعنی کچلا اور تلا ہوا انڈا نہیں بلکہ عجب نہیں کہ غریبانہ ناشتہ چٹنی پھلکی کی قسم کا مراد ہو۔ (جیسا کہ راقم سطور کو گھر کی ایک لکھنوی خادمہ کی زبان سے معلوم بھی ہوا تھا) افسوس ہے کہ فرہنگ آصفیہ

اور نور اللغات اور مہذب اللغات تینوں بالکل خاموش ہیں۔ صرف پلیٹس Plates نے اشارہ PAN-CAKE لکھ کر کردیا ہے۔ بعض لفظ اپنی جگہ پر صحیح تو بالکل ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا استعمال وسیع و عام نہیں ہوتا ہے محدود و قلیل ہی طبقہ تک ہی رہتا ہے۔ اس لیے اہل لغت کی نظر بھی چوک جاتی ہے۔

مکتبۂ جامعہ قابل داد ہے کہ اس نے معیاری ادب کے سلسلہ میں کتاب کا انتخاب خوب کیا۔ فسانہ آزاد کے بعد امراؤ جان ہی ایسی کتاب ہے جو لکھنوی تہذیب و زبان او ثقافت کا حق پورا ادا کر رہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مرتب صاحب نے ضرورت سے زیادہ شرافت نفس سے کام لے کر اور ناظرین کی فہم و استعداد و معلومات پر تکیہ و اعتماد کر کے ان پر ظلم عظیم کر ڈالا۔

منقول از صدق جدید ۱۰ر دسمبر اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۱ء

خیر مقدم

لکھنؤ کی زبان سے[1]

(خیر مقدم لکھنؤ کی زبان سے تو ہے ہی، خدا کرے کہ لکھنؤ کی زبان میں بھی ہو۔ "سے" اور "میں" میں جو فرق ہے۔ بالکل واضح ہے)

[یہ خاتون محترم جو آپ کے درمیان تشریف لائی ہیں ان کی منصبی حیثیت سے تو آپ سب ہی خوب واقف ہیں۔ میرا رشتہ اُن سے یہ ہے کہ یہ بیٹی ہیں جواہر لال کی جو لکھنؤ کی تہذیب پر فدا تھے۔ اور پوتی ہیں موتی لال کی جو اُردو پر مِٹے ہوئے تھے]

آیئے آیئے، میری سرزمین پر مہمان کرام! آیئے اور ایک زنانہ محاورہ میں جم جم آیئے! اور نزول اجلال فرمایئے میرے فرش پر ادب وصحافت کے عرش سے، تشریف لایئے دہلی یا شاہجہان آباد سے، آگرہ یا اکبر آباد سے، پٹنہ یا عظیم آباد سے۔ رامپور دالسرور سے، بھوپال دار الاقبال سے، میسور سرا پا نور سے، بمبئی بندر سے، کلکتہ ساحل سمندر سے۔ حیدر آباد فرخندہ بنیاد سے۔ مدراس مینو اساس سے۔ گجرات معدنِ برکات سے، اور کاش میں یہ بھی کہہ سکتا کہ ڈھاکہ سے اور چاٹگام سے، لاہور سے اور ملتان سے!

آپ سب اردو ہی کے رشتہ سے جمع ہوئے ہیں۔ اردو کا رشتہ ملک گیر ہے، ہند گیر ہے اور ہر اُردو زادہ قدرۃً وطن زادہ ہے۔ بلکہ وطن کا دلدادہ!

اردو اور وطن میں کوئی ٹکراؤ کیسا، باہم رشتۂ اتحاد ہے نقطۂ اتصال ہے، وحدت ہے۔ عینیت ہے۔ یا اگر ایک بھاری بھرکم جناتی اصطلاح کے بولنے کی اجازت ہو تو کہنے دیجیے کہ مساوات متماثلہ ہے اور وطن پکار پکار کر اردو سے کہہ رہا ہے کہ

جو تیرا نہیں ہے وہ میرا نہیں ہے

---

[1] ۱۰ر نومبر ۱۹۷۳ء کو اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی کانفرنس (لکھنؤ) میں یہ خیر مقدم مہمانوں کی خدمت میں مولانا عبد الماجد نے پڑھ کر سنایا۔

میری سرزمین کو اردو صحافت میں اوّلیت کا دعویٰ نہیں، نہ دہلی سے یا لاہور سے یا کلکتہ سے کوئی لاگ ہے، رقابت ہے لیکن اتنی عرض ہے کہ میں اتنا پیچھے بھی کسی سے نہیں کہ ہم چشموں میں پھسڈی کہلاؤں اور دوسرے شہروں سے شرما کر اپنا منہ چھپاؤں۔ اُنیسویں صدی کی تین ہی چوتھائیاں گزری تھیں کہ منشی نولکشور کی عنایت سے میری ہی سرزمین پر اردو صحافت کی شگوفہ کاری ہوئی۔ اور روزنامہ اودھ اخبار کے نام سے ایک ثمر نورس و شیریں کی دھوم مچی۔ منشی صاحب کی خوبیاں کیا کیا بیان ہیں۔ عجیب و غریب شخص تھے اچھے خاصے عاقل و فرزانے لیکن اردو کے پیچھے دیوانے! اردو کا پریس بڑے پیمانہ پر قائم کیا اور ہندؤں کے لیے جو کچھ چھپوایا، وہ تو خیر تھا ہی مسلمانوں کے لیے خالص اسلامی علوم قرآن مجید۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف۔ کلام کی سیکڑوں نہیں ہزاروں جلدیں چھاپ ڈالیں میرے شیر نے۔ اور بس اسی پر نہ کیا۔ روزنامہ اودھ اخبار نکال کر رہے۔ کیا کہنا اس کی شان کا اور آن بان کا۔ اب کہ سو برس ہوا ہی چاہتے ہیں اس کا اندازہ کرنا ایسا ہی دشوار ہے جیسا کہ پرانے پانیر کے اثر و اقتدار کا۔ ہیبت و جبروت کا۔ چھوٹے بڑے سب کے مذاق کی رعایت رکھنے والا۔ قشقہ و تسبیح دونوں کے احترام کا دامن تھامے رہنے والا۔ اخبار کی پالیسی اپنی مالک کی طرح مرنجان مرنج، شریف دوست۔ شریف نواز۔ شریف پرور۔ پالیسی کا خلاصہ ایک ایک کی دلدہی۔ دلداری، غم خواری' ایڈیٹر کبھی دہلوی اور کبھی لکھنوی۔ کبھی شیخ اور کبھی برہمن۔ کبھی سال خوردہ غلام محمد طپش دہلوی اور کبھی جوان رعنا شوکت تھانوی۔ ابھی دوارکا پرشاد افق لکھنوی اور ابھی منشی جالپا پرشاد۔ کس کس کے نام گنایئے اور کس کس کی یاد سے دل کو گرمایئے۔

البتہ یہ عرض کرنے سے کیسے باز رہوں۔ فخر سے اپنا سر اٹھائے ہوئے اور خودداری سے اپنا سینہ پھلائے ہوئے کہ اُردو کے دو بہترین ادیب و افسانہ نگار میں نے ہی اسی صحافت کی راہ سے اُردو کو دیئے ہیں۔ نام آپ سُنیں گے؟ ایک عبدالحلیم شرر نامدار، دوسرے فرد فرید رتن ناتھ سرشار۔ یہ دونوں زندہ جاوید فرزند میری ہی گود کے کھلائے ہوئے تھے۔ دونوں کی شہرت کی بنیاد اودھ اخبار کی ایڈیٹری ہی کے زمانہ میں پڑی۔ پہلے خلقت نے ان دونوں کو اودھ اخبار سے جانا۔ اور پھر اودھ اخبار کو ان کی شہرت کی روشنی میں پہچانا۔

اور لیجیے اودھ پنچ کا نام اب بھی بہتوں کی یاد میں تازہ ہوگا۔ اس کے ایڈیٹر سجاد حسین کاکوروی کی بذلہ سنجی اور زباں دانی ایک عالم کو گرویدہ کیے ہوئے تھی۔ اور زباں دانی سے بھی بڑھ کر ان کی "زبان آوری" کہ ہنسی ہنسی کسی کے چٹکی لے لی۔ اور کسی کے گدگدی کردی۔ بلکہ "زبان درازی" بھی کہ جیسے اس کو انگوٹھا دکھا دیا

اور اُس کا منھ چڑھا دیا۔ اور جو کبھی لارڈ کرزن کے سے دبدبہ والے اور طنطنہ والے بڑے لاٹ صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی تو بھری محفل میں ان کی کرکری کر دی!

...... گوکھلے کی وہ پھٹکار اور وہ مہتا کی ڈپٹ!

آنریبل مسٹر گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتا وقت کے مشہور ترین ارکان کونسل تھے۔

تو جو جانے پہ ہو راضی۔ تو قسم سر کی ترے
کر کے چندہ تجھے لے دیں گے ولایت کا ٹکٹ

اور نظم کے آخری میں یہ ٹھنڈی گرمیاں ؎

حضرت پنچ سے بگڑیں گے تو بن جائیں گے
لاٹ صاحب کو مناسب نہیں یاں جھلاہٹ

بیسویں صدی کے شروع میں یعنی آج سے کوئی ۶۵، ۶۶ برس پہلے یہ حرف گستاخانہ کسی اور کی زبان سے بھلا نکل سکتے تھے؟

یہ نظم پنچ کے مایۂ ناز نامہ نگار برج نرائن چکبست کے قلم سے تھی۔ اودھ پنچ کے دوسرے مضمون نگاروں کے نام بھی آپ سن لیں۔ جوالا پرشاد برق۔ میر اکبر حسین، اکبر الٰہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر، اور سجاد حسین انجم کسمنڈوی۔

حضرت ریاض خیر آبادی کا ہفت روزہ ریاض الاخبار کا مستقل مستقر تو گورکھپور رہا۔ لیکن میرے فخر و نازش کے لیے یہ کافی ہے کہ اس گل تر کی چمن بندی کچھ روز میری سرزمین پر بھی رہی ہے۔

تفریح نام کا ایک تفریحی پرچہ منشی رام سہائے تمنّا کی ادارت میں یہیں سے نکلا۔ اور کارنامہ کے نام سے ایک اور ہفت روزہ شاید اودھ اخبار سے بھی قدیم تر یہیں مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی کے سایہ میں داد صحافت دیتا رہا۔ اور فسانۂ عجائب کی مقفع، مسجع، مطلّا اردو کی یاد تازہ کیے رہا۔ اور اکیلا وہی نہیں اسی ردیف و قافیہ میں ایک پندرہ روزہ پرچہ جامع الاحکام بھی اپنی بہار دکھاتا رہا۔ فقہ و دینیات کا ترجمان نہیں سرکاری گزٹ عدالتی و انتظامی دونوں شعبوں کا اور ایک اور بھی ماہ نامہ مرأۃ ہند کے نام سے کشمیریوں کا نکالا ہوا۔ مطبع بہار کشمیر سے اپنی بہار دکھاتا رہا —— شرر صاحب کا مہذب اور منشی نثار حسین کا ظریف دونوں میرے ہی فرزند دلبند رہے ہیں اور ہفتہ واروں کا ذکر جب چھیڑا ہے تو کوئی مولانا عبد الشکور کے النجم کو اور

مرزا محمد ہادی مرزا کے الحکم کو اور محمود علی فلک کے رفیق ہند کو کیسے بھول جائے! ـــــــ اور نداء ملت اور عزائم اور تعمیر حیات، نظارہ اور سرفراز تو آپ کے سامنے ماشاء اللہ موجود ہی ہیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء تھا اور مسلمانوں میں تحریک آزادی نئی نئی پیدا ہوئی تھی کہ میری ہی سرزمین سے مسلم گزٹ نکلا۔ اس ہفتہ وار کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی تھے اور اس کے مالک میرے ہی ایک فرزند سید میر جان۔ اس پرچہ میں روح پھونک دی تھی مولانا شبلی نے۔ خوب جم کر یہ پرچہ ساتھ دیتا رہا کلکتہ کے الہلال کا اور دہلی کے ہمدرد کا اور لاہور کے زمیندار کا، اور اُن کا ہم آواز بنا رہا۔

ہفتہ واروں سے گزر کر جب ماہناموں کا نام آئے گا تو ایک بار پھر فخر سے گردن اٹھا کر عرض کروں گا کہ مولانا شبلی کے ماہ نامہ الندوہ نے مدتوں تحقیق علمی و ادبی کی داد میری ہی سرزمین سے دی ہے اور مولانا شبلی کے ساتھ اسی سلسلہ میں سید سلیمان ندوی اور ابو الکلام آزاد۔ اور عبد اللہ عمادی اور عبد السلام ندوی کے نام لوح حافظہ پر قدرتاً اُبھرتے ہیں کہ چاروں نام بھی اس بڑے نام کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔

اب کچھ ماہ ناموں کے نام بھی آپ کو سناؤں ایک شرر مرحوم کا مشہور و معروف دلگداز دوسرا انھیں کا مشہور مورخ۔ ایک تیسرا خواجہ غلام الثقلین کا بلند پایہ عصر جدید اور ماہ ناموں ہی کے سلسلہ میں ظفر الملک علوی کے الناظر اور نوبت رائے نظر کے خدنگ نظر اور بیا پیارے لال شاکر میرٹھی کے العصر اور قاضی تلمذ حسین کے الحکیم و شحیم لسان العصر، چکبست کے صبح امید۔ نیاز فتح پوری کے نگار اور عبد الوالی کے معلومات کو اور شعری و ادبی پرچوں میں منشی نثار حسین کے پیام یار۔ بشیر کے رسالہ سخن سنج اور علی محسن ابر کے معیار کو تاریخ صحافت سے کوئی کیونکر محو کر سکتا ہے، یہ سارے پودے اسی چمن سے اُگے اور اپنے اپنے وقت میں پوری بہار دکھلا گئے۔ بہ طور ضمیمہ یہ بھی سُن لیجیے کہ منشی نوبت رائے نظر کے خدنگ نظر کا درجہ کیا بہ لحاظ قدامت اور کیا بہ لحاظ معیار ادب ان سب میں ممتاز رہا ہے۔ اور اسی سلسلہ کی زندہ یادگار کتاب، اور فروغ اردو اور زنانہ رسالہ حریم اور دینی ماہ ناموں میں الفرقان اور سرکاری رسالہ نیا دور تو آپ کے سامنے حاضر ہی ہیں۔

اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء تھا کہ شیخ شاہد حسین قدوائی کی طلبی پر سید جالب دہلوی نے دہلی سے آکر یہاں بڑے آب و تاب سے روزنامہ ہمدم نکالا اور وہ پرچہ دس بارہ برس تک پوری شان سے لکھنوی صحافت کا نام اونچا کیے رہا۔ اور جب ہمدم سے میر صاحب الگ ہو گئے۔ تو ہمت کر کے اپنا ذاتی روزنامہ ہمت کے نام سے نکال دیا اور اپنے آخر دم تک اُسے نکالتے رہے۔

میر صاحب ہی کے ایک شاگرد انیس احمد عباسی تھے۔ اور "تھے" بہ صیغۂ ماضی کیا معنی ماشاء اللہ ہیں بہ صیغۂ حال۔ ۱۹۱۹ء میں ان کی ادارت میں پہلے تو ایک ہفتہ وار نکلا حقیقت کے نام سے اور پھر یہ روزنامہ ہوگیا۔ اور یہی سرگزشت عبدالرؤف عباسی کاکوروی کے اخبار حق کی رہی، کچھ دن ہفت روزہ اور کچھ دن روزانہ۔ اور حقیقت کے ہم عمر کم سے کم تین پرچے اور نکلے ایک اخوت، دوسرا استقلال، تیسرا سیارہ۔

ملک میں تقسیم سے پہلے جو زور مسلم لیگ کا بندھا تھا وہ تو بہتوں کی یاد میں ہوگا۔ لیگ کے ایک بڑے لیڈر چودھری خلیق الزماں میرے ہی لخت جگر تھے، سالہا سال تک میرے میونسپل بورڈ کے صدر۔ انھوں نے شوکت و شان اور پوری آن بان کے ساتھ ایک روزنامہ نکال دیا۔ تنویر۔ اور جب تک لیگ کا زور رہا، وہ بھی اپنی چمک دمک دکھاتا رہا۔

تحریک آزادی نے جب خوب زور پکڑا تو میں دوسرے شہروں میں کیوں کسی سے پیچھے رہنے لگا تھا۔ کانگریس نے پہلے تو ایک ہفتہ وار ہندستان نکالا اور پھر ایک پُرقوت روزنامہ قومی آواز کے نام سے حیات اللہ انصاری فرنگی محلی سے نکلوادیا۔ اس نے کانگریس اور نیشنلزم کی تبلیغ کا حق ادا کردیا۔ انصاری صاحب تو اپنی میعاد پوری کرکے ریٹائر ہوگئے۔ باقی روزنامہ اسی طرح رواں دواں ہے اور اس کے مدیر شہیر آپ کی اس کانفرنس کے صدر استقبالیہ ہیں۔

منشی گنگا پرشاد ورما کا نام میرا کوئی شہری کیسے بھول سکتا ہے پرانے ہوجانے پر بھی یہ حضرت امین آباد پارک کے خالق، نئے ہیں، ان کا سہ روزہ اخبار ہندوستانی اردو کی خدمت سالہا سال کرتا رہا اور ان کے بعد پنڈت کشن پرشاد کول نے اسے مدتوں چلایا، اور یہی کول صاحب چکبست کے ماہ نامہ صبح امید کے بھی شریک کار ہے۔

میں ہرگز دہلی، لاہور یا کسی شہر سے بھی تفوق یا برتری بلکہ ہمسری کا بھی دعویدار نہیں، البتہ اس مختصر سرگزشت سے صرف اس قدر واضح ہوجائے گا کہ میری خود گزشت ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ مہمانانِ کرام کے سامنے سرتاسر خجل اور مجرم بن کر آؤں۔ اجازت ہو تو مولانا محمد علی جوہر کا ایک شعر پڑھ کر خاموش ہوجاؤں۔

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے دلے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

چند مقدمے

کلام جوہر[1]

مقدمہ

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ۔ امیر تسلیم۔ جلال۔ عروج۔ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی۔ ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاران کی نظر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا۔ اس لیے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں۔ جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو)

آیا دہلی سے ایک مشکی خر
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجیے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

---

[1] تحریر ۱۹۲۵ء

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے۔ جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا "کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں"۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے۔ جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے انھیں کے چند شعر انھیں سنا دیئے۔ سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس "بچے" کو ضرور لایا کرو جناب والا اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بڑھ چڑھ کر ہے سنیے۔ میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش سنہ ۱۸۷۸ء کی آواخر کی ہے۔ میں نے دس برس کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے۔ اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری (OFFICIAL BIOGRAPHY) یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کے نذر کیا جائے، یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑ ونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑ ونٹے ہی کی کہانی اور مطلب صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب دہی ہمارے سر آ پڑے، آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا اوپچنے والا سیرۃ نگار باوجود نقاد سخن ہونے کے محض لطیل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لیے میری لچر پوچ گوئی باقی نہ رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے کہ گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی، پھر اس کا حلیہ پوچھا جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرع طرح

اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ۔ اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذو الفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج دیونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر صغیر "اصغر"۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدہ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبز خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارہ، جمال" لاکھ سہی اور "گرہ میں مال بھی سہی" تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے، مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد کپڑے پھاڑے گھر کو آئے تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر یہی۔ البتہ پچھلے دو تین برس سے عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں، مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے، چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لیے یہ

بھیجتا ہوں (TOUCH STONE) کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں (POOR THING BUTOWN MINE) اب رخصت ہوتا اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں...... (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں۔"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے تاریخ اس پر ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے اس وقت کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۹۱۶ء کے شروع میں اسی نظر بندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی۔ پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں۔ کسی والانامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیئے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ "اور عنایت ہو" عنایتیں مسلسل ہوئیں دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب کھلے ذرا کچھ فرمایئے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا گر کب سیکھا! کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا! جواب مفصل مرحمت ہوا۔ آپ اوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دینا میں کہیں سوچ بچار کر کے۔ ٹھہر ٹھہر کے۔ اور غور کر کے لکھے جاتے ہیں؟ بیچارے کو خیال تک نہ ہوگا۔ کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریر بھی چھپ کر تصنیفوں کا جزو بن کر رہے گی ـــــ اس تحریر کی اشاعت سے قبل دنیا کو خبر ہی نہ تھی، کہ محمد علی اردو کے شاعر بھی ہیں۔

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اوّل اوّل جانا، تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں۔ بولتے خوب ہیں، علی گڈھ کے فدائی ہیں، قوم کے "شیدائی" ہیں۔ مخلص ہیں، پر جوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندستانی طلبہ کی مجلس نورتن کے نام سے قائم کی۔ خود ہی صدر بنائے گئے، یا (کانگریسی اردو میں) چنے گئے۔ لوٹ کر آئے بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے اپنا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندستانیوں سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری، واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے ہر طرف ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی۔ شیکسپیئر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علی

ایڈیٹر نہ تھے۔ ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر لیڈر تھے اب قوم ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی مجنونانہ ادھر لپکے بلقان میں اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علی کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ اور اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگارِ زمانہ طبّی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لیے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامۂ خونیں پیش آیا محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ـــ اب ان کا شمار ہوشیاروں میں۔ عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے! مست الست!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے، چیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی۔ خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ! آہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم آخری بار لہرایا۔ محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منھ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں اکٹھے پانچ برس کی عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے۔ اس میں پانچ پانچ برس یوں ہی زبان بندی، معطلی کی نذر۔ شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں۔ مہر ہی مہر لیکن حقیقت مہر کبھی کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو معاملہ سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؎

عشقِ معشوقاں نہاں ست و ستیر
عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چکے تھے سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظر بندی تو نکلی ردِّ سحر ۔۔۔ دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لیے نقد مطالبہ تو نقد جاں کا ہوتا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا! ۔۔۔ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے حصہ بقدر جثہ' یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ے

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِدار دیکھ کر

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے۔ اسی نظربندی کے زمانہ میں ایک بار وطن کا سفر کر رہے تھے۔ ریل پر ملاقات ہوئی، پوچھا "رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں" فرمایا ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کروں۔ نظربندی اور اس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پیترے۔ ادھر ہندستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان، شروع ۱۹۲۰ء کا تھا کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں، وقت کی ضرورت ناگزیر یہ کہ موضوع تقریر صرف تحفظ خلافت ہی رہے۔ لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا۔ چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی! ے

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی تھا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڈھ میں ڈال چکے تھے۔ اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے اور جکڑے گئے ۱۹۲۳ء تک کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ سرکار والا کے مہمان رہے۔ اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین، رفعت میں آسمان کا دامن چھو کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روئداد تو کان لگا کر سن ہی لیجیے۔

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت

ایک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں!

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ استقبال میں پیش پیش وہ جن کے ہاں وطن مذہب سے عزیز تر۔ اور دنیا، دین پر مقدم۔ کانگریس کے صدر دسمبر ۲۳ء میں منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا،

سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر! — وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ چاروں دل وجان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ، دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنی نازوں کی پالی لختِ جگر کے لیے یہ خبر سُن کر کیسا کچھ پھڑپھڑایا ہوگا۔ دل پر کیا کچھ بیت گئی ہوگی! بیٹی سے عالمِ خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں   تجھ سے میں دُور سہی وہ تو مگر دُور نہیں

دوا دَرمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ یہاں وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا تھا رنجور و مہجور بیٹی کی شکل تک دیکھنے سے مجبور تھا!

امتحان سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا   جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ   اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے، اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے رو کر اور گڑگڑا کر یہ عرض و معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا

تُخرِجُ الحیَّ مِنَ المَیِّتِ مذکور نہیں؟

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم

آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دُور نہیں ،

اب اس کے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو

نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا۔ اسے قبر میں بھی اُتارا۔ ۱۹۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصبِ خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھیے کہ محمد علی پر کیا گزر کر رہ گئی۔ خلافتِ اسلامیہ کا مٹنا قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہا۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر، جھلس کر رہ گئے ۱۹۲۴ء سے آغاز ۱۹۳۱ء تک زندہ ضرور رہے اور بہت سے زندہ دلوں سے کہیں بڑھ کر

زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے۔ اور بچھڑے۔ لڑے اور روٹھے۔ ۱۹۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی، اور سال ہی بھر بعد ۱۹۲۹ء میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ دوبارہ نکالا۔ ہمدرد کو پھر سے زندہ کیا اور دونوں کو کچھ دن بعد بند کرنا پڑا، کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انقرہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا۔ لیکن دل کی کلی جو الغاء خلافت سے مرجھا چکی تھی۔ پھر نہ کھلنا تھا نہ کھلی۔ شاداب نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہیے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لیے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندو سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا، یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر! مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی چوتھی تاریخ اور شعبان ۱۳۵۰ھ کی پندرہویں شب میں عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی۔ مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! شاید اس لیے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس نعمت کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے، آزادی محمد علی کے ملک کو کیا ملتی۔ محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ عمر کل ۵۳ سال کی پائی۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلۂ اول میں ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبالؔ نے کہا ذرا دیکھنا اپنے رسول کا یہ عاشق و غلام جا کس راستے سے رہا ہے۔ ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر اس مدفن پر رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور و شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی یا دہلی میں نہیں۔ سارے ہندستان میں ہوا، ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ، گاؤں گاؤں میں ہوا۔ سارے عالم اسلام میں ہوا۔ اس کی نظیر تاریخ امت میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائرین کا ہجوم رہا کرتا ہے۔ مجاوروں کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر　　یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لیے ضرورت نہ کسی تمہید کی۔ نہ دیباچے کی۔ نہ پیش نامہ کی۔ ورق اُلٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجیے پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منھی سی کتاب جب جو حصہ چاہیے کھول لیجیے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے

محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں، شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیمان پر
تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش!
تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا!
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں، زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں۔ ۱۹۰۷ء علی گڑھ میں لڑکوں نے انگریز استادوں کے خلاف اسٹرائیک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی تھی محمد علی آتے ہیں۔ اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے لرزتے نہیں ان پر ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو

ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو

وہاں ضائع نہ ہو گی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں

اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا

جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تمہیں ہو زندہ جاوید باقی جانے والے ہیں

نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا ۱۹۲۸ء ہے اور — اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں۔ یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو۔ انگریزی کے زبردست انشا پرداز کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان تندرست سر شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی۔ اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین	کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے	ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
اے مرے رند، بادۂ حق کے	ابھی دو چار خم پیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی	کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ	ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے شعر کہتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر نہ اصلاح

نہ ترمیم۔ بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے یہی حال نثر کا تھا، یہی حال نظم کا، زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظر بندی" کا تھا، لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت نظر کشائی کا قرار پایا۔ خوب خوب پتے کی کہنے لگے ؎

سوز دروں سے جل، بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈ کے سب تھک گئے اُسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سُنئے :-

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے
یہ کیا کہ مئے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دَورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو!
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

حنا کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا لیکن ذرا دیکھیے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل!
ھل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالیؔ کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب ٭ بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حالیؔ بہرحال ایک مسلم استاد تھے۔ جوہران کے مقابلہ میں مبتدی اور نوآموز جیسے شعر و شاعری سے فنی واقفیت کے لیے زندگی بھر چند لمحہ کے لیے بھی فرصت نہ ملی پھر بھی جوابی شعر کچھ ایسا ہیٹا ہنہیں رہا ہے

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں　　آتا ہے لطف جرم تمنّا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے

اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر، ہندستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا

بولیں اماں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ کہنا تو محمد علی کی بی اماں کا تھا اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے

پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؓ کو

خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے۔ یا اپنی آٹو بیاگرفی (خودنوشت سوانح عمری) "آپ بیتی" قلم بند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا

سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت

پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے　　اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لیے ہے

محمد علی کا کلیجہ آخر عمر میں جنھوں نے اپنوں ہی کے طعنوں سے چھلنی ہوتے دیکھا ہے وہی کچھ اس "شاعری" کی قدر کر سکتے ہیں۔ اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لیے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحب "معارف" مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان بھی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا۔ ع

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لیے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو ۱۹۲۲ء میں جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا، جیل کے اندر اخبار کا گزر نہیں۔ بیجاپور کا جیل جو آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں، دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے۔

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی!
سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلیے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا	تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی![1]
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا	اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اسکے باب میں	کب ہو گی لامکان سے مشیت مکین کی
تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہ	ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی[2]

"اسی گھر" کے جنوں نے تو خود اپنا گھر چھڑایا۔ اور جلا وطن بنا رکھا تھا رامپور میں پیدا ہوئے تھے، بڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی

---

[1] تلمیح ہے آیۂ کریمۂ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن، کی طرف۔

[2] اشارہ ہے مسیحیوں کے عقیدہ توحید فی التثلیث کی طرف۔

گو یہ مستقل جلاوطنی بھگتنی پڑے جب قدر معلوم ہو، ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ہم نہ تھے ان کے آستانے کے
ایک اک کر کے سب کے سب تنکے ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھیے اب یہ گردش تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی تنہائی۔ بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں۔ سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھایا۔ راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ لاتے پتے اس عالم کے بھی دیتی چلی گئی[1] ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں !!
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں !
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی ہم نے بھی تو سوغاتیں

قربان ہو جائیں ایسی قید پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزارہا آبادیاں، مشت خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا جب جب تپ کر دہک کر لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے جو ہر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی رہ کہاں گئی تھی بہ۔ ایک دیوانہ تھا جسے ایک دوسرے دیوانے

---

[1] یعنی فاضل گرامی مولانا مناظر احسن گیلانی نظم کے باقی اشعار سیرت محمد علی (رئیس احمد جعفری) میں ملیں گے۔

نے مرنے کے بعد بھی بلا ظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا اور خوب ہی کہہ ڈالا ؎

بدین مصطفےٰ دیوانہ بودی — فدائے ملت جانانہ بودی!

سیاست را نقاب چہرہ کردی — وگرنہ عاشق مستانہ بودی

سیاست تہمتے بر عشق پاکت — ز آئین خرد بیگانہ بودی

رمیدی از رہِ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

زبان پر آئی ہوئی واہ کا غلغلہ بس، یہیں محفل کے فرش تک۔ دل سے نکلی ہوئی آہ کی رسائی مالک عرش تک ہو جاتی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ کیا محض اس لیے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی زندہ روح ہوتی تھی، فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے محاورات تبدیل ہو گئے ترکیبیں نئی ہو گئیں لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں، خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جوہر نے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا فنا کر دیا تھا عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے۔

سیرت محمد علیؒ[1]

دیباچہ

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو ممتاز ترین اکابر و مشاہیر پیدا کیے اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سر فہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری تاریخ عصر حاضر کی آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جا سکتا ہے اور وہ نام نبی اور ایک ولی کے ناموں کا مجموعہ ہوگا! یعنی محمد علی۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کیے۔ لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی۔ بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدیوں کے حلقہ کے اندر رہا۔ بعض مشہور قومی "رفارمر" پیدا کیے لیکن ان کی اور ان کے "رفارم" دونوں کی شہرت جدید تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی۔ بعض زبردست خطیب اور مقرر پیدا کیے لیکن انھیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا۔ یہ حال مشاہیر خاص کا ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر رہیں۔ اور تنگ تر دائروں سے ان کی گونج آگے نہ بڑھی۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز شمال نے بھی سنی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی وادیوں نے بھی، خواص نے بھی اور عوام نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی بوڑھوں نے بھی اور بچوں نے بھی۔ آسام نے بھی اور سندھ نے بھی، بڑے بڑے مہذب شہریوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی وائسرائیگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی اور جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریوں نے بھی۔ راجوں

---

[1] سیرت محمد علی از مولوی رئیس احمد جعفری ندوی مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۲ء

مہاراجوں کے قصر وایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی۔

اس کا کلام سُن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کر ہنسے۔ اس کا پیام سن کر مسجد کے در و دیوار بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں اور درس گاہیں، ہوٹل اور بازار، دفتر اور کارخانے، "آزادوں" کی کانگرس اور رجعت پسندوں کی کانفرنسیں، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل، جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، چپہ چپہ پر اس کے نقش و قدم کے نشان ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے، قابل بھی اور فاضل بھی، لیکن قبول خداداد اور مرجعیت عام کی دولت سے وہی ایک ممتاز۔ یہ سعادت "زور بازو" کا نتیجہ نہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا۔ لیکن یہ مشاہدہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کا ہو گیا تھا اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے۔ محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لیے وقف کر دیا۔ وعدہ ربانی

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ع ۵)

ترجمہ۔ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہتے ہیں خدائے رحمٰن ان کے لیے (خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔ کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت پوست کی مجسم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی۔

اس دل و دماغ کا، ان صفات و کمالات کا سردار کسی قوم کی خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی —— وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے —— دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی۔ آئی اور گئی ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر ہم مسلمان! ہم نے اپنی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیر خدا علی مرتضٰے رضہ کی؟ خلیفۂ رسول عثمان غنی رضہ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسین رضہ کی؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر ہم نے نہ پہچانی تو اب اس کا کیا غم و ماتم کہ ان کے ایک ادنیٰ خادم محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور پھر اسے خواہ مخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجیے؟ حکیم مطلق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے۔ خدا جانے کتنی تکوینی مصلحتیں ان میں بھی ہوں گی!

کم تھے جنھوں نے محمد علی کے پہچاننے کی کوشش کی کم تر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے، ادب و انشاء پردازی، سیاست و قیادت، خطابت و صحافت، طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرہ کے اصلی خد و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہی ہو گیا تھا۔ مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا۔ مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دُور ہی سے فراست ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا۔[۱]

بدین مصطفےٰ دیوانہ بودی	فدائے ملت جانانہ بودی!
بہ بزم ما رئیس عشق بازاں	بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے	بہ قالب پیکر شاہانہ بودی!
سیاست را نقاب چہرہ کردی	وگرنہ عاشق مستانہ بودی!
سیاست تہمتے بر عشق پاکت	ز آئین خرد بیگانہ بودی!
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم	تو شمع دین را پروانہ بودی!
با یمانہا ز تو زورے و شورے	بجانہا ہمت مردانہ بودی
رسیدی از رہ اغیار تا یار	عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہ ہے کہ محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں۔ علی گڑھ کے ایک مشہور کھلنڈرے آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشاء پرداز، انگریزی صحافت کے ایک جوہر قابل شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ایک نامور رہنما، ایک ممتاز سیاسی لیڈر وغیرہ، لیکن آخر میں یہ ساری حیثیتیں گھل گھلا کر سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت باقی رہ گئی تھی، اور وہ جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لیے مشہور تھا، اپنے "خبط" و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا، لیکن اپنے دل سے صدا اٹھی تو بس یہی، کہ آج محمد کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

---

[۱] الحاج مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بہاری شیخ الحدیث (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) اہل دل اور اہل علم دونوں کی صف اول لیں تھے زندگی میں کبھی محمد علی سے ملاقات نہیں ہوئی وفات پر جو جلسہ تعزیت حیدرآباد میں ہوا، بس اس میں مولانا ابل پڑے اور وہیں تعزیتی تقریر میں رو رو کر یہ اشعار کہہ سنائے۔

ہاں، وہ ذات محمد کا شیدائی، دین مصطفےٰ کا دیوانہ اور امت محمدی کا بن داموں غلام تھا۔ ہندستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور چبھن محمد علی کے پہلو میں ہونے لگتی۔ مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی۔ اسلام پر قانون اسلام پر شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہو اور تڑپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا۔ مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! ۱۹۲۶ء میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کے لیے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی، تو اپنے اردو روزنامہ ہمدرد میں اپنے قلم سے لکھا۔

"اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا اور نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی"

"دن رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ۔ آخری سفر پر اور وہی سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے تو اس وقت بھی ناموس اسلام کے تحفظ پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے تھے۔ حق تھا کہ جب ایسے شخص کی موت آئے تو سارا عالم اسلام، شرق سے غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے۔ اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا۔ پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے، آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے سلیمان و داؤد کا قبلہ، موسیٰ، عیسیٰ کا قبلہ نبی القبلتین کا پہلا قبلہ اقبال نے مرثیہ میں کیا خوب کہا ہے ؎

خاک قدس اورا بہ آغوش تمنا در گرفت

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

"جسم" کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا روح کو جو مقام حاصل ہوا ہو گا اس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے اسے سب نے دیکھا جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجے اور مرتبہ کو کون پہچانے؟

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو اور وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ اظہار خیال کر سکتا ہو، جو عین ہیجان مخالفت کے وقت ۱۹۲۰ء میں لندن اور پیرس کی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ تقریر و تحریر پر قادر ہو۔ جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے سارڈا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے انہیں قائل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو جو اپنے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ میں سیاست حاضرہ اور مذہب پر دس دس بیس بیس کالم کے مضامین بہترین

ادب وانشا کے ساتھ سپرد قلم کر سکتا ہو انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انھیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے اور دوسری طرف مسجد کے ممبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے داڑھی بھگو لے، اور سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد وحال دیکھ کر دوسروں کو وجد آجائے مسئلہ قتل مرتد پر فتویٰ جمہور کے خلاف جب قلم اٹھائے تو اپنے تفقّہ کی داد اچھے اچھوں سے حاصل کر لے، آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ برطانیہ کے ایوان پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت کی ساری تاریخ میں پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کرے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطان وقت کے منھ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے۔ ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد عقیدت سے سرفراز ایسی "عامتہ الورود" ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت کے سلسلہ میں جتنے بھی اہم جلسے اس پچیس، تیس سال کے اندر، اسلامی ہند میں ہوئے، بلکہ عالم اسلامی کے طول و عرض میں جو بھی اہم تحریک کسی ادارے سے اٹھی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کار فرما اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس میں موجود۔ ایسے شخص کی سیرت نگاری ایک شخص کی سیرت لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کئے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیئے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیتی۔ اور وہ بھی برجستہ اور فی البدیہہ نہیں بلکہ ایک عرصہ تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی۔ لیکن حالات مساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے، تفصیلات کو چھوڑیئے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک رسالہ مستقل "شرح اسباب" تیار ہو جائے۔ جمود اور افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر و ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمّت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لیے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا، جس کے سنبھالنے کے لیے کئی کئی قوی اور تنومند پہلوان، کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے۔ آفریں و رحمت اس کی

ہمت پر، آفرین و رحمت جامعہ کی مستعدی و کارگزاری پر، جامعہ، ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ ـــــ وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے لگایا، بڑھایا، سینچا اور پالا۔

منازل سفر کی وادیاں، اور راہ کی دشواریاں، زاد سفر کی بے سروسامانیاں اور یاران طریق کی کج ادائیاں ان سب کی شکایت کیا اور کس سے کیجیے؟ اور کیجیے تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے؟ خود جوہر ہی کے الفاظ میں،

خضر کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے

بہرکیف و بہرحال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات جو کچھ اپنے نقوش کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں، یہ لخت دل ہیں ان پر "مال تجارت" کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرمالیا جائے۔

صاحب سیرت کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے بلکہ اکثر تو دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرت دیانت کے ساتھ لکھی جائے اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے "خالد جانباز" کے دقائق اور کارناموں میں کوئی "حافظ شیراز" کا رنگ آخر کیوں کر بھر دے۔ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جا بجا صدمہ یقیناً پہونچے گا اس کے لیے شروع ہی سے تیار ہو جایئے، مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے۔ پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰ رضؓ کے سیرت نگار کے لیے جنگ صفین، اور حسین رضؓ ابن علی کے سوانح نویس کے لیے میدان کربلا کے ذکر کو نظر انداز کر دینا آخر ممکن کیونکر ہے۔

عروس ادب[1]

تقریب

ہوش "ذی ہوش" میرے پرانے عنایت فرما ہیں حیدرآباد میں ان کے عروج و زوال دونوں کا تماشا ان آنکھوں نے دیکھا ہے[2] ۱۷ء و ۱۸ء میں ایک وقت وہ تھا جب ہوش کی ہوشمندی کا ہر طرف چرچا تھا ذخیرہ[3] کی کنجی ان کے ہاتھ میں تھی اور ذخیرہ زبان و ادب کا ذخیرہ کیا، یہ کہیے کہ پورا گودام بنا ہوا تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہوش معہ اپنی "ہوش ربا" کے اس جنت ارضی سے رخصت کر دیئے گئے اور ایک ظریف کو برجستہ یہ مصرعہ یاد آگیا ؎

ہوش رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

ایسے ہی واقعات عبرت سے ہم جیسے "بیہوشوں" تک کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

مزاج عاشقانہ پایا ہے اس لیے گردش تقدیر بھی کچھ عاشقوں ہی کی لازمی تھی۔ ارض "فلک نما" پر خسرو دکن کے الطاف کریمانہ سے سرفراز تھے یمین السلطنت مہاراجہ شاؔد کی عنایتوں سے شادکام تھے عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھ رہے تھے کہ دفعتاً یہی زمین ان کے حق میں آسمان بن گئی "فلک کج رفتار" کے فرضی افسانے شاعری کی دنیا میں خدا معلوم کتنی بار سنا چکے تھے اب وہ آپ بیتی تھے۔ بالآخر سرزمین رامپور کی کشش نے انہیں اپنا لیا سنا ہے کہ یہاں افواج ریاست کے بخشی ہونے کی عزت انھیں بخشی گئی ہے لیکن انھیں تو بخشی اردو کے لشکر کا ہونا تھا ان کی فوج میں تو انشا کی تلواریں چمکتی تھیں زبان کے پیادے بھرتی

---

[1] عروس ادب از ہوش بلگرامی مطبوعہ ۱۹۲۵ء

[2] اور اب اس مضمون کی نظر ثانی کے وقت (۱۹۴۴ء میں) تیسری بار ان کے کمال عروج کا نظارہ کر رہا ہے "ہوشیار" ہمیشہ سے تھے۔ اب چشم بددور، نواب ہوش یار جنگ بہادر ہیں۔

[3] ہوش بلگرامی اسی نام سے ماہوار رسالہ حیدرآباد سے نکال رہے تھے۔

ہوتے تھے، ادب کے رسالے نکلتے تھے، فصاحت کی پلٹنیں آراستہ ہوتی تھیں، بلاغت کے قلعے تعمیر ہوتے تھے، شاعری کے معرکے سر ہوتے تھے اور مشاعروں کی توپیں ڈھلتی تھیں! ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رامپور محض شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر نواز بھی ہیں ان کے لیے اس آرزو کو واقعہ میں اور اس مجاز کو حقیقت میں تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے۔

اردو کے ایک ادیب نے عرصہ ہوا ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہوش تو بڑی رقم نکلے" یہ بالکل درست تھا۔ اور کیوں نہ درست ہوتا۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم کی صحبت و تربیت تو بے ہوشوں کو ذی ہوش بنا سکتی تھی چہ جائیکہ اس کو جو مجسم ہوش ہو مرحوم نے ہوش کو یہی نہیں کہ مدتوں مثل اپنے عزیز کے رکھا بلکہ ان کے بعض مضامین کو بھی اپنی اصلاح سے مشرف فرمایا اور غالباً "ہوشمندی" کے انداز کے بعد ہی یہ تخلص "ہوش" بھی عنایت فرمایا تھا خدائے ہوش سے دعا ہے کہ اس "ستارہ بلندی" کی تابش میں اضافہ کرتا رہے۔

فاضل دوست مولوی عبدالحق صاحب کا ارشاد ہے کہ ہوش کے مزاج میں غضب کی جلدی ہے بجلا کا ہو یا نہ ہو لیکن تیزی تو یقیناً ہے ــــ دل تیز، ہاتھ تیز، پیر تیز، سوجھ بوجھ تیز، قلم تیز، خیریت یہ گوری کہ زبان نہیں تیز، ورنہ اور ہر شے میں تیز۔ اور محض تیز ہی نہیں بلکہ تیز اور طرار! ان کی تیزی و طراری، شوخی و رنگینی کے جلووں کی آئینہ داری اگر مدنظر ہو تو بسم اللہ "عروس ادب" کے چہرہ سے نقاب اُلٹ کر خود ملاحظہ فرمائیے۔

خوش سلیقی اور لطافت پسندی ہوش کے خاص جوہر ہیں ان کے نمونے اگلے صفحات کے سطر سطر میں ملیں گے۔ ان جواہر پاروں کی قدر و قیمت کا پرکھنا، مرحوم مہدی حسن (صاحب افادات مہدی) جیسے جوہری کا کام تھا۔ ہم تماشائی تو محض اس بزم رنگین کی سجاوٹ کو دُور سے دیکھ کر خوش ہو جانے والے ہیں۔ عروس ادب کی کائنات میں انھوں نے اخلاق، ادب، معاشرت، سیاسیات، ہر شعبہ موجودات کا جائزہ لے ڈالا ہے اور ہر میدان میں گامزنی فرمادی ہے، لیکن ان کے پائے نازک کی سبک خرامیوں کے لیے ادبیات ہی کا فرش مخملیں کچھ زیادہ موزوں ہے! خدائے پاک انہیں زیادہ فرصت و فراغت نصیب کرے کہ زبان و ادب کی زیادہ گراں مایہ خدمات انجام دے سکیں اور جس "عروس" کا ڈولا اپنے گھر لائے ہیں اس کا اور ان کا دونوں کا نصیبہ بلند ہو!

مسدّس ۱۹۳۵ء میں[1]

تقریب

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

اکبر و اقبال کے دور سے قبل، اپنے شعر و تغزل کے وصف آپ نے شاعر ہی کی زبان سے سن لیے۔ اپنے دو قرن قبل والی شاعری کا عکس آپ نے خود شاعری کے آئینہ میں دیکھ لیا کیا اب اس کی بھی حاجت ہے کہ اس "ناپاک دفتر" کے کچھ اوراق بہ طور نمونہ، آپ کی خدمت میں پیش کیے جائیں؟ گویا دن دوپہر کی کڑی دھوپ کے وقت اس کی بھی حاجت ہوتی ہے کہ پہلے صغریٰ وکبریٰ قائم ہولیں اور استاج مقدمات کی باضابطہ شکل مرتب ہولے جب جاکر آفتاب کے روشن ہونے کا یقین آئے۔

بات اتنی صاف اور کھلی ہوئی حقیقت اتنی روشن و واضح۔ لیکن آج سے پچاس ساٹھ سال ادھر جب پہلی بار حالیؔ کی زبان سے نکلی، تو بس ایک آگ سی لگ گئی، اور آگ بھی کہاں؟ راون کی لنکا میں! عفریتوں اور راکشسوں سے بھری اور رہتی پڑی ہوئی لنکا میں۔ بڑے بڑے پیل تن یلغار کرکے ٹوٹ پڑے۔ جواب کے لیے تردید کے لیے تضحیک کے لیے کوئی صاحب حال کے مقابلہ میں، قال لے کر 'قالی' بن کر آئے کسی صاحب نے خیالی ٹھا کا روپ بھرا۔ اودھ پنچ اخبارات کی تو پوچھیے نہ ان بیچاروں کا تو آذوقہ کھل گیا۔

"حالیؔ کا حال اور میدان پانی پت کی طرح پائمال" یہ تھا ان کی تک بندیوں کا حال، اور ان کی مسخرگی کا کمال! دوسروں کو بنانے سے بیشتر خود ہی مسخرے بن کر رہے۔

آج یہ سارے جوابات کہاں ہیں؟ ان اخبارات کی پرانی فائلیں تک کہیں ملتی ہیں؟ اس ساری

---

[1] مسدس حالی (صدی ایڈیشن) ناشر۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی تحریر ۱۹۳۵ء

دھوم دھام، کڑک گرج کا کہیں نام ونشان بھی باقی ہے؟

تھیٹر کے چونی ٹکٹ والوں کی تالیاں اور بازاری پھبتیاں مدت ہوئی ختم ہو چکیں، اور ان کے مقابلہ میں "مسدس"! کیا یہ کہنے کی، یہ بتانے کی حاجت ہے، کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے، کتنی محفلوں میں بند اس کے پڑھے جا چکے۔ واعظ کی کتنی مجلسیں گرما چکا، کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں یہ داخل ہو چکا، کتنے بوڑھوں کی، جوانوں کی، لڑکوں کی، زندگی میں انقلابی اثر پیدا یہ کر چکا، کتنوں کو رُلا کر یہ رہا۔ کتنوں کے دل اس نے بڑھائے غرض مقبولیت کے، مرجعیت کے جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں سب کے لحاظ سے آج اسے دیکھ لیجیے، جانچ لیجیے پرکھ لیجیے! بھلا ایک صاحب دل عارف، کہیں آہ وزاری کے ساتھ گرم آنسوؤں کے ساتھ، ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ مناجات میں مصروف ہو، اور شہر کے کچھ لفنگے آکر لگیں، تالیاں بجانے، ڈھول پیٹنے تو اس سالے سوانگ سے اس اللہ والے کی مقبولیت میں کچھ فرق آئے گا؟

تقریب کا عنوان، آپ کہیں گے کہ مسدس حالی کیوں نہ رکھا گیا ادھورا یعنی صرف مسدس کیوں رکھا؟ ادھر سے عرض ہوگی کہ محض مسدس بولنے سے کیا ذہن کسی دوسرے مسدس کیطرف بھی منتقل ہوتا ہے؟ اس مطلق مسدس سے کسی اور مسدس کا التباس ہوتا ہے؟ "مثنوی" مطلق بولنے سے اگر ذہن صرف مثنوی مولانا روم ہی کی جانب جاتا ہے تو مطلق "مسدس" کے لفظ سے بجز مسدس حالی کے اور کچھ کوئی کیوں سمجھنے لگا؟ کسی اور مسدس کا دھوکا کسی کو کیوں ہونے لگا؟ کوئی دوسرا مسدس فرط شہرت سے فرط مقبولیت سے ذہنوں کے سامنے ہے کب؟

خیر یہ تو ایک لفظی سی گفتگو چھڑ گئی، اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا اور اس شان کا اس جمال کا، اور اس کمال کا، اردو میں کوئی دوسرا مسدس ہے بھی؟ جب اپنی آج کی بپتیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھیے، کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے ؎

کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے — کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی — مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی
نہ گالی سے دشنام سے جی چرائیں — نہ جوتی سے پیزار سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو لُچپن دکھائیں — جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اٹھائیں
لرزتے ہیں اوباش ان کی ہنسی سے — گریزاں ہیں رندان کی ہمسائیگی سے

اور جب اپنے گزرے ہوئے "کل" کی بلندیوں کی تاریخ سنانے لگتا ہے تو ناصح ملامت گر اک دم شاعر رجز خواں بن جاتا ہے ؎

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحیٰ کے اٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دھمک دور دور اسکی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی — ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں — مہیا کیے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں — انھیں کر دیا رشک صحن گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود ا انھیں کی لگائی ہوئی ہے

خامیوں سے کون بشری تالیف آج تک بچ سکی ہے؟ کون آئندہ بچ سکے گی؟ نکتہ چینی پر کوئی آجائے تو عیب کہاں نہیں نکل سکتا؟ تو اس معیار کو خیر جانے ہی دیجیے، حق و انصاف کے کوچہ سے اگر آیئے تو خدا لگتی یہ ہے کہ مدس اپنا کام مدت ہوئی کر چکا۔ احساس کی بیداری جو اس کا مقصد تھا اس میں مدتیں گزریں کامیاب ہو چکا۔ اکبر و اقبال جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا، اگر اس کے بعد مٹ گیا ہوتا دنیا اسے بھول گئی ہوتی جب بھی یہ اس کی منقصت نہ تھی۔ عین فطرت کا تقاضا ہوتا۔ ضرورت دعوت پوری ہو چکنے کے بعد داعی کو باقی رکھنا سنت الٰہیہ میں داخل ہی نہیں لیکن جب کوئی اپنی بخششوں کو بغیر حساب اور بغیر شمار لٹانے والا محض فضل اور محض انعام پر آجائے تو کیا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ جس کو جتنی چاہے دولت حیات سے سرفراز کرے۔

اور پھر وہ جو رسول کی زبان سے توحید کی منادی کرنے پر آجائے تکبیر و تحمید کا غلغلہ ڈال دے ؎

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق

اسی کے ہیں فرماں طاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
. . . . — نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

جہاں دار مغلوب و مقہور ہیں واں — نبی اور صدیق مجبور ہیں واں
نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں — نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں
. . . . — مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا

سب انسان ہیں واں جس طرح سر فگندہ ! | اسی طرح میں بھی ہوں ایک اس کا بندہ
بنانا نہ تربت کو میری صنم تم ! | نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم | کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم !
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بڑائی | کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی !

اور نعت گوئی کے لیے جب چھیڑے تو منھ کے بول یوں زمزمے بن کر نکلنے لگیں ؎

ہوئے، پہلوے آمنہ سے ہویدا | دعائے خلیل اور نوید مسیحا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا | مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا | وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ | یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا | اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور جب دربار رسالت میں فریاد و استغاثہ کرے تو سننے والوں کے دل ہلا کر رکھ دے ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
اے چشمۂ رحمت بأبی انت و امیؐ !
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا پہ ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے اک ان میں سوا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف

اب تک وہی قبلہ تری اُمت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت

کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے

نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برُا ہے

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ!

اخبار میں الطالح لی ہم نے سنا ہے

تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے

ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں!

پر فکر ترے دین کی عزت کی سوا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلّت سے ہماری

امت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

زندگی اس کلام کو بھی نصیب نہ ہوگی تو اور کس ہوگی؟ حق یہی ہے کہ اس کی عمر بڑھے، اور خوب بڑھے اور ہم جیسے حشرات الارض قسم کے فانیوں کے تخیل سے اندازہ سے، کہیں بڑھ کر رہے۔

سفر سعادت[1]

(تعارف)

ایک نام کے "امیر" اور دل کے فقیر کا، میرا ساتھ عرفات کے میدان میں رہا منیٰ کی قربان گاہ میں رہا، مزدلفہ کی گھاٹیوں میں رہا، صفا کی بلندیوں پر رہا، مکہ کی سڑکوں پر رہا۔ مدینہ کی گلیوں میں رہا۔ بندرگاہ جدہ کے دفتروں میں رہا، جہاز رحمانی کے تختوں پر رہا، خشکی میں رہا، تری میں رہا، غرض سفر سعادت کی اکثر منزلوں اور بیشتر حصّوں میں رہا پھر اگر اس روزنامچہ سعادت کی پیش خوانی مجھ گمنام مشت خاک کے نصیب میں آرہی ہو، تو اس سعادت پر کسی کو رشک اور کسی کو حسرت کیوں ہو؟ بلبل کے فخر و مسرت کے لیے یہ کافی ہے کہ "گل" سے اس کا قافیہ مل جاتا ہے۔

روزنامچہ کے مصنف ایک پرانے مشاق اہل قلم ہیں۔ لیکن جب سفر حج کو نکلے تو اپنا قلم یہیں چھوڑتے گئے۔ زاد سفر میں بس پہلو میں ایک دل تھا جو درد سے چھلک رہا تھا وہاں جو کچھ دیکھا، جو سُنا اسے سادہ زبان میں اپنی یادداشت کے لیے نوٹ کرتے گئے۔ ذوق شکستگی نے اجازت نہ دی کہ پبلک کے لیے کوئی تصنیف تیار کریں شاعری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بہترین شعر وہ نہیں جو دنیا کو سنانے کے لیے کہے جاتے ہیں بلکہ وہ ہوتے ہیں جو خود اپنے لیے کہے جاتے ہیں۔ بعض اوقات نثر کی کتابیں بھی شاعری کے اس معیار سے جانچنے کے قابل ہوتی ہیں سفرنامے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے اس مجموعہ اوراق کا انداز سب سے نرالا پائیں گے یہاں مصنف دوسروں کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مخاطب کئے ہوئے ہے زیادہ سے زیادہ اس لطف میں اپنے مخصوص احباب و اعزہ کو شریک کرنا چاہتا ہے یا ان لوگوں کو جو مصنف ہی کی طرح اس سفر سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں، اور بس مصنف صاحب اپنی روئداد سفر کو زیادہ رنگین اور مرصع ادیبانہ و انشا پردازانہ بنا سکتے تھے اگر چاہتے، لیکن اس سادہ اور بے تصنع پرواز تحریر کی دلکشی ہی کچھ اور ہے شام کو ہَوا خوری کے لیے ہزار بن سنور کر باہر نکلیے، وہ بات کہاں جو گھر کے اندر

---

[1] از مولوی حاجی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی بی اے شائع شدہ ۱۹۳۰ء

بے تکلف، مخلی، بالطبع بیٹھنے اٹھنے میں ہے۔

لیکن یہ خیال نہ گزرے کہ مصنف آنکھیں بند کرکے گئے تھے اور صرف چند گھر بلو باتیں اپنی نوٹ بک میں ٹاتک کر اسی طرح آنکھیں بند کیے واپس چلے آئے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، کم لوگ دیکھتے ہیں، اور ان سے بھی کمتر زبان پر لاتے ہیں۔ انھیں عید مکہ میں آتی ہے اس جشن کی خوشیاں انھوں نے "سفر سعادت" کے صفحات پر خوب منائی ہیں، لیکن اس کے بعد ذرا دل تھام کر ان کے الفاظ ذیل بھی پڑھ لیجیے۔

"میں ہندستان کا رہنے والا۔ عقیدہ کا بودا۔ ایمان کا کمزور۔ اسباب و علل پر نظر کرنے والا۔ اور علت العلل سے غافل، آج دار السلام کی عید اور یہاں کی شان و شوکت دیکھ کر جتنا خوش ہوا۔ اتنا ہی چند باتوں سے ملول بھی ہوا، خوشی کا بیان ہوچکا، اب غم کی داستان سُنیے۔

حجاز کا بیشتر حصہ یورپ کی حکومت سے بحمد اللہ ابھی نیم آزاد ہے لیکن عربستان کی اقتصادی فتح لندن کو حاصل ہوچکی ہے یہاں کے بازار انگلستان کے مصنوعات سے بھرے ہوئے ہیں آج شہر میں ہزاروں روپے کے کھلونے فروخت ہو رہے ہیں اور وہ سب یورپ کے بنے ہوئے ہیں، ربڑ کے گیند، ربڑ کے پھکنے، ربڑ کے غبارے، ٹین کے انجن، ٹین کی ریل گاڑیاں اور ارگن باجے وغیرہ لاکھوں کی تعداد میں بک رہے ہیں کوئی لڑکا مجھ کو نظر نہ آیا جس کے ہاتھ میں دو چار کھلونے اس قسم کے نہ ہوں۔ افسوس ہے کہ غریب حجاج کی کمائی! اہل مکہ کے کام نہ آئی، بلکہ یہاں سے بھی اسی طرح ولائت کو پہنچتی ہے، جیسے ہمارے بدنصیب ملک سے جاتی ہے عبرت کا مقام ہے کہ صرف موٹر کے لوازمات جو اس سال انگلستان سے آئے ہیں۔ ان کی قیمت اکاسی ہزار پونڈ تھی! یہ لوازمات یورپ کے دوسرے مقامات سے بھی آئے تھے مگر ان کی قیمت مندرجہ بالا حساب میں شامل نہیں! ایک موٹر پر کیا موقوف ہے، یہاں کی تقریباً ہر ایک جنس انگلستان ہی سے آتی ہے اور تمام دنیائے اسلام کی کمائی مکہ کے راستے سے یورپ پہونچتی ہے افسوس ہے کہ یہاں کی عورتوں کو انگریزی فیشن کی طرف بدرجہ غائت رغبت ہوگئی ہے برقعہ کسی وقت زینت چھپانے کے لیے تھا مگر افسوس اب اس کا مقصود زینت دوبالا کرنا ہے۔ زرق برق ریشمی کپڑوں اور اطلسی تھانوں کے برقعے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی چمک دمک خواہ مخواہ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ نابالغ لڑکیاں جو بے نقاب پھرتی ہیں وہ سرتاپا انگریزی لباس میں ہیں، وہی ریشمی سائے اور وہی اونچی ایڑی کے بوٹ۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی اور آگے بڑھیے اور خون کے آنسو بہائیے:۔

"انگریزی مٹھائیاں، انگریزی بسکٹ بازار میں بھرے پڑے ہیں۔ سگرٹ و چائے شرط زندگی ہے گولہ بارود ولائیت

سے آتا ہے۔ ڈاک کے ٹکٹ ولایت سے چھپ کر آتے ہیں۔ ریال و قرش لندن سے بن کر آتے ہیں۔ کپڑا انگلستان سے آتا ہے اناج کے لیے ہمیشہ ہی سے یہ وادی غیر مزروعہ ہے یہاں کی خاص پیداوار صرف خربوزہ ہیں یا زمزم کا مقدس پانی، اونٹ معاش کا ذریعہ تھے اور شریف حسین سابق ملک الحجاز کے قول کے مطابق جس وقت اونٹ کا بچہ پہلی بار مکہ میں آتا تھا اس وقت سے اس ساعت تک جبکہ وہ صرف پوست و استخواں کا ڈھانچہ رہ جاتا تھا۔ ہر ایک اونٹ ۲۰ خاندانوں کی پرورش کرتا تھا کیونکہ اس آلۂ بار برداری کے تمام لوازمات مکہ یا اس کے ملحقات ہی میں تیار ہوتے تھے مگر اب موٹروں کی بدولت وہ رزق کا دروازہ بھی بند ہے ایک شرمناک بات ہے جس کو لکھتے قلق ہوتا ہے کہ جوان عورتیں بازار میں حاجیوں سے خیرات طلب کرتی ہیں اور ان کو روپیہ وصول کرنے کیلئے اغیار سے بغل گیر ہو جانے میں بھی غیرت نہیں آتی، زیادہ لکھنا خلاف تہذیب ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

دل کڑا کر کے ایک قدم آخری بار اور اٹھا لیجیے۔

"معاشرت کا یہ حال تھا، اب سیاسیات پر غور کیجیے۔ جدہ میں خطبہ و سکہ سلطان ابن سعود کا ہے لیکن حکومت درحقیقت برٹش کانسل کرتا ہے ابن سعود کے لونڈی غلام بھاگ کر انگریزی سفارت خانے میں پناہ لیتے ہیں اور کانسل جنرل ان کو جہازات پر سوار کرا کے بے تکلف ملک سے باہر نکال دیتا ہے لیکن ملک الحجاز دم نہیں مار سکتا، کانسل کی اجازت کے بغیر کوئی قافلہ جدہ سے مکہ یا مدینہ نہیں جا سکتا مگر بادشاہ کو دخل دینے کا اختیار نہیں، سفارت خانے نے افغانیوں کو دھمکی دی کہ اگر انھوں نے واپسی کے ٹکٹ وائس کانسل کے پاس جمع نہ کیے تو وہ مکہ نہ جانے پائیں گے۔ مگر عرب کا (بہ زعم خود) خود مختار بادشاہ زبان ہلانے کی مجال نہیں رکھتا مکہ معظمہ اللہ کی حفاظت میں ہے مگر انگریزی کانسل جس دن چاہے چند گھنٹوں میں یہاں قبضہ کر سکتا ہے نجدی فوج جو یہاں مقیم ہے وہ قواعد داں تو کیا ہوتی، آلات حرب سے بھی صحیح طور پر مسلح نہیں ہے جس نے جمعۃ الوداع کے دن اور آج بھی ان کا جلوس دیکھا کسی پاؤں میں جوتا ہے کوئی چپل پہنے ہے اور کوئی ننگے پاؤں کاندھے پر بندوق رکھے چل رہا ہے کارتوس کی پیٹیاں کمر میں بندھی ہیں معلوم نہیں خالی ہیں یا بھری ہوئی مگر بندوقیں ٹوٹی ہوئی اور زنگ خوردہ ہیں یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے ہندستان میں حیدرآباد، گوالیار اور رامپور کی فوجیں اس سلطانی لشکر سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہیں۔"

نجدیوں نے مزارات و مشاہد کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور قبور صالحین کی جس طرح توہین کی ہے خوش عقیدہ و صوفی مشرب مصنف کا دل اس سے قدرتاً دکھا اور یہ دل کی دکھن آپ کو ان اوراق میں جا بجا نظر آئے گی ساتھ ہی حکومت سعودیہ نے جو بے نظیر امن و امان قائم کر رکھا ہے، مصنف کی انصاف پسندی اس سے بھی اغماض روا نہیں رکھتی اس کا

اعتراف آپ کو ہر مناسب موقع پر ملے گا۔

مصنف صاحب کو "معلم" کے جن مظالم سے پالا ہوا تھا ان کا تذکرہ اس بسط و تفصیل کے ساتھ ممکن ہے بعض نازک طبائع کو گراں گزرے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ے

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل

کا اندازہ "سبک ساران ساحل" کسی طرح کر ہی نہیں سکتے، جس غریب کو قدم قدم پر اگر "فسوق" نہیں تو "جدال" پر مجبور ہو جانا پڑتا ہو، مستحبات و سنن سب ایک ایک کر کے ہاتھ سے جا رہے ہوں سکون قلب و انبساط کے بجائے ہر لمحہ انقباض و تشویش کا شکار بننا پڑ رہا ہو بلکہ دھڑکا یہ لگا ہو کہ سارا حج ہی غارت ہوا جا رہا ہے اس کا تو ردیاں ردیاں معلم کی جان کو روئے گا یہی غنیمت ہے کہ وہ سفرنامہ کی جگہ معلم "سکندر" کے کارناموں کے بیان میں پورا سکندر نامہ" نہیں لکھ ڈالتا دوسروں کو ایسے خطرات سے آگاہ کر دینا جائز ہی نہیں واجب ہے۔

کوئی بشری کوشش بشری لغزشوں سے پاک نہیں رہ سکتی" مصنف نے اپنے اس نیاز مند کا ذکر ان اوراق میں متعدد مقامات پر کیا ہے لیکن کہیں کہیں تو افراط حسن ظن کا کمال ہی دکھا دیا ہے، اور اپنی ساری شہرت ثقاہت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔ محدثین کرام نے صوفیہ و مشائخ سے روایات قبول کرنے میں جو احتیاط برتی ہے اس کی حکمت کا یقین تو پہلے سے تھا ہی اب عین الیقین ہو گیا۔

مشک کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر آپ کا شامہ درست ہے تو آپ مشک کے سامنے آتے ہی خود اسے پہچان لیں گے اور عطار کی ہر لسانی اور چرب زبانی سے قطعاً مستغنی رہیں گے یہاں بھی دیار حبیب سے آیا ہوا مشک آپ کے سامنے حاضر ہے اگر مشام جاں کہیں خوشبو محسوس کرلے تو مصنف اوراق کے ساتھ اس نامہ سیاہ تعارف نگار کے حق میں بھی دعائے خیر فرما دیجیے گا اللہ آپ کو جزائے خیر سے محروم نہ رکھے گا۔

سیرت سیّد احمد شہیدؒ[1]

(تعارف)

حضرت سیّد احمد رائے بریلوی پچھلی صدی ہجری کے ان اکابر و مشاہیر میں گزرے ہیں جن کی یاد مسجدوں اور خانقاہوں کی دنیا الگ رہی لندن اور آکسفرڈ اور کیمبرج کی دنیا کے بھی حافظہ سے محو نہیں ہوئی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ان کے تذکرے سے مزین انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ذکر ان کا موجود انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھیکس میں کارنامے ان کے مذکور۔ یہ الگ بات ہے کہ دوست انھیں عقیدت کی آنکھوں کے اندر جگہ دیتے ہیں اور دشمن کی نگاہ میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں لیکن نظریں اس شہید پر بہرحال پڑتی ہی ہیں ؎

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

جس کا نام ملائکۂ ربانی کے نورانی رجسٹروں میں درج ہو اس کے تذکروں اور چرچوں سے اگر خاکیوں کے سینے اور آدم زاد کے سفینے معمور ہوں تو اس پر حیرت نہ کیجیے!

سید صاحب کے سوانح حالات، کرامات و کمالات میں ضمناً و مستقلاً اس وقت تک متعدد کتابیں موجود تھیں لیکن اکثر نے سیّد صاحب کو ایک مخصوص و محدود ہی نقطۂ نظر سے دیکھا ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من　　　　وز دروں من نہ جست اسرار من

ضرورت اس کی تھی کہ کوئی سیرت ملک کی عام زبان میں، سلجھے ہوئے انداز سے ایسی لکھی جائے جو آپ کی ساری حیثیات کی جامع ہو اور جس میں عام پسند خوارق و عجائب سے زیادہ لحاظ واقعات کی صحت و استناد کا اور آپ کی تحریک کے اصل مقاصد کا رکھا جائے۔

---

[1] از مولانا ابوالحسن علی ندوی طبع ۱۹۲۹ء

شکر ہے کہ یہ سعادت سو برس سے زائد عرصہ گزر چکنے کے بعد اسی خانوادہ کے ایک ہونہار و صاحب رشد جواں ہمت اہل قلم کے نصیب میں آئی۔ کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک مجاہد کی سوانح عمری میں ہونا چاہیے لیکن زور یہاں صرف شوق غزا ہی پر نہیں ختم ہو گیا ہے علوم شریعت مسائل طریقت، مباحث سیاست سب اپنی اپنی جگہ پر حسن ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس محفل میں چنے ہوئے نظر آئیں گے۔ زبان صاف سلیس و شیریں بیان میں نہ اتنا اختصار کہ پڑھنے والے کا شوق جھنجھلا اٹھے نہ اتنی طوالت کہ مطالعہ کرنے والے کی ہمت جواب دے نکلے پھر سید صاحب اور اسمٰعیل شہید کے ساتھ ساتھ ان کے اور سارے رفقاء نامدار کے بھی انفاس بابرکات گویا سپہر جہاد و خدمت دین کے آفتاب و ماہتاب کے جلو میں ستارے اور سیارے بھی ہر طرف سے جھرمٹ کیے ہوئے۔

کم از کم ایک سبق تو کتاب کے مطالعہ سے عالم و عامی بوڑھے اور جوان خاص و عام سب کے لینے کا ہے اور وہ سبق نظم و اطاعت کا ہے اگر اندرونی نظم درست نہیں، اگر فاروقی شان انتظام و تدبر کی روح جسم میں دوڑی ہوئی نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ ایثار و اخلاص اور بڑے سے بڑا جوش و ولولہ بھی اس عالم اسباب میں بیکار و ضائع ہو کر رہتا ہے اگر یہی ایک سبق پڑھنے والے حاصل کر لیں گے تو بہت کچھ حاصل کر لیں گے۔

مشک کی مدح و توصیف عطار کی زبان سے مشک کی قدر و قیمت بڑھاتی نہیں اور گھٹا دیتی ہے عطار ہٹا جاتا ہے، مشک حاضر ہے، بے تکلف مشام جاں معطر فرمائیں۔

تاریخ نظمِ اُردو[1]

پیش لفظ

بدنفسی کہیے یا بدباطنی ، واقعہ یہ ہے کہ کوئی تین سال ہوئے صوبہ کی ہندستانی اکیڈیمی کے اجلاس خاص میں جب ناطق صاحب اپنی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو ان سطور کے راقم آثم نے سننا شروع کیا، نکتہ چینی وعیب جوئی کے کانوں سے لیکن ابھی پہلے بند کا پہلا شعر شاعر کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ شکاری خود شکار بن چلا اور جو اعتراض کی کمین گاہ میں بیٹھا تھا وہ اعتراف کے میدان میں آنے لگا اور دو ہی بند پورے ہوئے تھے کہ زبان پر بے اختیار واہ واہ سبحان اللہ کے نعرے آنے لگے اور جو منتقد تھا اسے معتقد بنتے بن پڑی ۔ جگ بیتی تو خیر نہیں آپ بیتی یہ تھی ۔ اب چاہے اسے کہہ لیجیے شاعری کی ساحری یا زبان وادب کی افسوں گری، بہرصورت یہ تھی نطق ناطق ہی کی کرامت کلام ناطق کا اعجاز !

وہی نظم اب مکمل صورت میں آپکے سامنے ہے تعارف حیران ہوں کیونکر کرایا جائے ۔ مشک کے تعارف کے لیے خود عطار کا زبان کھولنا خوشبوئے مشک کی توہین کرتا ہے چہ جائیکہ اس کی جسارت وہ کرے جو عطار بھی نہیں ! حسین وجمیل چہرہ کے حسن وجمال کے ادراک کے لیے ضرورت تو صرف آنکھ کی ہے زبان ایسے موقع کے لیے بالکل بے زبان ۔ دیدار کا کام "گفتار" آخر کیونکر دے سکے دن کے پھیلے ہوئے اجالے میں یہ کہنا کہ دیکھو آفتاب کیسا روشن ہے یہ تعارف آفتاب کا نہ ہوا یہ درپردہ اپنی تعریف ہوئی کہ ہم بھی چشم روشن وآفتاب شناس رکھتے ہیں ؎

مادحِ خورشید مداح خود ست
کیں دو چشم روشن و نامرمد ست

---

[1] از حکیم ابو العلا سعید احمد صاحب ناطق طبع سنہ ۱۹۴۰ء

ایک گوشہ نشین دیہاتی کے لیے پیش لفظ کا ایما درحقیقت خود اس کی عزت افزائی ہے کہ تو بھی اس قابل ہے کہ بزم ادب میں در آئے اور سخن سنجوں کی محفل میں بار پائے۔

اچھا شعر تو یہ ہے جو آفتاب کی روشنی کی طرح خود اپنے کو منوالے مسدس ناطق کی بسم اللہ سُنیئے ؎

گفتگو ناطق یہ ہے آغاز اردو کب ہوا

جستجو یہ ہے کہ ظاہر راز اردو کب ہوا

" زبان کا مسئلہ اور اس کا آغاز" گفتگو سے سبحان اللہ اور پھر معاً "ناطق" مومن خاں مرحوم کے مقطعوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ گفتگو کے معنی محاورہ میں بعض بات چیت کے نہیں "سوال" یا "مسئلہ" کے بھی ہیں اور دوسرے مصرعہ میں ٹھیک اسی کے وزن و مفہوم کا لفظ "جستجو" صنعت مناسبت لفظی کو تو لکھنؤ کے چند قافیہ بندوں نے سوء استعمال اور افراط بے جا سے غارت اور بدنام کر دیا۔ ورنہ اگر اپنے حدود کے اندر قرینہ سے رہے اور کلام میں ٹھونس کر نہ لائی جائے بلکہ بے تکلف آجائے تو یہ حسن انشاء کی جان ہے۔

انجمن میں نغمہ آرا ساز اردو کب ہوا

ساز بزم ہند ہم آواز اردو کب ہوا

وہی توازن جو پہلے شعر میں تھا، اس دوسرے شعر میں بھی موجود۔

ایک ہی دھن سنتے سنتے ہوگئے ہیں کان سن ⁂ دعویٰ ایجاد اُردو کی لگی ہے سب کی دھن

دھن، پہلے مصرع میں، بہ اصطلاح موسیقی ہے دوسرے میں اپنے عام معنی میں، اور بات کتنی سچی ہے تاریخ کی تاریخ اور شاعری کی شاعری،

اب آگے کہنا یہ ہے کہ جسے دیکھیے ایجاد اُردو کا سہرا اپنے ہی سر باندھنا چاہتا ہے دہلی والے کہتے ہیں کہ اردو کی زنجیر گیریاں ہم نے گائی ہیں۔ دکن والے بولے کہ پودے کا تخم تو ہماری سرزمین پر پڑا ہے۔ پنجاب سے آواز آئی کہ یہ دریا ہمارے ہاں سے رواں ہوا ہے۔ بہار نے دعویٰ کیا کہ اس بہار نے تو سب سے پہلے ہمارے چمن کو کھلایا ہے۔ اب دیکھیے جناب ناطق اس چومکھ چراغ کو کس حسن ادا سے روشن کرتے ہیں اور شاعری کے دھاگے میں کس لطافت سے تاریخ کے موتی پروتے جاتے ہیں ؎

دہلوی، بازار اردو میں خریدار زبان

دکھنی دربار اُردو میں گہر بار زبان!

عہد محمودی سے ہے پنجاب سر کار زباں

بودھ تک پہنچے بہاری لے کے زنار زباں

یہ الفاظ لائے ہیں یا ایک ایک مصرعہ کی انگوٹھی میں نگینہ پر نگینہ جڑتے چلے گئے ہیں آگے فیصلہ ناطق ملاحظہ ہو ؎

اک مورخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی

ملک میں تاریخ سے پہلے زبان پیدا ہوئی

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اُردو کا حال

کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال

خوب اور بہت خوب! مدتوں کی جنگ و جدل کا فیصلہ کس طرح آناً فاناً ہو جاتا ہے یک بیک آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ یہ کیسی نادانیاں تھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے بچے آپس میں الجھتے جھگڑتے، بزرگ خاندان کے پاس آئے ہیں (بزرگ سن وسال ہی کے لحاظ سے نہیں، فہم ودانش کے اعتبار سے بھی) اور وہ چٹکی بجاتے سارے جھگڑے چکا دیتا ہے لیکن ایسا جواب نہ محض شاعر کو سوجھ سکتا ہے نہ اکیلے مورخ کے بس کی بات ہے یہ وہی دے سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہو اور مورخ بھی اور ساتھ ہی نظر فلسفہ تاریخ و لسانیات پر بھی رکھتا ہو۔

فرماتے ہیں کہ بات یہ نہیں کہ جہاں ادھر کوئی دو قومیں بجنت و اتفاق سے اکٹھی ہو گئیں اور ادھر دونوں کی زبانوں سے مل جل کر ایک تیسری زبان وجود میں آگئی، بلکہ تجربہ تاریخی کا نچوڑ اور حکمت لسانیات کا عطر یہ ہے کہ دو قوموں کے جغرافی اتصال کے ساتھ ساتھ ان کا ہم تمدن ہونا اور باہم مناسبت رکھنا بھی شرط ہے جب کہیں جاکر تیسری اور نئی زبان پیدا ہوتی ہے عجب نہیں کہ اس نظریہ اور کلیہ تک پہونچنے میں حکیم ناطق صاحب نے کام اپنے مدت العمر کے طبی تجربہ سے بھی لیا ہو۔ نر اور مادہ اگر مختلف النوع ہیں تو ایسے جوڑے کو بارور ہوتے آج تک کسی نے دیکھا ہے؟ بہرحال آگے شعر سنیئے اور لفظی مناسبتیں جو آرہی ہیں ان کا مزہ دل ہی دل میں لیتے جایئے ؎

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام

واعظوں سوداگروں اور صوفیوں کا ہے قیام

اہل ہند، اہل عرب ہیں سب کے سب ابنائے سام

ہم نسب، ہم جنس، ہندو کیا کبھی ہوتے نہ رام

شاعری کا لطف اپنے ذوق سلیم پر چھوڑیئے تاریخی اعتبار سے وہ نثر کے حواشی پڑھتے جایئے، جو ہر بند کے مقابل گنجان لکھے ہوئے پورے پورے صفحے پر شروع سے آخر تک درج ملیں گے۔ پہلے شعر کے حاشیہ میں مسلمانوں کی آمد و رفت ہندستان میں پہلی صدی ہجری کے سنہ ۳۴ھ سے دکھائی گئی ہے اور سنہ ۳۴ھ سے لے کر سنہ ۸۶ھ تک ۱۲ مسلم فوجوں کے داخلہ ہند کی فہرست دے دی گئی ہے اور تیسرے مصرعہ پر مصنف کا حاشیہ ہے کہ حام کی نسل سے اہل حبش اور ہندستان کے قدیمی باشندے ہیں۔ یافث کی اولاد سے ترکی اور منگولین (مغل) اور سام کی نسل سے عرب، آرین یورپین اور ایرانی وغیرہ ہیں لہٰذا ہندستان کے شرفا اور عربی و ایرانی ہم نسب ہیں۔" (ص۸)

یہ حاشیہ محض مصنف کی تحقیق اور نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے نقل کر دیا گیا۔ یہ غرض نہیں کہ تعارف نگار مصنف کے ایک ایک فقرہ اور لفظ کو آیت و حدیث سمجھ رہا ہے، اچھا تو مصنف پہلے یہ کلیہ قائم کرتے ہیں کہ

ہو گا جن قوموں کی فطرت میں ازل سے اتحاد
جب کبھی وہ ایک جگہ ہو جائیں گے آباد و شاد
دونوں قومیں ہم سخن ہم داستان ہو جائیں گی
مل کے دونوں کی زبانیں یک زباں ہو جائیں گی

اور پھر ہند و عرب کے قدیم ترین تعلقات کو یوں بیان فرماتے ہیں ؎

میل میں صبح عرب سے کب تھی شام ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رُخ بہم
دل رُبائی کو بتان ہند پہونچے تا حرم!
ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم

تیسرے مصرعہ پر حاشیہ ہے کہ عرب کے بعض بت ہندستان سے گئے تھے اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا ؎

صورت و معنی کی آپس میں ملاقاتیں ہوئیں
پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں
فارسی عربی کے اسماء ہند میں داخل ہوئے
اور افعال و مصادر ہند کے شامل ہوئے

اور معاً اردو کی بنیاد پڑ گئی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ملاپ کی سب سے پہلی سرزمین پنجاب تھی ؎

بس کہ قصرِ ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا

اس لیے اُردو کا اول مستقر پنجاب تھا

لیکن

جیسے خطِ رخ کا بڑھے ابرو کی جدول چھوڑ کر

بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اول چھوڑ کر

تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں

لائے قطب الدین اس کو دہلی شاداب میں

اب دہلی مرکز بنا، اور اس مرکز سے ہر ہر صوبہ میں

ہر سپاہی اپنے ساتھ اردو کا لشکر لے گیا

"سپاہی" اور "اردو" اور "لشکر" لفظی لطافت کی داد بار بار کہاں تک دی جائے خلاصہ یہ کہ۔

نقش یوں بیٹھا اودھ میں نام اردو چل گیا

تھے بہاری نرم دل، خیر ان پہ قابو چل گیا حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا

آج اگر آئی اِدھر تو کل اُدھر چلتی ہوئی

اف یہ اتنی سی زبان اور اس قدر چلتی ہوئی

مسدس کی لفظی و معنوی خوبیوں کے اندازہ کے لیے اتنے اقتباسات بہت ہیں ورنہ اب کیا پیش لفظ میں ساری کتاب ہی نقل کردی جائے ؟ گو جی یہی چاہتا ہے۔

شاعری کی ساحری آپ دیکھ چکے اب نثر کی فسوں کاری کا ایک نمونہ دیکھتے چلیے مصنف کو لسانی نکتہ یہ بیان کرنا ہے کہ ہندو مسلم اختلاط کے بعد جب اسماء عربی و فارسی زبانوں سے ہندستان میں آنے لگے تو افعال و مصادر کہیں باہر سے نہیں آئے خاص اسی سرزمین سے پیدا ہوئے اس مسئلہ کو یوں تشبیہ و تمثیل کی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ گویا کسی علمی مسئلہ کی تحقیق نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی شفیق، مہربان ماں اپنے بچوں کو لوریاں سناتی جاتی ہے :-

ان الفاظ و اسماء نے صرف اپنی ہی ذات کے لیے ہندستان کو مستقل وطن نہیں بنایا بلکہ یہاں انھوں نے اپنے بال بچے پیدا کیے اور ان کے ہزاروں خاندان ہمیشہ کے لیے اس ملک میں آباد ہو گئے مثلاً تپ، فارسی اور سنسکرت میں بھی گرمی و بخار، ہند میں اس سے

"تپنا" مصدر پیدا ہوا پھر اسی کا متعدی تپانا بھی بن گیا ان دونوں مصدروں کا خاندان
یعنی پوری گردان الگ رکھیے "تپ" سے ایک لڑکی پیدا ہوئی "تپک" اس سے "تپاک" عالم
وجود میں آیا یا مثلاً "چارہ" ہند میں آکر متوطن ہوا یہ پہلے تو عالی خاندان تھا "چارہ ساز و چارہ گر"
اس کی نسل میں تھے مگر چھوٹی قوموں کی صحبت میں چارہ جانوروں کی غذاؤں میں شامل ہوا یہاں
تک کہ چرواہے اور چرکٹے پیدا ہونے لگے بہت سے ایرانی النسل اور عربی النسب الفاظ و اسماء
نے ہندی بیچاروں سے بھائی چارہ پیدا کر لیا اور ایسا میل جول بڑھا لیا کہ دونوں کا ایک دوسرے
سے جدا ہونا محال ہو گیا جیسے "بیلدار" "پچپکار" "سمجھدار" "سرچوڑ" "منھ زور" وغیرہ ایک
قسم ایسے الفاظ کی ہے جن کی صورت ویسی ہی رہی، مگر سیرت بدل گئی، جیسے "مشکور" "جذبات
شائق" "محرم" وغیرہ (صفحہ ۱۷۔۱۸)

اندازہ کے لیے ایک نمونہ بالکل کافی ہے مزید اقتباسات سے معاف ہی رکھا جائے اس لیے کہ تمہید کے حجم کو تصنیف
کے مساوی بنانا ہرگز مقصود نہیں۔

البتہ بڑی ناانصافی ہوگی، اگر اصل تصنیف کے متن و حواشی (نظم و نثر) کے ساتھ فاضل مصنف کے
مبسوط مقدمہ کا ذکر نہ کیا جائے اکثر اہل قلم اپنا سارا زور اصل تصنیف پر صرف کر دیتے ہیں اور چند سطریں چلتی ہوئی
مقدمہ کے نام سے لکھ اس پر کسی طرح چیپک دیتے ہیں یہاں یہ صورت نہیں۔ مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت
و اہمیت رکھتا ہے اور جو جو مسائل زبان، ادب شاعری کے اس کے اندر آگئے ہیں ان کے لحاظ سے اول سے آخر تک
پڑھنے کے قابل ہے۔

اردو غزل پر یہ اعتراض آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ "آخر اس میں حزن و غم کے مضامین لانے کی کیا ضرورت
ہے اسے تو شگفتہ ہونا چاہیے جواب حضرت ناطق کی زبان سے سنیے اور جواب کے بانکپن کی داد، دل اور زبان دونوں
سے دیتے جایئے۔

"یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ نوحہ و مرثیہ میں غم و ماتم کی کیا شرط ہے۔ غزل کے معنی ہی یہی ہیں
کہ با معشوق سخن گفتن و درد دل را نظم کردن" اس کے خلاف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو لفظ کے معنی بدل دینے کی قدرت
رکھتا ہو اور اپنی عقلمندی سے یہ اُمید رکھتا ہو کہ اور لوگ اس کی تقلید کریں گے۔ اب رہا یہ امر کہ غزل کے ہر شعر میں
اظہار غم و تمنائے مرگ بیشک مذموم ہے مگر غم سے کنارہ کشی اسی کا کام ہے جو اپنی اصل حقیقت سے بے خبر ہے۔

عشق مجازی میں اظہارِ عشق عیب ہے سوا اس کے کہ معشوق طوائف ہو یا یورو پین۔ ان دونوں مقامات پر نہ اظہار عشق عیب ہے نہ دیر ہوتی ہے اور جب اظہار محبت فوراً ہو جائے تو جذبات کی دنیا میں آبادی بڑھنے نہیں پاتی۔ نہ غم کی حرارت دل کو پگھلا کر مرکزِ غم بناتی ہے عشق میں ایک مدت گزرتی ہے تو پیمانہ بھر چھلکتا ہے اور جذبات پیدا ہوتے ہیں، انہیں کا نظم کرنا اور ایک ہی بحر و قافیہ میں محدود رکھنا غزل ہے۔

اردو ادب کی ہر تاریخ میں ایک لازمی بحث اس کی آئے گی کہ اردو شعر و ادب کی ترقی میں دکن کا کیا مقام ہے مصنف نے اس مبحث کو جس عنوان سے چھیڑا ہے اس کے آغاز ہی سے اس کے انجام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کسی علم و فن کی وسعت اور چیز ہے، ترقی دوسری شے ہے۔ دکن میں اردو کی توسیع تو اظہر من الشمس ہے مگر ترقی کے مدارج اس طرح معلوم ہوں گے کہ ہر ربع صدی کے شعراء کا تقابل کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ بتدریج کتنے غیر ملکی قدیم اور نامانوس اور غیر فصیح الفاظ نکال کے ان کی جگہ پر اردو الفاظ لائے گئے، کتنے الفاظ صرفی تبدیلی کر کے فصیح بنائے گئے اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا، اسی قدر زبان صاف ہوتی گئی، ان اصلاحات کی رفتار بالکل سست رہی سب ایک ہی لکیر کے فقیر رہے؟ ان لسانی اور صرفی و نحوی اصلاحوں کے علاوہ معانی و بیان میں ارتقا کے منازل برابر طے ہوتے رہے یا نہیں؟ مثلاً حقیقت کا نقش ثانی مجاز ہے تشبیہ کا دوسرا زینہ استعارہ ہے، صراحت کا لطیف جوہر کنایہ ہے، سادگی کے اسباب زینت، صنائع و بدائع ہیں انھیں مدارج کے طے کرنے کا نام تکمیل ادبی ہے، میں ہر زمانہ کے اشعار پیش کرتا ہوں اور مختصر شرح و تبصرہ بھی کیے دیتا ہوں، ناظرین خود ہی ترقی و تنزلی کا اندازہ کر لیں گے۔"

اس کے آگے یہ مختصر شرح بیسیوں صفحات تک پھیلتی چلی گئی ہے اور دکنی شعرا کے کلام پر تبصرہ کے ساتھ ہی ساتھ زبان، ادب، عروض کے خدا معلوم کتنے نکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی گئی ہے۔

کوئی بشری تحقیق، لغزش و خطا سے محفوظ نہیں ہو سکتی لیکن بحیثیت مجموعی یہ عرض کر دینا مبالغہ شاعرانہ سے پاک ہے کہ مسائل فن اور حسن بیان کی جامعیت کے لحاظ سے اردو میں کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر اس تمہید نگار کے علم میں نہیں اور اگر کالجوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں اسے جگہ مل جائے تو محض طلبا کی نہیں اکثر اساتذہ کی بھی خوش نصیبی ہوگی!

مسلمان اور آزادی کی جنگ[1]

تقریب

مضامین اور مقالات، چھوٹے بڑے رسالوں کو چھوڑیے، ایک مستقل ضخیم کتاب ہسٹری آف دی کانگرس کے نام سے کانگرس کی طرف سے انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔ نام اس ہسٹری آف دی کانگرس کا اگر ہسٹری آف ہندو نیشنلزم ہوتا، تو یقیناً صحت سے قریب تر ہوتا۔ ہند قدیم کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کی تاریخ پر افسانوں کا گمان ہو۔ ہند جدید کی خصوصیت شاید ٹھہرے کہ اس کے افسانوں کے لیے تاریخ کا عنوان ہو!

ذہن میں کسی پرانے زمانے کی فوج کے کوچ کا نقشہ جمایئے آگے آگے سپہ سالار ہیں پھر ترتیب وار رسالہ دار ہیں جمعدار ہیں، کمیدان ہیں، عام سپاہی ہیں اور ساری فوج کے گزر جانے کے بعد، اس کے عقب میں شاگرد پیشہ، کچھ مزدور، حمال، کچھ بہشتی سقے کچھ باورچی بکاول، کچھ نائی دھوبی وغیرہ یہاں بھی آزادی وطن کی فوج ظفر موج کے اس مرقع میں آگے آگے فیلڈ مارشل گاندھی ہیں اور جنرل تلک کرنل نہرو اور میجر پٹیل کیپٹن داس اور لفٹنٹ بوس، زرق برق وردیوں کے ساتھ پرچم لہراتے، تلواریں چمکاتے اور آخر میں، بہت آخر میں، دبے دبائے، کچھ شرمائے لجائے سے محمد علی اور انصاری اجمل خاں اور ابوالکلام، گویا میدان میں اپنے پیروں آ نہیں رہے ہیں، یہ کہیے کہ لائے جا رہے ہیں! اور حسرت غریب کی تو سرے سے پرسش ہی نہیں حالانکہ وہ بیچارہ جیل اس وقت گیا تھا جب جیل تفریح گاہ نہیں واقعی قید فرنگ تھی اور اس نے قید بامشقت کی کڑیاں اس وقت جھیلیں تھیں جب جیل کے اندر قیدیوں پر برقندازوں کے ڈنڈے برستے تھے اور جیل کے باہر پھولوں کے ہار گلے میں نہیں ڈالے جاتے تھے بلکہ اپنی ہی قوم طنز اور طعن سے کلیجہ چھلنی کر دیتی تھی!

ہندستان سے ہزارہا میل دور، انگلستان میں مستند اور ضخیم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا تیار ہوتی ہے۔

---

[1] از عبدالوحید خاں صاحب بی اے ایل ایل بی لاٹوش روڈ لکھنؤ تحریر نومبر ۱۹۳۸ء

جامعیت اور تحقیق کے بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ آخری (چودھویں) ایڈیشن کا جائزہ لے ڈالیے۔ ہندو لیڈروں میں، صف اول ہی کے نہیں، صف دوم کے ایک ایک لیڈر کا ذکر پڑھ لیجیے۔ ضمناً نہیں، اکثر صورتوں میں مستقل آرٹیکل کے تحت، لیکن آپ کے محمد علیؒ کا تمغۂ افتخار، گمنامی، اور آپ کے محمود حسن کا نشانِ امتیاز، بے نشانی! یہ ہے اس دور میں پراپیگنڈا کی سحرکاری!

اللہ اللہ یہ کمال اخلاص! قبول خلق سے یہ استغنا! طمع فاتحہ سے یہ بے نیازی!

عشق من در پس من فاتحہ خوانم باقی ست

وقت کی پکار، مسلمانوں سے مدت سے تھی کہ

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہوا!

اور حالات کا تقاضا تھا، کہ مسلمان، انگریزی میں نہ سہی، کم از کم، اردو ہی میں،

ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں

کا ثبوت دیں۔

آواز آخر کار ایک نوجوان گریجویٹ کے کان میں پڑی۔ قلم کی مشاقی اسے نہیں حاصل تھی نہ سہی، فرض کا احساس انتظار کی مہلت کہاں دیتا ہے جیسی کچھ بھی بن پڑی۔ جنگ آزادئ وطن میں مسلمانوں کی شرکت کی روئداد لکھ ڈالی۔ فرض کفایہ اصطلاح فقہ میں اسے کہتے ہیں کہ اگر ایک ادا کر دے تو سب کی طرف سے ادا ہو جائے اور کوئی نہ ادا کرے تو سب کے سب مجرم۔ سیاسیات و قومیات میں جو یہ فرض سب کی طرف سے اتار دے اس کا کیا کہنا اس کی سعی قابل مبارکباد، اس کی ہمت مستحق داد۔

مصنف کا قلم "آزادی کی جنگ" کا سرسری نقشہ اس سے قبل کھینچ چکا ہے نقش ثانی یوں بھی نقش اول سے بہتر ہوتا ہے پھر جب اس کا پشت پناہ مزید علم ہو، مزید تجربہ ہو، مزید مطالعہ ہو!

کتاب کا مسودہ پریس میں پہنچ چکا تھا جب جا کر اس پر نظر کرنے کا موقع ملا اور وہ بھی صرف جا بجا سے، ضرور نہیں کہ تائید ہر بیان کی، اور تحسین ہر عنوان کی کی جائے صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶ جہاں ترکوں کی طرف سے حق وکالت ادا کیا گیا ہے اس پر ساڑھے تیرہ سو برس والا اسلام حیران ہے کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ لیکن بہرحال

ایسے نشیب و فراز سے تو بڑے بڑے پختہ کار اہل قلم بھی نہیں بچ پاتے، ضرورت اس کی ہے کہ ہونہار مصنف کی حوصلہ افزائی دل کھول کر کی جائے اور اس کی کوششوں کا یہ ثمر گھر گھر پھیلایا جائے۔

نوابؒ جمیل الشان[1]

دیباچہ

دنیا نے نصیحت کو نصیحت کی راہ سے شاید کبھی سنا ہی نہیں یہ کونین جب حلق سے اتاری گئی ہے تو شکر کی تہ یا مصری کے غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر اچھے اطباء حاذقین بڑے بڑے جید معالجین سب کو یہی کرنا پڑتا ہے مثنوی معنوی کی حکایتیں منطق الطیر کی روائتیں گلستان کی کہانیاں اور بوستان کے قصے سب اسی کے نمونے گزرے ہیں سنائیؒ اور عطارؒ، رومیؒ اور سعدیؒ سب کو عمل اسی پر کرنا پڑا ہے کہ "سر دلبراں" کے لیے حدیث دیگراں اختیار کی جائے اور ے

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خود عارفانہ شاعری کیا ہے اول سے لے کر آخر تک مجاز بیان کا طلسم! حافظ اور خسروؒ اور مغربیؒ اور عراقیؒ جس کسی کے بھی آستانہ پر جایئے بادہ عرفان و معرفت چھلکتا ہوا ملے گا تو مجاز و استعارہ کے جام و ساغر میں، اور حقیقت کی جھلک نظر آئے گی تو شیشوں اور آئینوں کی وساطت سے۔ یہ بیسویں صدی کا زمانہ عشق و فسق کا زمانہ کھیل تماشہ کا زمانہ ناول اور ڈرامہ کا زمانہ تھیٹر اور سنیما کا زمانہ ہے رندوں کی محفل میں شیخ غریب کا کہیں گزر ہو جائے تو دستار بھی سلامت نہ رہنے پائے یہاں تو حکمت یہی ہے کہ خود بھی مستوں کے سے نعرے لگایئے خود بھی صراحی اور گلاس ہاتھ میں لیجیے پیجیے اور پلایئے، ظرف وہی رہے شیشہ و پیمانہ میں کوئی فرق نہ آنے پائے البتہ حلق کے نیچے جس چیز کے گھونٹ اتریں وہ شراب طہور ہو نہ کہ افشردۂ انگور!

جمیل الشان کے خوش نصیب مصنف نے اس نکتہ کو پالیا جمیل الشان کہنے کو ایک ناول ہے اور کہنے کو کیا معنی، واقع میں ناول ہی ہے حسن و عشق کا قصہ، ایک بیسوا سے عشق، باہم رقابتیں، پولیس والوں کی گھاتیں، شاطروں کی

---

[1] از عبدالرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ حق لکھنؤ تحریر مئی ۱۹۳۲ء

چالیں، ہجر کی بے تابیاں، مصاحبوں کی کارستانیاں، بگڑے ہوئے نوابی کارخانے، شاہی خاندان کی آن بان غرض ناول کی دلچسپی کے جتنے سامان ہوتے ہیں سبھی اکٹھے ہیں پھر زبان و حسن بیان، سبحان اللہ جہاں لکھنؤ کی زبان دکھائی ہے وہاں خالص لکھنوی جہاں بدایوں کی بولی بول چلے ہیں وہاں پورے بدایونی حیرت اس پر ہونے کو تھی کہ کاکوروی کو لکھنؤ کی زبان پر اتنی قدرت حاصل کیوں کر ہو گئی کہ معاً یاد پڑ گیا کہ سجاد حسین (اودھ پنچ والے) مولوی حاجی نور الحسن (نور اللغات والے) اور ڈپٹی امیر احمد علوی آخر کس خطہ کے رہنے والے ہیں۔

پلاٹ اتنا دلچسپ کہ ایک دفعہ کے شروع کر دینے کے بعد بغیر ختم کیے رکنا دشوار۔ قصہ کے افراد مردہ اور مفروضہ نہیں جیتے جاگتے حقیقی، واقعی، زندوں سے بڑھ کر زندہ، بار بار دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ لکھی ہوئی کتاب کے اوراق سامنے نہیں بلکہ اصل قصہ ان آنکھوں کے سامنے عملاً ہوتا ہوا گزر رہا ہے۔ فن (آرٹ) کے لحاظ سے طبیعت دو ایک مقام پر دراز کی بھی لیکن قصہ کی دلآویزی اتنی بڑھی ہوئی کہ پڑھنے والے کو رکنے اور غور و تامل کرنے کی مہلت ہی کب ملتی ہے۔

آخر تک پہنچتے پہنچتے بدکاری و ہوسنا کی بدانجامی، اور نیکی و پارسائی کی فتح، از خود بغیر بتلائے اور سمجھائے آئینہ ہو جاتی ہے اور مصنف کے حق میں دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں مصاحبوں اور خصوصاً میر صاحب عینک فروش کا چربہ خوب اتارا گیا ہے اور نواب جمیل الشان خان بہادر میراں بخش بدایونی اور نواب بنیاد حسین تینوں کی تصویریں اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ صرف ہیروئن کی تصویر کشی میں کہیں کہیں مبالغہ کا قلم چل گیا ہے آخر کتاب میں جو دو خطوط اس کی طرف سے ہیں وہ ساری کتاب کا نچوڑ ہیں حد درجہ موثر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے لاجواب، کتاب بھر میں یہی دو خط ہوتے اور کچھ نہ ہوتا، جب بھی بہت کچھ تھا، اب دعا صرف اتنی ہے کہ حسن قبول تصنیف اور مصنف دونوں کو نصیب ہو۔ کتاب کو خلق میں اور کتاب نویس کو خالق کے ہاں!

مُداوا[1]

پیش لفظ

ترقی تو ادب میں ہونی ہی تھی اور حرکت جب ہر چیز میں ہے تو ظاہر ہے کہ شاعری کیسے ساکن و جامد رہ سکتی تھی، لیکن بے راہ روی کا نام ترقی رکھ دینا اور بے قیدی کو آزادی سے تعبیر کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جسم پر آماس ہو آئے اور ہم اسے دیکھ کر کہیں کہ دیکھو یہ کیسا موٹا تازہ، تیار و تنومند ہے۔ اونٹ جیسا حلیم و شائستہ جانور بھی جب شترِ بے مہار بن جاتا ہے تو اس کے شتر غمزوں سے خدا کی پناہ!

پُرانی شاعری اور پُرانا ادب کوئی وحی آسمانی نہیں کہ اس کا کوئی نقطہ نہ بدل سکے، کوئی شوشہ نہ ٹل سکے خیالات بدلیں گے اسلوب بیان بدلیں گے اور بدلتے رہتے ہیں۔ ولی کی شاعری غالب کی شاعری نہیں اور فسانہ عجائب کی زبان امراؤ جان کی زبان نہیں۔ چراغ سے چراغ جلتا ہی آتا ہے اور شاخ سے شاخ پھوٹتی ہی رہتی ہے بچہ جوان ہوتا ہے اور جوان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے قدرت کا دستور یہ ہے لیکن کوئی زبردستی کھینچ تان کر اگر بچہ کو جوان کو اور جوان کو بوڑھا بنانے لگے تو یہ ارتقاء طبعی نہ ہوا یہ فطرت سے کشتی اور زور آزمائی ہوئی، جدت اگر محض جدت کی خاطر ہے تو اس کا نام ندرت نہیں بدعت ہے شگفتگی نہیں غرابت ہے۔

"ترقی پسند" ادیبوں کی فہرست میں نام منشی پریم چند آنجہانی اور قاضی عبدالغفار صاحب (مدیر پیام دکن) اور یہاں تک کہ "بابائے اردو" ڈاکٹر عبدالحق کے بھی لیے گئے ہیں اگر ترقی پسندی کا یہی معیار ہے تو پھر ہم سب ترقی پسند ہی ہیں اور اس ترقی پسندی سے انکار کس کافر کو ہو سکتا ہے، لیکن کاش اس دعویٰ میں خلوص ہوتا دریا کے مقابلے میں چند قطرے خرمن کے سامنے چند دانے ہستی ہی کیا رکھتے ہیں ترقی پسند ادب کے نام سے جو سیلاب عظیم نثر و نظم دونوں میں بد مذاقیوں عریانیوں اور گندہ بیانیوں کا چل پڑا ہے اس نے یہ حقیقت ہے کہ ہمارے پُرانے ادب کے بڑے بڑے

---

[1] مداوا مؤلفہ غلام احمد صاحب فرقت بی اے کاکوروی شائع شدہ ۱۹۴۴ء

فحش نویس اور بڑے سے بڑے ہزل گو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور نام از سر نو جان صاحب کا بلکہ بعض حیثیتوں سے میاں چرکین کا چمکا دیا ہے! انا للہ ـــــ بدعقیدگی اور اخلاقی بے ہودگی کو چھوڑیے آخر مذاق سلیم اور تمیزداری بھی تو دنیائے ادب میں ایک چیز ہے ان ظالم لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کے صفحات میں تو آنکھیں اس کو بھی ترستی ہی رہ جاتی ہیں ؎

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تیری صورت مگر ملے

جی خوش ہوا کہ ملک میں اس طوفان بے تمیزی (''طوفان'' کو آپ مجاز کہہ لیجیے لیکن بے تمیزی کو حقیقت کے بجائے مجاز سمجھنا ظلم ہوگا) کے خلاف تحریک پیدا ہوئی ہے اور جا بجا مزاحی اور سنجیدہ دونوں رنگ میں کوششیں رد و اصلاح کی شروع ہو گئی ہیں انہیں کوششوں کی ایک عملی شکل یہ پیش نظر کتاب بھی ہے کاکوری کے جواں عمر و جواں ہمت فرقت بی اے کے قلم سے اس کے مسودہ کے دو چار صفحہ مجھے بھی دکھلائے گئے یقین ہے کہ ساری کتاب اسی طرز و انداز کی ہوگی! لکھنؤ، زبان و ادب کی خدمت و اصلاح کے سلسلہ میں ممتاز شروع سے چلا آرہا ہے حق تھا کہ ایسی اصلاحی کتاب کی اشاعت بھی یہیں کی کسی اشاعت گاہ سے ہو۔

چند تبصرے

مرزا بلگرامی[1]

مغرب کی عقل و ذہانت کا منتہائے کمال یہ ہے کہ ہر جھوٹ کو سچ کے لباس میں پیش کیا جائے مشرق کی نازک خیالیوں کی بلند پروازی یہ تھی کہ سچائیوں کو جھوٹ کے پردہ میں بیان کیا جائے لندن کی وقائع نگاری کا ظاہر سچ ہے اور باطن فریب، دہلی کی داستان گوئی کا باطن سچ تھا اور ظاہر تصنع۔ ٹائمس اور مارننگ پوسٹ ہر نیست کو ہست کر دکھانے ہر رسی کو سانپ بنا دینے میں طاق ہیں الف لیلیٰ و انوار سہیلی والے حقیقتوں میں افسانے کا رنگ بھر دینے میں یکتا تھے، زدیمر اور مارگولیتھ، تاریخ اور سیرت نگاری کا نام لے لے کر ایسے ایسے واقعات لکھ ڈالتے ہیں جن کا وقوع نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا تھا۔ خواجہ حافظ اور امیر خسرو شاعری کی دنیا میں گل و بلبل کی زبان سے شراب و کباب کی اصطلاحوں میں، حکمت و موعظت، سچائیوں اور حقیقتوں کا دریا بہا جاتے ہیں، اپنا اپنا مذاق ہے، اور اپنا اپنا کمالِ فن۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے اور کیوں کرنے لگے کہ دونوں کی افسانہ گوئی میں بلند تر کمال اور پاکیزہ تر مذاق کس کا ہے!

افسانہ گوئی کی تعریف، مشرق میں یہی سمجھی گئی، کہ ظاہر جھوٹ ہو اور باطن سچ۔ اسم فرضی ہو، لیکن مسمیٰ واقعی۔ گلاس شراب کے ہوں، لیکن گلاس کے اندر بجائے شیرۂ انگور کے آب انار! زبان "دشنہ و خنجر" کے تلفظ پر کھلے، لیکن دل "ناز و غمزہ" کے معنی میں لگا رہے۔ گلستان کی حکایتوں کی تاریخی تحقیقات کرنے بیٹھیے اور اس کھوج میں پڑ جایئے کہ فلاں حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے وہ کس ملک کا تھا کس سنہ میں تخت نشین ہوا، کس تاریخ کو وفات پائی، کے شادیاں کیں، کتنی اولاد چھوڑیں تو شاید ایک حکایت بھی سچ نہ نکلے، لیکن اگر پوست کو چھوڑ کر مغز کو دیکھیے، نقاب کے رنگ میں اُلجھنے کے بجائے چہرہ کے خط و خال پر نظر جمایئے تو ایک ایک لفظ، سچ اور سچائی میں ڈوبا ہوا ملے گا۔

---

[1] رسالہ الناظر (لکھنؤ) سنہ ۱۹۳۰ء

صاحب مثنوی معنوی نے نہ صرف اس پر عمل کر کے دکھا دیا بلکہ اس کا فلسفہ بھی بیان فرمایا کہ "سر دلبراں" کو "حدیث دیگراں" ہی میں خوش تر و خوشگوار تر ہوتا ہے اور استاد غالب اپنی زبان میں فرما گئے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سنتے ہیں قدیم صوفیہ میں ایک فرقہ ملامتیہ تھا ظاہر خراب اور باطن آراستہ وضع رندانہ اور صورت مستانہ لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ آج کل کے مسخروں پر ان قدیم ملامتیوں کو قیاس نہ کیجیے یہ نیا سوانگ، طریق ملامت کے ساتھ تمسخر ہے ان ملامتیوں میں سے ایک ایک تھا ولی پوشیدہ اور کافر کھلا"۔

علی گڑھ بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر عالم صغیر ہے یعنی عالم کبیر میں جو کچھ بھی ہے سب کا نمونہ بندے کی بسائی ہوئی اس نگری کے اندر موجود کم سے کم عالم اسلام کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ (میوزیم) سمجھ لیجیے۔ ہر نوع، ہر قماش ہر نمونہ انسانیت کو اس ننھی سی دنیا کے اندر آ کر دیکھ لیجیے کیسے ممکن تھا، کہ طریق ملامتیہ کے نمائندوں سے سرزمین محروم رہتی۔ آیئے آج آپ سے بیسویں صدی کے ایک اپ ٹو ڈیٹ" علی گڑھ ملامتی کا تعارف کرایا جائے ظفر عمر کا نام آپ نے سنا ہے اسی نیچر گڑھ کا او لڈ بوائے اور نیکنام سرکار کے نیک نام ترین محکمۂ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر اس کی وضع قوم کی وضع سے الگ اس کی کوٹھی مسجد کے حجروں سے دور اس کی کچہری خانقاہ کے ہو حق اور مدرسے کے قال اقول سے کہیں پرے لیکن خود قوم و ملت خانقاہ و مسجد اس کے دل سے دور نہیں دل کے باہر بھی نہیں دل کے اندر، خاکی وردی اور کارتوس کی پیٹی، سفید ہلمٹ اور کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار سب نے دیکھی لیکن رنگ جامہ سے نگاہ ہٹا کر انداز قد بھی کسی نے نہ پہچانا؟ نقاب الٹ کر چہرہ کے رنگ روپ کو بھی کسی نے نہ دیکھا، اگر کسی نے دیکھا ہو بھی تو زبان پر لانے کی اجازت کسے؟ اس ناتمام داستان کو یہیں تمام ہو جانے دیجیے ـــــ مستقبل اسلام اور چوروں کا کلب، نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری سے تو یقین ہے کہ آپ بھی بے خبر نہ ہوں گے! نیلی چھتری" کا وجود افسانہ ہو گا لیکن جس افسانہ کا نام نیلی چھتری ہے وہ تو افسانہ نہ رہا۔ ایک مستقل حقیقت بن گیا! جس مٹی اور پتھر کے کھنڈر کا نام نیلی چھتری ہے وہاں کوئی خزانہ مدفون ہو یا نہ ہو، لیکن جو نیلی چھتری، کاغذ اور قلم اور روشنائی کی مدد سے تیار ہوئی، وہ تو یقیناً اپنے ہمراہ دولت لے کر آئی اور بہرام اور مسعود اب نرے متخیلہ کے بے جان مخلوق نہ رہے بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے راجہ اندر اور تاج الملوک، لال دیو، اور سبز پری، امیر حمزہ اور عمر عیار کی طرح

اچھے خاصے گوشت و پوست کے بنے ہوئے جیتے جاگتے چلتے پھرتے جانے پہچانے ہوئے جاندار انسان بن گئے!

ناول پڑھنے کی اب نہ فرصت نہ ضرورت، نہ شوق نہ ہمت۔ خود اپنے افسانہ حیات کا مطالعہ اور حسرت مطالعہ سے کہاں مہلت اور کسے دماغ کہ گڑھی ہوئی کہانیوں اور جھوٹے قصہ کے سیر و تماشا کا وقت نکالا جائے اور خود اپنی ہستی کی ٹریجڈی کیا کم ہے کہ قیس کی نامرادیوں اور فرہاد کی حسرت نصیبوں کا رونا بیٹھ کر رویا جائے اکبر علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں۔

عبرت زدہ را کار بہ آزردگاں نیست

ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ عرصہ ہوا چھوٹ چکا شرر و سرشار، جارج ایلیٹ اور میرا ڈتھ کی گلکاریوں سے دل بہلانے کا مشغلہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا ع

ماخانہ رمیدگان ظلمیم — پیغام خوش از دیار ما نیست

لیکن ایک معتبر و ثقہ دوست نے ہاتف غیب کی طرح آکر سرگوشی کی، کہ نیلی چھتری کے خزانہ کے مالک کی ہمت اب اور بڑھی ہے اور اب کی اس نے علاقہ مالوہ کے لال کٹھور کی چھپن کروڑ کی دولت پر دھاوا بول دیا ہے۔ اجی نہ مانا، تو بہ توڑی اور جس روز نامی پریس لکھنؤ سے دو سوا دو سو صفحہ کی چھوٹی سی خوبصورت و خوشنما کتاب کا پارسل آیا اسی وقت شروع سے آخر تک پڑھ گیا! لال کٹھور" آپ چونکیں گے اور منھ بنا کر فرمائیں گے کہ نام تو عجب قسم کا نامانوس اور غیر شاعرانہ ہے بجا ارشاد ہوا لیکن یہ تو فرمایئے کہ آج سے چند سال قبل نیلی چھتری کا نام کچھ نامانوس اور کچھ کم عجیب و غریب تھا، اور پھر عمرو عیار کی زنبیل اور دیوار قہقہہ اور چشمہ آب حیوان اور گل بکاؤلی کو آپ کیوں بھولے جاتے ہیں، کیا ان ناموں سے دنیا روز ازل ہی سے مانوس چلی آرہی ہے؟

نیلی چھتری اگر آپ پڑھ چکے ہیں اور بہرام و سعود کے کارناموں سے واقف ہو چکے ہیں تو اس جدید داستان کو آسانی سے سمجھ لیں گے بہرام اب معلوم و معروف مجرم نہیں بلکہ علیگڑھ کے مشہور "کھلنڈرے" مسعود کے ہمراہ اب مہراب جنگ کے نام سے دہلی میں ایک باعزت شہری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہو گیا ہے یہ راز نہیں کھلتا کہ اس کی سکونت کے لیے مصنف نے بجائے دہلی کے مشہور و معروف محلہ کوچہ چیلاں کے ایک دوسرے مشہور محلہ بلی ماراں کا انتخاب کیوں کیا۔۔ اب وہ خلق خدا کا دشمن نہیں، بلکہ اس کا ایک مخلص خادم اور اب اس کی حیرت انگیز ذہانت (یا بہ زبان اخبارات سنسنی خیز ذہانت) جرم کرنے کے بجائے مجرموں کو سزا دینے اور انھیں کیفر کردار تک پہونچانے کے لیے وقف ہے اس کی مختصر ٹکڑی کا نام خدائی فوجداروں کی جماعت پڑ گیا ہے اور اس کی بے جگری جانبازی و سرفروشی سے بڑے بڑے پرانے اور بیباک

مجرم تھرّانے اور پناہ مانگنے لگے ہیں مہراب جنگ کے خاص ملنے والوں میں قابل ذکر نام ڈاکٹر رحمٰن اور انسپکٹر وقار حسین کے ہیں۔ لال کنٹھور اگر نامانوس نام تھا تو یہ نام تو یقیناً آپ کے لیے نامانوس نہ ہونے چاہیے۔ ان خدائی فوجداروں کے ٹھیک مقابل اسی شہر دہلی میں چھپے ہوئے بدمعاشوں اور انتہا درجہ کے چالاک و بے درد مجرموں کا بھی ایک نہایت مضبوط جتھا قائم ہے جس کے سرغنہ و سردار دہلی کے ایک مشہور گیسو دراز اشتہاری صوفی (ص۱۱ ص۲۹ الخ ص۲۵) مرزا بلگرامی ہیں جن کی قلمی تصویر کو دیکھ دیکھ بے اختیار یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدۂ

چشم بد دور کہ خوش شعبدہ باز آمدۂ

خدائی فوجداروں جو خلق اللہ کی حفاظت کرتے رہتے اور ایسے بدمعاشوں کو جنھیں پولیس بھی ان کے کیفر کردار کو نہیں پہونچا سکتی خود ہی معقول سزا بھی دے دیتے ہیں ص۱۱ مقابلہ انھیں بزرگوار سے آپڑتا ہے اور ساری کتاب نور و ظلمت، جرم و تعزیر جرم کی کشمکش کی نذر ہے کتاب کے مرقع میں سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ سبق آموز تصویر مرزا بلگرامی کی ہے ان کی تفصیلی زیارت اور ان کے ہتھکنڈوں سے پوری واقفیت کا اگر شوق ہو تو ڈیڑھ روپیہ میں کتاب نامی پریس لکھنؤ سے حاصل کیجیے لیکن مرزا کی اجمالی شکل و صورت اور اس قابل زیارت چہرہ کے نمایاں خط و خال اگر آپ اس ریویو کے آئینہ ہی میں دیکھ لینا چاہتے ہیں تو بس اتنا سمجھ لیجیے کہ مرزا بلگرامی صاحب کوئی خدانخواستہ معمولی اور ادنیٰ قسم کے مجرم نہیں جن سے ملتے ہوئے آپ شرمائیں۔ کیا عجب کہ ان سے نیاز حاصل ہو جانا آپ اپنے لیے باعث شرف و عزت خیال فرمائیں۔ یہ ذات شریف مریدوں کی ایک بڑی جماعت کے پیر و مرشد ہیں اپنے بعض مریدوں اور معتقدوں کی جاں نثاری پر بجا طور پر فخر رکھتے ہیں ایک زنانہ اسکول کھول رکھا ہے بہت سے رسالوں کے مالک ہیں، پریس ہے کتابوں کا کاروبار ہے دفتر عین شہر دہلی کے وسط میں ہے لیکن یہ حضرت رہتے دہلی کے قریب ہی کسی ایسے مقام پر ہیں جہاں ایک مشہور درگاہ واقع ہے (ص۶) دفتر اور دفتر کی عالیشان عمارت دہلی میں مشہور ہے (ص۲۱) یہ بزرگ اپنے کارناموں سے حسن بن صباح کی یاد اس بیسویں صدی میں تازہ رکھے ہوئے ہیں (ص۲۰/۲۱ نیز ص۶۲و۶۳)

باوجود قانون اور حکومت کی سخت گیری کے پایہ تخت دہلی میں بیٹھے ہوئے اپنی دغابازی اور عیاری کے زور سے خلقت کو مسحور کیے ہوئے ہیں (ص۲)

مرزا بلگرامی کے سر پر کاکلین (ص۳) اور زینت و آرائش کے وقت ان لمبی کاکلوں میں خوب تیل لگا ہوا (ص۴۹) قوالی اور نعتیہ غزلیں سنتے رہتے ہیں (ص۱۴۴) خاص چیزان کے روزنامچے ہیں جو ان کے اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں اور

اور جن میں ان کے قلم سے بلگرامی بانو کی تعریف و توصیف برابر نکلتی رہتی ہے (ص۱۶۱) قومی اور مذہبی معاملات میں خاص دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تبلیغ کے سوانگ میں سرگرم ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جہراب جنگ ایک مشہور قومی لیڈر کی طرح مشتعل ہو کر مرزا بلگرامی کو مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے کہ اے اشتہاری صوفی اور تبلیغ کے جھوٹے سردار (ص۱۱۴) اور مسعود کی زبان میں اس صوفیٔ اشتہاری اور دغاباز پیر (ص۱۱۴) کا جامع اور مختصر تعارف یہ ہے کہ

مرزا بلگرامی ایک تاریخی خانقاہ کا مجاور، تبلیغ و اشاعت مذہب کے کاموں میں پیش پیش، کئی ایک اخباروں کا ایڈیٹر، اور مدرسوں کا مہتمم ہونے کے علاوہ پیری و مریدی کے سلسلہ میں بھی مشہور (ص۱۷۵)

ان بزرگوار کو اپنے اثر اور اپنے رسالوں اور کتابوں کی اشاعت پر ناز بھی ہے ایک جگہ اپنی زبان سے فرماتے ہیں میرا کاروبار سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے میرے مرید ہر جگہ بکثرت ہیں اور میری کتابیں اور رسالے تمام ملک میں شائع ہو جاتے ہیں میری اخباری نکتہ چینی سے بڑے بڑے والیان ملک کانپتے ہیں اور ان کے درباروں میں کھلبلی پڑ جاتی ہے۔ جہاں جاتا ہوں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں (ص۱۷۹) اور ساتھ ہی یہ کھلا ہوا راز بھی زبان پر آ جاتا ہے، کہ

"دنیا کے لیے میں زاہد خشک ہوں لیکن آپ یقین کریں کہ باوجود ان سب باتوں کے میرا دل اچھی صورت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اچھی آواز کان میں جاتی ہے، تو میں مسرور ہوتا ہوں۔ خدا نے آپ کو حسین بنا دیا ہے اور علم موسیقی میں آپ اس قدر مہارت رکھتی ہیں۔" (ص۱۷۶ و ۱۸۰)

فرمایئے، مرزا بلگرامی کی دلچسپ شخصیت سے اب بھی آپ کو دلچسپی پیدا ہوئی یا نہیں؟ لیکن ذرا ٹھہریئے بعض دلچسپ تر خصوصیات ابھی ظاہر ہونا باقی ہیں آپ لاکھ ذہین سہی، لیکن یہاں تک کہ آپ کا ذہن بھی نہ پہونچا ہوگا۔ اور کیسے پہونچتا، نہ آپ محکمہ پولیس کے کوئی افسر، نہ کوئی پیشہ ور سراغرساں، کہ یہ جو اطراف ملک میں بلیوں بلوے، کشت و خون اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، یہ

"انہی حضرت کی بدولت ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے روپیہ ان کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتا رہتا ہے دہلی کے کئی قتل جن کا آج تک پتہ نہ چلا ان میں مرزا کے گرگوں کی شرکت تھی، کتنے ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کا دیوالہ نکل گیا، وہ بھی مرزا کی بدولت" (ص۲۹)

یہ ذات شریف جب آخری بار مسعود کی گرفت میں آتے ہیں اور اپنے کیفر کردار تک پہونچنے کے قریب ہوتے ہیں، اس وقت وہ علی گڑھ کا مشہور "کھلنڈرا" انھیں مخاطب کر کے ان کی فرد جرم یوں سناتا ہے:۔

"لال کٹھور پر قبضہ کرنے اور دولت مند بننے کا جنون تم پر سوار تھا، تم موجودہ زمانہ کے حسن بن صباح ہونا چاہتے تھے، ہندو مسلمانوں کو تم نے آپس میں لڑایا، پیری مریدی کے گورکھ دھندے سے ہزارہا آدمیوں کو گمراہ کیا، مدتوں پولیس کی آنکھ میں خاک جھونکی، قتل پر قتل کیے اور خلقت کو لوٹا" (صفحہ ۲۳)

آپ کہتے ہوں گے کہ ایسا چھٹا ہوا مجرم تو پولیس کی نظر میں چڑھا ہوا ہوگا اور ملک کے امن و نظم کے ذمہ دار حکام سرکار تو اسے ملک کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہوں گے لیکن توبہ کیجیے آپ کا دماغ بھلا مرزا بلگرامی کی ذہانت کو کہاں پا سکتا ہے؟

"اس خیال سے کہ حکام وقت کو اس کی مجرمانہ حرکات کی جانب شبہ نہ ہو، وہ وقتاً فوقتاً اپنے اثر و ذہانت کو ان کی خدمت میں پوشیدہ طور پر صرف کرتا تھا" (صفحہ ۲۹)

پولیس والے کیا پتہ لگاتے طلسم ٹوٹنے پر، ایک انسپکٹر صاحب خود دنگ رہ جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آتا، کہ

"مرزا بلگرامی جو عوام میں اس قدر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور حکام دہلی جس کے اثر سے اکثر کام لیتے ہیں ایسا خطرناک مجرم ہے۔" (صفحہ ۸۶)

ایک مرتبہ جب انسپکٹر صاحب ایک اہم تلاشی کے لیے ناوقت مرزا صاحب کے دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو مرزا صاحب کیا فرماتے ہیں۔

"آپ ہیں انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے جو ایسے وقت تکلیف فرمائی؟ کیا ڈپٹی کمشنر پاکپتان صاحب نے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے آپ کو بھیجا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں گورنمنٹ کی خدمت کے لیے ہر وقت حاضر رہتا ہوں۔" (صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳)

یہ جاسوسی کوئی مالی منفعت کی چیز نہیں اس کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے ایک شریک کار اور راز دار تخلیہ میں دریافت کرتے ہیں کہ آخر جاسوسی تو کہیں نہیں گئی اس کا کیا حال ہے؟ (صفحہ ۲۸) تو جواب ملتا ہے کہ اس کی قدر بھی اسی وقت تک تھی جب تک میری اخباری ہلچل کامیاب تھی پھر اس میں ملنا ہی کیا ہے، وہ تو محض دوسری سرگرمیوں کی پردہ پوشی اور رفع شر کے خیال سے مفید تھی (صفحہ [illegible])

ان مرزا بلگرامی سے بھی کہیں بڑھ کر پراسرار ان کے "سانپ" ہیں جو ہر مخالف کو ڈس کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ دہلی کا بینک بابو ایک تھا اس بیچارہ کی شامت آئی تو اسے یہ پتہ لگ گیا کہ بینک میں

مرزا صاحب نے تبلیغ کے نام جو روپیہ جمع کرایا ہے، اسے اپنی ذات پر صرف فرمارہے ہیں اور اس نے دھمکی دی کہ جلسہ تبلیغ میں یہ راز فاش کردیا جائے گا بس پھر کیا تھا اس بابو غریب کا خاتمہ تھا (ص۸۹) ایک اور اجل گرفتہ احمد جان صاحب تھے جو مرزا کے شریک کار رہ کر پنجاب اور سندھ سے مدرسہ صوفیہ کے لیے بہت سا چندہ جمع کرلائے تھے۔ روپیہ کی تقسیم پر جھگڑا ہوا ان کے پاس مرزا کے کچھ خطوط تھے جن کے شائع کرنے کی انھوں نے دھمکی دی، شام کے وقت پارک گئے، گھر واپس نہ آنے پائے تھے کہ راستے میں سانپ نے ڈس لیا، اور جب پولیس آئی تو خطوط جیب سے غائب ہوچکے تھے (ایضاً)

سب سے زیادہ پر لطف مرزا صاحب کا اپنے ان کارناموں سے تجاہل ہے پولیس کے ایک افسر صاحب مرزا صاحب کو آگاہ کرتے ہیں کہ آپ کے سانپ کا راز، اب راز نہیں رہا ہے، تو معصومیت اور بھولے پن کی کس دلفریب ادا سے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

"سانپ کیسا؟ کیا میں کوئی سپیرا ہوں؟ صاف بتایئے، معموں میں بات نہ کیجیے" (ص۱۶۶)

"سانپ کیسا، کیا میں کوئی سپیرا ہوں"؟ کیا خوب ارشاد ہوا ہے جتنی بار جی چاہے دہرا دہرا کر اس فقرہ کا مزہ لیتے رہیے۔

آپ کہیں گے کہ مرزا بلگرامی کو آخر تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کی ضرورت ہی کیا پیش آئی، مزے سے اپنے تبلیغ کے کاموں میں لگے رہتے اور گھر بیٹھے معقول آمدنی کماتے رہتے۔ لیکن ان کی بدقسمتی کو کیا کیجیے کہ دہلی میں ایک مولوی صورت اور نیچری سیرت ایڈیٹر نے اس ہوائی قلعہ کی بنیادیں تک اپنی گولہ باری سے مسمار کردی تھیں ایک رازدار خلوت میں پوچھتے ہیں، کہ یہ تو فرمایئے، اب تبلیغ واشاعت مذہب کے گورکھ دھندوں کا کیا حال ہے؟ جواب میں ٹھیک کوسنے والوں کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> فی الحال اس کی بھی کساد بازاری ہے خدا سمجھے اخبار انیس کے مولوی نما کرسٹان صفت ایڈیٹر کو۔ اس نے ایسا بھانڈا پھوڑا ہے کہ اب وہ چشمہ بھی خشک ہوتا جاتا ہے اس کے علاوہ ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے کے خون کے اب ایسے پیاسے نہیں رہے ہے جیسے پہلے تھے باوجود کوشش کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں نہ مقدمہ بازی" (ص۲۸)

اتنی جلوہ آرائیوں کے بعد کیا اب بھی آپ کو یہ گلہ باقی رہے گا کہ ریویو نگار نے مرزا بلگرامی کے چہرے سے نقاب کے گوشہ الٹنے میں بخل سے کام لیا ہے؟

مصنف نے غائت ستم ظریفی یا فرط انکساری سے کام لے کر اپنا رستم داستان مہراب جنگ ہی کو ٹھہرایا ہے اور اس کے بعد پھر مسعود کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے عام تماشائی یقیناً اس نظر بندی میں گرفتار ہو جائیں گے لیکن بزم آخر محض تماشائیوں ہی سے تو بھری ہوئی نہیں، ع

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی!

ان اہل نظر کی نظر تو بس مرزا بلگرامی کے کے چہرہ پر پڑے گی اور وہ ساری کتاب کو اسی ایک متن کا حاشیہ قرار دیں گے۔ ایک پرانے افسانہ نویس نے بھی آج سے سیکڑوں برس قبل اپنی داستان کا نام داستان امیر حمزہ رکھ دیا تھا لیکن پڑھنے والوں کے دل سے کوئی پوچھے کہ وہ امیر حمزہ کی داستان ہے یا عمرو عیار کی؟ اس کتاب میں بھی مرکزی شخصیت اور سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت مرزا بلگرامی ہی کی ہے۔ دوسرے نام اس میں محض اس طرح آگئے ہیں جیسے بکاؤلی کے قصہ میں لکھا بیلسوا، اور زین الملوک یا داستان امیر حمزہ میں بختک ورلند ہور! البتہ دل کو تذبذب اس میں ہے کہ اس چھوٹی سی دلچسپ و خوشنما کتاب کی حیثیت کیا قرار دی جائے، اور اسے لٹریچر کی کس صف میں رکھا جائے۔ تاریخ یا سوانح عمری اسے قرار دیتے ہوئے تو دل دھڑکنے اور قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ پھر کیا ہے؟ افسانہ؟ اچھا افسانہ ہی سہی۔ مصنف کو اگر اسے افسانہ کہنے، اور ناظرین کو اسے افسانہ سمجھنے پر اصرار ہے تو افسانہ ہی سہی پھر وہی سوال ہوگا، کہ افسانہ جھوٹا ہے یا سچا؟ تو اب کیا ہر سوال کا جواب ریویو نگار ہی دے؟ ماشاء اللہ آپ کے بھی آنکھیں ہیں، اور آپ کے پاس بھی عقل و دماغ ہے سوال کا جواب اپنے ہی آپ کیوں نہیں حاصل کر تے۔

میٹھی کنین یا افسانۂ "جمیل"[1]

گرجستان یا آرسینیا کے نہیں اسی شہر لکھنؤ کے رہنے اور بسنے والے نواب جمیل الشان بہادر ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے ابھی کل تک زندہ سلامت موجود تھے اور عجب کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو زیارت بھی نصیب ہوئی ہو ایک ضعیف سے آدمی، شاہی خاندان کی یادگار، چہرہ پر جھریاں اور خضابی بال، عمر کچھ اوپر ساٹھ سال جسمانی قویٰ میں ضعف و انحطاط لیکن طبیعت وہی رنگین اور مزاج بدستور شوقین تمنائیں اور آرزوئیں جوان، دل کے گوشہ گوشہ میں نوجوانوں کے سے ارمان آخر دَورِ آخر کے نواب ہی تھے۔ معقول وثیقہ اور گرانقدر پنشن تھی کس دن کے لیے رئیسوں کی آن بان، نوابوں، شہزادوں کی شان، اور پھر گل ہوتے ہوئے چراغ کی لو تیز کرنے بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دینے کے لیے مصاحب ایک نہیں دو دو حاضر و مستعد۔ ایک مرزا مسیتا دوسرے میاں علی حسین۔ ایک روز باتوں باتوں میں ایک بازاری حسن کا وہ سبز باغ دکھایا اور شوق و اشتیاق کا وہ لام باندھا کہ بھلا شہزادہ اعادہ شباب کے کسی غدودی آپریشن کے بغیر اپنے کو عام تصور میں جوان رعنا سمجھ بیٹھا اور دل کسی کوہ قاف کی پری پر نہیں شہر ہی کی ایک لکھا بیسوا پر آ گیا۔ یہ بی صاحبہ، تھیٹر میں کام اور تماش بینوں میں نام پیدا کیے ہوئے اتفاق سے اس وقت ایک خان بہادر کی پابند تھیں۔ خان بہادر سن و سال میں تو تھے شہزادہ صاحب کے لگ بھگ لیکن مضبوط، اور ٹانٹھے۔ ساٹھے پاٹھے۔ بڑے حکام رس اور باثر، غضب کے زیرک و صاحب ہنر۔ رہنے والے لکھنؤ کے نہیں خاک پاک بدایوں کے وہی بدایوں جس کا کلمہ استاد مصحفی بھی پڑھ گئے ہیں ؎

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں

اسی ڈیرہ دالکے عشق سراپا فسق میں ڈیرے ڈانڈے لکھنؤ میں ڈالے ہوئے چوک کے قریب چھاؤنی چھائے ہوئے۔ اب شروع ہوئی بازار کی مٹھائی پر چھین جھپٹ یا شاعروں کی زبان میں رقابت۔ اِدھر سے بلا کے جوڑ۔ اُدھر سے قیامت کے توڑ۔ ادھر کے جیلیے اگر اپنے وقت کے "جالینوس" تو ادھر کے شاطر بھی اپنی حکمت و فطرت کے لحاظ سے

---

[1] صدق مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۰ء

پورے "فیلسوف" کبھی اِن کو مات، کبھی ان کو شکست فاش، ایک کو اپنے خاندانی جاہ و حشم کا غرّہ، دوسرے کو صاحب لوگوں کی خدمت میں ڈالی پیش کرنے اور شکار کھلاتے رہنے کا آسرا۔ اِدھر خان بہادر نے پولیس کپتان کو گانٹھا، ادھر شہزادے نے ڈپٹی کمشنر کو جاکر شیشہ میں اتار لیا۔ آج عتاب نازل ہوا پولیس کے داروغہ پر اور بیچارے کا درجہ ٹوٹ کر رہا، کل نزلہ گرا کوتوال شہر پر اور غریب کو لکھنؤ چھوڑ کر کانپور جانا پڑا۔

شہزادہ سے نپٹ لینے کے لیے خان بہادر بالکل کافی تھے لیکن ہوا یہ کہ شہزادہ کو کمک پہونچ گئی اپنے رفیق قدیم نواب بنیاد حسین خاں آنرری مجسٹریٹ اور رئیس اعظم کانپور کی یہ ٹھہرے سوجھ بوجھ میں خان بہادر سے بھی بڑھے چڑھے، اور حکام رسی اور خوشش تدبیری میں ان سے کہیں آگے اڑتی چڑیا کے پر گن لینے والے اب نقشہ جنگ یہ کہ ایک طرف لکھنؤ کے شہزادہ اور کانپور کے رئیس اور مجسٹریٹ اور دوسری طرف بدایوں کے خان بہادر اور کانپور کے کوتوال۔ محاذ جنگ بھی اب کھینچتے کھینچتے لکھنؤ سے کانپور اور کلکتہ اور بدایوں تک وسیع ہو گیا اور واقعات کے اسٹیج پر پہلے تو وہی جانے بوجھے دو ہی چار شخص تھے اب نئی نئی صورتیں نمودار ہوئیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ۔ نواب خورشید مرزا اور قمر مرزا اور خورشید دلہن اور فرحت مرزا اور مسعود شاہ اور سب سے بڑھ کر میر زین العباد چشمہ فروش۔ ان بزرگوار سے ایک بار بھی تعارف ہو جائے تو عمر بھر ساتھ چھوڑنے کو جی نہ چاہے ایک روز شہزادہ صاحب معہ اپنی اور خان بہادر کی مشترک محبوبہ کے غائب ہو جاتے ہیں، پھر یکایک کانپور میں ان کا نزول اجلال ہوتا ہے بجائے اس بیسوا کے ایک خوش جمال و شوخ دیدہ کشمیری لڑکے حسن جان کے ساتھ چند روز کے بعد حسن جان بھی "لاپتہ" یا مفقود الخبر!

"میری زندگی بھی عجیب زندگی ہے مجھے اس زندگی سے کبھی دلچسپی نہ تھی، ہمیشہ کراہت رہی۔ کئی دفعہ اس مخمصہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ روپیہ دولت کی چاٹ بری چاٹ ہے اور عادت پڑ جانے کے بعد بدکاری میں لذّت ملتی ہے مگر تاکے دس پانچ برس کے بعد کیا سے کیا ہو جانا پڑے گا۔ باسی ہار کو لوگ پیروں سے ملتے ہیں عشاق کہو یا چاہنے والے، سب جوانی کے ساتھی ہیں وہ ڈھلی، اور ان کی نظریں پھریں چھیڑ چھیڑ کر لڑائی کرتے ہیں، وضعدار ہوئے تو کچھ دنوں نباہا رفتہ رفتہ آنا جانا کم کیا، پھر بیٹھ رہے"۔

یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے ان خیالات کی جو اس بیسوا کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں جسے آپ ابھی اس عالم میں چھوڑ آئے تھے کہ

وائے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند

جی ہاں، یہ خیالات اور ایک بیسوا کے! بیسوائیں بھی آخر اسی مٹی کی بنی ہوئی ہیں، جس سے خمیر بڑی بڑی عصمت کی پتلیوں کا ہوتا ہے اور بندی اسی قادر مطلق کی ہوتی ہیں جو شریف بہو بیٹیاں پیدا کرتا رہتا ہے اس کی رحمت کی جب ہوا چلتی ہے تو وہ محلہ کے سڑے ہوئے گھورے پر مہکتے ہوئے گلاب اور لہلہاتے ہوئے چنبیلی اور جوہی کے پھول کھلا دیتی ہے اور اس کی صنعت جب بہار پر آتی ہے تو کھرے اور کھردرے پتھروں کو ہیرے اور جواہر بنا دیتی ہے ناپاکی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے' دنیا میں حقیر و ذلیل، آخرت میں رانده و درمانده جوانی کی بہار کے دن کی ؟ دولت کا خواب کے گھڑی کا؟ جوان جہان عورت اپنے انجام کو سوچتی جاتی ہے اور دل ہی دل میں روتی ہے۔

"بی صاحبہ سنوں سے اتریں اور چاہنے والوں کی کمی ہونے لگی، دولت کے پر لگے۔ یہ گئی اور وہ گئی مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ دن کے جلیس اور رات کے مونس ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے حیادار ہوئیں تو چل بسیں! نہیں تو برقعہ پہن کر بھیک مانگنے کی ٹھہری۔ آئے دن کے واقعات ہیں پچاسوں مثالیں اس قسم کی اسی شہر میں کیا ہر شہر میں موجود ہیں کسی کی ناک گئی اور کسی کی جان گئی اہتمام یہ ہے کہ اولاد نہ ہونے پائے بوڑھاپا آجائے گا چھوٹے بچے کو دیکھ کر ماں کو جو دلی خوشی ہوتی ہے وہ ان کے مقدر میں نہیں، جوان مریں تو کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں' نہ فاتحہ نہ درود کرنے والا۔"

پاک زندگی کی لطافتیں گھر گرہست شریفانہ زندگی کی مسرتیں، میاں اور اولاد کی محبتیں۔ ان بیچاریوں کو کب نصیب یہ بدنصیب کیا جانیں کہ گھر کی ملکہ ہونے کے معنی کیا ہیں اور شوہر کی کمائی کی موٹی جھوٹی میں بھی اللہ نے کیا لطف اور کیسے مزے رکھ دیئے ہیں عصمت جو غریب سے غریب عورت کا سب سے بڑھ کر بیش بہا خزانہ ہے، اور حوا کی بیٹیوں کے پاس اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے اس کی ناقدری کی سزا قدرت کی طرف سے اسی دنیا میں یہ مل کر رہتی ہے کہ عورت محبت سے محروم کر دی جاتی ہے اب نہ اس کے دل میں کسی کی محبت رہ جاتی ہے نہ کسی کے دل میں اس کی۔ اور یہ نہ ہو تو دنیا میں آخر نور و ظلمت، خوشبو و بدبو، پاکیزگی و گندگی ایک ہی ہو کر نہ رہ جائیں!

زمانہ کچھ اور دکھتا ہے واقعات پلٹوں پر پلٹے کھاتے ہیں کموجان کو آخر کار بڑی لمبی جد و جہد کے بعد خان بہادر کی قید سے رہائی نصیب ہوتی ہے شہزادہ صاحب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں شریف بیسوا اپنی نام کی ماں کے نام خط لکھنے بیٹھتی ہے خط میں کیا لکھتی ہے اپنی اور اپنی ساری برادری کے نامہ اعمال کی نقل کاغذ کے اوراق پر کر دیتی ہے۔

"امی جان" کمو کی بندگی قبول کیجیے مجھ نصیب جلی کو آپ چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور اپنے کانٹے بیچ سے

باز نہیں آتیں کہ آپ سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ ناپاک زندگی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی نہ معلوم وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ جب معلوم نہیں کس نے مجھے آپ کے سپرد کیا اور آپ نے مجھے پالا پوسا۔ میں مانتی ہوں کہ آپ نے مجھ پر بہت کافی روپیہ صرف کیا لیکن جتنا صرف کیا اس سے چوگنا آپ نے تھیٹر ہی سے وصول کر لیا۔ آج اسی شہر میں بیگم بنی بیٹھی ہوتی، اور چین سے براجتی، وہ بنا بنایا کھیل تمھیں نے بگاڑا اور لکھنؤ لے کر چلی آئیں۔ تم نے چاروں طرف سے خوب دولت گھسیٹی، لاکھوں کی آدمی ہو پر اللہ نے چاہا تو مرتے وقت بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں ہوگا کیا کروں، منھ سے کوسنا ہی نکلتا ہے خیر تم پر اور تمھارے گھر پر میں نے لعنت بھیجی اور موقع پاتے ہی بھاگ نکلی":

الفاظ سوزِ دل کی روشنائی سے لکھے ہوئے اس قلم نے نکل رہے ہیں جس کی برادری کو بڑے بڑے جبہ و عمامہ والے حقارت کے ساتھ دھتکارتے ہیں اور معززین و شرفا کبھی شرارت سے کبھی شقاوت سے گندگی کے اندھیرے غاروں کی گہرائیوں میں ڈھکیلے چلے جاتے ہیں۔ اللہ جزائے خیر دے بہت بہت جزائے خیر دے "صاحب حق" (روزنامہ حق لکھنؤ کے ایڈیٹر) عبد الرؤف عباسی صاحب کو انھوں نے نفرت و حقارت کے بجائے انسانیت و ہمدردی کے ساتھ اس طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی اور شستہ زبان اور میٹھی بول چال میں۔ اس داستان دلستان پُردرد کے حقائق کو ۲۸۰ صفحات کی ضخامت میں مرتب کرکے اس میٹھی کونین کو عدہ میں وقف عام کر دیا یہ کام کرنے کا تھا علما و صالحین کا لیکن اللہ جس سے جو خدمت چاہے لے لے اور جسے جس منصب پر چاہے سرفراز کرے۔

خط ابھی ختم کیا معنے، آدھا بھی نہیں ہوا چند سطریں اور سن لیجیے:۔

"ہے ہے وہ پاک پروردگار میری نہ سنتا تو میں کیا کرتی، بدایوں شہر، خان بہادر صاحب کا سا رئیس، حاکم ان کے اثر میں، پولیس ان کے کہنے میں لاکھوں کروڑوں کے مالک جو چاہیں کر ڈالیں کوئی پوچھنے گچھنے والا نہیں، میری بات سنو، چلتے چلاتے میں تمھارے ساتھ دوستی کیے جاتی ہوں ننھی جان اب میں تمھیں ننھی جان ہی کہوں گی بچی اس کے لگ بھگ ہو گئی ہو، کبھی اس کا بھی خیال آیا ہے کہ اب موت کے دن قریب ہیں خدا کو ظاہر میں بہت مانتی ہو۔ نذر نیاز بھی کرتی رہتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کا وہم آتا ہے کہ کتنے گھر تم نے کھائے ہیں اور کتنے خاندان تم نے تباہ کیے ہیں ان سب کا وبال تمھاری جان پر پڑے گا یا نہیں، یاد رہے کہ تمھارے اعمال قبر میں کالے بن کر ڈسیں گے اور یہ حرام کاری کے پیسہ کی نذر و نیاز ایک کام نہ آئے گی توبہ کرو توبہ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے":

کسی بڑے شہر کے جنکشن اسٹیشن کے باہر خصوصاً تیسرے درجہ کے مسافرخانوں کے دروازہ پر جب چاہے یہ تماشائے عبرت اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ سامنے فقیرنوں بھیک منگیوں کا ایک غول کا غول چیتھڑے

لگائے ہوئے، میلی کچیلی، گھناؤنی بیمار اور لاغران میں کتنی ایسی ہیں، جو ابھی کل تک جوان تھیں، بنی ٹھنی ہوئی، اپنے حسن وجوانی پر نازاں اور اللہ کی اس امانت کو بازار میں دوکان لگاکر بیچ ڈالنے والیاں۔ بی بی آسیہ کا نام کس نے نہیں سنا ہے؟ بیوی کس کی تھیں، اللہ کے دشمن فرعون مصر کی، اللہ کے دشمنوں کے درمیان پلیں بڑھیں، فرعون ہی کے محل میں رہیں بسیں، اس کے باوجود جب اللہ کی طرف جھکیں، سجدہ میں گریں تو مرتبہ کیا پایا؟ قرآن تک میں ذکر آیا فرشتوں کو رشک آیا۔ اللہ اللہ تائب کے مرتبہ اور سرفرازیوں کا کیا پوچھنا! اور پھر یہ بہکی ہوئی ہماری بہنیں اور بھٹکی ہوئی بیٹیاں تو منکر نہیں مومن ہیں باغی نہیں صرف غافل ہیں۔ آج یہ اپنے خوش نصیب شوہروں کے گھر آباد کیے ہوتیں تو خود بھی کیسی ہنسی خوشی، چین اور سکھ کی زندگیاں گزارتیں اور ان کی گودوں میں پل پل کر ہمارے سرور وسردار کے لشکر میں کتنے وفادار اور جانباز سپاہیوں کا اضافہ ہوتا! محمد مصطفےٰ کو برحق ماننے والیاں، اس نبی کی امت کہلانے والیاں، اس کی شفاعت سے آس لگانے والیاں، کیا خدانخواستہ ان کے کلیجے پتھر کے ہیں؟ جنت کی کھڑکی اپنے سامنے دیکھیں گی اور ادھر سے آنکھ بند کرلیں گی، منھ پھیر لیں گی، لپکتے ہوئے شعلوں سے بچانے والا ہاتھ ان تک پہونچے گا اور اپنی ٹھوکروں سے ٹھکرادیں گی؟ گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھیں گی اور آگ بجھانے کے انجن والوں کو اپنے پاس سے دھکے دے کر نکال دیں گی۔

طول طویل خط کا ایک آخری ٹکڑا سن کر مکتوب اور کتاب دونوں کو بند کر دیجیے:۔

"گھر گرہست اور پاک زندگی کے مزے تم کیا جانو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے۔ امیروں کی تو بڑی بات ہے بیسوں مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں ہر وقت منھ دیکھتی رہتی ہیں غریبوں کو لو میاں کے دل پر اگر بیوی بیٹھ گئی اور کیا بیٹھے گی، بیوی جوان اور وہ بھی جوان زندگی کی خوشی ہر وقت ہاتھ باندھے حاضر رہے گی، درد دکھ، خوشی وراحت۔ رنج وغم میں دونوں شریک، ایک دوسرے کی ہر حالت میں اور ہر جگہ ہمدرد آدمی آج خود مفلس اور قلاش ہوا تو کیا، اولاد کو خون جگر کھاکے حوصلہ سے پالتا اور پرورش کرتا ہے۔ اس امید پر کہ وہ جوان ہوگی تو اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ یہ ریت کی عمارت نہیں ہوتی سیکڑوں مثالیں اس کی میری اور تمہاری آنکھوں کی دیکھی ہوئی موجود ہیں۔ کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ کسی ہردی ٹکہائی یا تم سے بڑی ڈیرہ دار طوائف کے پہلو میں ایسی امید ہوتی ہے قصہ طویل ہے اگر خدا نے کچھ بھی عقل دی ہے تو اس خط سے سبق لو۔"

سبق قصہ کی اس نائکہ نے لیا یا نہیں۔ اسے چھوڑیئے، سبق لینے کے قابل ہے پڑھنے والوں کے اور پڑھنے والیوں کے بوڑھوں کے اور نوجوانوں کے، تماش بینوں کے اور تماشہ گروں کے، پھنسنے والوں کے اور پھانسنے والیوں کے، نوابوں کے، ڈیٹیوں کے، امیروں کے، کوٹھوں والیوں کے، فلم ایکٹرسوں کے، ریڈیو اسٹاروں کے، غرض ہمارے آپ کے سب کے۔

صحت کو، عزت کو، دولت کو، برباد کرنے والے اور برباد کرنے والیاں کاش آنکھیں کھولیں اور سوچیں کہ اب تک کس طرح زنگی کا نام کافور رکھے ہوئے ہیں۔

کوتوال شہر اپنی سراغ رسی میں کہاں تک کامیاب رہے؟ حسن جان کا کچھ پتہ لگا؟ میر زین العباد پر کیا گزری، نواب بنیاد حسین خاں کی خوش تدبیریوں اور ہوشمندیوں نے کیا کیا گل کھلائے؟ خورشید مرزا نے سارے کھیل میں کیا حصّہ لیا؟ خورشید دلہن کی اصلیت کیا نکلی؟ شہزادہ صاحب کی خبر ان کی بیگم صاحبہ نے کس بُری طرح لی؟ میر صاحب چشمہ فروش کی افیون نوازی کیا رنگ لائی؟ اس طرح کے سارے سوالات کا حل کتاب میں تلاش کیجیے اور اس کا اطمینان رکھیے کہ جو لوگ مغز کلام کی طرف سے آنکھیں بند کر قصہ کو محض لطف زبان اور حسن بیان کے لیے پڑھنا چاہتے ہیں وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ یہاں تو صرف مصنف سے یہ کہنا ہے کہ اگر انھوں نے اس خداداد نعمت کی پوری قدر نہ کی اور جس طرح اس کتاب میں لطیف و جمیل پیرایہ میں اور دلکش انداز سے نیکی کی فتح بدی پر اور پارسائی کی بے عصمتی پر دکھائی ہے آئندہ اگر اسی رنگ میں دین کی فتح بے دینی پر نہ دکھائی، تو عجب نہیں کہ کل خود ان سے سوال ہو جائے۔

نغمۂ زندگی[1]

از سید فضل احمد کریم فضلی، بی لٹ (آکسن) آئی سی ایس، چھوٹی تقطیع ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحے، مجلد قیمت بہ اختلاف جلد عا رعہ ر:- پتہ دفتر انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی۔

کتاب کیسے یا ننھے منھے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ، اردو دیوان ہے ایک آئی سی ایس شاعر کا، اور مجموعہ ہے ایک "آکسن" کے اردو کلام کا۔ اپنی نوعیت میں شاید پہلی اور انوکھی چیز۔

جدت اور ندرت صرف اسی حیثیت سے کب ہے؟ قدرۃً نظر سب سے پہلے فہرست پر پڑی اور پہلا عنوان "تصویر شاعر" نظر آیا، ورق اُلٹا، لیکن آئیں، تصویر کہاں؟ کسی نے تصویر والا صفحہ پھاڑ تو نہیں ڈالا، جی نہیں صفحہ سالم، لیکن درج بجائے تصویر کے صرف ایک شعری تصویر! لاحول ولاقوۃ کیا دھوکا ہوا آگے چلیے دوسرا عنوان "دیباچہ" اچھا صاحب دیباچہ تو پڑھنے میں آئے گا! لیکن توبہ اب کی پھر وہی دھوکا۔ دیباچہ الفقط، اور اس کے عذر میں دو شعر درج۔ غرض مصنف اور تبصرہ نگار کے درمیان آنکھ مچولی شروع ہوئی۔ شیوہ طراز شاعر ہے کہ قدم قدم پر مات دیتا اور بھولا بھالا ناقد ہے کہ مات پر مات کھاتا چلا جاتا ہے! یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہو گیا وہی ردیف وار اب کہیں استاد غالب سے مشورے ہو رہے ہیں کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں کہ لیجیے صہ۸۸ آگیا اور اب دو بدو ہونے لگی۔ فارسی کے استاد منوچہری سے۔

صہ۹۲ پر غزلوں کا جلسہ ختم ہوا صہ۹۵ سے نظم خوانی کی محفل آراستہ۔ کہیں رباعیاں ہیں کہیں قومی نظمیں اور سب سے آخر میں نظم آکسفرڈ "میر حسن کی بدر منیر کے وزن پر آکسفرڈ کی سرگزشت اور آکسن کی خود گزشت خدا معلوم اس مثنوی کو مثنوی کہنے میں شاعر نے کیوں تکلف سے کام لیا وہی روانی، وہی شوخ بیانی، وہی رمز و کنائے، وہی حرف و حکایت جو مثنوی کی جان ہوتی ہیں۔ غرض بجز عریانی و فحش نگاری کے اور سب کچھ۔ سب سے بڑی اور شاعر کے نقطہ نظر سے سب سے اہم نظم (یہ بھی مثنوی ہی ہے) کا عنوان ہے "قلم کا جادو" یہاں پہونچ کر شاعر نہیں رہتے، واعظ و خطیب بھی بن جاتے ہیں۔

---

[1] صدق ۱۲ اپریل ۴۳ء

وعظ و خطابت سینما کی ہجو میں نہیں، اچھی پاکیزہ، اصلاحی و انقلابی فلم سازی کی حمایت میں رند میں محتسب کی شان، زبان شاعرانہ، تیور مصلحانہ!

شاعر نے شہد کی مکھی بن، رس خدا معلوم کن کن پھولوں کا چوسا ہے کن کن کلیوں کا چوسا ہے۔ اقبال کا اثر سب سے زیادہ نمایاں، شروع میں بھی، آخر میں بھی، وسط میں بھی، لیکن اپنی خودی کو لیے دیئے ہوئے۔ اپنی شخصیت سب سے الگ تھلگ کیے ہوئے رنگ میں کسی کے بھی پیرو اور مقلد نہیں۔ سب سے آزاد، بس اپنے ہی اوپر اعتماد۔ یہ ہنر نہیں قدیم الخیال ریویو نگار کی نظر میں کچھ عیب ہی سا ہے۔

صلاحیتیں اب بھی موجود ہیں خدا کرے عمر میں اضافہ اور مشق میں پختگی کے ساتھ نظر بھی حکیمانہ و عارفانہ ہو جائے۔ شاعری تمام تر ایمانی و عرفانی بن جائے، اور حضرت اقبال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے حضرت فضلی پورے "اقبال مند" ہو جائیں ـــــ اور زبان؟ وطن کے لحاظ سے پنجابی اور مسکن کے لحاظ سے بنگالی، بھلا کیسے ممکن ہے کہ اتنی شاعری صحیح اردو میں کر جائے نکتہ چینی کی نگاہ اس تلاش میں دوڑی، پھری، گھومی، لیکن بجز ص ۹۵ کے آخری شعر کے شاید کہیں بھی جگہ ٹکنے اور رکنے کی نہ پائی۔

نقد و نظر[1]

از پروفیسر حامد حسن صاحب قادری، صفحات ۳۰۲ مجلد قیمت ے ر

پتہ :۔ شاہ اینڈ کمپنی، پبلشرز حکیم وسمی روڈ آگرہ

"نقد و نظر" پر تبصرہ کرنے کے لیے خود بڑے صاحب بصیرت ہونے کی ضرورت ہے لیکن سرے سے آنکھ چُرا جانا بھی بڑی بے بصری ہے۔

کتاب پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے زیادہ تر ایسے جو پہلے کسی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب اس مجموعہ میں قرینہ سے سج سجا کر نکلے ہیں تو سب نئے معلوم ہوتے ہیں پندرہ میں سے چند عنوان ملاحظہ ہوں۔

غالبؔ کی شرحیں، میاں نظیرؔ اکبر آبادی، آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ، خمخانۂ ریاض، زبان کے چند نکتے، تنقید کے نئے زاویے، عروضی غلطیاں۔

تنوع کے سرسری اندازہ کے لیے یہ عنوانات کافی ہوں گے اندازہ "سرسری" اس لیے کہ ادب، انشا، تنقید، عروض سخن فہمی کے جتنے عمیق نکتے اور جتنے وسیع مبحث کتاب کے اندر پھیلے ہوئے ملیں گے، ان کا پورا اندازہ تو بس کتاب ہی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے فہرست مضامین کا نقل کر دینا یا کوئی چھوٹا موٹا سا تبصرہ بھی اس کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے مشرقی طلبۂ فن کے لیے اور مشرقی عام ناظرین کے لیے قادری صاحب یہ نہیں کہ ہومر اور رورجل کے ناموں سے نا آشنا ہوں۔ وہ واقف بائرن، شیلے سب ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں اور اپنوں کے لیے لکھتے ہیں حد یہ ہے کہ مجموعہ کا مضمون "مطالعہ شاعری" ان کا طبعزاد نہیں بلکہ میتھو آرنلڈ کا ترجمہ ہے لیکن اس کو بھی اپنا لیا ہے، انگریزی نما اردو نہیں ٹھیٹھ اردو لکھ کر اور اشعار کا اپنی طرف سے جا بجا اضافہ کر کے۔ البتہ وہ ناواقف ایک فن سے ہیں انھیں یہ نہیں آتا کہ اپنے افلاس دماغی پر پردہ پر شوکت اور مرعوب کن ناموں کا ڈال لیں۔ کتاب متوسط

---

[1] صدق ۴ جنوری ۱۹۴۳ء

اور منتہی طلبہ کے تو خاص کام کی ہے ہی باقی عام شائقین ادب بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور پورا لطف و دلچسپی بھی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہت سے درس دینے والے اساتذہ بھی اگر کسرِ شان نہ سمجھیں تو اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں تین سو سے اوپر کی کتاب کے لیے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کے ہر ہر تبصرہ، ہر ہر خیال سے دوسروں کو اتفاق ہو، شرح دردؔ والے مضمون میں تو خصوصیت کے ساتھ فاضل مبصر کے تبصرے نظرِ ثانی کے محتاج نظر آئے لیکن بہ حیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی، سنبھلی ہوئی، سموئی ہوئی کتاب فنِ تنقید پر اردو میں عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی جب طبیعت دوسرے رنگ کی، صاحبانہ اور سرکاری رنگ کی، تنقیدی کتابوں سے اچھی خاصی اکتا چکی تھی!

ایک بڑا سبق ان صفحات سے یہ مل جاتا ہے کہ تنقید و تبصرہ کا لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعروں، ادیبوں، نقادوں سے اختلاف، اور شدید اختلاف شریفانہ انداز میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور ہاں ایک بات تو رہی جاتی ہے تضمین کلام غالب وغیرہ کے ضمن میں قادری صاحب نے جہاں جہاں خود اپنا کلام درج کیا ہے وہاں تو بے اختیار دل سے یہ نکلتا ہے کہ واہ حضرت آپ تو چھپے رستم نکلے سخن فہمی کے ساتھ سخن گوئی میں بھی طاق۔

این سعادت بہ زور بازو نیست

جزیرۂ سخنوراں[1]

از غلام عباس صاحب، ۱۴۴ صفحات، مجلد خوشنما، قیمت ایک روپیہ

پتہ :- کتاب خانہ ہزار داستان ۳۴۴ بازار لین نئی دہلی۔

یہ ایک افسانہ ہے نئے اور البیلے رنگ کا پلاٹ یورپ سے لیا ہوا لیکن قصہ بالکل اردو میں اپنایا ہوا۔ ایک جزیرہ ہے، جزیرۂ سخنوراں، تمامتر شاعروں اور ان کے مداحوں سے آباد، اخلاق کی قیود سے آزاد۔ وہاں یہ سیاح صاحب معہ اپنی ہم سفر ایک حسین خاتون کے اتفاق سے جا پہنچتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں باتوں باتوں میں مجلس شوریٰ تک پہونچا دیئے جاتے ہیں مجلس کے تین ارکان ہیں ایک ادھیڑ سن کے بزرگ فصیح الفصحا، شاعر بے ہمتا علامہ مفتی انور الحسن یکتا دوسرے ایک طرحدار نوجوان "بلبل داستان سرائے گلشن معانی رشک انوری و خاقانی، حضرت افعی" تیسرے خود صدر مجلس حقیر پرتقصیر، خاکسار ذرۂ بے مقدار مائل"۔

شاعروں کی دنیا، شاعری کی دنیا سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور قابل دید سرکاری مہمان خانہ کا نام دار الخیال، باغوں بازاروں، گلی کوچوں کا نام خیابان میر، غالب بازار، آتش باغ گلزار سرور، کوچۂ مومن خان وغیرہ، یہاں کے معشوق کا حلیہ۔

"نصف عورت، نصف لڑکا، ایک طرف محرم، چوٹی، موباف دوسری طرف کلاہ، چہرہ، اور سبز خط، طبیعت میں سفاکی اور جلادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہونٹوں پر عاشقان باوفا کا لہو لگا ہوا کسی پر کمند پھینکی، کسی کے پاؤں میں زنجیر ڈالی، کسی کو شہید تیغ ناز کیا، کسی کو بحر ظلمات میں دھکا دیا کہ عمر بھر ٹامک ٹوئیے مارتے رہے، کسی کو چاہ ذقن میں غرق کیا، کہ جیتے جی سر نہ اٹھا سکے، نہ انسان مامون نہ وحوش وطیور معئون" صہ ۵۶ و ۵۷

رہا عاشق بیچارا :- سوختہ مصیبت کا مارا، صدق ووفا کا پتلا، غریب الوطن، فلک ناہنجار کا ستایا ہوا، بھوکا پیاسا،

---

[1] صدق ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء

ننگ دھڑنگ، آج یہاں تو کل وہاں، کبھی دریا میں، ناخدا پر چھینٹیں اڑائے تو کبھی صحرا میں آہوؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلے، بھیس بدلنے کے فن میں استاد، کبھی مجنوں کا روپ دھار صحرا میں محمل کے گرد چک پھیریاں لے تو کبھی فرہاد بن کر کوہ بے ستون پر تیشہ تیز کرے۔ کبھی انسان، تو کبھی جانور، کبھی گھر کی کال کوٹھری میں تو کبھی درخت پر کسی گھونسلے میں ص۵۷ و۵۸

یہاں کی زبان، صنائع کی جان، بدائع کی کان۔ ایک صاحبہ اپنی ملازمہ کو گھڑک رہی ہیں۔ "اری موئی سوئی نہیں ملتی تو گولی مار، کیوں پیچ کھاتی ہے (پیچ + ک پیچک) ایک عاشق صاحب یوں داد فصاحت دے رہے ہیں:۔

"اے سنگدل تیری سنگدلی پر پتھر پڑیں ہم تو تیرے چہرہ بلوریں لعل لب و درِ دنداں کو یاد کر کے، کوہ و بیابان میں پتھروں سے سر پھوڑیں اور تو غیروں کے سنگ گل چھرے اڑائے ؎

رات آہوں کے شرارے مرے بے ڈھنگ اڑے

کوہ سے سنگ چٹخ کر کئی فرسنگ اڑے

معشوق صاحب جواب میں یوں بلاغت کے شرارے چھوڑتے ہیں:۔

"ارے نادان، میزانِ عشق میں پاسنگ ہونا محال، کیوں من من بھر کی باتیں چھانٹتا ہے۔ سنگسار ہونے کی نیت ہے کیا؟"

یہ فاسقانہ عاشقی معشوقی میں "سنگ ساری" کا ضلع بہت خوب بہت خوب! (ص۲ و ص۱) پر غالب کے دو شعروں کی جو شرح کی گئی ہے وہ پر لطف ہونے میں اپنی نظیر آپ ہے مشاعرہ کا منظر بہترین ہے شعر و ادب کے دیوانوں کے لیے ایسے دلکش و رنگین مرقع کا سودا ایک روپیہ میں مُفت ہے:۔

خنداں[1]

از رشید احمد صاحب صدیقی صفحات ۲۸۱ مجلد قیمت دو روپئے آٹھ آنے۔

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ اُردو کے مشہور ظریف و شوخ نگار۔ رشید احمد صاحب صدیقی کی چالیس ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے یہ تقریریں عرصہ تک دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتی رہیں اور اب مکتبہ جامعہ کے حسن اہتمام سے کتابی شکل میں آگئی ہیں۔ رشید صاحب کی پر لطف طرز نگارش اب پڑھے لکھے حلقوں میں قطعاً نہ کسی سفارش کی محتاج ہے، نہ تعارف کی۔ ان کا ایک خاص اپنا رنگ ہے، دوسروں سے ممتاز۔ اور وہ پختہ ہو چکا ہے۔ بغیر کسی کی دل آزاری بلکہ دل شکنی کے، بلا فحش و ابتذال کے شائبہ کے ہجو اور ریبابی سے پاک، وہ چھوٹے بڑے اپنے پرائے، سب کے خاکے اس دلچسپ انداز میں کھینچے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا ہر سطر پر لطف لیتا جائے، مسکراتا جائے، جھومتا جائے اور کہیں کہیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا ریڈیو بہرحال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں ظرافت کی بے تکلفی بھلا ان قیود کا تحمل کہاں کر سکتی ہے لیکن رشید صاحب کی معجز بیانی نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا اور اس ضخیم مجموعہ کے ہر ہر صفحہ کو زعفران زار بنائے رکھا ہے بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ ملے اور بعض خاکے تو خاص طور پر دلچسپ اور پر لطف ہیں، ایسے کہ پڑھنے والے انھیں بار بار پڑھیں گے کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں۔ یہ عیب ہو یا ہنر، بہرحال واقعہ یہ ہے کہ رشیدیات سے لطف اٹھانے کے لیے خود بھی اچھا خاصا پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ ادب اردو کے ہر صاحب ذوق شائق یا طالب علم کے مطالعہ کی میز پر نظر آئے مکتبہ جامعہ نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

---

[1] صدق ۲۳، دسمبر ۱۹۳۸ء۔

گنج ہائے گرانمایہ[1]

از جناب رشید صاحب صدیقی ضخامت ۲۱۹ صفحے قیمت عہ/

پتہ :- اُردو بک ایجنسی علیگڑھ -

خنداں کے بعد گریاں! رشید صدیقی کا نام سب جانتے ہیں، یہ علم کم لوگوں کو ہو گا کہ وہ اگر ہنس سکتے اور ہنسا سکتے ہیں، تو رو بھی سکتے ہیں رُلا بھی سکتے ہیں ان کے مزاحیہ مضمون کے مجموعے پہلے نکل چکے ہیں یہ تازہ مجموعہ ان کے تعزیتی مضامین کا ہے۔ ظریف کے آنسو! آنسو نہیں موتی کے دانے ہوتے ہیں۔ اُردو کا یہ شوخ نگار آج سوگوار ہے اپنے محبوبوں کے مزار پر عقیدت و محبت کے پھول ہاتھ میں لیے فاتحہ پڑھنے نکلا ہے، اس کا اداس چہرہ، اس کا اداس بشرہ، اس کا حسرت انگیز لہجہ سب قابل دید ہیں۔

محبوبوں کے نام آپ سُنیں گے؟ ان میں سے بعض تو یقیناً آپ کے بھی محبوب ہوں گے۔ محمد علی[1]۔ ڈاکٹر انصاری[2]۔ مولانا سلیمان اشرف[3]۔ مولانا ابوبکر محمد شیث[4]۔ اصغر گونڈوی[5]۔ ایوب عباسی[6]۔ اقبال[7]۔ احسن مارہروی[8]۔ اقبال۔ محمد علی انصاری کو تو ایک دنیا جانتی ہے۔ اصغر بھی کچھ ایسے گمنام نہیں۔ دونوں مولانا بھی علی گڑھ کے حلقہ میں خوب مشہور صرف ایک ایوب عباسی سے دنیا ناواقف تھی، اب واقف ہو جائے گی۔

مضمون بڑا کوئی بھی نہیں۔ سب لکھے ہوئے ہیں۔ لکھوائے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن محمد علی والا مضمون مختصر ہونے کے باوجود سب میں ممتاز ہے، اپنی مثال آپ ہے لکھنے والے کے لیے باعثِ فخر بھی، موجب اجر بھی، ایک بار سچ مرحوم میں نکل چکا ہے مستحق اس کا ہے دوبارہ چھپے بار بار چھپے۔

کتاب سب کے پڑھنے کے قابل ہے نوجوان طلبہ کے لیے خصوصاً وہ دیکھیں اور سمجھیں کہ جو قلم لطیف مزاح پر قادر ہے وہ تعزیت سے معذور نہیں۔ اور جو قلم لطف و مسرت کی گدگداہٹ کا خزانہ ہے وہ درد و غم کی بھی کسک سے خالی نہیں ادیب بننے سے پہلے شریف ہونا ضروری ہے اور یہ کتاب ایک خادم ادب کی شرافت کی دستاویز ہے۔

---

[1] صدق ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء

ہم اور وہ[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۱۲/

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی (خود مصنف سے بھی مٹیا محل دہلی کے پتہ پر مل جائے گی)

"قدیم" جدید کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی اس پر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے تو بحث کی مردہ ہڈیوں میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے۔ مدت سے یہ کہا جا رہا تھا کہ دلی اب دلی والوں سے خالی ہو گئی۔ اور زبان دانی اس خطہ سے رخصت ہو گئی "ہم اور وہ" نے ثابت کر دیا کہ دلی میں دلی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دلی کی زبان اب بھی ماشاء اللہ اسی آب و تاب سے اسی آن و بان سے زندہ ہے قائم و پائندہ ہے درخشان و تابندہ ہے مصنف نے ایک اچھوتے طرز پر قدیم و جدید کی بحث کو اٹھایا ہے اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رخ کہیں کہیں غلو و مبالغہ کی جانب جھک گیا ہو لیکن بحیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے، سچی، کھری، سیدھی، خدا لگتی۔ اور حسن بیان و لطفِ زبان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ۔ فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی ہے حسن انشا کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں اللہ ان کی عمر میں بہت برکت، ان کے قلم کو بہت قوت عطا کرے کہ گلشن اردو کو ایسی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں باقی رہے گی۔

---

[1] صدق، ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء

دلّی کا سنبھالا[۱]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی ۱۵۰ صفحے قیمت عہ ر پتہ :۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

کتاب کا تعارف ذرا مشکل ہے بس یہ سمجھ لیا جائے کہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں اگلے دلی والوں (کچھ دلی والیوں کی بھی) کی زندہ تصویریں چلتی پھرتی، بولتی چالتی نظر آرہی ہیں اور پھر اس مجمع میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ عالم و فاضل بھی اور رند و اوباش بھی۔ زاہد و مرتاض بھی، اور شوخ و طرار بھی ایک طرف شاہ عبد القادرؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اسمٰعیل شہیدؒ اور سرسیّد، حالی، نذیر احمد، حکیم محمود خاں تو دوسری طرف فلاں گویئے اور فلاں ستار نواز اور فلاں بی صاحبہ مصنف کا مقصد تاریخ نگاری نہیں۔ اس لیے ایسی فروگزاشتوں کو نظر انداز کیجیے کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے "علم جہاد" حکومت برطانیہ کے خلاف بلند کیا تھا (ص ۱۱۱) مصنف کا مقصد اپنی زباندانی کا جوہر دکھانا اور پرانی دلی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دینا ہے اور ان دونوں مقصدوں میں وہ اس طرح کامیاب رہے ہیں کہ گویا امتحان کے پرچوں میں سَو نمبروں میں پورے سَو پا لیے ہیں۔ زبان کی صحت اور زبان کا حُسن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو اہل قلم دلچسپ فقرے لکھ لیتے ہیں وہ ترکیبوں، محاوروں، بندشوں کی صحت ادا پر بھی قادر ہوں دونوں کا اجتماع اس وقت کے اردو لکھنے والوں میں خال ہی خال نظر آتا ہے۔ خواجہ شفیع صاحب ان مثالوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر اسلوب بیان کی دلکشی نہیں، دلبری اس پر قیامت۔ یہ ممکن نہیں کہیں سے کوئی صفحہ کھل جائے، اور پھر ختم کیے بغیر آپ کا چھوڑنے کو جی چاہے۔

ایک دو فقروں پر نگاہ اچٹتی سی ڈالتے چلیے۔

"اہل دربار مؤدب کھڑے ہو گئے دلی ماتا نے تعظیم دی۔ یہ کون تین بھائی آرہے ہیں کہ ملاء اعلیٰ طبقات نور لیے ساتھ ساتھ ہیں۔ نقیب نے آواز دی مولانا شاہ عبد القادر صاحب مترجم کلام پاک، مولانا شاہ عبد العزیز صاحب،

---

[۱] صدق نمبر ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

تفسیر فتح العزیز کے مولف مولانا شاہ رفیع الدین صاحب۔ بھاٹ نے عرض کی ؎

خاموشی در ثنائے تو حد ثنائے قست

رفعت علم تالب فرش لینے آئی صف علماء میں مرتبۂ بلند پر لے جا بٹھایا — مولوی میاں نذیر حسین اپنے معتقدین کے ہمراہ دفاتر احادیث مقدسہ لیے تشریف لائے۔ درجۂ اعلیٰ پر بصد ادب بٹھائے گئے۔ شاہ اسمٰعیل صاحب صراط المستقیم کی تلقین فرماتے تشریف لائے اہل دربار نے تعظیم دی دلّی ماتا نے بنظر عنایت دیکھا اور کہا کہ سر پر خود شہادت پر تو فگن ہے۔ ان کا مستقبل بتاؤ، منجم قدرت نے دلّی ماتا کی پیش گوئی کی شہادت دی۔"

علم و تقدس کی اس شہ نشین سے اتر کر اب ضلع جگت کے میدان میں آیئے۔

"روز محفل آراستہ ہوتی ہے شہر بھر کے تیز و طرار شوخ گفتار جمع ہوتے اکثر زبان دراز دُور دُور سے مقابلہ کے لیے آتے ہیں استاد کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے، جو منھ آتا ہے منھ کی کھاتا ہے ظالم ایک نہ ایک فقرہ ایسا چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منھ زور منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جواب نہیں بن پڑتا، اپنا سا منھ لے کر رہ جاتا ہے استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی، ایسے منھ بھی دکھا پھر بھی آنا جو ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے اس کا پھر منھ نہیں پڑتا، کہ منھ دکھائے۔ استاد ایسا منھ توڑ دندان شکن جواب دیتا ہے کہ منھ پھیر دیتا ہے۔"

زبان و ادب کے معیار سے ایسی کتاب مدّت کے بعد دیکھنے میں آئی اور عام متفرق معلومات کے لحاظ سے بھی کتاب گھٹیا نہیں۔

شرحِ درد[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۲۱۴ صفحے قیمت عہ۔ خود مصنف سے ٹیا محل کے پتہ سے ملے گی۔

خواجہ محمد شفیع دہلی کے رہنے والے ہیں اور نئی دہلی کے دَور میں پُرانی دہلی کی یاد تازہ رکھنے والے خواجہ میر دؔرد کے کلام کی یہ شرح، شرح درؔد اپنے رنگ میں فرد انھیں کے قلم کی ہے۔

کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے، جی ہاں کھجور کے درخت سے! ان رسیلی، شربتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لالوں لال کھجوروں کا مزہ تو بعد کو چکھیے گا ابھی ذرا ہری ہری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سَیر کرتے چلیے۔

صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت، ہر رگ و ریشہ کام کا، پھول پتی کارآمد پھل غذا، گٹھلی[1] دوا۔ جڑیں مضبوط[2]، بلند و بالا[3]، استوار[4]، باد سموم[5] کے تھپیڑوں سے جھک جائے۔ دم کے دم پھر سیدھا، مرکز[6] سے جنبش نہیں۔ اپنی بقا[7] کے لیے کم از کم کا طالب دوسروں کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش، فروعات[8] سے معریٰ چوٹی پر ایک گتھا ہوا گلدستہ پھول پھل سب ایک جگہ، ایک جہتی[9]، اور سلوک کا نمونہ، سایہ[10] دور دور پھینکے، جگہ کم سے کم گھیرے، برگ و بار[11] کی ہر فصل یا نسل اس کو ایک پوری بلند کر جائے خود سپرد[12] خاک ہو، کھاد بن جائے، آنے والوں کے لیے بلند تر مقام کی بنا بنے۔" (ص۱)

بارہ کی اس گنتی میں ماہ ربیع کی بارہویں کی بہار۔ بارہ برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکارا نئی تشبیہ اور نئی گریز۔ مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے، اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پایئے۔

جس خطہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا اسی دیس سے ایک دین چلا، کارآمد فطری اُصول کا حامل۔ قوی الاساس۔ رفیع النظر۔ راستی و راست بازی کا حامل۔ دب دب کر اُبھرنے والا، لیکن تسلیم و رضا کا طلبگار۔ فرقہ بندی سے غیر متاثر وحدت کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق کا حامی، رسم و رواج کی پہنائیوں سے معریٰ، ہلکا پھلکا دور رس

لہ صدق، ر نومبر ۱۹۴۱ء

ترقی کا راستہ دکھانے والا، فنا میں بقا کا سبق دینے والا، یہ وہ مذہب تھا جو رسول عربی لے کر آئے۔" صدق[1]

زبان کی ان لطافتوں، ادب کی ان نزاکتوں کی، جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اردو سے بارہ پتھر باہر۔

ناکامؔ

ازخواجہ محمد شفیع دہلوی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱۲ آنے

مصنف کے پاس سے مٹیا محل دہلی کے پتہ سے مل جائے گا۔

دہلی کے جدید انشا پرداز خواجہ شفیع کا نام اب نہ اردو کے طلبہ کے لیے نامانوس رہا ہے نہ ناظرین صدق کے لیے "ناکام" ان کا تازہ ترین افادہ قلم ہے سرسری نظر میں ایک دلکش افسانہ گہری نظر میں حکمت و اخلاق کا خزانہ اور ہر صورت میں ادب و انشا کا ایک گنج شائگاں زہرہ ایک مشہور بیسوا ہے حسین و حاضر جواب مغنیہ اس کا سابقہ ایک نوجوان کاظم سے پڑگیا ہے کاظم ذہانت میں فرد، حاضر جوابی میں استاد، ہر رنگ میں رنگا ہوا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے لیکن اپنے کو لیے دیئے ہوئے، نفس کو قابو میں کئے ہوئے۔ اس کا دل اس کے کہے میں، وہ خود دل کے کہے میں نہیں۔ بیسوا نے خوب خوب کمندیں پھینکیں، ہر ہر طرح جال ڈالے، وہ ظالم ایک بار بھی نہ پھنسا، ہر بار خود شکاری ہی کو شکار کرتا گیا اور چوٹ کھائے ہوئے غرور و تمکنت پر چرکے دیتا گیا۔ لفظ و عبارت میں مے و شاہد کی وہ سخن آرائیاں کہ دھوکا دیوان حافظ کا ہونے لگا معنی و مفہوم میں اخلاق و موعظت کی وہ گل افشانیاں کہ گمان گلستان سعدی کا گزرنے لگے۔

زبان کے جوہر دیکھنے ہوں تو کاظم کا معرکہ ایک رئیس کی محفل میں میراثی صاحب سے ملاحظہ ہو رئیس صاحب اپنی بے فنی اور بدآوازی پر نازاں، سر محفل چنگھاڑ رہے ہیں۔ ساری محفل ان کے بنانے یا داد دینے پر متوجہ، چوٹیں کاظم اور میراثی کے درمیان چلنے لگیں۔ ہلکی سی جھلک دیکھتے چلیے:۔

میراثی پھیپھڑا پھاڑ رہا تھا، ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، دماغ سے اُتار اُتار کر باتیں لا رہا تھا۔ بولا سرکار

---

[1] صدق ۲۳ فروری ۱۹۴۳ء

شانوں سے نُر نکل رہے ہیں۔ کاظم نے کہا "عالی جاہ مجسم موسیقی ہیں، ہر بن مو سے سر برس رہے ہیں۔" میراثی نے بہت دور مارا، باپ دادا کی ساری طاقت سے کام لے کر کہا۔

سرکار شاد موسیقی ہیں۔" وہ حاضر دماغ بولا عالی جاہ شہنشاہ موسیقی ہیں، لحن داؤدی پانی ہے۔ اس فن کے پیغمبر ہیں۔ میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹکا دیئے، اور بولا "تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ کاظم نے عرض کیا "بیجو باورے کی روح قدم بوس ہونے آئی ہے اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ کے راگ میں نہ آتا۔ سرہاتھ باندھے کھڑے ہیں موسیقی دامن سے وابستہ سرکار راجہ اندر ہیں۔ موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے اعجاز ہے اعجاز۔ شجر و حجر جھوم رہے ہیں مردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں بس نہیں نفس عیسوی ہیں۔" میراثی کچھ بھی ہو میراثی تھا تابڑ توڑ فقرے سن کر تیورا سا گیا جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کیا اور لگا حال کھیلنے۔ یہ روگ کاظم کے بس کا نہ تھا۔ میدان جاتا نظر آیا، بازی ہرتی نظر آئی پرواہ بے دماغ فوراً بولا "سروں کا زور ہے آگ لگ جائے گی۔" پانی ڈالو جلدی کرو۔" اور ساتھ ہی ساتھ برف کے پانی کا بھرا ہوا جگ اٹھا بدنصیب میراثی پر ڈال دیا، میراثی حال سے بے حال ہو گیا گھگھی بندھ گئی (ص ۴۸، ص ۴۹)

گنہگار عورت کے دل کی چبھن دیکھنا ہو تو ورق الٹیے، بیسوا کے کوٹھے پر کسی نے ایک پراثر قصہ میں مناسب تمہید کے بعد یہ شعر جو منسوب اکبر الہ آبادی کی جانب ہے سنا دیا ہے ؎

کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر بیسوا کے تاثرات :-

"کان یہ سن رہے تھے، آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی اپنے مناظر پیش کر رہی تھی اور میں اس تماشہ میں غرق تھی، ایک عجیب لطف تھا عجب کھٹک تھی، نرالی کاوش تھی، اچھوتی خراش میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسے بھوکا روٹی کے تصور میں، بانجھ اولاد کے خیال میں سینہ میں ایک چیز تھی، جو کچھ مانگ رہی تھی پہلو میں ایک خلا تھا، جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا میرا ہر قطرۂ خون کسی کی تلاش میں رواں، میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا، آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو بیوی بننے کے لیے پیدا ہوئی جو ماں بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دیکر سلا دیا گیا تھا آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی جس کو کذب و ریا اور غلط فہمی کے انبار میں دبا دیا گیا

تھا۔ رنڈی کا جامہ چاک کر کے عورت برآمد ہونے کو تھی عورت جو کھونے کو پا نا سمجھتی ہے
عورت جو اپنا خون چوسا کر نسل انسانی کو پالتی ہے عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے
عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے میں آدم و حوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی"۔
آج میں فطرت ہی فطرت تھی ماحول سے مبّرا فضا سے بالاتر (صہ ۸۱)

غرض کتاب کیا ہے ایک عجوبہ۔ صورت رندوں کی، سیرت زاہدوں کی، چہرہ پر شوخی و ظرافت کی نقاب، نقاب کے اندر پیشانی پر زہد کے سجدوں کے نشان بیسویں صدی کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں جلانے کے قابل افسانہ نام کا "ناکام" لیکن ہر اعتبار سے کامیاب۔

نزول رحمت معروف بہ میلاد شریف[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی قیمت ۴ھ ر ملنے کا پتہ (۱) خود مصنف ملّیا محل دہلی

(۲) مکتبہ جامعہ دہلی۔

دہلی کا ہونہار اور مشہور انشا پرداز خواجہ محمد شفیع، مولوی بن، چوکی بچھا، لوبان سلگا، اگربتی جلا خوش عقیدگی کا جبہ پہن پہنا، حسن عقیدت کا کیوڑہ گلاب چھڑک چھڑکا، محفل میلاد پڑھنے بیٹھا ہے اور ختم محفل کے بعد جب تبرک کی تقسیم کا وقت آیا تو حلقۂ صدق کو بھی اس کی "وہابیت" کے باوجود محروم رکھنا گوارا نہ کیا۔

خواجہ کے منھ سے نکلے ہوئے بول، یوں بھی آپ واقف ہیں کیسے ہوتے ہیں میٹھے رسیلے، سریلے پھر جب ذکر بھی ٹھہرا عزیز لذیذ، دل پذیر، محفل میں آبیٹھنے والے خود تجربہ کر کے دیکھیں۔ بہتوں کے عجب نہیں کچھ عقاید ہی درست ہو جائیں بہتوں کے کان میں کام کی باتیں پڑ جائیں اور جی تو یقین ہے کہ سب ہی کا لگ جائے۔ مشک کے اوصاف عطار کی زبان سے سننے میں لطف ہی کیا ہے ایک ذری سا نمونہ ہتھیلی پر رکھ کر خود ہی سونگھ لیجیے نہ؟

"اہل عرب کی عقلوں پر بت پرستی کے پتھر پڑے تھے، ہٹ دھرمی ضد اور بے جا بہادری کے فولادی خود دماغوں پر چڑھے تھے حرص وہوا کی سیاہی ان کے دلوں پر طاری تھی۔ جوئے نے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ رکھا تھا عیش پرستی نے ان کو اندھا کر دیا تھا۔ یہ دو روزہ آنی جانی بزرگی و برتری کے دلدادہ مخالفت اسلام پر آمادہ ہو گئے، ایک طرف مٹھی بھر کلمہ گو، دوسری طرف جاہلوں کے جتھے، ظالموں کے گروہ گو بظاہر شیر بکری کی لڑائی تھی، لیکن اس بکری کا رکھوالا، زمانہ بھر کا پالن ہار او وہ آقائے روزگار تھا، جسے وہ رکھے اسے کون چکھے، نہ دشمنوں نے اپنی کرنی میں کوئی کسر رکھی، نہ دوست نے دوستداری میں۔

ع دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

---

[1] صدق ۴ جنوری ۱۹۴۳ء

خدا کے ہاتھوں صحابہ کی کوشش سے اسلام کی کھیتی دون دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ کفار مکہ نے سخت ظلم ڈھائے، بڑے بڑے فساد مچائے سیل فنا کی طرح چڑھ چڑھ کر آئے لیکن یہ اسلام کی دیوار نمک کی نہ تھی جو بہہ جاتی ہر ریلے کے بعد پختہ سے پختہ تر ہوتی ہو گئی۔ مشرکین نے اہل دین پر جو ظلم توڑے اور جیسی جیسی آفتیں ڈھائیں، ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے اور بیان سے دل دہلتا ہے" (ص۳۵ و ص۳۷)

چلیے میلاد خوان کی آواز کان میں پڑ گئی اور آپ بھی داخل حسنات ہو لیے، جی لگا ہو تو محفل میں شروع سے آخر تک شریک ہوں۔ سودا کل چار پانچ آنے کے ٹکٹ میں مہنگا تو ہرگز نہیں۔

چند افسانے[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۱۰۸ صفحے مجلد قیمت ایک روپیہ

پتہ :- اردو مجلس ٹلیا محل دہلی

دہلی کے سحر طراز انشا پرداز اہل زبان خواجہ شفیع سلمہ، اب اس منزل سے گزر چکے ہیں کہ ان کی کسی نئی کتاب کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہو۔ اب ان کا نام خود ہی ایک مکمل تعارف ہے۔ مضمون کے پاکیزہ، شستہ و لطیف ہونے کی ضمانت زبان کی صحت سلاست و شیرینی کی دستاویز!

مجموعہ (جی میں آتا ہے اسے گلدستہ کے نام سے پکاریئے) میں دو نظمیں ہیں اور کوئی دس بارہ ہلکے پھلکے افسانے۔ پُربہار جیسے موسم گل، دلآویز جیسے نغمۂ بلبل۔ افسانوں کے پلاٹ کہیں مسجد و خانقاہ کے نہیں، وہی بازاروں کے اور ہوٹلوں کے کالج کے لڑکوں کے اور بیسواؤں کے کوٹھے کے مجال مجال کیا جو دامن خیال بھی معصیت سے آلودہ ہونے پائے اور طبیعت کی پاکیزگی پر کوئی داغ دھبہ، فحش و ابتذال کا پڑنے پائے۔ خواجہ اپنے ہاتھوں سے خوب بھر بھر کر آپ کو پلائیں گے۔ "گلاس پر گلاس چھلکائیں گے، بوتل پر بوتل لنڈھائیں گے آخر میں آپ کی زبان سے نکلے گا تو یہ کہ سبحان اللہ یہ تو عجب اسرار تھا۔ کلوار کی بھٹی کی جگہ جنت الفردوس میں پہونچ گئے اور لیبل دیکھ کر جن شیشوں پر "جانی واکر"[2] کے قدحوں کا گمان تھا، وہ شراب طہور کے جام نکلے" زبان دہلی کی مستند اور ٹکسالی، اور ادب سے مذاق رکھنے والوں کے حق میں ایک نعمت ——— البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کتاب "عوام پسند" طبقہ میں شامل ہونے کے قابل نہیں، اچھی خاصی استعداد اور اردو کے نسبتاً بلند مذاق کے بغیر کتاب پڑھنے والے کوئی خاص لطف شاید محسوس نہ کر سکیں۔

---

[1] صدق ۸ مارچ ۱۹۴۳ء [2] برطانیہ کا ایک مشہور و قدیم کارخانہ شراب۔

شیش محل[1]

از شوکت تھانوی ضخامت ۲۴۰ صفحے قیمت ۸؍۱ مجلد گرد پوش

پتہ:- اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور

شوخ نگاری و ظرافت دوسروں کے لیے، پطرس بلکہ رشید صدیقی تک کے لیے ایک مشغلہ تفریح رہی ہے شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنالیا ہے، اور قدرتہً ان کی نگاہ ایک فن کار کی نگاہ ہوگئی ہے ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

"شیش محل" ان کے مطالعہ بشری کا ثمرہ ہے اپنے ملنے والوں میں سے ۱۱۲ کے چہرے حروف تہجی کی ترتیب سے انھوں نے اس قلمی آئینہ میں دکھا دیئے ہیں سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ افراط نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اس تعلق کے لیے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ قلمی کارخانہ یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین، بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی بعض ایسے ہیں، جو سب کچھ ہیں، بعض ایسے بھی ہیں جو کچھ بھی نہیں، ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی۔ ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔ غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے لے کر افقر موہانی، امید امیٹھوی اور صدیق بکڈپو تک ہر ردیف ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں شاعر کہیں تو خالی مصرعہ طرح پڑھ کر چپ ہوگیا ہے اور کہیں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیتا ہے نگارخانہ ظریف کا ہے مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت بھی عموماً دوش بدوش عموماً کا لفظ خیال میں رہے ظرافت کی گلکاریاں شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں مورخ کے کیمرے اور فوٹو گرافی کی قائم مقام نہیں ہوسکتیں۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش سب کے ہیں اور یہی فن کار کا کمال ہے۔ البتہ کوئی چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا کسی پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا کسی پر روغن حسن افزا

---

[1] صدق یکم نومبر ۱۹۴۳ء

کا غازہ بھرا ہوا کسی کی پیشانی پر شکن، کسی کے چشم وابرو پر غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے میں خود بھی غچا کھا گیا ہے۔

نازک خیال اور پھر لکھنؤ وجوار لکھنؤ کے نازک خیال نازک مزاج بھی کچھ کم ہوتے ہیں۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم

لیکن معاملہ دوسرا ہے، خوب کیا شوکت صاحب نے دیباچہ ہی میں سب سے معافی مانگ لی، ورنہ عجب نہیں جو "بزم رزم" میں تبدیل ہو کر رہتی اور

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

کی شاعری حقیقت بن کر رہتی (یہ اسد خدانخواستہ اسداللہ خاں غالب نہیں، وہ دوسرے بزرگ ہیں جن کا یہ مصرع شہرت دوام حاصل کیے ہوئے ہے۔

ع میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

صفحہ ۲۸۴ سے صفحہ ۲۹۰ تک ایک بزرگوار کا ذکر جس رنگ میں ہے، یقین تو ہے کہ شوکت صاحب نے بازو پر امام ضامن باندھ کر لکھا ہو — شیش محل پر بے تحاشا پتھراؤ اس کے بعد کچھ بھی بعید نہیں رہ جاتا ہے۔

چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں۔ کل اسی سے بڑے بڑے سنجیدہ مورخ خوشہ چینی کریں گے۔ آخر آج بھی کتاب الاغانی کے حوالے کس شد و مد کے ساتھ مغرب و مشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ مؤرخ دے رہے ہیں پھر کیا یہ ادیب اور شاعران گویوں کے سازندوں، اور ڈھاڑیوں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ نگار خانہ خود مصور کے مرقع سے خالی ہے — مجنوں کا ڈرامہ بغیر مجنوں کے پاٹ کے یا برات بغیر نوشہ کے! عرضی دعویٰ بغیر بقلم خود کے؟ — ظریف کی ستم ظریفی!

اعمال نامہ[1]

از سر سید رضا علی ایم، ایل، لے ضخامت ۵۲۷ صفحے تقطیع ۲۰ × ۲۶،
مجلد مع تصاویر، قیمت آٹھ روپے، پتہ: ہندستانی پبلشرز (دہلی)

اعمال نامہ! نام سُن کر ذہن پولیس اور تھانہ کی طرف منتقل نہ ہو اور نہ کراماً کاتبین کے اعمال نامہ کی طرف! کتاب کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ ایک زندہ دل علیگڑھی کی کہانی اسی کی زبانی ہے اور بہتر ہوتا کہ یہی عبارت اندرونی سرورق پر بطور کتاب کے عنوان تحتانی کے لکھ دی جاتی۔

مراد آباد کے سید رضا علی سے علی گڑھ کے حلقہ میں کون ناواقف ہے بڑے منچلے بڑے ہونہار شروع ہی سے تھے۔ بی لے کیا، ایل ایل بی ہوئے، محسن الملک مرحوم کے پرائیوٹ سکریٹری رہے، وکالت میں نام پیدا کیا لیگ کے سلسلہ میں شہرت حاصل قومی لیڈری اور سرکاری جاہ و منصب کے اونچے اونچے مرتبے طے کرتے ہوئے اب "سر" ہیں، سی، بی، ای ہیں سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں مسلم لیگ کے سابق صدر رہیں۔ وقس علیٰ ہذا —— اور اب جاکر یہ کھلا کہ قانون اور سیاست کی خشکیوں کے باوجود یہ "بوڑھا لڑکا" (کسی نے اولڈ بوائے کا یہ ترجمہ خوب کیا ہے) ایک خوش ذوق سخن فہم اور اچھا خاصا اہل قلم بھی ہے ؎

وہ نام خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں

افسانۂ حیات مؤثر و دلچسپ کس کا نہیں ہوتا؟ بشرطیکہ بدمذاقیوں سے خود ہی تاثیر اور دلچسپی کا خون نہ کر دیا جائے اور پھر یہ تو محض آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے محسن الملک اور وقار الملک، جسٹس محمود اور بک اور مارسین، سر علی امام اور مظہر الحق راجہ صاحب محمود آباد نواب صاحب ڈھاکہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی محمد علی، شوکت علی سے لے کر کلکتہ کی مشہور مغنیہ تک خدا معلوم کتنوں کی قلمی تصویریں آپ کو اس مرقع میں ملیں گی، اور کتاب کہنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم یافتہ اسلامی ہند کی چالیس پچاس برس کی ایک سرسری تاریخ بن گئی ہے مگر

---

[1] صدق ۲۰ر مارچ ۱۹۴۴ء

ایسی تاریخ جس میں قدم قدم پر شعروادب مداخلت کرتے نظر آرہے ہیں شاید مداخلت بے جا کی حد تک !

سید صاحب مذہباً شیعہ ہیں مگر ایسے شیعہ جو سُنّیوں میں گھلے ملے ہوئے ہیں اور یہ اثر ایک تو علی گڑھ کی تربیت کا ہے اور پھر اس کا بھی کہ ان کے بزرگوں میں اہل سنت بھی رہے ہیں، سید صاحب تجدد سے بھی متاثر ہیں، پردہ کی بحث میں کھل کھیلے ہیں۔ لیکن ان کا تجدد کچھ بجھا ہوا سا ہے ایک اور مراد آبادی کی طرح جو ہندستان میں اس مسلک کے نقیب ہیں ان کا تجدد نہ خود مشتعل ہے نہ دوسروں کے لیے اشتعال انگیز اور صبر آزما۔ سیاسیات میں بھی سید حسن صاحب کی روش کچھ مرنجان مرنج ہی ہے کہیں کہیں گرما گرم بھی لیکن بحیثیت مجموعی سب کو سموئے ہوئے، مروت کی نظریں ہر طرف کیے ہوئے۔

کتاب حسن ترتیب کے اعتبار سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں، خلط مبحث جا بجا ہو گیا ہے لیکن حُسن ترتیب ہے بھی مشکل چیز اور کہنہ مشقی کے بعد ہی میسر آتا ہے جو پیشہ ور مصنف نہیں، ان کے ہاں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، کتاب متفرق معلومات کے کشکول کی حیثیت سے بڑی دلچسپ اور پر لطف ہے اور شعروادب کے بکثرت مباحث میں تو کہیں کہیں تو سید صاحب بڑے پتہ کی کہہ گئے ہیں، کاش ادب ہی کو انھوں نے اپنا مستقل موضوع رکھا ہوتا !

ایک بڑی بات، ہندستان کی موجودہ ذہنی فضا کے لحاظ سے بہت بڑی بات یہ ہے کہ کتاب سوانح عمری محض دماغ کی نہیں بلکہ دل کی بھی ہے "گفتنی" کی تصریحات کے ساتھ ساتھ اشارات "ناگفتنی" کے بھی جا بجا پھیلے ہوئے ہیں اور "برون در" کی نقاشی کے پہلو میں مصوری "درون خانہ" کی بھی اچھی خاصی ہوتی گئی ہے۔

یہ صرف "پہلا حصہ" ہے دوسرا عجب نہیں کہ اس سے دلچسپ تر ہو۔

رسالہ کلیم دہلی[1] (ماہوار)

ایڈیٹر جوش ملیح آبادی، قیمت سالانہ چھ روپے ضخامت ۹۶ صفحے۔ جوش صاحب اب تک "شاعر" انقلاب تھے اب کلیم کے صفحات میں داعی انقلاب کی حیثیت سے نظر آرہے ہیں پہلے ہی نمبر میں اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر ایک پرجوش مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے اس کو شروع یوں فرماتے ہیں:۔

"نوع انسان کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ واہمہ نہیں؟

لیکن یہ نہ ارشاد ہوا کہ دعوت اصلاح اگر تمام تر مضحکہ خیز ہے تو دعوت "انقلاب" کو سنجیدگی اور حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔

دعوت انقلاب بار بار پڑھنے کے بعد بھی انقلاب ادبی کا کوئی نمونہ اس صحیفۂ انقلاب کے اندر نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ "بہ نام قوت وحیات" کو رائج کر دینا کیا کوئی تھوڑا انقلاب ہے؟ تو عرض ہے کہ قوت یا شکتی اور حیات کو مستقل دیویاں تو مشرک قومیں مدتوں سے مانتی چلی آئی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پرستش ہزارہا ہزار سال سے چلی آرہی ہے اس میں انقلاب کی کیا بات ہوئی زیادہ سے زیادہ ارتجاع یا ارتداد ذہنی کہہ لیجیے، رہیں نیم برہنہ زنانی تصویریں سو یہ شرف بھی لاہور، دہلی وغیرہ کے بعض رسالوں کو مدت سے حاصل ہے۔ انقلابیت اس میں بھی کچھ نہ ٹھہری۔ مدیر کلیم کی نثر میں تازہ کلام کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا۔ ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

میں تمھاری صفوں میں سے آندھی کی طرح گزروں گا، تمھاری بے مغز سری پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا تم پر میرا غیظ و غضب بپھرے ہوئے دیوی دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔ اے مورکھ ہندوؤ — اور اے نادان مسلمانو!

---

[1] صدق ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء

دین دین، دھرم دھرم، کلیجہ پیپ ہوا ہو جاتا ہے ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے ـــــ اے دھوتی اور پاجامہ کے گرد ہولے لوٹنے اور بدھنے کی انجمنوں لے داڑھی اور رچٹیلے کے ادارو، تمھاری کس کس حماقت پر رحم کروں۔"

یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوشربا تجلیات آتشیں اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے یہ "لن ترانیاں" اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعائت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کے اور بعض دوسرے صاحبوں کے ادبی مضامین اچھے ہیں خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں اگر چاہیں۔

انشاء[1]

از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی ۱۷۶ صفحے قیمت ۱۲ آنے

پتہ :- مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

مشہور صاحب طرز شاعر و نثار، انشاء اللہ خاں انشا کی شاعری پر یہ ایک دلچسپ تبصرہ ہے اس وقت کے صاحب طرز انشا پرداز مرزا فصاحت اللہ بیگ دہلوی کے قلم سے دو لفظی تعارف یوں کیجیے کہ انشا انشاپرداز کی نظر میں۔"

اس سے زیادہ کچھ کھل کر کہنا کتاب کے لطف و لطافت دونوں کو غارت کرنا ہے فرحت کو افسوس ہے کہ اردو دنیا میں وہ وسیع شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق ہیں :-

---

[1] صدق ۳۱ جولائی ۱۹۴۲ء۔

چند ہم عصر[1]

مولوی عبدالحق صاحب کے چند مقالات، مرتبہ شیخ چاند ایم اے مرحوم طبع ثانی ۱۸۸ صفحات۔
تقطیع ۱۸ × ۲۲ قیمت مجلد ۱۲/ غیر مجلد ۱۰/، پتہ :- انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی۔

یہ ۱۷ معاصرین کے تذکرے اور ان کی زندگیوں پر تبصرے مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے ہیں۔ معاصرین میں سے اکثر تو مشاہیر بھی ہوئے ہیں مثلاً امیر مینائی، جسٹس سید محمود مولانا محمد علی، حالی اور بعض ایسے گمنام جیسے ایک باغ کا مالی نام دیو نامے اور بعض کا شمار نہ مشاہیر میں ہو سکتا ہے نہ گمناموں میں مثلاً وحید الدین سلیم۔

یہ تذکرے زمانے کا بہت وسیع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں یعنی ابتدا سنہ ۱۹۰۰ء سے ہوئی ہے اور انتہا سنہ ۱۹۴۲ء پر ظاہر ہے کہ ۴۰ و ۴۲ سال کی مدت میں انسان کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے اور اس کا قلم بھی کیا سے کیا ہو جاتا ہے اس کے علاوہ بعض صاحب ایسے تھے جن کے سامنے خود مولوی عبدالحق بچہ تھے مثلاً امیر مینائی اور بعض ایسے جو خود ان سے جونیئر (چھوٹے) تھے مثلاً محمد علی یا راس مسعود یہ کتاب کوئی مستقل تصنیف نہیں محض متفرق مضامین کا مجموعہ ہے چاہیے تو یہ تھا کہ اس کے مختلف حصوں میں بڑا تفاوت پایا جاتا اور نشیب و فراز کی مثالیں کثرت سے ملتیں لیکن حیرت ہے کہ ایسا نہیں اور طرز اسلوب کی یکسانی و یک رنگی بڑی حد تک قائم ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب عموماً سادہ نویس و سنجیدہ نویس ہیں گویا حالی کے مثنیٰ۔ لیکن جب مخلی بالطبع بول چال پر آتے ہیں تو مولویوں کے لیے بے تکلف (جغادری) کا لفظ بھی بول جاتے ہیں۔

---

[1] صدق ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء۔

(۱) ہماری زندگی

اور

اس کے رنگ ڈھنگ[ۃ]

ہوٹل سے بھلا پرہیز تمھیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

نگاہوں سے دور اور آنکھوں کی پتلیوں سے مستور لیکن دل کی آنکھوں کے پاس اور جسم تصور کے لیے بمنزلۂ لباس، سننے والے بھائیو! سننے والی بہنو! زمانہ کی نیرنگی اور کارخانۂ دہر کی عجائب کاری کہ "سوسائٹی" کے مضمون پر بولنے وہ کھڑا کیا گیا ہے جو شہر چھوڑ خود ایک ویرانہ میں پڑا ہے اور آپس کے میل جول کی رنگا رنگی پر زبان کھولنے وہ اٹھا ہے جو خود گوشہ نشینی کی کملی سے چمٹا ہوا ہے! زنگی کا نام کافور! اناڑی کے ہاتھ میں بندوق! ریڈیو کے عجائب زار میں ایک اور عجوبہ کا اضافہ! فطرت ٹھیٹھ مشرقی تعلیم ملی تو کچھ مغربی سی۔ آنکھ کھلی مشرق کے صحن و دالان میں، عقل و خرد نے ہوش سنبھالے مغرب کے پارک اور میدان میں۔ جوانی آخر دیوانی، یہ دیوانگی ہمیشہ شعر و شاعری کے سایہ میں نہیں پلتی اور افسانہ اور رومان ہی کی سرزمین پر نہیں جڑ پکڑتی، کبھی شدت فرزانگی کے

ۃ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۹ر اکتوبر ۳۸ء کو نشر ہوئی۔

روپ میں بھی جلوہ دکھا جاتی ہے، دلِ طلسم فرنگ کا مفتوں اور دماغ لیلائے مغرب کا مجنوں! مدتوں مل اور اسپنسر اور ہکسلے سر پر سوار رہے اور برسوں آنکھ لڑی رہی ریشنلزم (عقلیت) سے اور ایگناسٹی زم (لاادریت) سے۔ نشہ آخر اترا اور تب چھوٹا ہوا گھر یاد آیا۔

گھر! ہاں وہی مشرقی گھروندا۔ ہاں وہی مشرق، جہاں ہر صبح مجدوں میں وضو ہوتے ہیں اور دریاؤں میں اشنان، جہاں ہر شام مسجدوں میں اذانیں اور مندروں میں گھنٹے بجتے ہیں، جہاں صبح آفتاب نکلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے اور جہاں شام، دن چھپنے کے ساتھ ہی آجاتی ہے، جہاں یہ نہیں ہوتا کہ سائنس کا کمال رات کو دن بنا دے اور آرٹ کی جنت نگاہ دن میں رات کے سب مزے بھر دے! یہ وہ زمین ہے جس پر کبھی آسمان کو ناز رہ چکا ہے! نبیؑ اور ولی اور بڑے بڑے رشی اور گیانی کسی زمانہ میں اسی زمین پر چلے پھرے، رہے بسے ہیں۔ اور آج بھی اپنے اپنے طریق پر خدا جانے کتنے ذکر و فکر کے حلقوں کو بسائے اور گیان دھیان کی سمادھیوں کو رچائے ہوئے ہیں! یہ وہ خطہ ہے جہاں اب تک عزت ہو رہی ہے برقع اور گھونگھٹ کی، نقاب اور چادر کی۔ جہاں اب تک شوہر کو سرتاج اور سوامی کہا جاتا، اور باپ کو قبلہ و کعبہ لکھا جاتا ہے! یہاں والوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے اور ماں کو ادب کے ساتھ سلام کرنا، اس کے قدموں سے آنکھیں ملنا دستور میں داخل ہے۔ اولاد کا سلسلہ پیدائش روکنے کی جگہ یہاں اب تک بیٹا "لخت جگر" اور بیٹی "نور نظر" ہے! غیرت یہاں اب تک سب سے بڑھ کر ماں کی اور بہن کی اور بیٹی کی، دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ان کی بے حرمتی کی طرف اشارہ، شریفوں کو چھوڑیئے، بازاریوں اور آوارہ مزاجوں کی زبان میں بھی سب سے بڑی گالی ہے! ادب اب تک یہاں بڑوں کا چلا آتا ہے۔ محلہ کا "ادنیٰ" اگر سن میں بڑا ہے تو "اعلیٰ" ہے۔ استاد اور گرو کا حق مانا جاتا ہے استادوں کے خلاف اور اسٹرائکوں (ہڑتالوں) کی جگہ الٹے ان کے حق دو دو پشتوں تک مانے جاتے ہیں! خاندان کے معنی محض میاں بیوی کے جوڑے نہیں لیے جاتے ہیں۔ ماں اور باپ کے علاوہ چچا اور ماموں اور پھوپھی اور خالہ اور بھاوج اور سالی اور سالے اور بہنوئی اور وہ بھی صرف سگے نہیں، رشتے کے، بیگانے نہیں، اپنے اور خاندان سے خارج نہیں، خاندان کا جزو سمجھے جاتے ہیں! یہاں بیسویں صدی میں بھی تعلقات آٹھویں صدی اور ساتویں اور چھٹی صدی اور اس سے بہت پہلے کی صدیوں سے ٹوٹے نہیں قائم ہیں۔

یہاں اب تک صبح اٹھ کر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے اور گیتا کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ یہاں والوں کی

سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ مذہب کی بنیادی حقیقتیں اور اخلاق کی ٹھوس سچائیاں بھی ایک طرح لباس کے فیشن کے حکم میں داخل ہیں کہ صبح کو کچھ ہیں اور شام کو کچھ اور ان کے دلوں پر اب تک حکومت گیتا کی اور رامائن کی، اور سعدیؒ کی اور مولانائے رومؒ کی چلی آرہی ہے۔ یہاں والے آج تک اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہدایتوں کو سورج کی روشنی کی طرح مستقل اور پائدار، سال کے تین سو پینسٹھ دن قائم مانتے ہیں اور بزرگوں کے نام پر مجلسیں محفلیں کرتے اور اپنی اپنی سمجھ کے لائق اُن کی یادگاریں مناتے چلے آتے ہیں۔ یہاں اب بھی انکسار، فروتنی اور عاجزی کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں شریف اُسے سمجھا جاتا ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسروں کو ڈھکیل کر، گرا کر، اپنا راستہ صاف کرنے کی جگہ اپنے کو پیچھے رکھتا ہے، خود ہٹتا جاتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ اپنے کارناموں کو مشتہر کرنے اور اپنے کمالات کا "مینی فسٹو" شائع کرنے کے فن میں کبھی ابھی وہ بالکل نو آموز بلکہ اناڑی ہے۔ اس کے ہاں اپنے لیے دستور اس قسم کے الفاظ کے استعمال کرنے کا ہے، "حقیر" "پر تقصیر" "کمترین" "مسکین" "خاکسار" "ذرۂ بے مقدار" "خادم" "آثم" اور جب کوئی اُسے آگے بڑھانا چاہتا ہے تو جواب اس قسم کا سننے میں آتا ہے "یہ محض آپ کا کرم ہے" "حسنِ ظن ہے" "بندہ نوازی ہے، عزت افزائی ہے، یہ خاکسار ہے کس قابل"۔ یہاں کے باشندے اپنی سادہ دلی سے اب تک مہمان نوازی کو کوئی بڑی صفت سمجھے ہوئے ہیں۔ اور گھر کو ہوٹل بنا دینے اور مہمانوں کے آگے بل پیش کر دینے کے فن میں بالکل کورے ہیں۔ اُن کے وسیع چوپال، اُن کے کشادہ چبوترے، اُن کے فراخ صحن، ہر وقت آنے جانے والوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ ڈرائنگ روم اور وزیٹنگ کارڈ کی رسم اور ان کے باہمی تعلق کی خبر سے اُن کے کان ناآشنا ہیں۔ اُن کے کچے گھروں کی بڑی رونق ہے اُن کی صفائی اور ستھرائی، اور اصلی زینت ہے ان کی لپائی اور پُتائی۔ بیش قیمت کوچ اور صوفے اب تک ان کی نظروں میں کچھ زیادہ جنچے نہیں ہیں۔ زمین کے قدرتی، سادہ فرش پر بڑا تکلف و اہتمام کیا تو گدے اور قالین اور سفید چاندنی کا اُجلا اُجلا فرش اُن کے لیے کافی سے زائد ہے۔

چائے اور کافی کی چاٹ اب تک ان میں سے بہتوں کو نہیں پڑی ہے۔ گھروں میں پلی ہوئی گائیں اور بھینسیں اور یہ انھیں کے دودھ، دہی، مکھن اور گھی میں مگن۔ سگار اور سگریٹ کے فوائد اب تک ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ پان کی گلوریاں، مسالہ، الائچیاں یہی ان کے تکلفات! اُن کی تفریح کی جگہیں خود ان کے گھروں کے اندر انگنائیاں اور دالان، پائیں باغ اور چمن۔ بیوی بچوں میں، گھر گھرانے کے دوسرے لڑکوں، لڑکیوں میں دل ایسا بہلا رہتا ہے کہ تھیٹر، کارنیوال، سنیما اور نائٹ کلب میں راتیں گزارنے کا دھیان کبھی نہیں

آتا! یہ صبح سویرے جب آنکھ کھولتے ہیں تو خدا کا نام لیتے ہوئے اور رات کو جب سوتے اور لیٹتے ہیں تو اپنے تئیں خدا کو سونپتے ہوئے۔ یہاں کی چڑیاں تک جب چہچہاتی ہیں، تو یہ بول اُٹھتے ہیں کہ وہ دیکھو خدا کا نام جپ رہی ہیں۔ کوئل کی کوک میں، مرغ کی بانگ میں، پپیہے کی پکار میں، قمری کے زمزمے میں، بلبل کے نغمہ میں مور کے شور میں، سب میں اُنھیں پروردگار کے نام کی تسبیح ہی سنائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں کمانا ایک ہے تو کھاتے دس بیس ہیں۔ لڑکے بالے بھائی بہن، ماں باپ، خون کے رشتہ دار اور دودھ کے رشتہ دار، اپنے عزیز اور پھر اُن عزیزوں کے عزیز۔ ایک کی کمائی میں خدا جانے کتنے شریک! خود غرضی کا یہ فلسفہ ابھی یہاں تک نہیں پہونچا ہے۔ کہ محلہ کے بوڑھوں اور اپاہجوں، پڑوس کے لنگڑے، لولے اور اندھوں اور بستی کے یتیموں اور رانڈوں کا حق ہی کسی کمانے والے کی کمائی میں کیا ہے؟ باضابطہ "محتاج خانے" اسی لیے اس سرزمین پر بہت کم نظر آتے ہیں۔ کوئی بیمار پڑتا ہے تو گھر والے اُس سے وحشت اور دہشت کھا کر بھاگتے نہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ گھر کی مالکہ، گھر کے مالک کو نرسوں کے حوالہ کر، خود شام کی ٹینس یا شام کی تفریح کے تشریف لے جائیں۔ مریض کی خدمت اور تیمارداری پر گھر بھر ٹوٹ پڑتا ہے اور اسے بیمار پر کوئی احسان نہیں، خود اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اور گھر والوں میں کوئی اس قابل نہ ہوا تو محلہ والے ہجوم کر کے آگھستے ہیں، اتنے رضاکاروں (والنٹیروں کے) ہوتے ہوئے باضابطہ ٹرینڈ نرسوں کی فوج کی فوج قدرتاً یہاں تیار نہیں ملتی۔

ان کے ہاں بچہ جب تعلیم کو بٹھایا جاتا ہے تو سب سے پہلا سبق خدا کے نام ہی کا ملتا ہے۔ یہاں تک کہ "بسم اللہ" کرانا ان کی بولی میں ہم معنی قرار پا گیا ہے ہر امر کی ابتدا کرنے کا۔ یہاں کانگرسیں، کانفرنسیں جب پرجوش جلسے کرتی ہیں تو دھواں دھار تقریریں اور گرما گرم بحثیں تو بعد کو ہوتی ہیں، پہل ہوتی ہیں کسی نہ کسی صورت میں خدا ہی کی حمد و ثنا سے۔ یہاں کے اہل قلم جب تصنیف کرنے بیٹھتے ہیں تو پہلی سطر ہوتی ہے حمد الٰہی کی۔ ان کے ہاں جو قصے کہانیاں رائج ہیں اُن میں کوئی نہ کوئی درس اخلاق کا، معرفت الٰہی کا خواہ مخواہ ہوتا ہے "ادب، ادب کی غرض سے"، فن، فن کی خاطر" آرٹ، آرٹ ہی کے لیے" اس اونچے، بہت اونچے، فلسفہ تک ان بیچاروں کے دماغ کی رسائی ابھی نہیں ہو پائی ہے۔ الکشن کے فن جدید میں بھی یہاں والے ابھی بہت پیچھے ہیں۔ حریف کو نیچا دکھانے کے داؤں گھات ابھی ان کی عقل کی گرفت میں پوری طرح نہیں آئے ہیں۔ اس لیے جب انھیں خود بحیثیت امیدوار اپنا فخریہ پیش کرنا ہوتا ہے تو کچھ جھجکر اسے جاتے

جاتے ہیں، اور جب بڑھتے ہیں تو ٹھوکر قدم قدم پر کھاتے ہیں۔ مروت ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ غریب کیا جانیں کہ وقت پر کام نکال لینے کا فن کیا ہوتا ہے۔ اُن کی مسجدیں اُن کی خانقاہیں، یہاں تک کہ ان کے میلے ٹھیلے لوگوں کو اکٹھا کرنے والے، جمع کرنے والے، مرکزِ وحدت کی طرف لانے والے ہوتے ہیں۔ انھیں کیا خبر کہ سیاسی بڑائی اس میں ہے کہ آپس میں خوب لڑا جائے اور پارٹی در پارٹی بنتی چلی جائے! ان کے ہاں عورت کے لیے نظریں نیچی رکھنا اور جسم کو ڈھکے رکھنا اب تک شرافت کا نشان اور عصمت کی پہچان ہے یہاں تک کہ ان میں جو بدنصیبیں بالکل بازاری ہو جاتی ہیں، وہ بھی دنیا کا شرم و لحاظ رکھتی ہیں۔ اور عام مجلسوں میں بے باک نہیں ہوتیں۔

یہ دقیق علوم ان کی سمجھ میں اب تک نہیں آئے ہیں کہ اگر کالج کے ایک ہی کلاس میں نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں زانو بہ زانو بیٹھ کر پڑھیں گی تو ان کا دماغ زیادہ روشن ہو جائے گا یا اُن کی عقل کو زیادہ جلا ہو جائے گی، یا عورتیں اپنے جسم کا بڑا حصّہ قیدِ لباس سے آزاد کیے بازاروں میں، اسٹیشنوں پر، سینما گھروں میں پھریں گی۔ تو اس سے ان کے اخلاق بلند ہو جائیں گے! ابھی تک یہاں کی عورتیں اپنا مقصدِ زندگی صرف خدمت سمجھ رہی ہیں۔ خدمت ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی، شوہر کی، اولاد کی۔ اور خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں وہ سہاگنیں، جو خدمت کرتی ہوئی شوہر کے ہاتھوں اٹھ جائیں! یہاں کے اخبارات عدالت طلاق کی کارروائیوں سے لبریز نہیں ہوتے۔ یہاں کی لڑکی جب بیاہ کے بعد اپنا گھر چھوڑ، سسرال جاتی ہے تو ساس کی شکل میں اُسے دوسری ماں اور سسرے کی شکل میں اُسے دوسرا باپ میسر آجاتا ہے۔ اور اس طرح ان دونوں کو بہو کے قالب میں ایک اور بیٹی مل جاتی ہے۔

یہاں کے نظام کی بنیادی کشمکش (Struggle) پر نہیں، معاونت و مددگاری (Alliance) پر ہے۔ قناعت اور زہد و تقویٰ کا اب تک ان کے ہاں بڑا درجہ ہے۔ خان بہادری اور رائے بہادری اور نائٹ ہڈ تو اُن کے بس کی چیز نہیں، اسے چھوڑیئے۔ باقی یہاں کی زبانِ خلق مقدس انھیں کو ٹھہراتی ہے جو بڑے بڑے بینکوں کے ڈائرکٹر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئر ہولڈر نہیں، بلکہ جو دنیا سے منھ موڑے، اور ہوسِ دنیوی کو چھوڑے ہوتے ہیں۔ عقیدت کے پھول اُنھیں آستانوں پر چڑھتے ہیں جو فقر و مسکنت کے تاجدار ہوتے ہیں۔ اعتقاد دواؤں سے بڑھ کر دعاؤں پر رہتا ہے اور بھروسہ تدبیر سے کہیں زیادہ تقدیر پر۔ بلاؤں کے دباؤں کے دور کرنے کے لیے یہ محض ڈاکٹروں، حکیموں کے سہارے پر نہیں رہتے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کرتے ہیں، روزوں کی منت مانتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں، خیرات کرتے ہیں ———— یہ ہے ہماری

یعنی ہم مشرقیوں کی سوسائٹی کا دھندلا سا خاکہ اور پُرانی دنیا والوں کی مجلسی زندگی کا مختصر سا نقشہ لیکن قریب ہے کہ حال ماضی ہو کر رہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا جو شعر شروع گفتگو میں عرض ہوا تھا۔ ایک بار حافظہ میں پھر تازہ کر لیا جائے

ہوٹل سے بھلا پرہیز تمھیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں

پنڈت جی مہراج اپنی بات پر جمے رہنے والے، اپنی آن پر اڑے رہنے والے عین کنسرویٹوازم کی تصویر تھے۔ جب وہی اپنی جگہ سے اتنا سرک گئے تو ہمہ شما کا ذکر ہی کیا۔ مشرق کو انقلاب کے ہنگامے مغرب سے گڈمڈ کر رہے ہیں۔ اور پُرانی دنیا کو نئی دنیا میں تبدیل ہونے کے لیے صدیوں کیا معنی برسوں کی بھی مدت درکار نہیں۔ مہینوں بلکہ ہفتوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ رہی ہے

مرزا غریب چُپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اودھ اور مگدھ دیش، اجودھیا اور پاٹلی پُتر مدت ہوئی افسانہ بن چکے۔ بلگرام اور خیر آباد۔ بارہہ اور عظیم آباد کی دل و دماغ پر حکومتیں مدت ہوئی ختم ہو چکیں، لکھنؤ کی لکھنویت ایک ٹمٹماتا سا چراغ، دہلی کی دہلویت ایک شمع بلا فانوس، لندن اور پیرس اور نیویارک کی ہواؤں کے جھونکے اُسے ہر لحظہ بجھا دینے کو تیار اور اب سب سے بڑھکر ماسکو کی آندھی کے جھکڑ

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے ساماں بہم ہونگے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشم دنیا میں
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

ریڈیو والوں کا یہ احسان کچھ کم ہے کہ جو تہذیب عنقریب مٹنے والی اور جو زندگی دیکھتے دیکھتے ختم ہونے والی ہے۔ اُسکی ایک ہلکی سی جھلک آئندہ زمانہ میں آثار قدیمہ کا کھوج لگانے والوں کے لیے محفوظ کرا دی!

(۲) سائنس پر مکالمہ[1]

میر صاحب۔ آداب بجا لاتا ہوں، سرکار۔ مزاج شریف۔

شیخ صاحب۔ آہا! جناب میر صاحب قبلہ ہیں۔ تسلیم۔ تشریف لایئے۔ یہ آج چاند کدھر سے نکل آیا۔ اچھا اب سمجھا۔ مرزا صاحب ساتھ ہیں، یہی گھسیٹ لائے ہوں گے۔

مرزا صاحب۔ جی اور کیا۔ یہ بھلا اب ریڈیو چھوڑ کر کبھی سے ملتے ملاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میں گرفتار کر لایا۔ آپ کو ان کے شوق کا حال معلوم ہے نا شیخ صاحب؟

میر صاحب۔ خیر یہ تو مرزا صاحب کی شاعری ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب سے ریڈیو لے لیا ہے۔ باہر نکلنا ذرا کم سا ہو گیا ہے۔ ظالم میں کچھ ایسی لذّت ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور بھئی چیز بھی تو ایسی ہی ہے۔ جو بیسوں گھنٹوں کا مصاحب۔ دن بھر چاہے باتیں سُنا کیجیے۔ دل بہلایا کیجیے، نہ لڑائی جھگڑے کا ڈر، نہ کسی کی حکایت شکایت۔ میں کہتا ہوں شیخ صاحب ان ولایت والوں کو سوجھتی بھی کیا کیا ہے کیسی کیسی چیزیں ایجاد کر دی ہیں۔ ان کا سائنس ہے کہ جادو۔ کوئی حد ہے ان کی عقل کی رسائی کی۔

شیخ صاحب۔ جادو آپ کی عقل پر تو ضرور چل گیا ہے۔ مرد آدمی عقل نام ہے قوتِ فکری کا۔ ان مشینی ایجادوں سے قوت فکری کی کون سی کرامت ثابت ہو گئی؟ بس وہی جیسے ہمارے ہاں بڑھئی، لوہار، مستری، کاریگر ہوئے

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۳ر دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء کو نشر ہوا۔

ہیں، ویسے ان کے ہاں انجنیر، مکینک، ٹکنیشین۔ تجربہ ان کا بڑھا ہوا۔ بہت بڑھا ہوا سہی۔

میر صاحب۔ حد کر دی آپ نے بھی شیخ صاحب۔ یہ کوئی کمال ہی آپ کے نزدیک نہوا کہ آدمی گھر بیٹھے سیکڑوں، ہزاروں میل کی خبریں دم بھر میں سن لے۔ لندن کا آدمی گویا دیوار کے پیچھے کھڑا ہوا اور اب تو بولنے والے کی تصویر بھی آجایا کرے گی اور پھر خرچ ہی کیا۔ دو چار سو میں اچھا سا سٹ لے لیجیے۔ دیہات میں بیٹری لگا کر سنیے۔ سفر میں ساتھ رکھیے۔

شیخ صاحب۔ جی ہاں اور یہ کمال کچھ کم ہے کہ گھر بیٹھے جن بائی صاحبہ کا چاہے پتہ لگا لیجیے، نہ بدنامی کا ڈر نہ گلیوں میں خاک چھاننے کی ضرورت۔

میر صاحب۔ لاحول ولاقوۃ آپ کی نظر بھی سب چھوڑ چھاڑ کر کہاں جا کر پڑی! میں کہتا ہوں کہ اوّل تو موسیقی کی سرپرستی میں عیب ہی کیا ہے۔ زندہ تو میں زندہ اسی کے دم سے ہیں اور پھر مانا کہ ایک عیب آپ نے ٹٹول لیا۔ نٹو ہنر بھی تو اس کے مقابلہ پر دیکھیے۔

شیخ صاحب۔ وہی تو جاننا چاہتا ہوں۔ یہ مشین پر مشین جو دن پر دن ڈھلتی جاتی ہے آخر اس سے فائدہ کیا ہے جو دنیا کو پہونچ رہا ہے؟

مرزا صاحب۔ میرے خیال میں یہ طے کر لیجیے کہ نفع یا فائدہ کسے کہتے ہیں؟

میر صاحب۔ میں تو فائدہ سے مراد یہ لیتا ہوں کہ انسان کو زندگی میں راحت ملے، سکھ نصیب ہو۔

شیخ صاحب۔ اور دکھ دور ہو۔ ورنہ ایک راحت اگر دس مصیبتیں اپنے ساتھ لگا لائی تو یہ بھی کوئی علاج ہوا الٹا اور وبال ہو گیا۔

میر صاحب۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔ آگے چلیے۔

شیخ صاحب۔ تو بس اپنے ہی قائم کیے ہوئے معیار پر ان نت نئی کوششوں کو جانچ لیجیے۔ ریل کا نام آپ پیش کریں گے؟ اچھا اسی کو لیجیے یہ فرمایئے کہ غلّہ کی مستقل گرانی جواب ہو گئی ہے، کبھی ریل کے دور سے پہلے بھی تھی؟

میر صاحب۔ سبحان اللہ! ریل کا اس میں کیا قصور۔ ریل قحط زدہ علاقوں میں غلّہ پہونچا کر مصیبت ہلکی کر دیتی ہے۔

شیخ صاحب۔ جی کیسی کچھ۔ ادھر غلّہ کھیتوں سے کٹ کر آیا نہیں کہ ادھر مال گاڑیوں میں بھر بھر کر باہر چلا نہیں اور پھر ملک کے اندر الٹ پلٹ کر رہتا، جب بھی غنیمت تھا یہ تو خدا معلوم کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔ ایسے

میں گرانی نہ ہو تو کیا ہو؟

میر صاحب۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ مسوری اور نینی تال اور شملہ آناً فاناً پہونچا دینا ریل ہی کا کام ہے۔ ریل نہ ہوتی تو ہم ترسا ہی کرتے اور ان صحت بخش مقاموں کی ہوا بھی نہ لگنے پاتی۔

شیخ صاحب۔ اور ریل خود جو بیماریوں کا گھر ہے! یہ انجنوں کا بھکبھکاتا ہوا دھواں آپ کے خیال میں بالا بالا چلا جاتا ہے؟ سانس پر پھیپھڑوں پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا؟ میرے بھائی نزلہ اس سے پیدا ہو جائے، گلے میں خراش اس سے ہو جائے، کھانسی اس سے آنے لگے، دق اور سل کی بنیاد یہ پیدا کر دے یہ دھواں کوئی ایسی ویسی چیز ہے۔ کسی بڑے جنکشن پر ذرا کچھ دیر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھیے تو بادل کے بادل دھوئیں کے چھائے ہوئے، جمے ہوئے۔ کپڑے الگ غارت۔ ہاتھ منھ الگ کالک میں لت پت۔ اور کوئلہ کے ذرے ہیں کہ گھسے جا رہے ہیں، آنکھ میں، کان میں، ناک میں! انجن والے بیچاروں کی تو وہ گت بن کر رہتی ہے کہ سبحان اللہ۔ اللہ نہ کرے دشمن کا بھی یوں منہ کالا ہو!

میر صاحب۔ آپ اپنی ہی کہے جائیے گا، یا دوسرے کی بھی سُنیے گا؟

شیخ صاحب۔ بات ابھی کہاں ختم ہوئی جو دم لوں۔ اپنی کالی کلوٹی کے گُن ابھی آپ نے پورے سُنے کہاں ہیں؟ اپنے کسی لمبے سفر کو یاد کر لیجیے، مسلسل جھٹکے اور دھچکے اور ٹکر اور ہچکولے، انسان کو پیس کر چور چور کر کے، اعصاب چاہے فولاد کے بنے ہوں جب بھی انھیں دھونس کر رکھ دیں۔ پھر رات کے سناٹے میں کوس کوس دو دو کوس کے فاصلہ سے سن لیجیے کہ انجن گھڑ گھڑاتا ہوا دھک دھکاتا ہوا زمین کا سینہ چیرتا ہوا چلا آ رہا ہے جیسے جنگل کا کوئی دیو چیختا چنگھاڑتا پھنکارتا ہوا آ رہا ہے۔ یہ آج جو اتنی کثرت سے عصبی اور خفقانی بیماریاں نکل پڑی ہیں، ان میں کوئی ہاتھ ریلوے بازی کا نہیں؟ ذرا کسی بڑے محقق ڈاکٹر سے تو پوچھ دیکھیے۔

میر صاحب۔ غرض یہ کہ دنیا جہان کی ساری خرابیاں ریل ہی میں آ کر جمع ہو گئی ہیں!

شیخ صاحب۔ ابھی کیا ہے۔ سُنے جائیے۔ ہیضہ اور طاعون اور چیچک اور خدا جانے اور کون کون، آپ ہی کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ لگنی بیماریاں ہوتی ہیں۔ یہ ملک الموتی وبائیں کہ ابھی کلکتہ میں تھیں، ابھی بمبئی پہونچ گئیں، ابھی لکھنؤ میں نمودار ہوئیں، ابھی پشاور میں جا نکلیں۔ یہ سب آپ کے ریلوے کی برکت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر یہ تو ہوئیں جسمانی بیماریاں۔ باقی جہاں جہاں پہلے پہل آپ کی یہ سواری بادبہاری پہونچی ہے وہاں اس کے جلو میں شراب خواری ناچ گھر اور کیا کیا نہیں پہونچا؟ کچھ اس کی بھی خبر ہے؟

میر صاحب۔ اور فائدہ ان ساری برائیوں کے مقابلہ میں آپ کو ایک بھی نظر نہ آیا۔

شیخ صاحب۔ ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ پیروں کی قوت دن پر دن جواب ہی دیتی چلی گئی۔ باپ دادا تیس ۳۰ تیس ۴۰ چالیس میل کی منزل پیدل مارنے والے۔ صاحبزادوں کے سامنے نام ۸۔۔۱۰ میل کا بھی لیجیے تو اوسان خطا ہو جائیں۔ اور ایک ریل ہی کیا۔ آپ کی سائنس کو خدا سلامت رکھے۔ موٹر اور ٹرام، لاری اور سائیکل اور موٹر سائیکل۔ ع

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

اور پھر آپ کی تجربہ گاہوں اور کارخانوں کی خوشبوؤں کا کیا کہنا! جس آلہ کو اٹھا کر دیکھیے، ربڑ کی بدبو سے ناک لبس جائے۔ جس مشین کو چلائیے، پٹرول کی گندگی سے دماغ اُڑ جائے۔ کیسی کیسی عطر بیز گیسیں، کیا کیا شامّہ نواز الیسڈ اور تیزاب میرے شیر نے ایجاد کر ڈالے ہیں۔

مرزا صاحب۔ جی ہاں نفاست تو ختم ہے سائنس والوں پر، ان کی کسی لیبوریٹری میں کسی فیکٹری میں جا نکلیے، ممکن نہیں رومال ناک پر نہ رکھ لینا پڑے۔ لیکن شیخ صاحب یہ آپ کی بھی زیادتی ہے کہ آپ سارا الزام ان ایجادوں ہی کے سر منڈھے دیتے ہیں۔ بیجا مصرف جس چیز کا بھی کیجیے وہ بری بن جائے گی، میرے خیال میں تو مشینوں کے استعمال کو صرف ضرورت کے وقت تک محدود کر دیا جائے تو ان کے نقصانات گھٹ تو یقیناً جائیں گے چاہے بالکل دور نہ ہوں۔

میر صاحب۔ آپ بھی مرزا صاحب کس کی باتوں میں آ گئے۔ ہمارے شیخ صاحب تو وہ ہیں کہ دن دوپہر آفتاب ہی سے انکار کر بیٹھے۔ آنکھوں میں خاک جھونکنا اور کہتے کسے ہیں؟ وہ دن بھول گئے، جب رات میں قدم گھر سے باہر نکالتے، تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے۔ یہ سائنس ہی کا کرشمہ ہے کہ شہر کا ہر گلی کوچہ پڑا جگمگا رہا ہے اور اب تو بجلی گاؤں گاؤں پہونچتی جا رہی ہے۔

شیخ صاحب۔ جی ہاں وہ بجلی کے لیمپ نا، جن کی شان میں حضرت اکبر قصیدہ خوانی کر گئے ہیں۔ ع

روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

یہ بھی خبر ہے کہ جب سے یہ روشنیاں نکلیں، خاص لندن کی گلیوں میں جرموں کی تعداد گھٹی نہیں اور بڑھ ہی گئی۔ لندن کی نائٹ لائف (شبانہ زندگی) پر تو مستقل کتابیں وہیں کے محققین نے لکھ ڈالی ہیں، کبھی ذرا انھیں اٹھا کر دیکھ لیا کیجیے "روشنی میں اندھیر" کے معنی سمجھ میں آ جائیں گے۔ اچھا جانے دیجیے، لندن اور پیرس کی

اس تحقیق کو، ذرا ہمیں کے کسی مُبصر سے پوچھ دیکھیے کہ اتنی تیز تڑپ کا اثر بصارت پر کیا پڑتا ہے؟ کیا خوب ترقی ہے۔ پہلے آنکھیں پھوڑیئے۔ پھر آنکھ کی کمزوری دُور کرنے کے لیے عینکیں خریدیئے "روشنیِ طبع" کا بلا ہونا تو شاعروں کی زبان سے سُنا تھا، اس روشنیِ برق کا بلا ہونا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ؎

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں

اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں!

میر صاحب۔ آپ تو ہر سیدھی بات کو اُلٹی کر دیتے ہیں۔ لیکن میں بھی دیکھتا ہوں کہاں تک ہٹ دھرمی سے کام لیے جائیے گا؟ ایک اسی بات کو لے لیجیے کہ جب تک یہ پانی کے نل نہیں لگے ہیں، سقہ بہشتی کا رونا جھینکنا کیسا گھر گھر شور مچا رہتا تھا۔ اور اب وہی ہے کہ بے محنت، بے کھٹکے پانی چلا آ رہا ہے، ڈول رسّی کا جھگڑا، نہ پانی کھینچنے کی مشقت مزے سے جب چاہا، بمبہ کھول دیا، نہا لیے دھو لیے۔

شیخ صاحب۔ جی کیا کہنے ہیں واٹر ورکس کی برکتوں کے۔ پانی ٹک ٹپ کر اور تُل کر بکنے لگا! یہ حد ہے ترقیوں کی! جس دیس میں گلی گلی سبیلیں لگیں اور جانوروں تک کے لیے پیاؤ چلا کریں، وہاں آج دو دن کی دیر ہو جائے میونسپلٹی میں واٹر ٹیکس داخل کرنے کی، پہلے پانی بند! ترسا کیجیے حلق تر کرنے کو۔

مرزا صاحب۔ اور یوں بھی تو پانی وقت ہی وقت آتا ہے، اتنے گھنٹے صبح، اتنے گھنٹے شام۔

شیخ صاحب۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ صاف شفاف، بہتا ہوا، کھلا ہوا، پانی چھوڑ چھاڑ، بند، گُھٹا ہوا، طرح طرح کی ترکیبوں سے پکے پکائے ہوئے پانی میں آخر جان ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اور گرمیوں میں تو بس مزہ ہی آ جاتا ہے۔ وہ تپتے ہوئے بمبے اور دہکتے ہوئے نل اور کھولتے ہوئے پانی کی دھار۔ برف کا سہارا نہ ہو تو حلق جھلس کر رہ جائے!

میر صاحب۔ تو آخر برف کیوں نہ پیجیے؟ اب کیا ایسی نعمت پیسہ دو پیسہ سیر میں مہنگی ہے؟

شیخ صاحب۔ جی کیوں نہ پیجیے۔ بڑے شوق سے پیجیے۔ چاہے دانتوں اور معدہ پر اور اعصاب پر جو کچھ بیت جائے۔ آخر برف بھی تو ہے نہ سائنس کی پیداوار اور مشینوں سے تیار ہونے والی نعمت!

میر صاحب۔ خیر، وہ کچھ بھی سہی یہ فرمایئے کہ ایسے شاندار اسپتال اس دور سے پہلے کب تھے؟ سامانِ راحت سے لیس، گھر سے بڑھ کر آرام دہ،

شیخ صاحب۔ اور یہ نئی نئی بیماریاں، اعصابی اور دماغی اور ہر طرح کی جو اب نکل پڑی ہیں، ان کے نام تک

بقراط اور جالینوس نے کب سُنے تھے؟ زہر خورانی کب اتنی عام ہوئی تھی؟ خودکشی کب آج کی طرح داخل فیشن ہوئی تھی۔ گندی سے گندی بیماریاں اپنے ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی کب اس طرح انسان پر مسلط ہوئی تھیں؟ اور سب اُدھیڑے ہوئے سائنٹفک ایجادوں اور آلوں کی۔

مرزا صاحب۔ اجازت ہو تو ایک اصولی بات میں عرض کر دوں۔ مل کے نام سے تو آپ دونوں واقف ہی ہیں، وہی انگلستان کا مشہور فلسفی۔ ایک جگہ لکھ گیا ہے کہ نیچر اور آرٹ کے درمیان نسبت تضاد ہے۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میرے خیال میں کچھ ایسا ہی رشتہ نیچر اور سائنس کے درمیان بھی ہے۔ گویا جو چیز جتنی زیادہ انسانی سائنس کی شرمندۂ احسان ہو گی، اسی قدر وہ طبعی اور فطری حالت سے دور ہو گی، ہے یہ بات کہ نہیں؟

میر صاحب۔ یہ موشگافیاں تو میں جانتا نہیں۔ سیدھی سی بات یہ دیکھتا ہوں کہ دُوربینوں نے آسمانوں تک کو چھان ڈالا ہے۔ یوں کہیے کہ ستاروں کی "مردم شماری" کر ڈالی ہے۔ پھر یہ بھی سُن لیجیے کہ فلاں ستارہ اتنا بڑا ہے، فلاں زمین سے اتنی دُور ہے، فلاں کی رفتار اتنی ہے واللہ یہ عجائبات ہیں عجائبات!

شیخ صاحب۔ عجائبات کیوں؟ کہیے معجزات ہیں معجزات ہیں قصور معاف یہ نہ ارشاد ہوا کہ اس ستارہ نوردی اور آفتاب گردی سے آخر حاصل کیا ہوا؟ انسانیت کی راہ کی کتنی منزلیں طے ہوئیں؟ یہ مسافتیں اور پیمائشیں نہ معلوم ہوتیں، تو انسان کی تکمیلِ انسانیت میں کون سی کسر باقی رہ جاتی؟ وقت اور قوت کا صَرف بے حساب، روپیہ کا خرچ بے شمار، اور پھر ہاتھ کیا لگا؟ مادی؟ روحانی؟ کچھ تو بتایئے۔ اس لاحاصل دُوربینی اور ستارہ پیمائی سے تو ڈلیا ڈھونا اور گھاس کھودنا کیا بُرا ہے؟

میر صاحب۔ کیا خوب! بس معلوم ہو گئی آپ کی قدردانی یہ کوئی ترقی ہی آپ کے خیال میں نہیں کہ خاک نشین انسان ہوا میں اُڑنے لگا، طرح طرح کے اُڑن کھٹولے ایجاد کر لیے، ملکوں ملکوں کی سیر آناً فاناً کر ڈالی، آپ کے نزدیک یہ کوئی ترقی ہی نہ ہوئی؟

شیخ صاحب۔ اچھا تو معیار ترقی یہ ٹھہرا۔ مگر حضور والا، یہ ترقیاں تو آج سے نہیں، ہمیشہ سے حاصل ہیں۔ جنگل کی چڑیوں کو، درختوں پر گھونسلہ بنانے والے پرندوں کو، چیل اور کوّے اور گدھ اور کبوتر اور باز سب ہی ہوا میں خوب فرّاٹے بھر لیتے ہیں، منزلوں کی خبر دم بھر میں لے آتے ہیں! حضرت انسان نے یہ بلند پروازی کے سبق جو کچھ سیکھے ہیں، انھیں جانوروں کو دیکھ کر سیکھے ہیں۔ یقین نہ آئے تو فن ہوابازی (Aviation) کی جون سی کتاب چاہے اُٹھا کر دیکھ لیجیے، یہ اقرار درج ملے گا۔

میرؔ صاحب۔ خیر اب آپ سے مغز کون خالی کرے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ جیسے جیسے عجیب اور نادر آلاتِ جنگ جدید سائنس نے ایجاد کر لیے ہیں۔ رستم اور بھیم کے تو خواب و خیال میں بھی آئے نہ ہوں گے۔

شیخؔ صاحب۔ یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا سائنس کی استادی کا، واقعی بات ہے کہ خوب ہی سکھا دیا۔ آپ کے سائنس نے بھائی کو بھائی کا پھاڑ کھانا، جسم کے ریشہ ریشہ کو قیمہ کر ڈالنا، ہاتھ، پیر، کان، آنکھ، ناک کے پرخچے اڑا دینا، سائنس کی راہ سے جسم کے پور پور میں زہر اتار دینا! آپ سے زیادہ مانتا ہوں کہ یہ حصّہ ہے آپ کے سائنس کا! میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ لطیف صنعتیں دیکھ کر جنگل کے شیر اور تیندوے، ریچھ اور بھیڑیئے، سانپ اور اژدہے، سب اپنے کان پکڑ کر رہ گئے۔ کیا بات ہے آپ کے سائنس کی! بات کی بات میں انسان کو درندوں سے بڑھ کر درندہ بنا ڈالا،

مرزاؔ صاحب۔ اور اصلی جوہر تو سائنس کا میدان جنگ ہی میں کھلتا ہے۔ اخباروں میں آپ نے پڑھا نہیں کہ ایک صاحب کرۂ مریخ کے نہیں، اسی زمین کے، دون کی لینے پر آئے تو بولے، خبردار جو کوئی میرے قریب پھٹکا، اپنے خفیہ اور بے پناہ حربہ کا وہ ہاتھ دوں گا کہ بھاگتے راہ نہ ملے گی۔ ادھر حریف کے ڈائرکٹر آف سائنٹفک ریسرچ نے گرج کر جواب دیا کہ مردود اس بھول میں نہ رہنا، یہ میرے محکمہ کے آٹھ سو سورما، نو ٹولیوں میں تقسیم، اپنا رات دن، کس دن کے لیے ایک کیے ہوئے ہیں[1]؟ عین وقت پر وہ شگوفہ چھوڑوں گا کہ دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی۔

شیخؔ صاحب۔ تو یہ کہیے۔ ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!

ہاں صاحب پڑھے جنون کو اتارنا کوئی دل لگی ہے!

مرزاؔ صاحب! میرے خیال میں تو گفتگو کو بہت طول ہو چکا۔ اب مجلس برخاست نہ ہو، ہمارے میر صاحب بھی کچھ پریشان ہو چلے ہیں۔

میرؔ صاحب۔ نہیں پریشانی کاہے کی، البتہ رہ رہ کر حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ ساری دنیا سے عنقا خیالات ہمارے شیخ صاحب ہی کے کیوں ہیں؟

مرزاؔ صاحب۔ تو آپ کے خیال میں یہ بھی کوئی جرم ہے؟

شیخؔ صاحب۔ اور جرم ہو بھی تو تنہا بندہ مجرم ہے کب، رسکن اور کارپنٹر اور ٹالسٹائے اور خدا جانے کتنے یورپ

---

[1] پہلے فقرہ میں اشارہ روس کی طرف تھا اور دوسرے فقرہ میں برطانیہ کی جانب۔

ہی ہیں میرے ساتھ ہیں باقی رہا ہندستان تو کم از کم گاندھی جی کے انڈین ہوم رُول کے اُردو ترجمہ ہی دیکھ لیے جائیں!

مرزا صاحب۔ لیکن میرے نزدیک تو کچھ زیادتی آپ کی بھی ہے شیخ صاحب،

شیخ صاحب۔ وہ کیا۔ کھُل کر کہیے نا؟

مرزا صاحب۔ زیادتی یہی ہے کہ سائنس کو ایک سرے سے بُرا کہا جائے۔ اور مطلب تو غالباً آپ کا بھی یہ نہیں، سائنس کو دراصل جس چیز نے اتنا بدنام کر رکھا ہے اس کا غلط اور بیجا استعمال ہے، نہ کہ سائنس بجائے خود۔ سائنس تو بس ایک قوت ہے۔ جیسے آگ یا کسی پہلوان کا جسم۔ اب اگر پہلوان اتنی طاقت کو زور وظلم میں صرف کرنے لگے تو یہ خطا پہلوانی کی نہیں، پہلوان کی ہوئی۔ آگ کو قابو میں رکھیے تو جو چاہیے خدمت لے ڈالیے۔ اور وہی آگ بے قابو ہو گئی تو خود آپ کو جلا ڈالے گی۔ یہی حال سائنس کا ہے۔ انسانیت کو اس پر حاکم رکھیے تو نعمت ہی نعمت اور جو کہیں اس کو انسانیت پر حاکم بنا دیا تو لعنت ہی لعنت۔

شیخ صاحب۔ اے زندہ باد۔ کیا خوب فیصلہ کر دیا۔ میں تو خود اسی نتیجہ کی طرف لا رہا تھا۔ ہمارے ہاں کے حقیقت شناس تو صدیوں پیشتر یہی فیصلہ کر گئے ہیں ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　　علم را بر دل زنی یارے بود۔

علم کو کہیں آپ نے نفس کے تابع کر دیا تو سانپ اور اژدہا بن کر رہے گا۔ اور اگر عقل سلیم کے تابع رکھا تو اس سے بڑھ کر رفیق اور کون ہے؟ ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی ست　　　آب اندر زیر کشتی پشتی ست

پانی اگر کشتی کو اُٹھائے ہوئے ہے تو رحمت ہی رحمت اور کہیں پانی کشتی کے اندر آگیا تو ہلاکت ہی ہلاکت۔ بس قیامت!

مرزا صاحب۔ سبحان اللہ! ایسے عارفوں کے کلام کا کیا کہنا۔ اچھا تو اجازت ہے نا؟

میر صاحب۔ آداب عرض ہے۔

شیخ صاحب۔ خدا حافظ۔

---

(۳) مولانا محمد علی[1]

نومبر ۱۹۲۶ء کا مہینہ ہے اور شروع کی کوئی تاریخ۔ ایک خوشگوار شام کو بمبئی، لکھنؤ میل کانپور سے چھوٹنے کے قریب تھا کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے موٹر پر بھاگم بھاگ اسٹیشن پہونچتے ہیں اور جھٹ ٹکٹ لے لوا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیروں کی مدد سے پھینک پھانک سکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں داخل ہو گئے۔ دو انگریز بمبئی کے پہلے سے چلے آرہے تھے۔ دونوں نوارد کھدر پوش عبا پوش۔ ایک وجیہہ، خوش قطع دوسرا کریہ منظر و بد قوارہ۔ دونوں داڑھی باز۔ ان نوواردوں کو دیکھ کر انگریز کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ خوش قطع نوارد اسی برتھ پر بیٹھ گیا جس پر دونوں صاحب بہادر جمے ہوئے تھے۔ دوسرے نے متقابل کی نشست اختیار کی۔ گاڑی چلی۔ گنگا کا پل بات کہتے آگیا۔ ایک صاحب بہادر دونوں کی طرف دیکھ چھیڑ کی مسکراہٹ سے ہنسے اور منہ بنا کر بولے (This is mother Ganga) یہی گنگا مائی ہے) طنز اور زور (MOTHER) پر تھا۔ پاس کے کھدر پوش نے معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا انگریزی زبان اور انگریزی کے لہجہ میں جواب دیا "اچھا! آپ یہ ماں اور موسی کا رشتہ لیتے ہیں! میں تو جانتا تھا کہ دریا، دریا ہے اور بس" صاحب یہ تڑاق سا جواب پاکر سناٹے میں آگئے۔

برجستہ جواب دینے والا تھا محمد علی۔ اور اُس کا ساتھی یا تابع مہمل "آپ کا یہ خادم"۔

---

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۱۸ مارچ ۱۹۴۰ء کو۔ وقت ۱۵ منٹ (بہ سلسلہ "کیا خوب آدمی تھا")

صاحب کو یہ گمان نہ تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ انگریزی میں جواب دے سکے، اور وہ بھی شستہ اور برجستہ! چُپ سادھ کر رہ گئے اور اس کے بعد اِدھر سے منہ پھیر گفتگو اپنے پرانے رفیق سفر سے شروع کی۔ لندن سے کرکیٹ کی مشہور و معروف ٹیم "ایم سی سی" نئی نئی شاید پہلی بار ہندستان آئی ہوئی تھی۔ موضوع گفتگو یہی ٹیم تھی، اور اس کے کھیل اور مختلف میچ۔ محمد علی تھوڑی دیر تو چُپ سُنتے رہے۔ اس کے بعد نہ رہا گیا۔ بولے "دخل در معقولات معاف۔ کھلاڑیوں پر آپ جو رائے زنی کر رہے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی" اور لگے اس کی تفصیل بیان کرنے۔ اور صاحب تھے کہ بھوچکے بنے، ایک ملّا نما انسان کی زبان سے یہ ماہرانہ معلومات سُن رہے تھے! محمد علی اب نفس کرکیٹ پر آ گئے اور لگے انگلستانی کرکیٹ کی تاریخ بیان کرنے۔ لندن میں اور آکسفورڈ میں فلاں سنہ میں بولنگ کے یہ طریقے رائج تھے۔ گیند کی ٹپ یوں پڑتی تھی۔ بیٹنگ یوں کی جاتی تھی۔ فلاں زمانہ میں یہ تبدیلیاں ہوئیں، ہندستان اور انگلستان دونوں کی زمینوں میں یہ فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔ بولنے والا اب گفتگو نہیں کر رہا تھا، گویا کرکیٹ پر کسی انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل سُنا رہا تھا! آخر میں صاحب بولے "آپ کو بڑے معلومات کرکیٹ کے متعلق ہے" محمد علی نے کہا "مجھی کو نہیں ہر علیگڈھی کو ایسے ہی معلومات ہوتے ہیں"، وہ بولا "کیا آپ علیگڈھ میں کپتان رہ چکے ہیں؟" یہ بولے "نہیں میں تو نہیں، میرے بڑے بھائی (Big brother) البتہ تھے" شوکت صاحب کے لیے یہ (Big brother) کا لقب محمد علی ہی نے اپنے کانگریس کے خطبۂ صدارت کے وقت سے چلا دیا تھا۔ وہ انگریز اس پر بے ساختہ بولا "(you talk like Md. Ali) یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں" یہ فوراً بولے " I am Md. Ali (زبان کیسی) میں خود ہی محمد علی ہوں" صاحب بہادر کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے، "Really one of the two Ali Brothers" ارے! وہی محمد علی جو علی برادران میں سے ہیں) انھوں نے چمک کر جواب دیا "Yes, the younger and more sharp-tongued of the two." جی ہاں عمر میں چھوٹا زبان درازی میں بڑھا ہوا!) صاحب کو اپنی حیرت کے رفع کرنے میں ابھی دیر سکنڈوں کی نہیں، منٹوں کی لگی۔ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ پہلو بدل رہے تھے اور نظر محمد علی کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھی۔

محمد علی نے اب ہنسنا اور لطف لینا شروع کیا، بولے گھبرائیے نہیں کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ علی برادران جس انگریز کو دیکھ پاتے ہیں اس پر جست کر بیٹھتے ہیں، دیکھ لیجیے نا میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں، حملہ کا خیال

ہی دل میں نہ لائیے۔" بمبئی کا مشہور انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا اُس وقت انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور علی برادران کا شدید مخالف تھا۔ صاحب نے اس کا تازہ پرچہ آگے بڑھایا۔ محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں۔ البتہ اس کے ایڈیٹر پر خوب فقرے کسے[1]۔ داستان خاصی طویل ہو گئی۔ اور ایک ہی قصہ کو کہاں تک سنے جائیے گا۔

ایک بار ۱۹۲۰ء میں محمد علی بہ حیثیت صدر وفد خلافت انگلستان میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ وقت کُل پانچ منٹ کا ملا۔ انھوں نے تمہید یوں اٹھائی کہ میں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے تیس کروڑ آبادی کی نمائندگی کرنے آیا ہوں؟ آپ خود ہی حساب لگا لیجیے، کہ فی گھنٹہ نہیں، فی سکنڈ بھی نہیں، ہر سکنڈ کی کسر میں میں کتنوں کے خیالات و جذبات آپ تک پہونچاؤں گا۔" آوازیں آنے لگیں آپ کہے جائیے کہے جائیے اور پانچ منٹ کے بعد پانچ ہی پانچ منٹ بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہو گئے!

اسی سفر لندن کا ایک اور منظر۔ مولانا مخالفین کے مجمع میں تقریر کر رہے ہیں کہ صلح کے وقت ہم استنبول کس طرح چھوڑ سکتے ہیں، تھریس اور سمرنا تو پھر غنیمت ہیں۔ لیکن استنبول سے تو ہماری تاریخ وابستہ ہے ......" یہیں تک پہونچے تھے کہ ایک گوشہ سے آواز آئی "یعنی یعنی؟ استنبول آخر کب سے آپ کے قبضہ میں ہے؟ جواب میں دیر کیا تھی، کھٹ سے ارشاد ہوا کہ "کوئی فاضل تاریخ مجھ سے سند دریافت کر رہے ہیں۔ اس وقت تو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے پاس ہندستان ہے اس کے تگنے زمانہ سے ہمارے پاس استنبول ہے! جلسہ لوٹ لوٹ گیا اور فاضل تاریخ کی آنکھ پھر اونچی نہ ہوئی۔

ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔ محمد علی خود بھی شاعر تھے۔ اور شاعری کی دنیا میں نام تھا۔ جوہر۔ سب سے بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تخلص تجویز کرتا ہوں اسی وزن اور قافیہ میں "شوہر"

---

[1] اس وقت کے چیف ایڈیٹر کا نام اتفاق سے Shappard تھا اور جس کا املا اور تلفظ دوسرے لفظ Shippard سے ملتا ہوا تھا۔ جس کے معنی گلہ بان یا گڈریے کے ہیں۔ محمد علی نے کہا "میں اس کے اخبار کو کیا پڑھوں گا۔ خود اس کو پڑھ چکا ہوں۔ میرے زمانہ میں آکسفرڈ میں تھا۔ جب بھی اُسے کچھ نہیں آتا تھا اور اب بھی کچھ نہیں آتا۔ اس کے بعد فرمایا " بھیڑیں تو بغیر گلہ بان کے بہت سی دیکھنے میں آئی ہیں لیکن اب گلہ بان ایسا دیکھنے میں آیا جس کے گلہ میں کوئی بھیڑ نہ ہو۔

There are many a sheep without a shippard, but he is a shippard with out a sheep.

شیفتہ کی مشہور غزل نادانیوں میں ہم، پشیمانیوں میں ہم پر غزل کہنے بیٹھے تو مطلع فرماتے ہیں ؎

کیوں شہر چھوڑ جا رہے دہقانیوں میں ہم — مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

علیگڑھ کے ایک مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔ اس کے ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال — پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

خود بیجاپور جیل میں قید تھے۔ لحیم و شحیم بڑے بھائی راجکوٹ جیل میں پڑے پڑے دُبلے ہو گئے تھے۔ ان کی زبان سے ادا کیا ہے ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں — پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی نوجوان ہی تھے کہ علیگڑھ کالج میں طالب علموں نے زبردست اسٹرائک کی عین اسی زمانے میں سرسیّد کی برسی کا دن آیا۔ اور اسی دن اولڈ بوائز نے بھی اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عریضہ سرسیّد کی روح کی خدمت میں اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو — ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقاید دعا و قبول و دعا کے بارہ میں ملحوظ خاطر رہیں۔

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو! — وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اب آنکھیں علیگڈھ میں — اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک زمانہ تھا کہ ہندستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا ؎

بولی امّاں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ سب جیل کے باہر تھا۔ جیل کے اندر خود محمد علی کیا کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؓ کو — خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا — سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ تھی۔ آپ بیتی کا ایک ٹکڑا تھا۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ ایک سے ایک بڑھکر چہیتی اور لاڈلی۔ ۱۹۲۳ء میں ابھی جیل ہی میں تھے۔ کہ منجھلی لڑکی آمنہ بی پالی پوسی، جوان، شادی شدہ، دق میں مبتلا ہوگئیں اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور و مقید چاہنے والے باپ پر کیا گزری ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنے نازوں کی پالی نور نظر کے واسطے کیا کیا بلبلایا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا۔ کچھ زور نہ چلا تو عالم خیال میں بیٹی سے کہنے لگے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے ہی کو یوں تسکین بھی دینے لگے ؎

امتحان سخت سہی پر دلِ مومن ہے وہ کیا
جو ہر اک حال میں اُمید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا
اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نور نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے، قرآن میں کیا
تخرج الحیّ من المیت مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے کہ سرنوشت کا نوشتہ ٹلتا نہیں، سمجھتے تھے کہ تقدیر الٰہی کیا فیصلہ کر چکی ہے، کہتے ہیں اور کلیجہ تھام کر کہتے ہیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

محمد علی کو قوم و ملت کے پیشوا، ملک کے سردار کی حیثیت سے لاکھوں نے جانا، کروڑوں نے پہچانا، ان سب سے زیادہ خوش نصیب وہ تھے جنھوں نے محمد علی کو قریب سے بحیثیت دوست کے عزیز کے۔ انسان کے دیکھا۔ کیا بیان کیا جائے، کیسی نعمت انھیں ہاتھ آگئی تھی، ایک صداقت مجسم۔ ایک پیکرِ اخلاص۔ جرأت، دیانت، ہمت بے خوفی کا مجسمہ، پاس والے جتنا قریب سے دیکھتے گئے۔ حضرت جوہر کے جوہر اور زیادہ کھلتے گئے، نکھرتے گئے۔ مشہور تمام تر ایک بے باک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تھے، لیکن ان کے لغت میں ڈپلومیسی کا لفظ ہی نہ تھا۔ ظاہر و باطن یکساں، جو خیال جس کے متعلق دماغ میں آگیا، زبان سے ادا کر دیا۔ جو بات دل میں آئی، منبر پر آئے بغیر نہ رہی۔ کہتے ہیں کہ اہل سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ محمد علی اسی معنی میں

اہل سیاست قطعًا نہ تھے، ایک بار نہ تھے، ہزار بار نہ تھے، محبت کے پتلے تھے۔ مہر و الفت کے بندے تھے۔ بیوی بچوں کے عاشق زار، دوستوں، رفیقوں، ساتھیوں پر سو جان سے نثار اور دُور کا واسطہ رکھنے والوں کے مونس و غمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے، میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ مسلمانوں کے اور عالم اسلامی کے ساتھ شیفتگی کی یہ کیفیت کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن یہاں ہندستان میں بیٹھے محمد علی محسوس کریں۔ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" یہ مصرعہ بار بار سننے میں آیا تھا اور دل ہمیشہ اسے نری شاعری سمجھا۔ محمد علی کی زندگی نے سمجھا دیا کہ شاعری کبھی حقیقت مجسم بن جاتی ہے۔ لوگوں کو مہمان بنانے۔ کھانا کھلانے۔ خاطریں کرنے کے حریص تھے۔ ایک نہیں، دو جوان پیاری سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اٹھایا، قبر میں سلا دیا۔ دل ان ذاتی صدموں کی تاب کہاں لاتا۔ قومی صدمے ان سے بڑھ چڑھ کر۔ جیسے اس کے بعد چھ سات سال اور زندگی کا ثبوت بہت سے زندوں سے بڑھ کر دیتے رہے۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ ہنستے ہیں۔ بولتے ہیں گرجتے ہیں، لیکن اندر ہی اندر جلتے گئے، پھکتے گئے، پگھلتے گئے۔ مذہب کے دیوانے تھے، پروردگار سے ایسا عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جب اس مضمون کی آیتیں آتیں کہ منافقوں کو دیکھو تو بجائے اللہ کے یہ اللہ کے بندوں سے ڈرتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بار بار ان آیتوں کی تکرار کرتے۔ ان الحکم الا للہ تو گویا تکیہ کلام تھا۔

۴ اور ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کی درمیانی شب میں جو مسلمانوں کے یہاں پندرہویں شعبان کی متبرک رات تھی۔ جب روئے زمین کے مسلمان بڑے ذوق و شوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا اور عقبیٰ کی، دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے ان سے یہ نعمت واپس طلب کر لی۔ شاید اس لیے کہ محمد علی کے اہل وطن، اہل ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان لندن میں جان آفریں کے سپرد کی اور آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سر زمین مقدس میں قبلۂ اوّل کے قریب جامع عمرؓ سے متصل۔ اقبال کو الہام ہوا۔ ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

ماتم و شیون کی صدائیں ہندستان بھر میں اور سارے عالم اسلام میں اس زور شور سے اٹھیں اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

"ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لیے ہے" انھیں کا مصرع ہے اور یہ بھی تو خود فرما گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر   یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

امیر خسروؒ[1]

بزرگ اور درویش کی حیثیت سے

خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سُنا ہوگا۔ کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی پوچھے! کتاب کی کتاب ازبر تھی، زیادہ نہیں، پشت ہی دو پشت اُدھر کی بات ہے کہ کتاب مکتبوں میں چلی ہوئی تھی، گھروں میں پھیلی ہوئی تھی، زبانوں پر چڑھی ہوئی تھی، گویا اپنے زمانہ تصنیف سے صدیوں بعد تک مقبول و زندہ، مشہور و تابندہ۔

دست قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھدی تھی، جس کے کلام کو حُسن قبول کی یہ دولت دیدی تھی، اُسی کا نام تھا امیر خسرو، امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار۔ شعروادب کے دیوان اس کی ادبی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجّادے اس کے مرتبۂ روحانی سے آگاہ۔ بزم شاعرو آجائیے تو میر محفل اسے پایئے۔ خاندانِ چشت اہل بہشت کے کوچہ میں آنکلے تو حلقۂ ذکر و فکر میں سر مسند جلوہ اس کا دیکھیے۔ اچھے اچھے شیخ دم اُس کا بھر رہے ہیں معرفت و طریقت کے خرقہ پوش، کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں!

والدین نے نام ابوالحسن رکھا۔ شہرتِ عام کے نقیب نے امیر خسرو کہکر پکارا۔ سال ولادت ہجری کا چھ سو اکاون (۶۵۱) اور عیسوی کا بارہ سو ترپن (۱۲۵۳)۔ ترکستان کے علاقۂ بلخ میں کوئی بستی ہزارہ کہلاتی تھی، یہ گوہر اُسی کان سے

---

[1] لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۸ر نومبر ۱۹۴۰ء کو وقت ۱۰ منٹ۔

نکلا۔ ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے نام سے موسوم تھا، یہ جوہر اسی خاندان سے چمکا، والد بزرگوار کا نام تھا، امیر شمس الدین محمود شمسی۔ چنگیز خاں کے زمانے میں ترک وطن کر کے ہندستان پہونچے یہاں ایک مقام پٹیالی عرف مومن آباد تھا۔ وہاں آ بسے، پرانے تذکرہ نویسوں نے ڈھنڈلی سی نشان دہی کی ہے کہ شہر کہیں نواح سنبھل یا مضافات دہلی میں تھا۔ نئے جغرافیہ نے نقشہ پر رکھ کر دکھا دیا کہ ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے۔ شادی یہیں ہوئی۔ بستی کے نامور اور درویش منش رئیس اور سلطنت کے منصب دار نواب عماد الملک کی صاحبزادی کے ساتھ۔ یہاں امیر کی پیدائش بھی ہوئی۔

تاریخ خوش اعتقادی کی زبان سے روایت یہ بیان کرتی ہے کہ پڑوس میں کوئی مجذوب رہتے تھے۔ صاحب کشف، لوگ خرقہ میں لپیٹ کر بچہ کو اُن کی خدمت میں لائے، دیکھتے ہی بولے، یہ کس کو لے کر آئے۔ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر رہے گا ——— مجذوب صاحب کی نگاہ کشفی شاعری کی حد تک رہی۔ بچہ نے بڑے ہو کر فقر و درویشی میں وہ کمال حاصل کیا کہ خود شاعری منھ دیکھتی رہ گئی!

تعلق عمر بھر کہنا چاہیے کہ سرکار دربار سے رہا۔ کبھی براہ راست شاہی دربار سے اور کبھی اُمرائے نامدار سے اور سرکاریں بھی دو ایک نہیں، خلجی اور تغلق ملا کر سات سات بادشاہوں کی دیکھ ڈالیں، پھر شخصی سلطنتوں کی نیرنگیاں، انقلابات کے طوفان قیامت خیز۔ دیس میں بھی رہے، پردیس بھی گئے، بنگال بھی گھومے، اودھ کی بھی سیر کی۔ لیکن دل جہاں اٹکا تھا وہیں اٹکا رہا۔ نظر جس رُخ پر ایک بار پڑی تھی اُسی پر جمی رہی۔ ابھی آٹھ برس کے تھے کہ عقیدتمند باپ نے لا کر سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدینؒ کے قدموں پر ڈال دیا۔ سن رشد کو پہونچے تو بیعت کی تجدید کی۔ بیعت رسمی نہ تھی، ایک نسبت عشقی تھی کہ دونوں طرف سے قائم ہو گئی تھی، خواجہ کا مرتبہ دیار محبت و معرفت میں اس سے ظاہر ہے کہ اولیاء کرام نے، مقبولین انام نے، بقاء دوام کے دربار میں محبوب الٰہی کہہ کر پکارا۔ امیر کو دولت ملی محبت کی بھی محبوبیت کی بھی۔ تذکروں کی روایت ہے کہ جس روز تجدید بیعت کی ہے، سارا ساز و سامان کھڑے کھڑے لٹا دیا ——— جو دل نثار کر چکا ہو، اُسے دولت لٹا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے؟

کہتے ہیں کہ آج سے پہلے، بہت پہلے، کوئی چھ سات سو برس پہلے، باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر دہلی جاتے ہیں، ایک سرا میں آ کر اترے۔ کنیزیں، خدام، زر و جواہر، بیش قیمت مال و اسباب، سب ہی کچھ ساتھ۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں ایک دوسرا مسافر، مفلس و مفلوک الحال دہلی سے واپس ہوتے اسی سرا میں ٹھہرا لیکن

کو بوے اُنس محسوس ہوئی، بڑھ کر پوچھا کدھر سے آنا ہوا؟ جواب ملا دہلی سے! پوچھنے والے کا اشتیاق دہلی کا نام سُن تیز ہوا۔ پوچھا اس شہر میں ایک درویش خواجہ نظام الدین ہیں، وہاں بھی حاضری کا اتفاق ہوا تھا؟ مفلس بولا "اتفاق کیسا، انھیں کے پاس تو گیا تھا، حاجت مند ہوں، چاہتا تھا کچھ مل جائے میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہ تھا۔ پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں پڑی تھیں، وہی میرے حوالہ کردیں، اُنھیں کو لیے چلا آرہا ہوں"۔ سننے والا اب شوق واشتیاق سے بیخود تھا۔ بولا خدا کے لیے، وہ جوتیاں میرے حوالہ کردو، اور یہ میرا ساز وسامان سب تمہاری نذر ہے! ادھر رئیس صاحب اپنے ہوش میں تھے کب، اور ہنسی، دل لگی کی سکت ہی اُن میں کہاں تھی؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار یا پانچ لاکھ میں پڑا، اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اُتری جوتیاں آنکھوں سے لگا کر، سر پر رکھ کر پگڑی کے اندر لپیٹ لیں، اور ایک وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے ——— جوتیاں جن محبوب کی تھیں، وہ تو وہی ہیں جنھیں زبان خلق محبوب الٰہیؒ کے نام سے پکارتی ہے اور امیر وہی امیر خسروؒ تھے، جن کا یہ فارسی شعر اُس وقت سے اب تک خدا معلوم کتنے دلوں کو حال وقال کی کتنی محفلوں کو گرما چکا ہے ؎

متاعِ وصلِ جانانِ بس گران ست

گر ایں سودا بجان بودے چہ بودے

یہ رقم تو خیر لاکھوں ہی کی تھی، شاعر تو یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب تک رسائی اگر نقد جاں کے معاوضہ میں ہو جائے تو بھی یہ سودا نہایت ارزاں ہے!

آگے چلیے، دنیا کی عمر چند سال اور ڈھلی۔ خلجی و تغلق کی بہار رُخصت ہو چکی۔ دہلی کے تخت پر اب آلِ تیمور کا اقبال چمک رہا ہے۔ سخن سنج وسخن گستر بادشاہ کے حضور میں محفلِ سماع گرم ہے۔ قوال جب اس شعر پر پہونچا ؎

تو شبانہ می نمائی، بہ برِ کہ بودی امشب

کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ کا ذہن قدرۃً شعر کے ظاہری مفہوم کی طرف گیا۔ اور قریب تھا کہ شاعر کی بے حیائی کا خمیازہ قوال غریب کو عتاب سلطانی کی شکل میں اٹھانا پڑے، کہ ایک مزاج داں ادب شناس مصاحب نے جھٹ ہاتھ باندھ عرض کی کہ "پیر ومرشدا غزل خسرو کی ہے، تصویر کھینچ رہے ہیں، اپنے تہجد گزار، شب بیدار، محبوب محبوب الٰہی کی کہ ساری رات کن کن اذکار کن کن اشغال میں گزری، کون کون سے احوال ومقامات طے کیے رات بھر جاگنے کا اثر اس وقت

اس وقت تک باقی ہے!"

معاً عتاب لطف میں اور ناگواری داد میں تبدیل ہو کر رہی۔

وقت کی محدود گنجائش کی رعایت سے صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا، ورنہ غزلوں کی غزلیں نہیں دیوان کے دیوان لبریز ہیں انھیں مقامات واحوال کی تلمیح سے، رموز واسرار عارفانہ کی توضیح سے۔ ہندی کے دوہے اور ٹھمریاں ایک دو کی تعداد میں نہیں، پچاسوں اور سیکڑوں سب میں یہی نقشہ جما ہوا، یہی رنگ بھرا ہوا۔ تذکرہ نویسوں کی روایت ہے کہ مرشد خود فرمایا کرتے تھے کہ "خدا قیامت میں پوچھے گا، کیا لائے ہو؟ جواب میں عرض کروں گا کہ خسرو کو"۔ گریہ و مناجات میں ہوتے ہیں عرض کرتے کہ الٰہی میری مغفرت اسی ترک کے سوزِ دل کے طفیل کر دے! ـــــــ مرشد کا وسیلہ پکڑتے ہوئے سب نے دیکھا ہے، مرید کے وسیلہ بننے کی مثال امیر خسرو کے نصیب میں آئی!

سوزِ دل اور ذوق عبادت کا عالم یہ تھا کہ پچھلی رات نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو کہنے والوں کا بیان ہے کہ سات سات پارے قرآن مجید کے پڑھ جاتے! دل جب تک ایسا درد وخشیت سے لبریز نہ ہو، اتنا بڑا مجاہدہ کس کے بس کی بات ہے؟ اودھ میں ایک بڑے رئیس کے دربار میں تھے، ماں نے دلّی میں یاد کیا، معقول مشاہرہ پر لات مار ماں کے پاس پہونچے۔

ماں کی وفات پر، پر درد مرثیہ لکھا، بقول مولانا شبلی، اڑتالیس سال کی عمر میں ماں کی یاد میں اس طرح آنسو بہاتے ہیں کہ گویا کوئی کمسن بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ یہ سب پرتو ہے اُسی سوز وگداز کا جس کا واسطہ دلا دلا کر خود مرشد علیہ الرحمۃ اپنی نجات کے طالب رہتے تھے۔

۷۲۵ھ کا ماہ ربیع الثانی تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ جنت کو سدھارے۔ امیر اس وقت بنگال میں تھے، خبر وحشت اثر سنی تو بھاگا بھاگ دلّی پہونچے، مزار پر حاضر ہوئے تو ماتمی اہل ارادت کی روائت ہے کہ ہندی کا شعر اُسی وقت پڑھا ؎

گوری سوئے سیج پر، منھ پر ڈالے کیس

چل خسرو گھر آپنے، سانجھ بھئی چو دیس

ماتمی لباس پہن لیا۔ سب کچھ لٹا دیا۔ خالی ہاتھ ہو بیٹھے۔ غم کی آگ میں جلتے، ہجر کی بھٹّی میں تڑپتے، خود اپنے وقت کا انتظار کرنے لگے، ادھر چھ مہینے کی مدّت پوری ہوئی کہ اُدھر ۱۸ شوال ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء کی

کو خود بھی اپنے محبوب سے جا ملے ــــــ حضرت فاطمہ زہراؓ بھی مرشد کائنات کا غم اس سے زیادہ مدت تک برداشت نہ کر سکی تھیں ۔ تجویز یہ پیش ہوئی کہ دفن مرشد ہی کی تربت میں کیے جائیں۔ احترام شریعت غالب آیا، پائینتی کی جانب چند گز ہٹ کر قبر بنی۔ اہل دل اپنا تجربہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آستانہ سلطان المشائخ سے پہلے اگر اس کشتۂ عشق و محبت اور مجسمہ سوز و گداز کے مرقد پر فاتحہ خوانی کر لی جائے تو دل کی انگیٹھی کی چنگاریاں کچھ اور تیز و روشن ہو جاتی ہیں!

---

(۵) محمد علی کے خطوط[1]

نوجوانی سے لے کر اپنے قبل از وقت بڑھاپے تک محمد علیؒ یورپ "سمندر پار" چھ بار گئے۔ اور خط ہر دفعہ وہاں سے بہت سے لکھے، لیکن شروع میں ان خطوں کو کون محفوظ رکھتا؟ اس وقت کسے خبر تھی کہ گود وں کا کھلایا ہوا لڑکا، ساتھ کا کھیلا ہوا نوجوان ایک روز شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا؟ آخر کے خطوط بے شک بہت سے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس، لیکن وہ زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز انھیں کوئی ریڈیو پر کیسے لائے۔ ہر خاص و عام کو کیسے سنائے؟ اس ذخیرہ کے علاوہ بھی جتنے ہیں، اتنے زائد ہیں کہ کوئی انھیں پھیلانے پر آئے تو آج کا سارا پروگرام اسی ایک عنوان کی نذر ہو جائے۔ داستان گو تھک جائے اور داستان ختم نہ ہو پائے۔

محمد علی "مولانا" تو بہت بعد کو ہوئے، شروع میں مدتوں "مسٹر" رہے۔ مسٹر ہی کہلائے۔ پہلا سفر ۱۸۹۸ء میں کیا، جب پرانی صدی کے ختم ہونے کے دو سال رہ گئے تھے۔ سن اس وقت بیس[2] سال کا تھا، دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں کیا، جب نئی صدی کو شروع ہوئے بھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ سن اس وقت ۲۴ سال کا۔ دونوں سفر طالب علمی ہی کے سلسلہ میں تھے، زیادہ تر آکسفرڈ اور لندن میں مشغلے

---

[1] دہلی ریڈیو اسٹیشن سے (بہ سلسلہ "مشاہیر کے خطوط سمندر پار سے") اپریل ۱۹۴۱ء میں وقت ۱۵ منٹ۔

سی سن و سال کے لائق اور مراسلے اِنھیں مشغلوں کے مناسبِ حال۔ انگریزی میں لکھے ہوئے بڑے بڑے طویل مراسلے علی گڑھ منتھلی میں (Oxford Idling) کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ ذکر ان میں زیادہ تر ہوتا کالج کے کھیل کود کا، ہم جولیوں کی رنگ رلیوں کا، اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا۔ اس دور سے یقیناً آپ کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔

تیسری بار انگلستان جانا ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ اب محمد علی ملک کے ممتاز جرنلسٹ اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز تھے۔ کامریڈ عرصہ سے نکل رہا تھا۔ اور اب ہمدرد بھی نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ کانپور میں ایک نئی نکلنے والی سڑک کی زد میں ایک مسجد کا گوشہ آ رہا تھا، اس پر قدرتاً ایک سخت ہیجان برپا ہو گیا تھا اور معاملہ شہر، بلکہ صوبہ کے حدود سے نکل کر "آل انڈیا" بن چکا تھا۔ محمد علی مسلم لیگ کے سکریٹری کو ساتھ لے، چپ چپاتے لندن روانہ ہو گئے کہ وہاں جا کر اس معاملہ اور ایک یہی کیا، ملک کے بہت سے معاملات پر انگلستان کے بڑے لوگوں سے ملیں، ملائیں، دلوں کو گرمائیں، طبیعتوں کو نرمائیں، تقریر سے، تحریر سے، قلم سے، زبان سے، غرض وہاں پہونچ کر ہندستان خط بہت سے لکھے، عموماً انگریزی میں، اکثر کامریڈ میں چھپ بھی گئے، انھیں پڑھ کر نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے اس وقت کے ہندستان کا، اُس وقت کے ہندی مُسلمان کا، اس وقت کے انگلستان کی شان و شوکت کا۔ ناکامیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں، "ہمت پست نہ ہوئی"۔ دعوتیں، ضیافتیں محمد علی کی بکثرت ہوئیں، لندن میں بھی اور ایڈنبرا اور نیو کاسل میں بھی، ان جلسوں اور صحبتوں میں شریک انگلستان کے بہت سے چوٹی کے مشاہیر ہوئے، مثلاً اہل قلم و اہل صحافت میں ایچ جی ویلز، جی کے چسٹرٹن، اے جی گارڈنر، سی پی اسکاٹ، جے اے اسپنڈر، ویلنٹائن ولیمس اور آئرلینڈ کے مشہور شاعر ڈبلو بی ایٹس۔ اہل سیاست میں ریمزے میکڈانلڈ، کیر ہارڈی، جان ڈکن، آبرے ہربرٹ، ڈاکٹر ورفرڈ، مسٹر نیوٹسن وغیرہم، کچھ ایسے مشاہیر بھی تھے، جو عین وقت پر خود آنے سے معذور ہو گئے اور اپنے بجائے اپنے معذرت نامے بھیج دیئے، مثلاً برنارڈ شا، مسٹر بلنٹ وغیرہم۔ محمد علی ان جلسوں سے خوب کام نکالتے، جو کچھ کہنا ہوتا، انھیں موقعوں پر کہہ ڈالتے۔ ان کے طویل مُراسلے ٹائمز میں تو بار نہ پاتے، البتہ دوسرے اخبارات میں ان کے بیانات نکلتے رہتے۔ لارڈ ہیڈلے اس زمانہ میں نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور لیڈی ایولین کوبولڈ تو ان سے قبل ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ان راستوں سے بھی محمد علی نے انگلستان کی سوسائٹی کے اندر رسوخ پیدا کر لیا، اور اپنے مشن میں کچھ ایسے ناکام نہ رہے۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں جو مراسلہ نکلا ہے، اس میں اس سفر پر گویا تبصرہ کرتے ہیں:-

"۲۷ر نومبر کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے رہے ہیں، اس لنچ کی حیثیت سیاسی اور نزاعی نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم ہندستان اور انگلستان، اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے سکیں۔ اور تاکہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزوں دونوں کو بتادیں کہ وہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب سے ایسے بے تعلق تو نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکے ہیں۔ بلکہ ہمارے عزم، اور ہمارے مقصد اور گلے شکوے خود ہماری زبان سے سن لیں۔ مشہور افسانہ نگار ایچ جی ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے، بلکہ ابھی جمعہ کو تو ان میاں بیوی نے ہمیں اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کر دیا ہے' اور وقت بھی میری خاطر سے سوا آٹھ کا رکھا ہے۔ کہ میں اس وقت تک ہندستان کی ڈاک سے فارغ ہو جاؤں" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ہندستان اور اسلام کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے خبری اور جمود دور کرنے اور انھیں بار بار چونکاتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگ ہندستان سے بار بار آتے اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں۔ میں بحیثیت مجموعی مایوس نہیں ہوں۔"

محمد علی اب ملک وملّت یعنی ہندستان اور اسلام دونوں کے سفیر تھے، اور یہ دوہرا نقطۂ نظر قائم ہو چکا تھا۔ چوتھا سفر انگلستان اور فرانس کا ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے کیا، اب ان کا شمار ملک کے مسلّم لیڈروں میں تھا اور مسلمانوں میں تو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی کہ باید وشاید۔ اب ان کی حیثیت سفیر سے زیادہ مجاہد کی تھی۔ انگلستان خصوصاً شہر لندن میں بہت سی تقریریں کیں۔ ایسکس ہال کیکسٹن ہال وغیرہ میں، اور کچھ فرانس میں بھی۔ موضوع تقریر اسلام اور ہندستان دونوں کی ترجمانی اور پرجوش ترجمانی ہی رہتا تھا۔ تقریروں اور پبلک تحریروں کے انہماک میں ہندستان خطوط لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے اور جو کچھ لکھے ہیں، ان کی اشاعت کی نوبت اور بھی کم آئی اخبار اس وقت اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، نہ اردو کا، نہ انگریزی کا،

پانچویں بار۔ بیمار اور زار ونزار ایک قدردان اور جوہر شناس ہندو رئیس کے خرچ پر آخر مئی ۱۹۲۸ء میں اپنے علاج کے لیے یورپ روانہ ہوئے، ذیابیطس کا علاج فاقوں کے ذریعہ کرتا تھا۔ اور اس طریقِ علاج کے ماہرین فرانس میں تھے۔ اس لیے قدرتاً ابھی زیادہ تر قیام فرانس ہی میں رہا۔ اور ڈاکٹروں کی شدید تاکید پر سیاسیات وغیرہ سے ایک بڑی حد تک الگ تھلگ رہنا پڑا۔ اس سفر میں راستہ سے جو مفصل خط لکھا ہے۔

قابل ملاحظہ ہے۔ اقتباس ذرا طویل ہوگا۔ لیکن اس سے ایک طرف تو اس سفر اور چوتھے سفر دونوں کے مقاصد روشنی میں آجائیں گے۔ اور دوسری طرف مولانا کا مجلسی اور معاشی نقطۂ نظر بھی کسی قدر واضح ہو جائے گا۔ خط ولایتی جہاز میسی ڈوینا سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ ۶ رجون ۱۹۲۸ء کی پڑی ہے۔ اور اب جامعہ والوں نے خطوط محمد علی کے مجموعہ میں چھاپ بھی دیا ہے مولانا فرماتے ہیں :-

"چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا۔ اور ایک آخری کوشش کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے۔ گذشتہ تجربوں کی بناء پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا۔ مگر ع

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔ اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں گے۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی۔ آج مسٹر واٹسن پولیٹیکل سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے جہاز پر ملاقات ہوئی۔ تو اُن کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ بٹلر کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا ہوں محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے۔ کہ ایک فاقہ کش ملک سے متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بصرف کثیر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے۔ ہندستانی عورتیں بھی اس جہاز پر ہندستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں۔ لیکن سوا مسز ایسی بسنٹ کے اخبار نیو انڈیا کے ایڈیٹوریل کے اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آرٹا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ مردوں میں میں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں۔ آج صبح سے تموّج میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ اور آج شب کو ساڑھے آٹھ بجے سے جب یہ خط شروع کیا گیا ہے۔ جہاز پر عورتوں اور مردوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ ڈاک پر میرے قریب ہی ایک خوش رو وجیہہ اور بلند قامت فوجی افسر لیٹے رہا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بجے سے میری دیر تک گفتگو رہی۔ جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور اُن کی عمر وغیرہ کے متعلق اُس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سُن کر اور کچھ دلچسپ پا کر اُن صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو ۲ گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے مگر پر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی۔ جس کے بعد انھوں نے شکریہ ادا کیا۔ اور داد بھی دی۔ بعد کو

معلوم ہوا کہ یہ بریگیڈیر جنرل ہیں۔"

دوسرا خط فرانس کے قیام کے بعد لندن سے ۱۹ اگست کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے طویل اقتباسات بھی نہ لطف سے خالی ہوں گے نہ فائدے سے۔ اس لیے اور بھی کہ اس میں ذکر ایک مشہور بزرگِ قوم کی وفات کا ہے۔ جس سے محمد علی سے خاصی چشمک رہ چکی تھی۔ اپنی صحت اور بدپرہیزی کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:۔

"جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کیا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا اسی وقت سیّد امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ گو کچھ عرصے سے وہ صاحب فراش تھے۔ تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے، اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جس دن امیر علی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے۔ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک نہ ہو سکا۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں قبرستان پہونچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ دوکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا چکے تھے اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں۔ اور اس شہر خموشاں کا نام بھی Necropolis ہے۔ ریل کی پٹری اس کے اندر تک آئی ہے۔ نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا ہے جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں روشیں چلنے پھرنے کے لیے بنا دی گئی ہیں۔ اس شہر خموشاں کے اندر اچھی خاصی رسٹوران بھی موجود تھی، جہاں لنچ کھایا جا سکتا ہے یہاں ایک چھوٹا سا حصّہ مسلمانوں کی قبروں کے لیے بھی ہے۔ یوں تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمیٹی نے سب کچھ کر لیا تھا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رُخ کسی قدر غلط تھا۔ لیکن الحمدللہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ اور امام صاحب نے میّت کا مُنہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہونچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے۔ جن میں لارڈ ہیڈلے اور پنجاب کے سابق لفٹننٹ گورنر سر لوئی ڈین بھی تھے۔ سر لوئی ڈین نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہکر میرا حال دریافت کیا ___ اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمدللہ کہکر اور اُن سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا۔ مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے۔ اُن سب کو میں نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون صفیہ احمد فارسی کی ہے۔"

یہ خط بھی جامعہ کی چھپی ہوئی تازہ کتاب خطوط محمد علی میں درج ہو چکا ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں بمبئی، حیدرآباد، جہلم، راندھیر اور مصر کی متعدد میتوں کی قبروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد فوجیوں کی قبروں کی ایک

طویل فہرست ہے اس سے کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ محمد علی سیاسیات کے علاوہ بھی انگلستان میں کیا کیا دیکھتے تھے اور کس نظر سے؟

"اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں۔ جو نہ کسی اور سے ہو سکتا ہے نہ کوئی کرتا ہے۔ با اثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں ٹیلیفون پر رات دن باتیں ہوا کرتی ہیں۔ خواہ ٹائمز کا فارن اڈیٹر ہو، خواہ برنارڈ شا، وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ یہاں آنے پر اصرار کیا۔ اس طرح گھنٹہ بھر گفتگو کی۔ اور مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ تو عجیب وغریب ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے آج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسپکٹیٹر کے اڈیٹر سے دو گھنٹہ باتیں ہوا کیں۔ اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اس طرح ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے ½-۱۰ سے ۱۲ بجے تک ٹیلی فون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ خود ہی اس نے ملنے کی خواہش کی۔ سوا گھنٹہ اس سے ہندستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا۔"

یہ وہ وقت تھا، جب اس محمد علی نے جواب مسٹر تھا نہ مولانا، بلکہ صرف دیوانہ راؤنڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس کے بھرے مجمع میں اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندستان کا ساحل آخری بار چھوڑتے وقت بھی تو جب ایک مخلص نے بڑھ کر پوچھا تھا کہ "آخر آپ اس حالت میں جا کس لیے رہے ہیں؟" تو دیوانے کی زبان سے پھٹ سے یہی نکلا تھا کہ "مرنے کے لیے"۔ "سچے" کی بات، اللہ نے سچ بھی کیسی کر دکھائی!

---

(۶) غالبؔ کا فلسفہ[1]

فلسفہ کا نام سُن کر گھبرائیے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے نامانوس لغات کا، ثقیل و مغلق اصطلاحات کا نام نہیں۔ فلسفہ نام ہے خود شناسی کا، اور زینہ ہے خدا شناسی کا، ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ عادات و اطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ بس یہی روزمرّہ کے مسئلے جن سے ہم کو آپ کو سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے، کبھی جان کر، اور کبھی انجان، انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے دیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہو گئے۔ پھر غالب غریب کینٹ اور ہیگل کے کنیڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں، ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں، عمق کی عادی، چھلکے پر پڑ کر پھسل جاتے والی نہیں، مغز تک پہونچ جانے کی خوگر۔ سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دلآویز نظم میں۔ کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اُٹھا لیتے، کبھی نثر کے مائکروفون کو منہ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہو گئی ورنہ تحقیق کی زبان سے تو روایت تو یہ سننے میں آئی ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے: لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا جب چاہا

---

[1] نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۶ر فروری سنہ ۴۲ء کو وقت ۱۵ منٹ۔

ہنستوں کو رُلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا لٹا دیا، مرجھائے دلوں کو کِھلا دیا! فطرتِ بشری کے رازداں ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سُروں میں الاپتے۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہی ان کی حکمت، یہی اُن کا فلسفہ، یہی ان کی شاعری کا پیام یہی اُن کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے۔ اور دماغ بیدار، شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے تھے۔ جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا، آخر تک رہا۔ جوں جوں سن بڑھتا گیا، پختگی آتی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقتی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ رندی و مستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جھامتے ہیں، لیکن اس بے ہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں ؎

قطع سفر ہستی و آرامِ فنا ہیچ　　　رفتارِ نفس بیشتر از لغزش پا ہیچ

کس بات پہ مغرور رہے اے عجز تمنا　　　سامان دعا وحشت و تاثیر دوا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی، لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدت اس نومشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا طباق سا چاند ہوتا ہے، وہ آخر پیدا ہوتا ہے اسی منحنی، کم رُو اور خیال کی طرح نازک و باریک ہلال سے، گویا کمال کی بنیاد ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے ؎

بدر ہے آئینۂ طاق ہلال　　　غافلاں نقصان سے پیدا ہے کمال

مذہب کے تشدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے، اور فریقانہ غلو سے تنگ آکر کہتے ہیں کہ سکون خاطر منظور ہے تو بس توحید سے لَو لگا لیجیے، وحدت کی خانقاہ میں کنج نشین ہو جائیے اور یک دان، یک بین، یک گو بن کر رہ جائیے ؎

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے　　　جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار ہے، اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لیے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ، صنعت و ربوبیت کی کنگھی دست قدرت میں لیے مانگ چوٹی بھی ان کی درست کیے ہوئے ہے اور اُن کی بھی اس مضمون

کو کہیں یوں ادا کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں　　بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں، یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے، موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرتِ انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں، اور باہر اُسی وقت نکلتے ہیں، جب چوٹ پڑ لیتی ہے، دل پر نہ سہی، کم از کم جسم ہی پر سہی۔ سلسلۂ موجودات میں جس کا جیسا ظرف، ویسا ہی اس کا مرتبہ ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گُناہ بیشک، بے حد و بے شمار، لیکن فطرت میں جو قدرت عصیاں میلانِ فسق، طاقتِ گُناہ رکھدی گئی ہے، وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان گُناہ کہاں تک کرے گا، جتنے بھی کرے گا، پھر بھی بہت سے چھوٹ ہی جائیں گے، کر سکتا ہوگا مگر کرے گا نہیں۔ پھر کیا جب وقت جزائے کامل کا آئے گا تو عادل حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کے لحاظ بھی نہ رکھے گا؟ اس مضمون کو کئی کئی طرح ادا کیا ہے، کہیں یوں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے، ہم نے، آپ نے سب نے دیکھا ہے۔ چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا، اور اس کی کرنوں کے ساتھ وہ ساری بنی رخصت۔ اس منظر پر کبھی کبھی نظر پڑی ہو گی۔ غالب کی نظر اس پر بھی گہری گئی۔ آفتاب کا کام تو زندگی دینا ہے، نشو و نما بخشنا ہے۔ بعض قدیم فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے لیکن ادھر کرن پھوٹی، اُدھر شبنم کا وجود بھی رخصت ہو گیا، کل نے جزو کو اپنی طرف کھینچ لیا، اپنے میں جذب کر لیا۔ ظاہر میں فنا اور واقعتہً بقا حاصل ہو گئی ــــ کہتے ہیں اور فلسفہ وحدتِ وجود کے اندر گُم ہو کر کہتے ہیں کہ یہی حال انسان کا ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اس پر توجہ کرے اُس پر تجلی رحمت کا عکس ڈالے اور اُسے اپنے اندر جذب کر لے ـــــ بندہ کا وجود یوں بھی تو مالک کے سامنے

بمنزلہ عدم کے رہتا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور پھر یہی شربت ایک دوسرے گلاس میں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستان کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو سب نے دیکھا، یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کی کرائی محنت سب دم بھر میں غارت گئی، اور جو غلّہ کا انبار تھا، وہ راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ لیکن دہقان ہی نے تو آخر دوڑ دھوپ کر کے اس آفت کا محل د مورد تیار کیا تھا، اس آگ کے لیے مسالہ فراہم کیا تھا ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالبؔ پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینیوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لے ہلکی ہے۔ دھیمے سروں میں کہتے ہیں ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے　　　بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے، اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے۔ اس کاروبارِ حیات کی مثل طلسمات نمود ہے، حقیقتہً معدوم اور صرف بظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا، برکلے کے نام کا گزرا ہے، وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر　　　کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی!

اور پھر کہتے ہیں اور فلسفہ کی خشکی میں شاعری کی رنگینی پیدا کر کے کہتے ہیں ؎

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم　　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو، حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربے نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔ جب تک انسان اس آب و گل کی دنیا میں ہے، کچھ بھی کرے، ناسوتی جھگڑے بہرحال اس کا ساتھ چھوڑنے کے نہیں، مرزا کی یہ آپ بیتی اُن کی ذاتی نہیں، نوع بشر کی آپ بیتی ہے۔ لیکن شعر کے موزوں سانچہ میں، لطیف قالب میں ادا تو اُنھیں کی زبان سے ہو رہی ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

یہی مفہوم، ردیف قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور یہ عدم ہستی نما جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے، اس کی بھی بساط کیا، اور پائداری کتنی؟ ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل!
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہدوں کو دیکھا ہوگا کہ خلق سے اپنے آپ کو گویا بالکل علیحدہ کر لیتے ہیں اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں اور باپ بھائی اور بہن، ہمسایہ اور ہم وطن کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ غالبؔ کی اصطلاح میں اس کا نام "وحشت" ہے اور ان کا فرمانا ہے کہ اس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے نہ کہ دوسرے ؎

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

حسد کا علاج اکثر حکمائے اخلاق نے لکھا ہے۔ مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے، اور اس لیے ان کے مطب میں اس کا علاج نظر کی وسعت ہے ؎

حسد سے دل ہے اگر افسردہ سرگرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مذہب اور اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں، عارفوں کے نزدیک اخلاص ہے، غالب بھی اسی مشرب کے پیرو ہیں، ان کی شریعتِ شعری کا فتویٰ ہے کہ وضعداری بجائے خود قابلِ صد قدر و مستحق ہزار داد ہے ؎

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو — وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

بعض اہلِ باطن کا قول ہے کہ حکمتِ کاملہ کو منظور ہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں حدود کو توڑ دے تو اب بندہ کا اسے جھجکنا اور رُک کے رہنا، خود ایک معصیت اور خود بینی ہے۔ یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سُنیے ؎

جب کرم رخصتِ گستاخی و بےباکی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش و موثر انداز میں ؎

کر رہا ہوں میں اُسے نامۂ اعمال میں نقل — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نامحدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے ہیں اور جو مطلق ہے، اُسے کوئی مقید، اپنی عقل و فہم کی گرفت میں کب لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے۔ غالبؔ نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے اور ذرا دیکھیے گا کس شاعرانہ بانکپن سے اُسے اپنے انداز میں دُہرایا ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

ذات کے طالب کو بھلا تجلّی صفات سے کب تسلّی ہو سکتی ہے؟ غالب صوفیوں کی بتائی ہوئی، عارفوں کی سمجھائی ہوئی اس حقیقت کو دُہراتے ہیں، اور بیان میں شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں، شاید اس لیے کہ سننے والے کہیں بھول نہ جائیں کہ غالبؔ خانقاہ کے بوریے پر نہیں، مشاعرہ کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

عبرت کا رنگ کلام میں ہمیشہ موجود تھا، سن بڑھتا گیا اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا۔ سرتاسر صحیح، مدۃ العمر کے تجربات کا نچوڑ سارے فلسفۂ حیات کا خلاصۂ روداد زندگانی کا لب لباب ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار گر تمھیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی! | مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ | یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں | نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ کیا ہے، گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے۔ اس قطعہ کا زمانہ، صاحبِ غالب نامہ کی تحقیق ہے کہ ۱۸۲۰ء ہے گویا غالب کی عمر اس وقت کل ۲۳ سال کی تھی، اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیے کہ غالب عین جوانی ہی میں بوڑھوں کے ہم سِن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط، عبرت اور رضا کے مضامین سے پٹے پڑے ہیں۔ ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کو اپنی وفات سے کوئی چھ سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں، کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، یہ جو کچھ لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے ؎

خرم آن روز کزین منزل ویران بروم"

منزل ویراں کی بربادی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین سال قبل نومبر ۱۸۶۵ء میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جسے دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا، اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں، لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ"

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں۔ نجات کا طالب، غالب"، "مرگ ناگاہ کا طالب غالب"

اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:۔

"زندہ ہوں مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار، غالب"

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا۔ زبانوں پر آج تک چڑھا ہوا ہے، اور معنی خدا معلوم کیا کیا لیے جا رہے

ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اُردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی، اور اِس غزل کا مطلع آپ نے ابھی سُن لیا ہے۔ اب مقطع بھی سُن کر فاتحۂ خیر کے لیئے ہاتھ اُٹھا دیجیے حاؔلی کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے ؎

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

---

(۷) "شکوہ" و "جواب شکوہ"[1]

جو زبان خوگر تھی حمد و ثنا، شکر و مناجات کی، وہ ایک بار گلہ و شکوہ پر کھُلی، کھُلی نہیں کھُلوائی گئی ——— آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے، تو کون بندہ ہے، جو نیاز کے فرش کو چھوڑ، ناز کی فضا میں نہ اُڑنے لگے؟

جب کرم رُخصتِ گستاخی و بیباکی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں کہ گریۂ یعقوبی کے ساتھ ساتھ ایک منزل تبسّم سلیمانی کی بھی تو آتی ہے۔

اقبال شاعر اس وقت تک شاعرِ اسلام بن چکا تھا ——— اقبال کے شکوہ میں بندہ گویا روٹھ کر کہتا ہے اپنے خالق و پروردگار سے، کہ واہ لطف و نوازش کی یہ بارشیں بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر، اور ہم اہلِ توحید کا یہ حال زار! یہی صلہ ہے ہماری وفا کیشی کا، یہی انعام ہے ہماری توحید پرستی کا؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی — اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

شکوہ صرف نام ہی کا شکوہ ہے۔ مضمون وہی، صرف لفافہ بدلا ہوا، ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی، ہر گلہ میں توحید

---

[1] نشریہ بسلسلۂ یوم اقبال، دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء وقت ۵ منٹ۔

پرستی کی شیرینی! اقبال کی شہرت وعظمت کا سنگِ بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا، خوب چمکا، خوب پھیلا۔ بعض کچھ بھی نہ سمجھے۔ بعض مطلب بالکل اُلٹا سمجھے۔ مزہ سب کو آگر رہا۔

حکیم ملّت، ملّت کا نباض تھا۔ بھانپ گیا کہ آبِ حیات، صراحیوں اور گلاسوں تک پہونچتے پہونچتے زہر کے بوند بن گیا! معًا پلٹا۔ شکوہ کے جواب میں، جواب شکوہ تیار کردیا! زور وہی، جوش وہی، چہرہ وہی، تیور وہی۔ البتہ ابکی حکمت وموعظت کی آمیزش اور زائد، حقیقتیں کھلی ہوئی، صداقتیں فاش وبرملا۔ جواب کا حاصل یہ کہ "وعدے تو مسلموں کے، اور عہد وپیمان تو، توحیدیوں کے ساتھ تھے۔ تم ہو بھی کہیں مسلم وموحد"؟ نام اور لیبل نہیں، نامۂ اعمال پیش کرو، گواہ قال کو نہیں، حال کو لاؤ۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو   پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے   تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی شکوہ میں زیادہ پاتے ہیں، اسی کو سینہ سے چمٹائے چلے آتے ہیں۔ جوابِ شکوہ کی سطح ذرا اونچی ہے۔ ایسی چیز بھلا کب مقبول وعام پسند ہو سکتی ہے؟ — شکوہ والا اقبال صاحبِ حال ہے، سالک ہے۔ جوابِ شکوہ والا اقبال صاحبِ مقام ہے، عارف ہے۔ ایک کے قدم اقلیم قلب کی وادیوں میں، دوسرے کی نگاہیں فضائے روح کی بلندیوں میں!

---

(۸) آدمی نامہ[1]

آدمی، سچ کہا جس نے کہا، خلاصۂ کائنات ہے۔ بڑھنے پر، اُٹھنے پر، سنورنے پر آئے، تو فرشتوں سے بازی لے جائے۔ اور گھٹنے پر، گرنے پر، بگڑنے پر اُترے تو شیطان بھی اس سے نیچا دیکھ جائے مذہب کی اسی بتائی ہوئی اور اخلاق کی اسی سجھائی ہوئی بات کو نظیر اکبر آبادی نے آدمی نامہ میں ادا کیا ہے، شعر کی زبان سے، شاعرانہ آن بان سے، شاعری کے ساز و سامان سے۔

نظم کچھ ایسی بڑی نہیں، مخمس کے کل سترہ ہی تو بند ہیں اور اب تو مخمس کا رواج ہی اُٹھ گیا۔ نظیر کے زمانہ میں یہ شعر و سخن کی بڑی کارآمد چیز تھی۔ ہر بند میں کئی کئی نظیریں آس پاس کی لاکر، سب کی نظیر دکھا کر بتایا ہے کہ آدمی یہ بھی ہے، وہ بھی ہے بلندی، پستی، نیرنگی کے بے شمار امکانات اس کے اندر موجود۔ کہتے ہیں ؎

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور	یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دُور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور	شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زُور

اور ہادی رہنما ہے، سو وہ بھی ہے آدمی

بات بات میں نصیحت، اور افسانہ، حکایت، کہانی کے پردے میں اخلاق کا سبق، مشرق کا پرانا

---

[1] نشریہ یوم نظیر کے سلسلہ میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۳۰ جون ۱۹۴۳ء کو وقت ۵ منٹ

دستور ہے۔ اور اردو میں نظیر کے شعر میں اس کا پورا ظہور ہے۔ زبان عام فہم، خیال پاکیزہ، نظیر کی اور بہت سی نظموں کی طرح آدمی نامہ کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ زبان بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انیسویں صدی کی ابتداء کی، ذرا پرانی اور نامانوس تو ضرور ہو گئی ہے، لیکن اس میں شاعر غریب کا کیا قصور؟ وقت کی رفتار اور اس کے لازمی اثرات کو کون روک سکا ہے؟

بہرحال آدمی نامہ لکھ کر اس مرد آدمی نے حق ادا کر دیا، اپنے آدم زاد ہونے کا اور مصوّری کر دی آدم کے پھیلے ہوئے سارے نسل و خاندان کی!

انسانی برادری کا حق، آدمیت کی تعلیم، هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ کی تفسیر اس سے بڑھ کر اردو ادب میں اور کہاں ملے گی!

---

(۹) نظیر کی دلچسپی عام چیزوں میں[1]

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں

دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

شعر ہے تو اکبر الہ آبادی کا، لیکن اپنے سے ایک صدی قبل کے پیش رو نظیر اکبر آبادی کے حال کا آئینہ۔ ان کے کلام پر بہترین تبصرہ، اور ان کی شخصیت کا صحیح ترین اسکیچ یا خاکہ۔

آگرہ کا پرانا نام اکبر آباد ہے۔ میاں نظیر، اپنے رنگ میں فرد و بے نظیر، آج سے سوا سو، ڈیڑھ سو برس پہلے باشندہ تھے اسی ملک ہندستان کے اور رہنے والے اسی شہر اکبر آباد کے۔ شاعری میں اپنی مثال آپ، اور انسان جیسے ہم آپ۔ اسی آسمان کے نیچے سوتے اور اسی زمین پر چلتے، جو کچھ خود دیکھتے اوروں کو بھی دکھاتے۔ جو کچھ خود سنتے اوروں کو سناتے ——— دکھانا، اور سنانا، کیسا؟

اس سے تو نکلتا ہے کہ شاید طبیعت پر زور دے دے کر کچھ کہتے ہوں۔ جی نہیں۔ یہ کہیے کہ قدرت کی رنگارنگی کو دیکھ کر، کبھی ہنستے اور کبھی مسکراتے، کبھی روتے اور بلکتے۔ کبھی خوش ہوتے اور کبھی غمگین۔ اور اسی عالم میں کبھی کبھی گنگنانے بھی لگتے۔ بس یہی ان کی شاعری ہے اور یہی ان کی ساحری ہے۔ وہ شعر سنانے کے لیے نہیں، بلکہ کہنے ہی کی خاطر کہتے۔ اس مقام کی شرح حضرتِ اکبر کی زبان سے سنیئے ؎

---

[1] نشریہ یوم نظیر کے سلسلہ میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۳۰ر جون ۱۹۴۴ء کو وقت ۱منٹ

نہ اِن کے لیے ہیں نہ اُن کے لیے ۔۔۔ نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لیے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیز ۔۔۔ کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے

انگریز فلسفی مل نے بھی تو کچھ ایسا ہی کہا ہے:

Rhetoric is heard. Poetry is over heard

خطابت دوسروں کے لیے ہوتی ہے اور شاعری اپنے لیے۔ وہ سُنائی جاتی ہے، اور یہ سُن لی جاتی ہے۔

وہ شاعر ہی کیا جس کی نظر صرف خاص پر ہو، عام پر نہ ہو۔ بڑی چیزوں کو تو وہ دیکھے، اور چھوٹی چیزوں کی طرف سے اپنے کو نابینا کرلے۔ سعدی نے کانٹوں ہی سے کیسے کیسے گلدستے تیار کر دیئے۔ اور مولانائے روم (صاحبِ مثنوی) گھونگھوں اور سیپیوں سے کیسے کیسے موتی برآمد کر لائے، آبدار اور تابدار! اور تو اور خود قرآن نے مکھّی اور مچھّر اور مکڑی کے نام لے کر، سبق کیسے کیسے دیئے ہیں۔ یہ تو محض عامیوں اور سطحی دماغ والوں کا عقیدہ ہے کہ نتیجہ اہم اور دور رس نکالنے کے لیے پہلے نام بھی کچھ بڑے بڑے لے لینا چاہیے، بچپن ہر شخص پر آتا ہے، اور طوفان کی تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ نظیر اپنے اس دور کو بڑھاپے میں بھی یاد رکھتے ہیں ؎

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چھوڑے ۔۔۔ ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے

بچپن کی بے فکریوں، آزادیوں، غیر ذمہ داریوں کے سماں ایک ایک کر کے اُن کی نظر میں ہیں ؎

نے دوستی کسی سے، دل میں نہ اُن کے کینا ۔۔۔ جانیں نہ بے قرینا نے سمجھیں کچھ قرینا!
نے گرمیوں سے واقف نے جانتے پسینا ۔۔۔ چھاتی سے ماں کے لپٹے خوش اُن کو دودھ پینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کس حسرت پر آ کر اس یاد کی آخری تان توڑتے ہیں ؎

کیا عمر ہے عزیزو، اور کیا یہ وقت ہے گا ۔۔۔ جب گھٹنیوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا
پاؤں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا ۔۔۔ سب زندگی کا حظ ہے ان کو نظیر آہا ہا

برسات کے چھینٹوں سے سب ہی کھیلے ہیں۔ لیکن نظیر کے آئینہ میں یہی نقش آکر مستقل تصویر کی طرح جم جاتے ہیں۔ مکانوں کے گرنے، انسانوں کے گرنے، سب کے گرنے گرانے کا نقشہ، برسات کی شدت میں کس خوبی سے کھینچا ہے ؎

جھڑیوں نے اس طرح کا دیا آ کے جھڑ لگا ۔۔۔ سُنیئے جدھر اُدھر کو دھڑا کے کی ہے صدا

کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا | کوئی کہے ہے ہائے کہو میں بتاؤں کیا
تم در کو جھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا!

کوچہ میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا | کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستہ کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا | اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ گیا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

نظیر زبان بھی وہی بولتے ہیں جو اُن کے اردگرد بولی جاتی ہے۔ تصنّع، آورد ٹھونس ٹھانس ان کے بیان میں نہیں۔ بناوٹ، تکلف، اغلاق ان کی زبان میں نہیں وہ وہی بولتے ہیں جو سنتے رہتے ہیں، وہی لکھتے ہیں جو پڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو غلطیاں ان کے زمانہ میں چلی ہوئی تھیں، وہ بے تکلف ان کی زبان پر بھی چڑھی ہوئی۔ نہ ان کا کلام کسی شرح و فرہنگ کا محتاج، نہ اُن کی زبان کے سمجھنے کے لیے لغت کی ورق گردانی کی احتیاج۔ یہ اور بات ہے کہ اب وہ زبان ہی پرانی ہو گئی۔ بہت سے لفظ متروک ہو گئے "ٹک، کیمو، بیچ (سے، کے معنی میں) کیونکہ (کیونکر، کے معنی میں) وغیرہ۔ اور بعض کے تلفظ بدل گئے۔ مثلاً "ادپر" اُس وقت 'اُپر' تھا۔ "تیئں" اُس وقت "تئیں" تھا۔ اِدھر' اُس وقت 'ایدھر' تھا۔ خواب' اُس وقت 'خاب' تھا۔

آرٹ (صنعت گری) کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ نیچر (فطرت یا طبیعت) کی بالکل ضد ہے۔ یہ تعریف اگر صحیح ہے تو نظیر قطعاً آرٹسٹ نہ تھے۔ اُن کا آرٹ تو تمام تر نیچر ہی کی نقاشی ہے، نیچر ہی کی نقالی ہے۔ اور اس معنی میں یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ نظیر اپنے زمانہ کے بہت بڑے "نیچری" تھے وہ تخیل کے نہیں، دید کے قائل تھے۔ اُن کے ہاتھ میں مصور کا قلم اور کوچی نہ تھی، پہلو میں فوٹو گرافر کا کیمرا لٹک رہا تھا!

خیال نہ گزرے کہ نظیر صرف واقعاتی شاعر تھے۔ وہ نصیحت کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ نیکی کی طرف بلانے کے فن سے خوب آگاہ تھے، کبھی آپ بیتی سنا کر، کبھی جگ بیتی کے راگ گا کر۔ ایک بڑی حد تک اُستاد سعدی کے رنگ میں۔ رنگِ قبول بھی کچھ سعدی ہی کا سا حاصل ہوا۔ سعدی کی کتابیں صدیوں تک لڑکوں کے درس میں داخل رہیں۔ نظیر کی نظمیں بھی بیسیوں برس تک فقیروں نے گائیں۔ قلندروں کے گلے سے صدائیں بن بن کر نکلیں اور کلام کا خدا معلوم کتنا حصہ اسوقت بھی لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا، اور گویا، ادب اردو کا ایک مستقل حصہ بنا ہوا ہے۔ غزل کا ایک شعر فراقیہ مضمون کا ضرور آپ نے سُنا ہو گا ؎

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ چلا ہوا شعر میاں نظیر ہی کا ہے۔

یہ بیت بھی خوب چلی ہوئی ہے ؎

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اور وہ بنجارہ نامہ والی مشہور نظم تو بیشمار لڑکوں کے درس میں شامل رہ چکی ہے۔ اور کتنوں کو اب بھی زبانی یاد ہوگی وہی جس کا مشہور مصرع ہے ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

موت اور آخرت کی یاد دلانے اور عبرت اور دنیا کی بے ثباتی کا مضمون پیدا کرنے کے نظیر بادشاہ ہیں۔ کلیات میں دو ایک نہیں بیسیوں نظمیں نام اور عنوان بدل بدل کر اسی ایک مفہوم سے متعلق ملیں گی۔ حمد الٰہی، فنا و بقا، تنبیہ غافلاں، انعام خدا، مکائد دنیا سب اسی قسم کی نظموں کے عنوان ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف قصۂ ہنس سنتے چلیے۔

آیا تھا کسی شہر سے ایک ہنس بچارا
ایک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اُس کا گزارا

رہتے تھے بہت جانور اُس پیڑ کے اوپر
اُس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

دیکھا جو طیوروں نے اُسے حُسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

بازو لگر و چرّہ و شاہیں ہوئے عاشق
شکروں نے بھی شکّر سے کیا اس کا مدارا

زاغ و زغن و طوطی و طاؤس و کبوتر
سب کرنے لگے اس کی محبت کا اشارا

جتنے غرض اُس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے
اور ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

کچھ روز کے قیام کے بعد ہنس کے کوچ کی گھڑی آگئی ع

اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

لو یارو اب ہم جائیں گے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

جانورستان بھر میں اس سے کھلبلی مچ گئی ؎

اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک کے اُڑے ہوش　　سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا!
ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمھارے ہی چلیں گے　　یہ درد تو اب ہم سے نہ جائے گا سہارا!

صبح نمودار ہوئی، اور "پر اپنا ہوا پر وہیں اُس ہنس نے مارا" ؎

سب ساتھ چلے اُس کے وہ ہمراز و ہوا خواہ　　ہر ایک نے اڑنے کے لیے پنکھ پسارا
دو کوس اُڑے تھے کہ ہوئی ماندگی غالب　　پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا!!
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ　　آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا!

اس قسم کی دلچسپ، نصیحت آمیز شاعری مشرق میں "آرٹ" کا ایک جزو سمجھی گئی ہے۔ اور نظیر اس معیار پر پورے اور بہتوں سے کہیں زیادہ پورے اُترے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سادگی اور فطرت سے مطابقت اگر ایک طرف ان کی شاعری کا غازۂ جمال ہے تو دوسری طرف ان کی انسانیت اور شخصیت کا عنوان کمال!

---

(۱۰) اکبرؔ الہ آبادی[1]

ایک مختصر سی، لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ، لکھنؤ میں آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے۔ طرح کی زمین ہے "ازل سے" "کل سے" ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ے

اُلجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے — مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں، کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا۔ اور اس شعر پر تو محفل لوٹ لوٹ گئی

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی — ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہِ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے اور شراب سے اسے تشبیہہ بارہا دی جاچکی ہے۔ حافظ کی غزل تک اس کا رتبہ پہونچا دینا یہ اسی شاعر کی جدّت طبع کا کرشمہ ہے۔ اور عجب کیا جو خود خواجہ حافظ کی رُوح بھی یہ اچھوتی داد سُن کر وجد میں آگئی ہو۔ اور جب اس شعر کی نوبت آئی ے

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ — ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

اور معاً بعد اس شعر کی ے

درجہ مُتحیر کا ہے بیخود سے فروتر — ہے رُوح کو اُمید ترقی کی اجل سے

تو جو اہلِ دل تھے ان کی آنکھوں میں کچھ بوندیں جھلک آئیں اور اہلِ معرفت کی زبان پر بے ساختہ مرحبا اور سبحان اللہ

---

[1] نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۲ء کو۔ وقت ۱۰ منٹ

کے نعرے جاری ہو گئے ــــــ لیکن شاعر نے جب اسی غزل کے ایک شعر کا یہ مصرعہ پڑھا کہ ع

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے گہرے مذہبی شخص، خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم موجود تھے، اُن کے تیور پر کچھ بل سے پڑنے لگے کہ لیجیے مذہب سے بھی شوخی ہونے لگی! احساس شاعر معًا بھانپ گیا، اور جھٹ پہلے مصرعہ کو مکرر پڑھ، پورا شعر یوں سُنایا ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے　　　کس حُسن سے، یہ بھی تو سُنو حُسنِ عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی، اور خان بہادر نے تو بے اختیار اُٹھ کر شاعر کو گلے لگا لیا! ان شاعر صاحب کو آپ نے پہچانا؟ یہی تھے سید اکبر حسین اکبرؔ۔ اُس وقت غالبًا منصفی کے عہدہ پر تھے۔ آگے چل کر خفیفہ کے جج اور پھر سشن جج ہوئے، جو اُس زمانہ کے لحاظ سے ہندستانیوں کی گویا ترقی کی معراج تھی۔ خان بہادر ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہوئے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیات کی تین جلدوں کے مصنّف، اپنے وقت کے ایک نامور ترین شاعر ہوئے، اپنے رنگ میں فرد۔ برجستگی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ ایک نمونہ تو ابھی آپ سُن ہی چکے، اور معنی آفرینی گویا اُن کا حصّہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھے اُن کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جب جس مضمون کو چاہا، بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت، ہم کو آپ کو کچھ نہ کچھ وقت لینا ہی پڑتا ہے۔ انھیں شعر کہتے اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ اس نیاز مند کو مرحوم کی عمر کے آخری نو دس سال ذاتی نیاز مندی اور حضوری کا اچھا خاصا اتفاق رہا۔ یہ بات اسی تجربہ کی بنا پر عرض کی جا رہی ہے۔ حضرت اکبرؔ بوڑھے ہو چکے تھے۔ عمر ۶۴، ۶۵ سے زائد ہو چکی تھی۔ ذہانت، شوخی، برجستگی، معنی آفرینی، لطافتِ زبان، حُسنِ بیان یہ سب اوصاف اُس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے، اور بعض دفعہ بے بات کی بھی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود ہنستے بہت کم تھے۔ دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ تھے۔ اور ہنساتے ہنساتے کبھی رُلانے بھی لگتے۔ کوئی چوٹ ایسی دل پر لگا دیتے، کہ سُننے والے کا دل درد سے بھر آتا! ــــــ راگوں میں سُنا ہے کہ کوئی دیپک راگ بھی تو ہوتا ہے، جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے!

پر گوئی گویا ان پر ختم تھی۔ تین کلیات تو صرف چھپے ہوئے ہیں۔ باقی جتنا حصّہ چھپنے سے رہ گیا ہے، وہ بھی ایک کلیات یا ڈیڑھ کلیات سے کم نہیں، اور وہ شعر جو اکبرؔ سخن گو نے کہے اور اکبرؔ سخن سنج کو چھپنے کے قابل

نظر نہ آئے، اُن کی تعداد اُن کے علاوہ! اصل ناموری غزل گوئی میں نہیں، نظم گوئی میں پائی۔ بلکہ اُس کی بھی ایک خاص صنف یعنی ظرافت میں۔ لیکن غزلیں بھی جناب اکبر کی کسی سے کم نہیں۔ کم نہ تعداد و حجم کے لحاظ سے اور نہ حسن و معنویت کے اعتبار سے ——— امنٹ کی مہلت میں اتنی گنجائش ہی کہاں۔ ورنہ اکبر کے عاشقانہ کلام کے کثرت سے نمونے پیش کر کر کے فیصلہ خود آپ ہی کے ذوقِ سلیم پر چھوڑ دیا جاتا۔ اکبر مذہب کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرفداروں میں تھے۔ اور یہ یاد رہے کہ یہ وہ وقت تھا جب "رفارم" یا اصلاح و تجدد کا جھنڈا سید احمد خاں کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر اُن کے معاصر تھے، گو سن میں اُن سے کہیں چھوٹے۔ اور علیگڈھ میں خود منصف رہ کر "رفارم" یا تجدد کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ کلام میں خوب خوب چٹکیاں لیتے جاتے ہیں، لیکن، چٹکیاں بھی عموماً گدگدیوں ہی کے رنگ کی ہوتی ہیں ——— ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد میں ایک رات — افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے وہ مجھ سے "دین کی اصلاح فرض ہے" — میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

کہیں کہیں یہ ظرافت ہلکی سی نشتریت بھی پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے یہ شعر ؎

سیّد اُٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

گزٹ کے معنی سرکاری گزٹ کے تو بالکل ظاہر ہیں۔ تلمیح یہ ہے کہ سر سیّد کے ہفتہ وار اخبار کا نام بھی علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا۔ یہ شعر ایک غزل کا ہے، اور غزل کا مطلع ہے ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بُت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

یہاں تک جب آپ آگئے ہیں، تو ایک آدھ شعر اور بھی اسی غزل کے ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے ؎

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالبِ زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا!

بزمِ یاران سے پھری بادِ بہاری مایوس — ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا

اور ایک شعر مخصوص اکبری رنگ کا ؎

واہ کیا راہ دکھائی ہے، ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبہ کو گُم اور کلیسا نہ ملا!

سیاسیات میں اکبر کا مذاق وہی تھا، جو ہر خود دار مشرقی کا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ میدان کے سپاہی اور اکھاڑے کے ڈنر سیل پہلوان نہ تھے۔ مجلسِ ادب کے مسند نشین اور بزمِ ظرافت کے میر تھے۔ زبان کھولتے تو میٹھے میٹھے بولوں میں ایک پھلجھڑی چھوٹ جاتی۔ ہنسی کی کھلکھلاہٹ سُننے والوں کی پیشانیوں پر شکن قائم ہی کب رہنے

دیتی۔

ایک رباعی کے پہلے مصرعہ میں فرماتے ہیں،

"انگریز ہر ایک فن میں ممتاز بھی ہیں"

دوسرے مصرعہ کے کچھ لفظ بھول رہا ہوں۔ "دمساز بھی ہیں" کچھ اس طرح باندھا تھا خیر، جانے دیجیے[1]۔ کام کے مصرعے آخر کے[2] دو ہیں ؎

بابو کو نچا دیا جو چابی دے کر
اس سے یہ کھُلا کہ دلّگی باز بھی ہیں!

"بابو" کیا خوب! ایک طرف بنگالی بابو بلکہ کل انگریزی داں ہندوستانی اور دوسری طرف دو کانوں پر بکنے والے چینی کے کھلونے، کوک سے ناچنے والے! ——— اور 'چابی' کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں "کھُلا" کیا خوب! کیا خوب! اس چابی سے "کھولنے" پر تو شاید لکھنؤ کے بڑے بڑے اُستاد بھی "بند" ہو جائیں!

اکبر ذاتی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہر بڑے چھوٹے سے جھک کر ملنے والے۔ کسی کی دل شکنی نہ گوارا کرنے والے۔ اور نماز و قرآن کے گویا عاشق۔ ایسا عشق جو اچھے اچھے عالموں، درویشوں میں بھی کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ آج ۹ ستمبر کو اُن کی پچیسویں برسی ہے۔ فاتحۂ خیر پر اس ذکرِ خیر کو ختم کیجیے۔

---

[1] بعد کو پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔اے (الہ آباد یونیورسٹی) کی عنایت سے یہ دونوں صحیح مصرعہ بھی معلوم ہو گئے ؎

انگریز قوی بھی ہیں سرفراز بھی ہیں　　تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں

(۱۱) دِلم در عاشقی آوارہ شد[1]

مصرعہ جو ابھی آپ کو سُنایا گیا، آپ نے سُن لیا؟ ایک بار پھر عرض ہے۔ ع

دِلم در عاشقی آوارہ شُد آوارہ تر بادا!

شاعر کس حسرت سے کہہ رہا ہے کہ میرا دل غم عشق میں مبتلا ہو چکا، اس میں حیران و پریشان پھر رہا ہے۔ اس پر بھی جی یہ نہیں چاہتا کہ یہ غم ختم ہو جائے، اور اس آزار سے رہائی حاصل ہو جائے۔ بلکہ اس کے برعکس آرزو ہے تو یہ، کہ یہ آوارگی، غم اور بڑھے اور دل جتنا اب کُڑھ رہا ہے، اس سے اور زیادہ کُڑھے —— اللہ اللہ محبت کا درد بھی کتنا لذیذ درد ہوتا ہے!

اور دوسرے مصرعہ میں تکملۂ آرزو کرتا ہے کہ ع

تنم از بے دلی بیچارہ شُد بیچارہ تر بادا

دل کے طفیل جسم بھی تو خستگی و ناتوانی کا شکار ہو چکا ہے، کاش یہ خستگی اور ناتوانی بھی اور بڑھے، اور عشق کے چرکے اٹھانے اور غم کھانے میں جسم کا قدم دل سے پیچھے نہ رہنے پائے!

شعر ہم نے آپ نے سب نے سُن رکھا ہے کہ امیر خسروؒ دہلوی کا ہے۔ اور امیر خسرو کا نام آتے ہی ذہن کے سامنے تصویر ایک بزرگ درویش پیرمرد کی آجاتی ہے —— تصویر درویشی اور بزرگی کی حد تک

---

[1] نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۹ر نومبر ۱۹۴۶ء کو۔ وقت ۱۰ منٹ

تو ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن کبر سنی کے پہلو سے تو قطعی غلط ہے۔ امیر کی یہ غزل اُن کے پہلے دیوان میں درج ہے، جس کا نام "تحفۃ الصغر" یا "کمسنی کا تحفہ" ہے۔ اور اس کے دیباچہ میں اُن کے اپنے قلم سے تصریح موجود ہے کہ اُس کے اندر صرف ۱۶ سال سے ۱۹ سال کی عمر تک کا کلام ہے! ——— تو گویا جس نے یہ پھڑکتا ہوا مطلع کہا اور دردِ عاشقی کی تصویر کھینچ دی، وہ ایک نوجوان لڑکا نکلا، زیادہ سے زیادہ ۱۹ سال کی عمر والا، اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی سال دو سال کم ہی کا! کمال ہے کہ کلام میں یہ پختگی اور سنِ کُل اتنا!

مطلع پر حیرت ختم ہو چکی ہو، تو آگے بڑھیے۔ غزل کی غزل ایک رنگ میں ہے ؎

بہ تاراج اسیران زلف تو عیاری دارد
بہ خونریز غریبان چشم تو عیارہ تر بادا
رُخت تازست بہر مُردن خود تازہ تر خواہم
دلت خارست بہر کشتن من خارہ تر بادا

معنوی حیثیت سے مضمون کا تسلسل قائم ہے، اور تلازمے سب وہی چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر اسیروں کے لیے "زلف" کی لفظی مناسبت اور "رُخ" اور "دل" کا تقابل غرض صنعتیں بھی اُستادانہ! لفظ و معنی دونوں کی پختگی کے اعتبار سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام کسی نوجوان صاحب زادہ کا ہے؟

غزل میں مسلسل مضمون شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ غزل کا جو عام دستور فارسی میں چلا ہوا ہے (اور وہیں سے اُردو میں آیا ہے) وہ تو یہ ہے کہ ہر شعر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر شعر کا مضمون دوسرے سے الگ۔ غزل مسلسل کم تر ہی کوئی کہتا ہے۔ یہ صاحبزادے مستند اُستاد تو بہت بعد کو تسلیم کیے گئے، لیکن اُستادی کی یہ ایک جھلک شروع ہی سے رکھتے تھے، کہ تسلسلِ مضمون پر اُسی دقت سے قادر تھے!

چوتھا شعر، جانِ غزل یہی شعر ہے، ملاحظہ ہو ؎

گر اے زاہد دعائے خیر می گوئی مرا ایں گو
کہ ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

معلوم ہوتا ہے شاعر آشفتہ سر، عشق پیشہ کو کسی زاہد بزرگ نے کہیں دیکھ پایا ہے، اور اس کی آشفتہ حالی پر ترس کھا کر اُس کی فلاح و اصلاح کے لیے دعا کرنا چاہتا ہے، اور دعا قدرۃً یہی ہوتی کہ اس بیچارہ کو عشق سے نجات حاصل ہو۔ شاعر یہ صورتِ حال بھانپ جاتا ہے۔ حضرت زاہد کی عظمتِ زہد سے اُسے

بھی انکار نہیں۔ جانتا ہے کہ اُس کی دعا قبول ہو کر رہے گی۔ قبل اس کے کہ زاہد کے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھیں، شاعر کی زبان چل اٹھتی ہے اور یہ عرض کرنے لگتا ہے کہ "حضرت خدا کے لیے کوئی اور دعا نہ کر بیٹھیے گا، دعا یہ فرمایئے کہ آزارِ عشق مجھ خستہ جگر کے لیے اور بڑھتا ہی جائے"

دلِ من پارہ گشت از غم نہ زاں گونہ کہ بہ گردد
اگر جاناں بدیں شاد ست یارب پارہ تر بادا

میرا دل تو غم سے ٹکڑے ٹکڑے، پاش پاش ہو چکا، جس کے جُڑنے اور درست ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں (نہ زاں گونہ کہ بہ گردد) لیکن محبوب کی مرضی اگر یہی ہے، اگر وہ اسی میں خوش ہے، تو اے پروردگار یہ اور زیادہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر، اور اس سے زیادہ پاش پاش ہو کر رہے!

چھٹا شعر پھر اسی تمنّا کا ترجمان ہے ؎

ہمہ گویند کز خونخوارئیش خلقے بجان آمد
من ایں گویم کہ بہر جان من خونخوارہ تر بادا

لوگ کہتے ہیں کہ محبوب کی سفاکی سے خلقت جان سے تنگ آگئی ہے، لیکن مجھے تو ارمان اس کا ہے کہ میرے حق میں اس کی سفاکی کچھ اور بڑھ ہی کر رہے!

ساتویں شعر پر پہونچ کر شاعر قلم رکھتا ہے، تو اپنے حق میں یوں دعا گو ہوتا ہے ؎

چو با تر دامنی خو کردہ خسرو با دو چشم تر
بآب چشم مژگاں دامنش ہموارہ تر بادا

کہ اس غمزدہ کا غم اور ترقی ہی پر رہے،

سات شعر دیارِ عشق کی سات منزلیں تھیں، طے ہوئیں۔ گویا ایک ہفتخوان سر ہوا۔ یا یوں کہیے کہ شاعر کو ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی۔ "سات" کا عدد صوفیہ کے ہاں بڑا مبارک مانا گیا ہے۔ اور اکیلے صوفیہ ہی کے نہیں، مشرقی مذہبوں میں عموماً۔

امیر نے غزلوں پر غزلیں نہیں، دیوان پر دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ غزلوں اور پھر غزل کے شعروں کا کوئی شمار ہی نہیں۔ عشق و محبت وصل و فراق، سوز و گداز کی مصوری خدا معلوم کے ہزار بار کامیابی اور رعنائی کے ساتھ کی۔ اور آخر کو اُستادِ سخن، امام فن کہلائے۔ اس شاندار انجام کی خبر سب کو ہے۔ قابلِ رشک آغاز آج آپ نے

دیکھ لیا ؟

لیکن اس حیرت انگیز ابتدا کی علم بھی کچھ خیال شریف میں آئی ؟ تذکرہ نویسوں کے قلم نے یہ تصریح جو کردی ہے کہ امیر ابھی آٹھ سال کے بچے تھے کہ پدر بزرگوار نے لاکر شیخ وقت، عارف باللہ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر ڈال دیا اور خواجہ کی نظر قبول اسی وقت پڑ گئی۔ ادھر خود جوہر قابل، اتنے بڑے صاحب نسبت سے نسبت کہیں بیکار جا سکتی ہے ؟ دن دونی، رات چوگنی ترقی شروع ہوگئی۔ قمقمہ "کرنٹ" آجانے سے جگمگا اٹھا ——— خواجہ کا یہ قول بھی تو منقول ہے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے، تو عرض کروں گا کہ خسرو کو! اور تذکروں کی زبان پر یہ روایت بھی تو چڑھی ہوئی ہے کہ حضرت دعا مانگتے تھے تو امیر کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ "الٰہی اس ترک کے سوزِ دل کے طفیل میں میری مغفرت کر"!

اس مرتبۂ راز و نیاز اور اس درجۂ اختصاص کے بعد اس میں حیرت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ اس پایہ کا کلام ایک کمسن کی زبان سے ادا ہوا ہے ؟ محض شاعر، ردیف و قافیہ کا استاذ و ماہر، ان مرتبوں تک پہونچ ہی کب سکتا ہے، یہ تو عشق حقیقی کی روح ہے جو اس قال کو حال بنا دیتی ہے۔ اور الفاظ کے اندر معنویت پیدا کر دیتی ہے! عارف رومیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود   عشق نہ بود عاقبت ننگے بود

دنیا والوں اور دنیا والیوں کا عشق بھی کوئی عشق ہے! اگر ناجائز محل پر ہے، جب تو سراپا فسق، لیکن اگر محل جائز پر ہے، جب بھی آب و رنگ، نقش و نگار کی بہار کب تک ؟ حسن و شباب کی طلسم بندی کے دن ؟

ہے یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جاکے راز

سب ہے فریبِ آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

یہ قوت تو اسی اور صرف اسی حسن میں ہے، جو زوال و انحطاط، تغیر و فنا کے ہر قانون سے بالاتر ہے۔ ایک بار پھر یہ قول مولانائے رومی ؎

عشق با مردہ نہ باشد پائیدار   عشق را برحی و برقیوم دار

بس دل کا اٹکاؤ شرط ہے، امیر کو عشق اسی محبوب حقیقی سے تھا۔ اور مرشد کامل کے فیض و توجہ سے کہنا چاہیے کہ بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ ساری طلب و تمنا اسی عشق میں زیادتی کی تھی، دل میں بھی اور زبان پر بھی۔ ان کے کوئے بتاں سے مقصود و مراد شہر کا کوئی بدنام محلہ یا بازار کا کوئی کوچۂ فسق نہیں، بلکہ حسن مطلق کی تجلیات

گوناگوں ہیں، انھیں حسین و جمیل تجلیات میں وہ گم ہیں، اور انھیں میں ضم ہو جانے کی دعا اپنے حق میں وہ زاہد سے بھی کرا رہے ہیں،

کہ آں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا !

رحمت ہو اُن کی پاک روح پر۔ بزم سخن میں امیر بن کر رہے، اور اقلیم تصوف و معرفت میں خسرو بن کر چمکے! زباں پر وہ قدرت کہ ایران کے اہلِ زبان تک اُن کی فارسیت کے قائل اور سلوک و فقر میں وہ مرتبہ کہ جو تذکرۂ صوفیہ و سالکین ان کے نام نامی سے خالی، وہ خود ناقص و ناتمام۔

---

(۱) عبدالرحمٰن کی موت[1]

پہاڑ اور پہاڑی غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج پڑی ہوتی ہے، جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انھیں میں کوئی کوئی سنگریزہ لعل و یاقوت بن کر نکل آتا ہے۔ جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے، تو دل پر کیا گزر جائے گی؟ سمندر میں بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے۔ لیکن انھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوشِ صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاجِ سلطانی کا زیور بنتے ہیں، اُن کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیونکر صبر آئے گا؟ جنگل میں خودرو پھول اور پتے، درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں۔ جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں۔ لیکن گلاب کی تازہ و شاداب کلی بزمِ ہستی کو معطر کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست بُرد کی نذر ہو جائے، تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟

ایک چراغ جلا، لیکن قبل اس کے کہ اس کا اُجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا۔ ایک آفتاب چمکا، لیکن پیشتر اس سے کہ اس کی شعاعیں پورا نور پھیلائیں، غروب ہو گیا۔ ایک پھول کھلا، مگر معاً مرجھا گیا۔ سبزہ لہلہایا مگر فوراً خشک ہو کر زمین کے برابر ہو گیا۔ حق کی پکار بلند ہوئی لیکن معاً فضائے نامتناہی میں گم ہو گئی۔ عبدالرحمٰن بگرامی نے

---

[1] سچ (لکھنؤ) ۱۹ مارچ ۱۹۲۶ء۔

۲۷-۲۸ سال ہوئے ناسوت کے ظلمت کدہ میں آنکھیں کھولیں لیکن یہاں کی فضا کو شاید اپنے غیر موافق پاکر ۴ مارچ ۱۹۲۶ء (۲۰ شعبان ۱۳۴۴ھ) کو صبح کے وقت مقید مطلق میں، قالب بے قالبی میں، جسد عنصری عالم جان میں پھر جذب و گم ہوگیا۔ سچ کہا ہے سچ کہنے والے نے کہ ہم سب "اسی" کے ہیں اور سب "اسی" کی طرف واپس جانے والے ہیں ؎

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون

آنکھیں اشکبار کہ عالم انسانیت کے اس جوہر آبدار کو اب کہاں تلاش کریں، قلب مضطرب کہ کائنات آب و گل کے اس گوہر بے بہا کے بغیر کیونکر آرام پائے۔ عقل حیران کہ گلشن بشری کے اس گل رعنا کو کہاں سے ڈھونڈھ نکالا جائے۔ لیکن غیب کا فرشتہ آواز دیتا ہے کہ اس قید خانۂ عنصری میں صرف اسی وقت تک کے لیے روحوں کو مقید رکھا جاتا ہے، جب تک وہ اپنی تربیت حاصل کرلیں۔ عالم معنی میں زمانہ کا شمار، انسان کی بنائی ہوئی جنتری اور آفتاب کی گردش سے نہیں ہوتا۔ بلکہ روح کے لیے واپسی کا "وقت مقرر" وہی ہے جب وہ اپنی تربیت کی تکمیل کرلے۔ پس اگر اس پاک وصف و پاکیزہ سرشت ہستی نے، جس کا ناسوتی نام عبدالرحمٰن تھا اتنی کمسنی ہی میں تکمیل روح کے سارے مدارج طے کرلیے تھے، تو ٹھیک اسی وقت مقررہ پر اس کا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا لازمی تھا، جس پر حیرت کرنی بے جا اور تاسف کرنا بے محل ہے۔ دنیا کی ظاہر بیں نگاہیں، اس مرنے والے کے خط و خال سے زیادہ مانوس نہ تھیں۔ آج اگر اس مرحوم کے فضائل و کمالات کو پھیلا کر بیان کیا جائے تو یقیناً بہتوں کو مبالغہ کا شک گزرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو خوش نصیبی سے ذاتی نیاز حاصل تھا، وہی بدنصیب اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس ایک ذات کے اٹھ جانے سے امت اسلامیہ کیا کھو بیٹھی۔ میں مرحوم کو اس زمانہ سے جانتا تھا جب وہ دارالعلوم ندوہ کی شاید کسی نیچی جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر ۱۵، ۱۶ سال سے زیادہ نہ تھی، تقریر کا شوق انھیں اسی وقت سے تھا اور قیصر باغ لکھنؤ میں جب پہلی بار میں نے ان کی تقریر سنی تو تقریر اتنی بلند و برتر تھی کہ قدرتاً بدگمانی یہ پیدا ہوئی کہ کسی نے یہ تقریر قلمبند کرکے پیشتر سے حفظ کرادی ہے۔ ورنہ اتنا کم سن طالب علم ایسی تقریر برجستہ کر نہیں سکتا، مگر جوں جوں سابقہ بڑھتا گیا، یہ بدگمانی دور ہوتی گئی۔ اور اس آئینہ کے اصلی جوہر کھلتے گئے۔ ندوہ میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک زمانہ تک سرائے میر ضلع اعظم گڈھ کے مدرسۃ الاصلاح میں آتالیقی کے فرائض انجام دیئے۔ مولوی امین احسن اصلاحی جن کے مضامین سچ کی پہلی

جلدمیں بہ کثرت شائع ہو چکے ہیں[1]، اسی دور کے شاگرد ہیں۔ مدرستہ الاصلاح اپنے رنگ کی سارے ملک میں بہترین تربیت گاہ ہے۔ سادہ ترین معاشرت کے ساتھ اعلیٰ ترین علم واخلاق سے مسلمانوں کے بچوں کو آراستہ کرنا اس کا مقصد ہے۔ جناب مولانا حمید الدین صاحب مدظلہ العالی (صاحب تفسیر "نظم القرآن") اس کے سرپرست ونگران اعلیٰ ہیں[2]۔ اور مرحوم ان کے بہترین رفیق ومددگار تھے۔ چھوٹے چھوٹے یتیم اور بے والی ووارث بچوں کو جس شفقت ومحبت کے ساتھ مرحوم تربیت دیتے تھے، اس کا نمونہ میری نظر سے کم گزرا ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام کی طلب پر مرحوم کلکتہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں اس اسلامی دارالعلوم میں جو سرکاری امداد سے بے نیاز رہ کر کھولا گیا تھا، صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ اس کم عمری میں اتنی بڑی ذمہ داری کے عہدہ پر انتخاب ہو جانا اور پھر اس ذمہ داری کو حسن وخوبی انجام دینا مرحوم کی ایک مخصوص فضیلت تھی۔ یہ زمانہ تحریک خلافت وترک موالات کے شباب کا تھا اور مرحوم نے علاوہ اپنے مشاغل تعلیم وتدریس کے ان اجتماعی وقومی تحریکات میں پوری قوت جوش وسرگرمی کے ساتھ حصّہ لیا۔ بہ کثرت تقریریں کیں اور متعدد مضامین مسائل حاضرہ پر سپرد قلم فرمائے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی آخری سہ ماہی میں مولانا ابوالکلام کی سرپرستی اور مولوی عبدالرزاق خاں ملیح آبادی کی ایڈیٹری میں پیغام کے نام سے ایک ہفتہ وار، کلکتہ سے نکلا۔ مرحوم نے اس کے اوراق پر بارہا ملکی آزادی کے مسئلہ کو شریعت وقرآن پاک کی روشنی میں پیش کیا غالباً شروع سنہ ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ مستقل طور پر آ گئے، اور دارالعلوم ندوہ نے اپنے ہاں ادیب کی خدمت پر انھیں مامور کیا۔ قرآن کا ذوق فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ درس ادب بھی درس قرآن ہی ہوتا تھا۔ ہر شاگرد کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ کر شفقت تھی۔ متعدّد شاگردوں کو ذرّہ سے آفتاب بنا دیا۔ دارالعلوم ندوہ کی جو اصلی روح تھی، اسے از سر نو زندہ کر دیا اور بہت سے سینوں میں قرآن کی خدمت اور اسلام کی محبت کا نور پیدا کر دیا۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کی ہر اصلاحی تحریک میں خلوص قلب کے ساتھ حصّہ لیتے رہے تبلیغ، تنظیم، خلافت، ندوہ، کانگرس، ہر تحریک میں جو امت اسلامیہ کے لیے مفید معلوم ہوئی، بہ قدر استطاعت پوری سرگرمی کے ساتھ شرکت فرمائی۔ لکھنؤ میں سنہ ۱۹۲۴ء کے ہندو مسلم فسادات کے موقع پر اور سنہ ۲۵ء

---

[1] یہ وہی صاحب ہیں، جو اب سنہ ۱۹۵۳ء میں "جماعت اسلامی" پاکستان کے نائب امیر ہیں۔

[2] ظاہر ہے کہ یہ ذکر مدرسہ کے ان خصوصیات کا ہو رہا ہے جو سنہ ۱۹۲۶ء میں اس میں موجود تھے۔

میں جونپور کے ہندو مسلمانوں میں صلح کرائی۔ مارچ ۲۵ئ میں لکھنؤ کے اور نومبر ۲۵ئ میں انبالہ کے اجلاس ندوہ میں مقاصد ندوہ پر جو اعلیٰ تقریریں ارشاد کیں، وہ گویا اس وقت بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔ انبالہ والی تقریر غالباً زندگی کی سب سے آخری تقریر تھی۔ علالت اس وقت شروع ہو چکی تھی۔ تقریر بہت دیر تک جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اکتوبر ۲۵ئ میں رفاہ عام لکھنؤ میں توفیق شریف کی عربی تقریر کا جس برجستگی و شستگی کے ساتھ اردو ترجمہ کیا تھا، اس نے مخالفین تک کو داد دینے پر مجبور کر دیا۔

ہم چند شوریدہ سروں کو ایک اصلاحی پرچہ نکالنے کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۴ئ کی آخری سہ ماہی میں مولوی ظفر الملک صاحب کی مستعدی سے یہ دشواری ایک بڑی حد تک حل ہو گئی۔ ۲۱ر نومبر ۲۴ئ کو دفتر سچ میں چار شخصوں کی مجلس میں تمام ابتدائی مراتب طے پا گئے۔ اس مختصر مجلس کے ایک اہم رکن خود مولوی عبدالرحمٰن تھے۔ عام مقاصد سے ہمدردی اور اتفاق رکھنے والے متعدد احباب تھے۔ لیکن یہ اسی وقت نظر آگیا تھا کہ اکثر عقاید و خیالات کے جزئیات تک میں جو موافقت عبدالرحمٰن کو عبدالماجد کے ساتھ ہے، وہ شاید کسی دوسرے عنایت فرما کو حاصل نہیں اور شرکت تحریر میں جو سہولت، مرحوم کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے، اس کی توقع کسی اور سے نہیں۔ بعد کے تجربے نے اس توقع کو حرف بحرف صحیح ثابت کر دیا۔ ایک سال سے کچھ اوپر کے طویل سابقہ میں مرحوم کے لہجہ تحریر سے صرف ایک بار (جلد اوّل ۱۵ میں) ایک مضمون کے عنوان اور اس کے بعض الفاظ سے متعلق مجھے اختلاف ہوا۔ اور جب میں نے اپنی اس رائے کو ان پر ظاہر کیا تو اس بے نفسی کے ساتھ جو ان کے بعد میرے لیے اب خواب و خیال ہے۔ انھوں نے بلا تامل و توقف میری گزارش کو تسلیم فرمالیا۔ سچ میں اپنے مضامین کے ذریعہ سے اسلام و اُمّت اسلامیہ کی جو خدمت وہ انجام دیتے رہے، اس کی پوری روئداد ناظرین سچ کے سامنے ہے۔

پچھلے چند ماہ سے پیروں کے درد میں مبتلا رہنے لگے۔ جسے ہم لوگ ہلکے وجع مفاصل کے قسم کا کوئی مرض سمجھتے رہے۔ اور چونکہ خود مریض نے اپنے صبر و توکل کی بنا پر کبھی مرض کی شدت نہیں بیان کی اسلئے قدرتاً اسے معمولی اور غیر اہم سمجھا کیے۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا۔ لکھنؤ اور نگرام (ضلع لکھنؤ) میں متعدد اطبا کے علاج کے بعد بہرائچ ایک عزیز کے ہاں علاج و تبدیل آب و ہوا دونوں کی غرض سے تشریف لے گئے، مہمل ہوئے، افاقہ محسوس ہوا، چنانچہ ان کے آخری مکتوب میں انھیں کے قلم سے افاقہ کی خبر پڑھ کر سچ (نمبر ۱۰) میں میں نے ان کے متعلق کسی قدر اطمینان بخش نوٹ دے دیا تھا۔ اور ناظرین سے ان کی صحت کے لیے

دعا چاہی تھی۔ عین اسی روز جبکہ وہ نوٹ طبع ہوا، اسی صبح کو نماز فجر کے فوراً بعد خاک کا یہ پُتلا مرض وصحت کی کشمکش سے ہمیشہ کے لیے نجات پاکر رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔ اور اپنے تمام دینی بھائیوں پر بجائے دعائے صحت کے دعائے مغفرت کا حق قائم کر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں کی جماعت کثیر سے قطع نظر کر کے اپنے خاص عزیزوں میں مرحوم نے ایک نوجوان بیوہ، ایک خوردسال بچّی اور دل شکستہ ماں کو چھوڑا ہے۔ ماں کی سرگزشت خصوصیت کے ساتھ دردناک ہے کم سنی میں بیوہ ہوئیں، بجز خوردسال عبدالرحمٰن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ساری بیوگی اسی نونہال کے پروان چڑھانے میں بسر کر دی۔ یہاں تک کہ مادی زندگی کا یہ بڑا سہارا ابھی دغا دے گیا۔ ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے بدنصیبی نہیں انتہائی خوش نصیبی ہے کہ سارے سہارے مٹ کر صرف ایک ہی سہارا باقی رہ جائے۔ اور سب سے رشتہ ٹوٹ کر صرف ایک ہی سے رشتہ جڑا رہ جائے!

حُسنِ عمل اب بھی مسلمانوں سے بالکل رخصت نہیں ہو گیا ہے، سرزمین ہند کے گوشوں اور زاویوں میں ابھی بعض بڑے بڑے زاہدان شب بیدار موجود ہیں، قومی کام کرنے والوں کی جماعت میں بھی ابھی چند نہایت مخلص اور پختہ ایمان جواں مرد زندہ ہیں، لیکن اگر میری دیانت سے یہ سوال کیا جائے۔ کہ اب تک سب سے زیادہ معصومانہ زندگی، لغزشوں اور آلائشوں سے پاک زندگی، بچوں کی طرح پاک اور بے زنگ زندگی، کس کی دیکھی ہے۔ تو اپنی واقفیت وتجربہ کے دائرہ میں بلاتامل صرف مرحوم عبدالرحمٰن کا نام پیش کر سکتا ہوں۔ نوجوانی کے باوجود اس قدر صالح وپاکباز رہنا محض عطائے الٰہی ولطف خداوندی کا ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ وہ صحیح معنی میں مسلم ومومن تھے۔ اسلام کی حقیقت ان کے دل کی گہرائی میں اُتری ہوئی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی صحبت، ان کی تقریروں سے بھی زیادہ موثر ہوئی تھی۔ اللہ پاک پر ہر وقت بھروسہ رہتا تھا۔ ذاتِ مبارک نبویؐ کے ساتھ دلی شیفتگی تھی، جستجو وطلب صحابۂ کرامؓ کے دین فطرت کی تھی، متاخرین کے زوائد اور رنگ آمیزیوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ملکی وسیاسی آزادی کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی بصیرت کو قرآن کریم سے اسی کے احکام ملتے تھے۔ دینی خدمت کی ہر صنف اور ہر صورت کے لیے ان کی زندگی وقف تھی۔ تقریر وتحریر کے علاوہ اگر کوئی موقع جہاد بالسیف کا آجاتا، تو اس میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا۔ جزئیات عقائد میں رواداری خاص مسلک تھا۔ بجائے کسی خاص فرقہ کی جانب زیادہ جھک جانے کے اپنا انتساب محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے "اسلام" ہی کی جانب پسند فرماتے رہے۔ شان رحماء بینہم کو پوری طرح نباہا۔ عقائد وخیالات میں اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی

ہمیشہ نرم سے نرم تاویل پسند کی۔ ذاتی دشمن ہر شخص کے ہوتے ہیں، میرے تجربہ میں ان کی شخصیت اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ میں نے ان کا کوئی دشمن نہ دیکھا۔ وہ صحیح معنی میں درویش تھے۔ گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی۔ صبر و ضبط، فطرت ثانیہ بن گئے تھے۔ ماسوا سے بے تعلقی و بے نیازی زندگی کا جزو تھی، بڑی سے بڑی ترغیب نے بھی کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی۔ بار ہا بڑے بڑے کٹھن وقت آپڑے، اس کا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا۔ کلکتہ کے زمانہ قیام میں ایک مدت تک معاش کی یہ عسرت تھی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی۔ یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گزار دیا۔ لب کبھی حرف شکایت سے آشنا نہ ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ کی سرکاری یونیورسٹی کی طرف سے علوم اسلامیہ کی پروفیسری کے لیے تحریک ہوئی۔ مشاہرہ جس قدر ندوہ میں پا رہے تھے اس سے بقدر چھ گنے کے زائد تھا۔ شہرت و ناموری وغیرہ اس پر مستزاد، اللہ کے نیک بندہ نے نہ صرف اس دعوت کو مسکرا کر ٹال دیا، بلکہ اپنے خاص خاص رفیقوں اور دوستوں سے بھی اس کا ذکر تک نہ کیا! قناعت، استغنا، ایثار، یہ الفاظ سننے میں بار بار آتے ہیں، دیکھنے میں ان کا پورا نمونہ صرف عبدالرحمٰن کی ذات میں آیا تھا۔ وہ صحیح معنی میں متقی تھے۔ زبان، آنکھ، کان اور دل سب کو بدی، بدکاری و بدخیالی سے روکے ہوئے تھے، حلم و تحمل خمیر میں داخل تھا۔ سخت سے سخت اشتعال کے موقع پر بھی غصہ آتے نہ دیکھا۔ یتیموں پر شفقت، محتاجوں کی خبر گیری، بیکسوں کی امداد کے بغیر زندگی محال تھی، انکسار و فروتنی ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے مقابلہ میں برتتے تھے۔ بڑوں کے ادب و لحاظ اور چھوٹوں کی محبت و الفت سے کسی گھڑی خالی نہ تھے۔ نفل نمازیں پڑھتے تھے مگر چھپ کر، روزے بکثرت رکھتے تھے۔ مگر راز رکھ کر بے لوثی و بے نفسی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی، خودداری کے جدید مفہوم (خودی، خود بینی خود نمائی) سے بالکل ناآشنا تھے۔ ساری زندگی، طاعت و عبادت، تقویٰ و طہارت میں گزار دی اور کبھی اپنی مذہبیت، پاکبازی و تقدس کی تجارت نہ کی۔ قومی و اجتماعی زندگی میں پوری طرح پڑنے کے باوجود بھی، کبھی آگے بڑھنے اور ابھرنے کی کوشش نہ کی، یہ آزمائش بھی ہر واقف کار پر روشن ہے کہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

دل ان کی ساری فضیلتوں کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ممتاز لے کر آئے تھے۔ صحیح معنیٰ میں عالم طالب علم تھے۔ علمی مصروفیتوں سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی۔ علوم میں سب سے زیادہ ذوق و دلچسپی کی چیز، کسی انسان کی نہیں، اللہ کی کتاب حکیم تھی۔ خاص شغف و انہماک اسی کے مطالعہ میں تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی سارے دینی و مذہبی ذخیرہ و ادبیات پر گہری اور وسیع نظر تھی خدمتِ دین کی غرض سے انگریزی بھی بقدر ضرورت پڑھ لی تھی۔ حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہنے کے لیے بکثرت اخبارات و رسائل کا مطالعہ

برابر جاری رہتا تھا۔ ذہن میں سلجھاؤ تھا۔ حُسن ترتیب، حُسنِ بیان، سلاست زبان، ذوق انشاد کی شہادت، ان کے قلم کی نکلی ہوئی ہر سطر دے رہی ہے۔ الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا کہ اس نادر شخصیت، اس جامع کمالات، اس حیرت انگیز نمونۂ عمل کی وفات سے امت اسلامیہ نے کیا کچھ کھو دیا۔ بہر حال تقدیر الٰہی پوری ہو کر رہی اور بجز صبر و شکر کے اَب کسی کے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہیں۔

پچھلے سال اسی ماہ مبارک رمضان کے آغاز میں مجھے قلب کا ایک سخت دورہ پڑا تھا معلوم ہوتا تھا کہ حرکت قلب فوراً بند ہوا چاہتی ہے۔ افاقہ ہونے پر میں نے ایک مختصر وصیت نامہ تحریر کیا تھا۔ اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ میری تجہیز و تکفین، نماز جنازہ وغیرہ جہاں تک ممکن ہو (منجملہ اور دو تین صاحبوں کے) مولوی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں انجام پائے۔ رفیق اعلیٰ کی رفاقت اعلیٰ کے اختیار کرنے پر حریص عبدالرحمٰن جس شخص کو تمھارے خلوص، تمھاری برگزیدگی، تمھارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا، کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اسی کے اعتماد کو شکست کر دو گے۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ اسی بدنصیب کو آہ تمھاری تعزیت و ماتم میں اشکبار ہونا پڑے گا! بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند عبدالرحمٰن! جس ماں نے اپنی بیوگی اور پھر کم سنی کی بیوگی تمھیں کو دیکھ دیکھ کر پار کر دی، اور جس نے اپنی ساری خوشیوں اور آرزوؤں، حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمھارے ہی مکھڑے کو رکھا، آج اس دکھیاری کے کلیجے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں! کیا یہ حسرت وہ اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جائے گی، کہ ایک بار تم اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو آکر پونچھ دو! ——— نوجوانی میں ایک عصمت مآب پردہ نشین کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دینے والے عبدالرحمٰن! جس دلاروں کی پالی کو تم اس کے وطن سے بے وطن کر کے، اس کے ماں باپ سے چھڑا کر اس کے بچپن کی سہیلیوں سے جدا کر کے اس کا ڈولا بڑے شوق و ارمان سے اپنے ہاں لائے تھے، جس کا لباس عروسی بھی ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا، اور جس حسرت نصیب کو آخری وقت میں تمھاری خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا، آہ آج اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے! کیا اب بجز حشر کے اب تمھارا دیدار اسے نصیب نہ ہو گا؟ معصوم بچی کے معصوم صفت والد عبدالرحمٰن! تم تو غیروں کے یتیموں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر رکھتے تھے آج خود تمھاری ننھی معصوم تمھارے غم میں کیا بلک رہی ہے؟ کیا اس کے سر پر اب وہی ہاتھ پھیرے گا جو یتیموں، غمزدوں، بیکسوں اور بے وارثوں سب کا حقیقی والی و وارث ہے؟ عزیزوں سے بڑھ کر عزیز، مخلصوں سے بڑھ کر مخلص عبدالرحمٰن، اپنے ایک گنہگار اور شکستہ دل بھائی کی جانب سے سلام و رحمت، مغفرت مرحمت کی بے گنتی اور دل سے نکلی

ہوئی دعاؤں کا ہدیہ حقیر قبول کر:۔ تمھاری آنکھوں سے آج پردے اُٹھ چکے ہیں، لفظ و عبارت سے گزر کر آج تم معنی و حقیقت کے محرمِ اسرار ہو چکے ہو۔ جمالِ سرمدی کے بے حجاب نظارے سے تم آج شاد کام ہو رہے ہو۔ تمھیں اپنی ان خوش نصیبوں کا واسطہ اور جس بے نیاز کی حریم ناز میں شرفِ بازیابی حاصل کر چکے ہو، اسی کی عظمت و کبریائی کا صدقہ، کہ لَهُمْ مَا يَشَآؤُنَ عِندَ رَبِّهِمْ کے مرتبہ پر فائز ہو کر اور رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کے خلعت سے سرفراز ہو کر اور لَهُم مَّا يَشَآؤُنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ کے انعامات سے مالا مال ہو کر اپنے گنہگار اور بد نصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی جو حالت دیکھ گئے ہو، اس سے غافل نہ ہو جانا اور اللہ کی یکتائی کے زبانی اقرار کرنے والوں کے حقوق کو فراموش نہ کر جانا! دنیا نے اگر تمھیں نہیں پہچانا تو معذور تھی۔ اہلِ دنیا اگر تمھاری قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکے، تو کچھ ہرج نہیں۔ جس سے تم کو اور ہر نیک و بد کو آخری اور دائمی سابقہ پڑنے والا ہے، وہ تو بہر حال بے خبر نہیں، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

---

(۲) محمد علیؒ [1]

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب، شب قیامت، بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت اس کو اٹھا لیا جائیگا جس کے وجود سے ملّتِ اسلامیہ کا وجود تھا، جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے؟ اس پچھلے زمانے میں ۱۵۔۲۰ سال کے اندر مسلمانوں پر کیا کچھ نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لیے گئے۔ ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر کیا جھیلنا پڑا۔ انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا۔ ترکوں پر "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکّہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا۔ عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم، ہر زخم کے لیے مرہم تھا۔ ہر تازہ صدمہ کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اسی خیال سے کہ جو کوئی بھی چلا جائے، محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جس پاک دبے باک وبے نیاز نے پیمبر محمدؐ کے لیے یہ منادی کردی تھی کہ "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ

---

[1] سچ ۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ" اس کے فرشتوں نے اس کے بندوں تک اس کے پیمبر کے ایک وفادار اُمتی کے لیے بھی یہی صدا پہونچادی! اے پاک پروردگار، اے سب کے جِلانے والے اور سب کے اٹھانے والے مولا، تیرا ارادہ بیشک سب کے ارادوں پر حاکم، تری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنادینے پر قادر، لیکن کیا ہم جیسے ناتواں اور کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش، اتنے بڑے ابتلا، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمائشیں تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہیں۔ ہم کم ظرف کیا اس لائق تھے کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑاتے ہوں، عین اُسی وقت ہماری سب سے بڑی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ جس کے لیے دل چاہتا تھا کہ اس کی موت کی خبر کبھی نہ سننی پڑے، اسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور اُس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا بھی تصوّر نہیں لایا جاسکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک انصاف کر کہ تیرے حبیب و محبوب کو اس عالمِ ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق رضؓ پر جلالت کا قلب تاب نہ لاسکا تو تیرے اُس حبیبؐ پاک کے ایک ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سے ادنیٰ آزمائش کا بھی تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لیے دل و جگر کس سے مانگ کر لائیں!

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں کی جارہی ہیں، مرثیے لکھے جارہے ہیں، تجویزیں پاس کی جارہی ہیں، کہ ایک بڑا قومی لیڈر اُٹھ گیا، نیشنل کانگرس کا سابق صدر چل بسا، ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہوگیا۔ یہ سب کچھ صحیح ہوگا لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا کہ اللہ کا بندہ اُٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہوگیا۔ آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک جادو بیان مقرر اور بہترین انشاء پرداز گم ہوگیا۔ ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہوگیا، جو سچائی کا پُتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا۔ جس نے اپنی دنیا برباد کر کے، اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا، جس نے زرّیں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اُتار کر جیل کی کملی اوڑھی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے،

ایک ہی دُھن جو تھی تو رسُولؐ کی نصرتِ خدمت کی ! اس کی سچی آپ بیتی خود اسی کے ایک شعر میں سُنیئے ؎

سب کھو کے تری راہ میں میں دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

بے شک اس نے دنیا اور دولتِ دنیا ساری کی ساری کھو کے رکھدی، اور کھوئی بھی کس کی راہ میں ! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا "پاتے" ہوئے اور "لیتے" ہوئے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی اور "کل" انشاءاللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری، شروع ہی سے حصّہ میں آئی، علیگڈھ میں نام پیدا کیا، آکسفرڈ جاکر ناموری کہاں سے کہاں پہونچی، "سول سروس" کی جانب لپکے، اُلٹے پاؤں واپس کیے گئے، رامپور اور بڑودہ درباروں کی قدر شناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے، جو غلاف کعبہ کو پکڑ کر رب کعبہ سے مانگی گئی تھی، کہ "میرے شوکت اور محمدؐ کو اسلام کا خادم بنادے" قبولیت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جو نہ صرف "مسٹر" تھا بلکہ اپنے وقت کے مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا، چہرہ پر داڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز اور دین کی تڑپ ! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی۔ ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی ! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچی نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں ! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے ملامت قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کامریڈ و ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر پڑھا لکھا، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر ! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں۔ اور آخر عمر میں اس سے بھی بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیتہ العلماء سے جنگ، پنجابی ٹولی سے جنگ، بنگالی ٹولہ سے جنگ، احناف سے جنگ، اہل حدیث سے جنگ۔ ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی۔ اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ ! تصدق شروانی، مجید، خواجہ، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ ! غرض ایک خدا کے لیے، ساری خدائی سے جنگ۔ دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا لیکن جس کی نگاہ یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے!

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اُسے کوئی کیا سمجھاتا اور کیونکر روکتا، اللہ کا شیر اللہ کے لیے، سب سے لڑا اور خوب لڑا، شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اُسے سچ کر دکھایا، کہا کرتا تھا اور بالکل سچ کہا کرتا تھا کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔ احباب بار بار بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا ہے کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے نہ مصلحت وقت پر نظر ہے نہ کسی کی دل شکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، کامریڈ و ہمدرد ہی کو آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں چلایا جا سکتا، کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور و غل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضائع کر دیا، ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا تھا۔ دوسرے صاحب فرماتے، تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی۔ اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی "دیوانہ" ہو چکا تھا، اُسے جو کچھ دکھا دیا گیا تھا، اس کے دیکھ چکنے کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟ ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے کہ محمد علی کو "نیشنلسٹ" ثابت کر دکھایا جائے۔ حالانکہ وہ "دیوانہ" عقل و فرزانگی سے بیگانگی دیوانگی کے اس مرتبہ تک پہونچ چکا تھا، جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے نہ "کمیونزم"۔ اُسے مدنظر صرف اپنے خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو اتنا اونچا ہو چکا ہے اسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ کر لیا جا رہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اُس کے لیے باعث فخر یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے بُت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا اُسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا لیکن اس کی ہندوستانیت بھی ماتحت تھی اُس کی اسلامیت کے! وہ "خدا" اور "وطن" دو کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف "خدا" کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی بتائی ہے، اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے وابستہ کی گئی ہیں اور جب وہ امیدیں اُن پاکوں کی ذات سے پوری نہیں ہوئی ہیں تو ناپاکوں نے اُن پر حملے خوب خوب کیے ہیں - آج کی یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ سنّت قدیم سے چلی آرہی ہے قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ ھٰذَآ اَتَنْھٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ - اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے دعویٰ محبت کا کیا اُس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروایا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک و خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا، اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گرانبار کیا گیا، محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا۔

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اسے یونہی بے امتحان و آزمائش کے چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبّوں اور عاشقوں سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لیے تو یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلّت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکست نفس

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ عشق عاشق جان او را سوختہ

محمد علی تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے اور پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللّٰہ کا کلام شاہد ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا دوہی روشن چہرہ لیے ہوئے، عالم برزخ میں جنت کی سیر کر رہا ہے اور تیرے نیازمندوں کو اپنی جگہ پر یہ یقین ہے کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کرے گا، اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے

دکھا، جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا۔ اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور پیش روی کا علم تیرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیق خاص غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ اور ایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے۔ وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے،

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے

تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیئے ہوتے

تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کیے ہوتے

خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بدنصیب قوم، تو رو اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہو گئی، تیرا والی وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! خفتہ بخت ملت آج تو یتیم ہو گئی، تیرے سر سے سایہ پدری اٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہو گئی، صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے! وہ ہر نیست کو ہست، ہر محال کو ممکن کر دکھانے پر قادر ہے، لیکن ہم اسباب ظاہری کے گرفتار بندے اب کیا کہکر اپنے دل کو سمجھائیں اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح

باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علی کی عمر کل ۵۳ سال کی ہوئی، حضور انور نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی، آقا کی مکی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصا نظر آتا رہا قبل اس کے کہ مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے، خادم کا رشتہ حیات ہی منقطع کر دیا گیا، "آج" کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ "کل" کس کس طرح نکل کر رہیں گی!

---

(۳) راجہ علی محمد خاںؒ[1]

محمد علی کے بعد علی محمد! سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ ملت نے محمد علی کا داغ سینہ پر کھایا۔ سنہ ہجری شروع ہوا، علی محمد خاں نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ قوم کا خادم جب رخصت ہوا تھا اور وطن کا مخدوم اب!

آج وہ، کل ہماری باری ہے!

آج "مہاراجہ" کی باری آئی، کل "مہاپرجا" کی باری تھی۔ شب برات میں ایک کی طلبی ہوئی، محرم میں دوسرے کی سناونی سننی پڑی، غربا، امت کا جگر "کل" پھٹ چکا تھا، امراء امت کا بازو آج ٹوٹ کر رہا! کن کن حسرتوں پر روئیے اور دل کو کیا کہکر سمجھائیے! خاص وعام، امیر وغریب راجہ اور پرجا، سب کے سب، اب حسرت و یاس کی تصویر، مجبوروں سے بڑھکر مجبور اور یتیموں سے بڑھ کر یتیم! انسان ضعیف البنیان، کائنات کے ذرہ ذرہ کی حرکت کو اپنی مرضی کے تابع دیکھنے کا آرزومند، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آج تک کبھی پروا کی گئی ہے؟ جس حکمت کاملہ نے عالم کے سرور و سردار کو مخاطب کرکے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُم مَّيِّتُوْنَ کی منادی کر دی، اس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جو بھیجے گئے تھے وہ واپس بلا لیے گئے، اور جس نے بھیجا تھا، وہ اُسی آن

---

[1] سچ ۵ جون سنہ ۱۹۳۱ء۔

اور اُسی شان، اسی جاہ، اور اُسی جلال اُسی حُسن اور اُسی جمال، اُسی دارائی اور اُسی کبریائی، اُسی رعنائی اور اُسی دل ربائی، اسی ناز اور اُسی خوبی، اُسی حسن اور اُسی زیبائی کے ساتھ، جوں کا توں قائم و موجود، حی و قیوم!

مٹ گیا نقش احمد و محمود　　رہ گیا لا الٰہ الا اللّٰہ

کہتے ہیں کہ راجہ (پرانے نیازمندوں کی زبان بجائے لفظ مہاراجہ کے "راجہ" ہی کی عادی ہے) علی محمد خاں شیعہ تھے۔ ہوں گے۔ زبانوں پر چرچا ہے کہ بڑے تنشلسٹ تھے، یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن میں جن راجہ صاحب محمود آباد سے واقف تھا، وہ مسلمان ہی تھے اور نرے مسلمان، اول بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان۔ محمد علی کی سی تڑپ اور تپش نہ سہی، پھر بھی زبان پر محمدؐ کا کلمہ، دل میں اسلام کا درد اور دماغ میں مسلمانوں کی خیر اندیشی۔ دسترخوان کی وسعت ہر مسلمان کے استقبال کو موجود، خزانہ کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لیے کُھلی ہوئیں دولت کی تمنّا تھی تو مسلمانوں پر زر پاشی کے لیے، اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے۔ ایک فیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لیے۔ ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آبیاری کے لیے۔ ایک جود و عطا کا بادل تھا جو امنڈ امنڈ کر برسا اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبہ حدود میں تشنہ لب نہ قوم کو چھوڑا نہ افراد قوم کو، اس کا در حاجت مندوں کا مرجع، اس کی ڈیوڑھی ناداروں کی امیدگاہ۔ کم نصیب تھا وہ جو اس کے ہاں سے مایوس اور اُس کے پاس سے محروم واپس ہوا۔

صوبہ کا ایک شریف سنی مسلمان حج کے لیے روانہ ہوتا ہے اور رخصتی ملاقات کے وقت بغیر کسی حق سابق کے اپنے لڑکے کا ہاتھ خالی "شیعہ" رئیس کے ہاتھ میں دے جاتا ہے، حاجی کو حج مبرور نصیب ہوتا ہے اور استراحت دائمی کے لیے حرم پاک کی سرزمین۔ یتیم لڑکا کالج کی اعلیٰ تعلیم میں زیرِ تعلیم ہے، اور ختم تعلیم میں ایک سال کی مدت باقی ہے، دریادل "شیعہ" رئیس کو اطلاع ہوتی ہے اور بارہ مہینہ کے بجائے پورے سولہ مہینہ کے لیے اور جو ماہوار رقم للعہ ر کے حساب سے ہوتی تھی، اس کے بجائے پورے فشہ ر کرکے آٹھ سو کی مجموعی رقم بینک میں اُس کے نام سے جمع کردی جاتی ہے!

لکھنؤ کے ایک نہایت شریف و ممتاز اہل سنت خاندان کی ایک مسکین بیوہ کی جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے، سامان مفلسانہ و غریبانہ حیثیت کا بھی میسّر نہیں۔ "شیعہ" رئیس کو خبر ہوتی ہے، اور دوسری صبح کو ایک معتمد خاص کے ہاتھ ایک معقول رقم چپ چپاتے اسی بیوہ کے ہاتھ میں پہونچ جاتی ہے ——— میں جس

"محمود آباد" کے غم میں افسردہ وملول ہوں۔ وہ یہ شخص تھا۔ اس کی فیاضیوں کے بے شمار واقعات میں سے یہ دو صرف نمونہ کے طور پر یاد دلائے گئے۔ وہ محمود آباد نہیں۔ جو قومی لیڈر اور نیشنلسٹ پارٹی کا افسر، مسلم لیگ کا صدر اور مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر، لکھنؤ یونیورسٹی کا ساعی اور اودھ چیف کورٹ کا محرک، گورنر بٹلر کا دوست، اور گورنر مسٹن کا دشمن، انگریزی روزنامہ آئی ڈی، پی کا مالک اور اردو روزنامہ ہمدم کا پروپرائٹر، یوپی گورنمنٹ کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا کے، سی، آئی، ای تھا۔ وہ مسکین نواز و یتیم پرور، شریفوں کا مربی اور حاجت مندوں بے وارثوں کا وارث، غریبوں کا دستگیر، مہمان نواز و سیر چشم، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا۔ اُس کے بڑے بڑے شاہانہ چندے اور لکھو کھا لاکھ کی فیاضیاں سب نے دیکھیں اس کی چھپی ہوئی خیرات اور پوشیدہ زر پاشیوں کی خبر، مخلوق میں سے کس کو؟

دنیا اور اس کی جگمگاہٹ ختم ہو چکی نیشنلزم اور کمیونزم کے مناقشے تمام ہو چکے۔ بندہ اپنے مالک کے پاس پہونچ چکا.. راجہ پرجا بن کر حقیقی مہاراجہ اور اصلی شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ نوحے لکھے جا رہے ہیں، رزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، تقریروں میں قوت خطابت کے کمالات دکھائے جا رہے ہیں اور شعراء نامدار مضمون آفرینیوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ مہذب دنیا کی ان طلسم آرائیوں کو چھوڑ کر آیئے، ہم اور آپ مل کر، سیکڑوں اور ہزاروں، محتاجوں اور درد مندوں، یتیموں اور بیواؤں، مسکینوں اور معذوروں کے ہم آہنگ ہو کر، مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت اس رب الارباب کے حضور میں پیش کریں، جس نے اپنی رضا، ناتوانوں اور کمزوروں بیکسوں اور دل شکستوں کی رضا میں مخفی کر رکھی ہے، آج نہ راجگی باقی ہے نہ مہاراجگی، نہ بٹلر کی دوستی کام آ رہی ہے نہ حکومت کی ہوم ممبری، نہ سرکاری خطابات پوچھے جا رہے ہیں، نہ انجمن تعلقداران اودھ کی صدارت نہ کوئی مصاحب و رفیق میسر ہے نہ کوئی مشیر۔ ہاں! آج قدر ہو رہی ہے تو ان بھوکوں کو کھانا کھلانے کی، جو دانہ دانہ کو ترس رہے تھے، اُن ننگوں کو کپڑے پہنانے کی جو ایک ایک دھجی اور ایک ایک چیتھڑے کے لیے آسمان کا منہ تک رہے تھے۔ جو مخلوق کی نظر میں حقیر اور بیچارے تھے، وہ خالق کے دربار میں عزت والے نکلے، جنھیں کچہریوں کے پیادوں اور کوٹھیوں کے دربانوں نے دھکے دے دے کر نکالا تھا، انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے ملائکہ کی صفیں آگے بڑھیں۔ جس نے دنیا میں ان ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا، ان ٹھکرائے ہوئے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تھا، اس کی بشری کمزوریوں اور لغزشوں کا شمار کچھ بھی سہی، کیا اس مولا کے دربار میں جو کریموں کا کریم ہے، اس کے ساتھ بجز لطف و رحمت، بجز عفو و مغفرت کے کسی اور

معاملہ کی بھی توقع ہو سکتی ہے؟ جا! اے نیک دل رئیس! اے امت مرحومہ کے غمخوار و غمگسار، اپنے رب اور اپنے مولا کے حضور میں خوش خوش جا! خائف و متردد نہ ہو، کہ آج تیری حمایت اور پشت پناہی پر تیرا بوجھ اپنے سروں پر اُٹھا لینے کو یتیموں کی فوج کی فوج، بیواؤں کی قطاروں کی قطاریں اور بیکسوں اور بینواؤں کی صفوں کی صفیں ہیں!

---

(۴) ہم نام ناموڑ[1]

سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ قوم کو ناخدائے قوم، محمد علیؒ کا داغ سہنا پڑا، سنہ عیسوی ختم ہو رہا ہے کہ دوست و محب عبدالماجد بدایونی یک بیک اور دفعتہً اپنے پست اور ادنیٰ رفیقوں کو چھوڑ کر، اس بے وفا دنیا سے منہ موڑ کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے! سنتے چلے آئے تھے کہ آغاز و انجام میں ایک رشتہ ہوتا ہے اور "اول با آخر نسبتے دارد" کسے خبر تھی کہ جو سال شروع یوں ہوا تھا وہ ختم بھی یوں ہوگا، اور کون کہہ سکتا تھا کہ ملت کے حق میں یہ پرانی ضرب المثل اپنے اس دردناک معنی میں صادق آ کر رہے گی!

شعبان ۴۹ھ آیا، تو ماتم اُس کا کرنا پڑا جو تحریک خلافت کا بانی و علمبردار تھا۔ شعبان ۵۰ھ آیا تو زخم اس کا اٹھانا پڑا، جو اس وقت مرکزی خلافت کمیٹی کا صدر تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی ماہ مبارک میں ایک شب مبارک ایسی آتی ہے، جس میں سال بھر کے لیے افراد و اقوام کی قسمتوں کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ کیا ہم شور بختوں کی قسمت میں اب لیلۃ البرات کے معنی، صرف نالہ و فریاد، یتیمی و بیوگی، حسرت و حرمان، غم و الم، شیون و ماتم کے رہ گئے ہیں؟ نہیں۔ شعبان کو تو نبیؐ نے اپنا مہینہ کہہ کر پکارا ہے۔ شعبان کو شہرت کی خلعت سے سرفراز کیا ہے، اسے سال کے سب مہینوں سے محبوب تر قرار دیا ہے (کان احب الشھور الی رسول اللہ صلعم شعبان۔ ابوداؤد) حق ہے کہ اُس آقا کے سر فروش غلام اسی مہینہ کو اپنے لیے اختیار کریں۔ اور اُس

---

[1] سچ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء

شمع کے پروانے، اپنی اپنی جان کے نذرانے، اسی محبوب زمانہ میں لے کر آگے بڑھیں!

مرحوم بدایوں کے مشہور و معزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے، ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوئے۔ ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک، دوسروں کو کھلا کر کھانے والے۔ تحریکِ خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیارِ زندگی بدل دیا اور معاشرت بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کرلی۔ جیل نہیں گئے، لیکن جیل پہونچنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعتہً ترک کر کے، درویشانہ زندگی اختیار کرلینے کا مجاہدہ بھی جیل خانہ کے مجاہدہ سے کم نہ تھا۔ خلافت، جمعیۃ علماء، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس، اور آخر میں پھر خلافت، جس تحریک میں بھی شریک ہوئے دل و جان، شغف و انہماک، مستعدی و سرگرمی سے شریک ہوئے۔ جس کام کو ہاتھ لگایا اُس میں جان ڈال دی۔ زندگی کے آخری ۱۱-۱۲ سال کا ہر روز، بلکہ کہنا چاہیے، ہر گھنٹہ قومیات کے لیے وقف تھا۔ سکون و راحت کا کوئی زمانہ نہ تھا۔ مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے باوجود کام کے پیچھے دیوانے تھے۔ اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ تیز بخار چڑھا ہوا اور حجاز کانفرنس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے، اور امین آباد میں محفل میلاد، ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے تک بیان کر رہے ہیں۔ شانے میں ورم، ہاتھ جھولے میں پڑا ہوا، لیکن یہ کیسے ممکن کہ مجلس تنظیم کی مجلس عاملہ میں شرکت نہ ہو؟ والدۂ ماجدہ نزع میں، اور مولانا کانپور میں تقریر کر رہے ہیں۔ بڑی بہو کی آخری سانسوں کی اطلاع آ رہی ہے اور آپ ہیں کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رُلا رہے ہیں۔ کل لکھنؤ میں تھے، آج کلکتہ پہونچ گئے۔ عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا نماز آکر میرٹھ میں پڑھی۔ صبح پٹنہ میں تھے۔ شام کو معلوم ہوا کہ دکن کے راستہ میں ہیں۔ عجیب و غریب مستعدی تھی، عجیب ہمت و مردانگی! تحریکِ خلافت کے، کم از کم اپنے صوبہ میں تو شاید سب سے بڑے پُرجوش مبلغ اور علمبردار تھے۔ مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

جمعیۃ العلماء کے اجلاس اجمیر واقع مارچ ۱۹۲۲ء میں جو ہنگامہ خیز تقریر کی تھی اس کی گونج اب تک کانوں میں سمائی ہوئی ہے، کانگرس نے بھی ایک زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تو بہرحال تھے، غالباً اس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ اور تحریکِ تنظیم ۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء والی تو جب تک زندہ رہی، بڑی حد تک انھیں کے دم سے چلتی رہی، مسیح الملک اجمل خاں مرحوم اور رئیس الملت محمد علیؒ دونوں سے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، شاید انھیں سے ملنے کی جلدی تھی جو وہ مضطرب روح، سب کو مضطرب چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی۔

لکھتے اچھا خاصا تھے، متعدد رسائل و مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں لیکن جیسا لکھتے تھے، اس سے کہیں بہتر، بدرجہا بہتر، چند در چند بہتر بولتے تھے۔ تقریر، اور موثر تقریر ہر موضوع پر کر سکتے تھے، سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے، اور مجلس کو لٹا دیتے تھے، لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی۔ حبیب رب العالمین کا ذکر پاک کرنے کو اٹھتے تو آپے میں نہ رہتے۔ کھڑے ہو کر بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے، اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے، خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی، اور خوش بیانی مست ہو ہو کر منہ چومتی۔ ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور ایک ایک جملہ نظر آتا تھا۔ سوز و گداز کے عطر میں بسا ہوا، نکلتا چلا آرہا ہے! فصاحت و بلاغت کا ایک دریا تھا کہ ابلا پڑتا ہے۔ کیا ابکی ربیع الاوّل میں جنت کی حوروں اور آسمان کے فرشتوں کو بھی اس کا شوق ہوا ہے کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں، اس کی نعت ایک خاکی کی زبان سے بھی سنیں ؟

بڑے زبردست و خوش عقیدہ صوفی تھے۔ قادریت حد توغلّ تک پہونچی ہوئی، ہر بزرگ کے ادب شناس، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش، بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے، لیکن شیخ الہند مولٰنا محمود حسنؒ کے پوری طرح معتقد۔ بڑے ذہین، بڑے ذکی، شوخ وطباع، بڑوں کی عظمت کرنے والے، چھوٹوں پر شفقت رکھنے والے، متواضع و خوش اخلاق، فیاض و مہمان نواز، سو وصفوں کا ایک وصف یہ تھا کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے، دل سے ملتے۔ تکبّر سے دور، تمکنت سے نفور پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے، اور اپنے اعزاز و وقار کی ذرا پروا نہ کرتے۔ جس کے دوست ہو گئے آخر تک ساتھ دیا۔ دوستی کا حق نباہ دیا۔ وضعدار ایسے کہ دوستوں اور دوستی کے اوپر سب کچھ قربان کر دیا۔ لڑتے تو جلد معاف کرنے پر تیار ہو جاتے۔ روٹھتے تو بخشنے میں دیر نہ کرتے۔ دوستوں سے خفا ذرا جلد ہوتے، خوش جلد تر ہو جاتے۔ ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے اور ہر چھوٹے بڑے کی خدمت پر کمربستہ رہتے۔ لکھنؤ میں ایک مرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی، خود دوڑ دوڑ کر مہمانوں تک کھانا پہونچاتے تھے، اور شیخ ہو کر مریدوں سے بڑھ کر کام کرتے تھے۔

مرنے والے، اپنے مالک و مولا کے حضور میں جا اور اپنے ایک ادنیٰ و گمنام ہمنام کا آخری سلام لیتا جا!

تو نے اپنے وطن سے دور، مسافرت میں موت پائی، اور تیرے سچّے سردار نے اس موت کو شہادت کی موت

فرمایا ہے۔ تیرے نامور آقا نے اپنا سفر آخرت دوشنبہ کی صبح کو اختیار کیا تھا، تیرا رخت سفر بھی اس سے کچھ ہی قبل شب دوشنبہ میں بندھا، تیری خوش نصیبی میں کسے شبہ ؟ لیکن تو دوسروں کے بچوں پر رحیم و شفیق تھا، آج خود تیرے کمسن بچوں اور بچیوں کے سر پر ہاتھ کون پھیرے گا، تیرا درد مند دل بیوہ کی اعانت کے لیے تڑپ جاتا تھا، آج خود تیری لٹی اور اُجڑی ہوئی بیوہ کی غمگساری کون کرے گا ؟ تو ہر مسلمان کے حق میں قوت بازو تھا، آج خود تیرے بھائی کے مجروح دل پر کون مرہم رکھے گا ؟ تو قوم کے دھندوں سے کسی وقت خالی نہ تھا، اب اس بیڑے کی ناخدائی کون کرے گا ؟ ——— ہاں وہی کرے گا جو تیری طرح فانی نہیں، باقی ہے، عبد نہیں رب ہے بے بس نہیں، قادر ہے، جو ہر یتیم کے حق میں باپ سے کہیں بڑھ کر شفیق، ہر بیوہ کے لیے شوہر سے کہیں بڑھکر غمگسار، ہر مسلمان کے لیے بھائی سے کہیں بڑھ کر سامان تقویت اور قوم کے حق میں ہر سردار قوم سے کہیں بڑھکر ناصر و حافظ ہے۔ جو اُن کا سہارا ہے جن کا کوئی سہارا نہیں۔ وہ جس خاک کے پتلے سے، جبتک جو کام چاہتا ہے، لیتا رہتا ہے اور جب چاہتا ہے، اپنے حضور واپس بلا لیتا ہے۔ بقا ہے تو ایک اسی کی ذات کو اور دوام ہے تو بس اسی کے نام کو اور اُسی کے کام کو!

---

(۵) خوش نصیب گول کیپر[1]

تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد۔ سنہ غالباً ۱۹۰۷ء تھا اور جاڑوں کا زمانہ، علیگڈھ کی فٹ بال ٹیم، لکھنؤ میچ کھیلنے کو آئی۔ ادھر علیگڈھ کے کھلاڑی گیند بلے کے کرتب میں اپنا سکّہ جمائے ہوئے، اِدھر لکھنؤ کی خلقت، کھیل تماشے کے شوق میں نام چمکائے ہوئے، شہر میں ایک دھوم مچ گئی، میچ پرانی کیننگ کالج گراؤنڈ پر تھا، قیصر باغ کے مشرقی و شمالی سرے پر تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، امیر، غریب، جوان، بوڑھے، طالب علم، سودے والے سبھی اور اسی ہجوم میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالب علم بھی۔ تھا، ہو لکھنؤ کے کھلنڈرے ایک سے بڑھکر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علیگڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئیں، ایک سرخ و سفید قوی تنومند، خوش رو نوجوان پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپر ہی کے فرائض کے لیے خلق ہوا ہے۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ بپھر بپھر کر کیسے کیسے حملے کرتی، اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام! بس یوں سمجھیے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں! یہ تھا علیگڈھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ "تصدق" کون کہہ سکتا تھا کہ اسے چند ہی روز بعد کھیل کود میں نہیں، فٹ بال فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبہ کے اندر نہیں، سیاسیات و قومیات کی سنجیدہ

---

[1] صدق ۳ رمئی ۱۹۳۵ء۔

اور خشک دنیا میں ہندستان بھر کے طویل و عریض رقبہ میں بڑی زبردست ٹیموں کے مقابلہ میں ملک و ملت کی گول کیپری کے فرائض انجام دینے ہوں گے!

سب سے پہلی زیارت یوں ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ سننے میں آیا کہ یہ کھیل کا مرد میدان، یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے اور اچھا جید مقرر بھی۔ یونین کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو علیگڈھ سے واقف ہیں۔ دل خوش ہوگیا کہ جو جسم کا دھنی تھا اس کا دماغ بھی کورا نہ نکلا ——— چار پانچ برس کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے ——— اب ۱۹۱۴ء آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری عشرہ۔ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے۔ اور پرانے قومی لیڈروں کے قلوب لرزہ میں! ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، فاؤنڈیشن کمیٹی، ہر قومی ادارہ میں ٹکر یڈ، ہمدرد اور الہلال کی معجزانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں! آزادی کی تحریکوں کا بگل بج چکا ہے۔ "وفاداریٔ حکومت" اور "مطالبۂ حقوق" کے درمیان پوری شدومد کے ساتھ پہلی بار طاقت آزمائی ہو رہی ہے، ایک طرف سب کے سب پُرانے لیڈر ہیں۔ یعنی وہ آقا جن کی زبانیں اس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں۔ اور دوسری طرف باغی، ابوالکلام اور شوریدہ سر محمد علی، مع اپنے چند نوعمر رفیقوں کے۔ اِن گِنے چُنے رفیقوں میں آپ کو باعتبار ظاہر جو سب سے زیادہ بلند نظر آرہا ہے (اور بلحاظ "باطن" بھی وہ کس سے کم ہے؟) وہ وہی پُرانا گول کیپر ہے۔ تصدق احمد خاں شروانی، علیگڈھ کا گریجویٹ اور لندن سے لوٹا ہوا تازہ وارد بیرسٹر۔

آج سے محمد ی۔ تحریک اُٹھاتے ہیں، چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح کی ہو یا جنگ بلقان کے چندے کی یا قوم و ملت کی آزادی کی، تصدق شروانی سب میں سب سے پیش پیش۔ شیردل جنرل کا ایک شیر دل لفٹنٹ۔ یہاں تک کہ ۲۰-۱۹ء کی وہ ہنگامہ خیز تحریک خلافت و ترک موالات شروع ہوئی۔ جس نے سارے ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک ہلا ڈالا۔ تصدق اس وقت تک ایک کامیاب بیرسٹر ہو چکے تھے۔ اب اپنے پیشہ میں نامور، گھر کے خوش حال پہلے ہی سے تھے اور اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ پریکٹس چھوڑ دو، بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کردو جو مراس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے ان السابقون الاولون میں ایک یہ بھی تھے، غالباً ۲۲ء تھا کہ علی گڈھ میں عدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا، شروانی ہنگامہ فرد کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو دل کے بخار نکالنے کا موقعہ ہاتھ لگا۔ دھر پکڑے گئے۔ اُلٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا، گئے تھے آگ بجھانے، مجرم آگ لگانے کے قرار پائے اور

وہ جس کا کام قصور واروں کا چھڑانا اور خطا کاروں کو رہائی دلانا تھا، اب خود بے جرم و بے خطا، قید فرنگ میں اسیر و محبوس تھا! ——— قید اور پھر قید سخت! غالباً کچھ روز کے لیے قید تنہائی بھی۔ ایک رئیس اور رئیس زادے کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی؟ بڑی بڑی تکلیفوں کو چھوڑیئے، تنگ و تاریک کوٹھری میں مچھروں ہی نے ایسا جھنجھوڑا کہ بے حال ہو گئے اور بیمار بن کر نکلے! ماں باپ نے نام تصدق رکھا تھا۔ کیا یہ نام، نام ہی رہتا؟ اور عزت کی، آرام کی، مال کی، جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی؟

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے۔ آزاد ہوئے اور پھر جکڑے گئے، وہ زندگی ہی کتنی تھی جو لے کر آئے تھے۔ لیکن بہرحال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب اسی الٹ پھیر میں گزار دی! ابھی دیکھیے تو علیگڈھ کی عدالتوں میں ہیں۔ الہ آباد میں صوبہ کی عدالت العالیہ کے نامور ایڈوکیٹ ہیں۔ اور دوسروں کی بگڑی ہوئی بنا رہے ہیں، موتی لال کے مشیر اور جواہر لال کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگرس کو اپنے اشارات پر چلا رہے ہیں۔ اور ابھی معلوم ہوا کہ لق و دق کوٹھی، سجی سجائی موٹر کار، نفیس مسہری اور دلکشا پائیں باغ، سب چھوڑ چھاڑ، چوروں اور اٹھائی گیروں کی سی میلی کچیلی جانگھیا پہنے کھڑے ہوئے۔ نقب زنوں اور گرہ کٹوں کی قطار میں پھٹی گدڑی اوڑھے لپیٹے، جیل کی کھری زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ بلند ہو اقبال سرکار نامدار کا، جوہر شناسی اسے کہتے ہیں، قدردانی اس کا نام ہے' ہندستان کی سرزمین کو کبھی کیوں ایسی خوش مذاق، نکتہ نواز، قدر شناس حکومت سے واسطہ پڑا ہوگا!

مرنے والا مر چکا، جینے والے اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزار ہا روپے بیدریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے؟ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا، کوئی ہائی کورٹ کا جج، کوئی ہزار کما رہا تھا تو کوئی ہزاروں لٹا رہا تھا کوئی صوبہ کا منسٹر، کوئی ایگزیکیٹو کونسلر۔ کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یوں ہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا؟ اس کے دل میں امنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اس کی بیوی بچے دوست، عزیز بھائی بند نہ تھے، کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے، دنیا کا چین کرنے، زندگی کے سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟

کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہوچکا تھا؟ کیا تکلیف اس کے لیے تکلیف اور راحت اس کے لیے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہوسکے تو سوچنے والے سوچیں۔

محمد علی جیل جاکر شاعر ہو جاتے تھے۔ ۲۱ء یا ۲۳ء کی قید سے جب نکلے تو غزلوں کا ایک پشتارہ ساتھ لیے ہوئے۔ شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ہی، شاعری میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتے۔ جیل جانے سے قبل مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں علیگڈھ کے شروانی خاندان کے بعض اکابر سے بہت رنج اٹھا چکے تھے۔ رہائی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو خوب اشعار سننے میں آئے ایک بڑی سی غزل اس زمین میں سُنائی، "بیابانیوں میں ہم" "پریشانیوں میں ہم" اس میں ایک مشہور "وفادار" علیگڈھ بزرگ کی زبان سے فرمایا گیا تھا ؎

شرط وفا یہی ہے، تقاضائے دیں یہی
گڈنی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم!

(ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے مسلمانوں کے "جیش انگورہ" کے مقابلہ میں "جیش یونان" کی تحریک کی تھی۔ یہ اشارہ اسی طرف تھا) اور تو اور اپنے بڑے بھیا تک کو نہیں چھوڑا تھا ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم!

(خبر آئی تھی کہ مولانا شوکت علی راجکوٹ جیل میں رہ کر بہت لاغر ہو گئے ہیں۔ یہ تلمیح اسی کی ہوئی) سناتے سناتے ارشاد ہوا کہ مزے کا شعر "تصدق" کی زبان سے کہا ہے، اسے ضرور سُنو۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

شرافت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے۔ یوں تو جب تک دوستی ویکدلی ہے، سبھی اچھے نظر آتے ہیں۔ محمد علی سے شروانی کا سیاسی اختلاف ۲۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا، روز بروز بڑھتا گیا۔ ادھر آغاز ۲۸ء میں مولانا کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہو کر رہی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صبح کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہو گی۔ مولانا کی لاعلمی میں دو چار نیازمندوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے کچھ ماہوار رقمیں جمع کر لی جایا کریں، نام پیش

ہوئے۔ محبت و عقیدت کے دم بھرنے والے بعض اچھے اچھے بزرگوار اس امتحان میں نکل گئے۔ شروانی کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا، میں ذکر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ الہ آباد میں ایک بار جب جی کڑا کر کے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا کہ مسرت کے ساتھ حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں! خیر وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی (زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استغناء کی بنا پر) لیکن شروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے، خوبیاں بہت تھیں، اس محبت و اخلاص، اس ہمت و مردانگی اس رواداری و فراخدلی، اس ذوق خدمت و تحمل مصائب کی مثالیں کمتر دیکھنے میں آئی ہیں۔

جمعہ کے دن کی موت، عین نماز فجر کے وقت، ہر ایک کے نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے۔ اور پھر ہزارہا مسلمانوں کی دعائیں۔ خوش نصیب گول کیپر دنیا اور آخرت، دونوں جگہ بازی لے گیا!

---

(۶) شوکت علیؒ[1]

ایک دور کا خاتمہ

نظرِ تصوّر کو ۲۵۔۲۶ سال پیچھے پھینکیے۔ مسلم یونیورسٹی کی نئی نئی تحریک کا وہ غلغلہ بلند ہے کہ ہر صدا، اس صدائے صور کے آگے دب کر رہ گئی ہے۔ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی (مجلسِ ترتیب آئین وضوابط) کا اجلاس لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کی زیر صدارت قیصر باغ میں ہو رہا ہے۔ باہر کے تقریباً سارے معزز مہمان محمود آباد ہاؤس کے عالی شان و پر تکلف مہمان خانہ میں مقیم ہیں۔ ایک "صاحب بہادر" ایسے ہیں، جن کی "صاحبیت" کی تسکین صرف انگریزی ہوٹل ہی میں ٹھہرنے سے ہو سکتی ہے۔ اجلاس ہو رہا ہے کہ دوپہر کے وقت یہی "صاحب" جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ لحیم وشحیم، گراں ڈیل، رنگ سرخ وسپید، وضع وصورت میں بالکل انگریز، مونچھیں خوب گھنی اور خوب چڑھی ہوئی آنکھوں سے گویا شعلے نکلتے ہوئے۔ یہ آنے والا تھا شوکت علی! ۱۹۳۸ء کا "مولانا" شوکت علی نہیں، ۱۹۱۱ء کا "مسٹر" شوکت علی۔ محکمہ افیون کا اعلیٰ افسر، علی گڈھ کا مشہور کرکیٹ کپتان اور مشہور ترفدائی، ہٹ چھٹ اولڈبوائے، چندہ بازوں کا سردار۔ بوڑھا نہیں جوان شوکت علی۔ اور بوڑھا اُس نے اپنے کو ۶۵ سال کے سن میں بھی کب ہونے دیا تھا؟ دنیا کی عمر سال ڈیڑھ سال اور کھسکتی ہے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخیں

---

[1] صدق ۱۵؍دسمبر ۱۹۳۸ء

ہیں۔ لکھنؤ میں وقت کی سب سے بڑی قومی مجلس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دھوم دھام سے ہورہا ہے۔ سہ پہر کے وقت کانفرنس کے مہمان امریکیوں کے مشہور زنانہ کالج، ازابیلا تھابرن کالج میں چائے پر مدعو ہیں۔ جاڑوں کی شام آتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ نماز مغرب کا وقت آجاتا ہے۔ اچھی اچھی لمبی داڑھیاں رکھنے والے، جبہ و عمامہ والے ابھی جیبیں بیٹھی ہی میں ہیں کہ اس تمام تر عیسائی و امریکی ماحول میں نماز کی صورت کیا ہو۔ ایک سوٹ پوش "نیچری" اُٹھ کر وہیں امریکی کالج کے برآمدوں اور کمروں میں نماز جماعت کے لیے اعلان کر دیتا ہے۔ اور آ آ کر ایک ایک مہمان سے خوشامد کرتا ہے کہ "بھائی" خدا کے لیے اس وقت نماز جماعت میں شریک ہو جاؤ، وضو نہ ہو نہ سہی اس وقت تو ہمیں عیسائیوں پر اپنی نماز جماعت کا سکہ جمانا ہے۔" یہ وہی سوٹ پوش، ہیٹ نواز شوکت علی ہے جس کا "قالب" اب بھی انگریزی لیکن "قلب" جنگ طرابلس و جنگ بلقان کے تجربوں کے بعد بحمد اللہ پوری طرح مسلم ہو چکا ہے ——— فقہا و اہل ظاہر جو کچھ بھی فتویٰ دیں لیکن ہائے وہ ایک نماز بے وضو، جو کتنی ہی باوضو نمازوں سے اِن شاء اللہ، اللہ کے ہاں افضل نکلے گی! ——— خون کے چند قطرے بھی اگر کپڑوں میں لگ جائیں تو نماز درست نہ رہے لیکن شہید کا سارا جسم اسی ناپاک خون سے ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور حکم یہ ہے کہ اس کو پانی سے پاک نہ کرو۔ اسی حالت میں اُس کے جسم کو اللہ کے حضور میں پہونچاؤ!

خون شہیداں را ز آب اولیٰ تر است ——— این خطا از صد صواب اولیٰ تر است

منظر بدلتا ہے۔ اور ۱۳ء و ۱۴ء میں نہ وہ صفاچٹ چہرہ رہتا ہے نہ وہ چڑھی ہوئی مونچھیں اور نہ وہ زرق برق انگریزی سوٹ۔ سر پر ہیٹ کی جگہ کلپاک، جسم پر ڈھیلا ڈھالا ترکی وضع کا موٹے کپڑے کا لمبا سبز کوٹ، چہرہ پر گھنی داڑھی اور لبیں کتری ہوئی۔ اب شوکت علی اسٹینشن کلب کی جان نہیں، انگریزی سوسائٹی کا منظور نظر نہیں۔ وہ نہیں، جس پر لیڈیوں کی نظریں دوڑیں اور جس کی طرف انگریز افسران کے ہاتھ شیک ہینڈ (مصافحہ) کے لیے بڑھیں۔ وہی شوکت علی جو طالب علمی کے زمانہ میں نیچے درجہ کے طلبہ سے ان کی اچکنیں، شیروانیاں اور کرتے اتروا کر انھیں سوٹ میں ملبوس کراتا تھا، ان کے گلے میں ٹائیاں بندھواتا تھا جسے مشرقیت سے گویا چڑ تھی۔ اور جو کہنا چاہیے کہ "صاحبیت" کا باضابطہ بپتسمہ دلاتا تھا، اب سر سے پیر تک مشرقی تھا، اور ٹھیٹھ مسلمان وہی شوکت علی جو کبھی علیگڈھ کی پرستار تھا اور اولڈ بوائز لاج کا فرماں روائے خود مختار، اب محض "خادم کعبہ" ہے، خادم محض کعبہ کا نہیں۔ کعبہ کے خادموں کا خادم، کعبہ کے زائروں کا چاکر، سینہ پر مجلس خدام کعبہ کا نشان لگا ہوا۔ جب دیکھیے حاجیوں اور زائروں کی خدمت میں سرگرم! ——— مولیٰ کی کریمی کے رنگ کیسے بے حساب اور

بندہ نوازی کے ڈھنگ کیسے بیشمار ہیں! بھاگے ہوؤں کو کس کس طرح پکڑ پکڑ کر، گھیر گھیر کر لاتے ہیں اور منہ موڑے ہوؤں کو کس کس طرح، کمندیں ڈال ڈال کر، کھینچ بلاتے ہیں:-

اس کے بعد جتنے دَور ہیں، سب کی نظروں کے سامنے ہیں۔ مقصود طولِ کلام نہیں۔ ہندستان میں تحریک خلافت عبارت تھی انھیں دو بھائیوں علی برادران کی ذات سے! ہزاروں کے لیے جیل کی راہ آسان کر دی، خود کانٹوں کا تاج بار بار پہنا کہ دوسروں کے لیے کانٹے پھول بن جائیں۔ برسوں ہندستان کے طول و عرض میں، شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک گاندھی جی اور محمد علی کے ساتھ مل کر بے تاج کی بادشاہت کی۔ مسلمان تو مسلمان، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں، تک سے اپنا کلمہ پڑھوایا۔ اور لکھو کھا بلکہ شاید کروڑوں کی زبان سے اللہ اکبر کے نعرے لگوا دیے اپنے مولیٰ کی بڑائی پکروا دی اور پھر برسوں بعد وہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، خوب سہ لیا، بھگت لیا، جب بیگانے نہیں خود اپنے بیگانے بن چکے تھے اور جنھیں کل تک ناز تھا، مولانا کی رفاقت پر نہیں، ادنی خدمتگاری پر، جو فخر و مباہات کے ساتھ آپس میں چرچا کرتے تھے کہ آج مولانا نے ہم سے چوکی پر لوٹا رکھوایا، اُن ہی نے وہ زبان درازیاں شروع کیں کہ شرافت کی آنکھیں نیچی ہو ہو گئیں اور متانت نے منہ پھیر پھیر لیا۔ دنیا بھر کا کوئی گندہ سا گندہ الزام نہ تھا کہ جو گندی سی گندی زبان سے اس پر نہ لگ چکا ہو، جو آج پھر کمال عزت اور انتہائی حمیت کے ساتھ "مردِ مجاہد" پکارا جا رہا ہے! محمد علیؒ قلب نازک تر اور دماغ حساس تر رکھتا تھا۔ کئی برس قبل اس ابتلاگاہ سے اٹھا لیا گیا۔ "بڑے بھیا" کو اپنے صبر و ضبط کا دعویٰ تھا امتحان گاہ میں سات آٹھ سال اور رکھے گئے! ——— دونوں بھائی دن میں خدا جانے کتنے الفاظ شمار و حساب سے خارج بول ڈالتے تھے۔ آخر زبان کے گناہوں کا کفارہ کیونکر ہوتا! کارساز و بندہ نواز نے کیا خوب انتظام کر دیا۔ ادھر دل و جگر پر ہر روز نشتر و خنجر چلتے رہے۔ ادھر سارے گناہ ایک ایک کر کے دُھلتے رہے۔ قرب و رضا کے درجے ایک ایک کر کے بڑھتے رہے۔ یہ سمجھے کہ ہم مظلوم ہیں۔ غیب سے ندا آئی کہ مظلوم ہی یہاں مقبول ہیں!

بزرگوں نے کہا ہے کہ اللہ والا وہ ہے جسے دیکھکر اللہ یاد پڑ جائے۔ شوکت مجذوب کی خصوصیت یہ تھی کہ شکل دیکھتے ہی اللہ اکبر کی آواز کانوں میں گونج جاتی! اللہ کے نام کو پکار پکار کر اتنی بار جپا، اللہ کے نام کی بڑائی اتنی بار خود پکاری، دوسروں سے پکروائی کہ خود ہی اللہ اکبر کا ایک مجسمہ بن کر رہ گئے تھے۔ اِدھر نمودار ہوئے کہ اُدھر نعرۂ تکبیر لگنے لگے! ——— کیا "ذکر جہر" کے سارے فضائل صرف خانقاہ نشینوں ہی کے حصّہ میں آئیں گے اور جس کے ذکر جہر سے عالم کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا وہ مردم منہ دیکھتا رہ جائے گا؟ ؎

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

سنہ ۲۴ء میں خلافت ہی نہیں ٹوٹی، محمد علی کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اور برابر اور زیادہ ہی ٹوٹتا رہا۔ شوکت کی موت، خوب وقت کی منتظر رہی۔ ادھر وہ ہستی اپنے مولیٰ کے حضور میں پہونچی۔ جس نے خلافت توڑی تھی[1]۔ اور وہ ذات بھی مخاطب ہوئی جو خلافت ہی کے نام پر بچی رہی تھی۔ پیشی اب اسی آخری دربار میں ہو رہی ہوگی جس کے بعد کوئی دربار نہیں۔ اور فیصلہ اسی عدالت سے ہو رہا ہوگا، جس کے اوپر کوئی عدالت نہیں کہ اجتہاد حق وصواب پر کس کا تھا۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ، ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔

کہتے ہیں کہ کرکٹ کی شہرۂ آفاق کپتانی کے زمانہ میں اسکی بیٹنگ بالکل بے تحاشا، بے تکان اور بے پناہ تھی، گیند پر بلّے کو اس زور وقوت سے مارتے کہ گیند وہاں پہونچ کر گرتا جہاں کوئی فیلڈر تو کیا اس کا وہم وگمان بھی نہ پہونچ پاتا۔ ۲۶ سال کی عمر کی یہ خصوصیت ۶۰ اور ۶۵ سال کی عمر تک قائم رہی۔ میدان کرکٹ کا نہیں، سیاسیات کا سہی، اس کپتان نے جب وار کیا، بے پناہ اور جب ہاتھ مارا تو اس زور قوت کے ساتھ کہ ساتھی اور تماشائی دنگ اور حریف کے چہرہ کا رنگ فق!

باؤنڈری اور اوور باؤنڈری ہیٹ لگانے والے کپتان! زندگی کی طرح موت کی بازی میں بھی جیت تیری ہی رہی۔ جلوس زندگی میں ہزارہا نکلے اور ایک سے ایک بڑھ کر پر شوکت۔ لیکن آہ ۲۸ نومبر سنہ ۳۸ء کا جلوس میّت! کیا کسی دولہا کی بارات اس دھوم سے چلی ہوگی! کیا کسی رئیس کی سواری اس شان سے نکلی ہوگی! کیا کسی سیاسی لیڈر کو اتنے سوگوار نصیب ہوئے ہوں گے! دیکھ اے شوکت ملّت! کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک رو رہی ہیں کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ کتنے سفید ریش پیر مرد خود اپنے کو آج یتیم سمجھ رہے ہیں کتنے جوانان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں۔ ہزارہا ہزار کے اس مجمع سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں، شہر میں، قصبوں میں دیہات میں، جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں، گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و دردمندی کے ساتھ برپا ہے۔ کروڑوں کی آبادی کس درد دل کے ساتھ تیرا سوگ منا رہی ہے! کتنے ایسے جنھوں نے کبھی تیری شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ آج اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا خاص انھیں کا گھر بے چراغ ہو گیا ہے!

---

[1] یعنی مصطفیٰ کمال، اتاترک

شوکت علی کی موت تنہا ایک سپاہی کی موت نہیں، محض ایک جنرل کی بھی وفات نہیں، پوری ایک نسل کی موت، ایک مستقل دور کی خاتم ہے۔ شام ہونے لگتی ہے تو آفتاب کی حدت و تمازت پہلے دھیمی پڑتی ہے۔ پھر آفتاب کے چہرہ پر زردی چھانے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ قرص آفتاب پورا غائب ہو جاتا ہے۔ جب دور تجدد و انقلاب کے پھیلنے کا وقت آیا تو کسی کی حکمت کاملہ متقاضی اس کی ہوئی کہ تہذیب محمدیؐ کے علمبردار اور 'اتحاد اسلامی' کے منّاد، ایک ایک کر کے اٹھا لیے جائیں۔ پہلا بلاوا محمد علی کا آیا۔ پھر شاہ نادر غازی کی طلبی ہوئی، پھر اقبال کی پکار ہوئی اور اب اس عمارت کے آخری ستون کو بھی مٹا کر راستہ بالکل صاف کر دیا گیا۔ شوکت علی آخری مسافر تھے، اس قافلہ کے آخری یادگار تھے، بقائے خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی (صاحب" کی اصطلاح میں پان اسلام ازم) کے اس آخری ستون گر جانے سے راستہ صاف ہو گیا، وطن کی پوجا کے لیے، سوشلزم اور کمیونزم کی خدائی کے لیے، اور نئے نئے ناموں کے ساتھ طرح طرح کے آنے والے فتنوں کے لیے ——— محض جیل جانے والے، بلکہ تختہ دار پر چڑھ جانے والے اب بھی یقیناً بہت سے پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن ملت اسلامیہ کے فروغ و برتری کے لیے، دین الٰہی کی نصرت کے لیے اپنا کاروبار مٹا دینے والا، اپنی جاہ و مال دونوں کو ذبح کر ڈالنے والا، اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لیے پیش کر دینے والا، اب کون اٹھے گا؟

وہ بات کہ مکن کی گئی کوہکن کے ساتھ!

اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا الگ رہا، خود یہ تخیل قابل مضحکہ قرار پائے گا۔ اس پر آوازے کسے جائیں گے، اس پر ٹھٹھے لگائے جائیں گے، اور اس کا نام زبان سے نکالنا، تعزیرات ملک میں سنگین جرم ٹھہرے گا۔

شوکت اعظم! زہد و تقویٰ کا پیکر نہ تھا۔ اس راہ کا مسافر نہ تھا مست و دیوانہ تھا۔ رند اور قلندر تھا۔ لیکن دیوانہ اپنے اللہ کے نام کا اور مست اپنے مولیٰ کے پیام کا۔ عمر بھر لڑتا ہی رہا۔ آج اس سے جنگ ہے کل اس سے۔ اور دشمنوں سے زیادہ خود دوستوں سے لڑا۔ لیکن یہ ساری لڑائی بھڑائی، یہ سارا شوق جنگجوئی، اسی محبوب کی خاطر جو ہر قدرت والے سے بڑھکر قادر اور ہر توانا سے زیادہ توانا ہے۔ مدت ہوئی، میر تقی میر کا ایک شعر، مثنوی زہر عشق کی دھن میں ایک صاحب کو پڑھتے سنا تھا ؂

دلِ پر خوں کی ایک گلابی سے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے

الحمد للہ کہ ایسے "شرابی" کا نمونہ دیکھنے میں بھی آ گیا۔ اللہ کے نام کا ایسا مست اور متوالا۔ اب کون دیکھنے میں

آئے گا! کس کا دل، اُمّتِ محمدیہ کی درمندی میں اتنا خون نکلے گا؟

اور موت کے بعد رُوح تو اُدھر اعلیٰ علیین کو سدھاری، اِدھر جسم کو جگہ کہاں ملی؟ آیئے! حالی کا شعر مرثیہ غالبؔ کا یاد کر لیجیے ؎

کس کو لائے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

جامع مسجد دہلی کے سامنے کا میدان، پشت کی طرف لال قلعہ، شاہانِ اسلام کی دنیوی عظمت و اجلال کی آخری یادگار، رُخ کی طرف مسجد کے در و دیوار گنبد و مینار، شاہان اسلام کی دینداری کا نشان، سبحان اللہ وبحمدہٖ اور پھر اپنے ہم مشرب سرمد سرمست کا جوار، اللہ اکبر! شوکت مرحوم اپنی زندگی میں اپنے مدفن کے لیے خود جگہ تجویز کرتے تو اس سے بہتر اور کون سی ہوتی؟ خوش نصیب اور نامور کیریکٹر! فلاح اُمّت و خدمت ملت کے میدان میں تیری باؤنڈریاں اور اُوور باؤنڈریاں، قیامت تک زندہ رہیں گی اور تیری تربت پر وہ لوگ عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے جو زندگی میں تجھے کچوکے بھی دیتے اور تیرے دل و جگر کو لہولہان بھی کرتے رہے۔ تیری تربت کے ذرّہ ذرّہ سے یہ صدا گوش دل سے سننے والوں کے کان میں آ رہی ہے۔

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر!

---

(۷) طبیب کی موت[1]

صبح تھی ۲۵ر دسمبر کی، اور وقت کوئی ۹ بجے کا، کہ خلقت کا ایک ہجوم موٹروں سے اور گاڑیوں سے اور تانگوں سے اور سائیکلوں سے اُتر کر پیدل نظر آیا، لکھنؤ کے ایک مشہور محلہ کی تنگ گلی میں۔ محلہ جھوائی ٹولہ، شہر اور صوبہ کا مشہور دار الشفاء۔ دہلی کے بعد طب یونانی کا دوسرا دار الحکومت۔ مریضوں اور زندگی سے مایوسوں کا قبلۂ اُمید۔ آج سے نہیں، پشتہا پشت سے۔ اس وقت سے کہ جب کسی کے کان میں نام بھی نہیں پڑا تھا، کسی کے ذہن میں تصور بھی نہیں آیا تھا وکٹوریہ ہاسپٹل کا، کنگ جارج میڈیکل کالج کا[2]! —— مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگتے رہتے تھے، اور یہی وقت بھی ہوتا تھا۔ آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا، آج قدم اُٹھ رہے تھے افسردگی سے اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے۔ آج نبض دکھانی نہ تھی نسخہ لکھانا نہ تھا، حال کہنا نہ تھا، خود حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا، قبر میں اُتارنا تھا۔ اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڈھے میں دفن کرنا، تربت پر فاتحہ پڑھنا! —— طبیب موت کے پنجہ میں، چارہ گر قضا کے شکنجہ میں! تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں میں، لاتعداد نظیروں میں ایک اور کا اضافہ

طبیب ابن طبیب ابن طبیب، حاذقوں کی اولاد، حاذق کے بیٹے، حاذق کے پوتے، شفاء الملک

---

[1] صدق ۶ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء [2] اُس وقت کے دو مشہور اسپتالوں کے نام۔

حکیم عبدالحمید لکھنوی، محتاج نہ تعریف کے نہ تعارف کے، مشہور طبّی درس گاہ تکمیل الطب کے روح رواں، اچھی خاصی صحت، سُرخ و سفید چہرہ، تندرست بشرہ، ابھی اِس مایوس کو دَوا پلا رہے ہیں، ابھی اُس لبِ مرگ کو خدا کے حکم سے جِلا رہے ہیں، کہ یک بیک خود بیمار پڑے، ذیابیطس اور پھر دق، پہاڑ گئے اور آئے۔ علاج یہ ہوا اور وہ۔ اور انجام آخر وہی ہوا، جو اس کشمکش کا ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جو علاج دوسروں کا کر رہا تھا خود اس کا مرض لاعلاج نکلا، جو داستان گوئی کے لیے مشہور تھا، پلک جھپکتے خود اُس کی زندگی ایک افسانہ بن کر رہی! طب کی کتابیں ازبر کر لینے سے کیا انسان آئی ہوئی گھڑی کے آگے پیچھے کر دینے پر کچھ بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے؟ دواؤں کو پہچان لینے، بیماریوں کا نام جان لینے، فن کی اصطلاحیں یاد کر لینے سے کیا مرگ و فنا کے قانون کی گرفت ایک ذرّہ بھی ہلکی ہو جاتی ہے؟ کاٹھ کی پتلیوں کو کپڑے جس کے چاہے پہنا دیجیے۔ نام بادشاہ، وزیر، کوتوال، فراش، بھشتی، دربان جو چاہے رکھ دیجیے۔ قوت ساری کی ساری اختیار کُل کا کُل کٹھ پُتلی والے کے تار اور اس کی مشیت کے ہاتھ میں ہے، یا زرق برق لباس والی مختلف شاندار ناموں والی کٹھ پتلیاں بھی اس میں کسی درجہ شریک ہیں، اختیار اور قوت سے متعلق پردے کیسے کیسے پڑے ہوئے ہیں! بچّے کس معصومیت کے ساتھ بادشاہ اور وزیر اور کیا کیا، اُن پتلیوں ہی کو یقین کیے ہوئے ہیں!

انتقال سے چند روز قبل، عیادت کا اتفاق چند منٹ کے لیے ہوا۔ چہرہ پر نور اور زیادہ آگیا تھا، گھُلتے جاتے تھے اور ڈھلتے جاتے تھے۔ لب برابر ہل رہے تھے۔ نماز کی پابندی ساری عمر کی اور آخر عمر میں حج و زیارت، آخر بے نتیجہ تھوڑے ہی رہ سکتی تھیں؟ اور پھر بالکل آخر میں موت سے کچھ ہی روز قبل، ایک ولی کامل کی نظر عنایت شفقت اور اس کے ہاتھ پر بیعت! عیادت کا بڑا وقت اس بیعت پر مبارکباد دینے میں صرف ہوا ——— استغفار اور بیعت ایسے وقت میں جب کسی نئی معصیت میں مبتلا ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں، اور مجاہدات اضطراری ہیں کہ ساعت بہ ساعت طے ہوتے جا رہے ہیں! اور مرشد کامل کی توجہ خاص اس پر مستزاد ——— حُسنِ انجام کی پیش خبری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے! اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہٗ۔

---

(۸) ماں کے قدموں پر[1]

ماہ مبارک ربیع الاوّل کی پندرہویں اور اپریل کی تیرہویں۔ اتوار کا آفتاب غروب ہونے کو اور شب دوشنبہ شروع ہونے کو۔ وطن سے دُور، پردیس میں، ایک اللہ کی بندی پر نزع کا عالم طاری ہے۔ لڑکی، لڑکوں، پوتوں، پوتیوں کا حلقہ زبانوں پر اللہ کا نام، اللہ کا کلام، اور توحید کا کلمہ۔ ادھر آفتاب غروب ہوا۔ اُدھر روح پاک عمر کی ۸۵ سے زائد منزلیں طے کیے اپنے مالک کے حضور میں پہونچ گئی ——— میری جنت انھیں کے قدموں کے نیچے تھی۔ خوش نصیب تھا میں کہ اتنے عرصہ تک خدمت کا موقع پایا۔ بد نصیب ہوں میں کہ قدر اس نعمت کی ایک دن بھی نہ کی۔ اور جو سب سے زیادہ مستحق خدمت کی تھی، اس کی خدمت کا حق ایک بار بھی ادا نہ کیا! حادثہ سخت، لیکن اپنی محرومی و بد نصیبی اس سے سخت تر!

نماز کی پابندی کا نہیں، نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دَور کے اکابرین میں بھی بس چند ہی مثالیں ایسی ملیں گی۔ اشراق، چاشت، تہجد کا وہ اہتمام کہ ہم جیسوں کو تو فرض کے لیے شاید ہی نصیب ہوتا ہو۔ یہ سن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موسم میں بھی ناغہ نہ ہونے پائے۔ گرمیوں کی مختصر راتیں کہ فجر تک بھی نیند پوری ہونی مشکل۔ یہ ابھی لیٹی نہیں کہ ابھی تہجد کے لیے اُٹھ بیٹھیں۔ چلّے کے جاڑے پڑ رہے ہیں۔ صبح ہونے پر لحاف کے اندر سے نکلنا دشوار اور یہ رات کے ایک بجے اور دو بجے اور تین بجے، تہجد کے لیے وضو کر رہی ہیں! عزیزوں میں کوئی پردیس سے

---

[1] صدق ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

آیا، کوئی بیماری سے اچھا ہوا، کوئی امتحان میں پاس ہوا، غرض کسی قسم کی بھی خوشی ہوئی اور انھیں نماز شکر ادا کرنے کا گویا حیلہ ہاتھ آ گیا۔ آئے ہوئے عزیز سے ملیں گی بعد کو، نماز کو پہلے کھڑی ہو جائیں گی۔ کسی کے انتقال کی خبر سنی اور جھٹ کچھ رکعتوں کے ایصال ثواب کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جتنی رکعتیں پڑھ ڈالیں، ان کا علم تو بس اللہ کے فرشتوں ہی کو ہوگا۔ محلّہ کی، شہر کی جو عورتیں ملنے ملانے آتیں، ان پر تبلیغ نماز کی کیا کرتیں۔ خدا جانے کتنوں کو نمازن اور بعض کو تہجد گزار بنا دیا۔ نماز ہی کا سا عشق نماز کی پکار یا اذان کے ساتھ تھا۔ پردیس میں اگر مکان ایسا مل جاتا جہاں اذان کی آواز صاف آتی تو باغ باغ ہو جاتیں۔ وطن میں رہتیں تو گھر کے صحن میں، یا ڈیوڑھی میں برابر اذان دلاتی رہتیں۔ کئی سال قبل سے کہہ رہی تھیں کہ مرنے کے بعد جی تو یہی چاہتا ہے کہ مسجد کے عین دروازہ پر دفن ہوں کہ اللہ کے گھر کے آنے جانے والے میرے اوپر سے گزرتے رہیں، اور خیر، یہ ممکن نہ ہو تو میری قبر مسجد سے متصل ہی ہے کہ اذان کی آواز برابر آتی رہے۔ نماز و اذان کے بعد نمبر روزہ کا تھا۔ عمر ستر کی ہوئی اور پچھتر کی، اور اسّی کی، یہاں تک کہ پچاسی سے گزر گئی، اور فرض روزہ تو کیا کوئی چھوٹنے پاتا، عاشورۂ محرم اور عرفہ ذی الحجہ اور پندرہویں شعبان کے روزے، موسم کوئی سا بھی ہو، ترک نہ ہونے پاتے، جوان جوان ہمت و عزیمت کی یہ مثالیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ حج اپنے شوہر مرحوم کے ساتھ ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں کر آئی تھیں اور کفن کا کپڑا، آب زمزم سے دھلا ہوا، اسی وقت سے سفر و حضر میں ساتھ رکھنے لگی تھیں۔ زیارتِ مدینہ اور دوبارہ ادائے حج کی تمنّا عمر بھر رفیق رہی۔ نماز کی طرح ادائے حج کی بھی تبلیغ پاس بیٹھنے والیوں کو کیا کرتیں۔ خیر خیرات، داد و دہش کی تو کہنا چاہیے، پُتلی تھیں۔ ہم لوگوں کے بچپن میں بارہا یہ ہوا کہ گھر میں مٹھائیاں یا موسمی پھل بہت سے آئے اور ہم خوش ہوئے کہ کئی دن تک خوب کھائیں گے۔ ذرا دیر میں دیکھا تو سب تقسیم ہو چکا! اب بڑھاپے میں یہ تھا کہ دسترخوان پر کوئی مخصوص چیز لائی گئی گھر کی انھیں معظمہ کی خاطر اور انھوں نے چٹ اٹھا، دوسروں کو بھجوا دی۔

اردو کی شُدبُد معمولی سی تھی، وہ بھی اب بھول بھال گئی تھیں۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی تھیں، زیادہ رواں وہ بھی نہ تھا، اور اب تو ضعف بصارت کی بنا پر اور زیادہ اٹکنے لگی تھیں۔ لیکن ہمت میں ذرا سا فرق نہیں، وہی شوق، وہی دھن۔ جلی حروف کا قرآن لے کر بعد اشراق بیٹھ جاتیں، ایک ایک سطر نکالنے میں ایک ایک منٹ لگ جاتا! اپنی ہار بھلا کبھی بھی ماننے والی تھیں! مذہبی کتابیں اخیر عمر میں اپنی پوتیوں سے پڑھوا کر سنا کرتیں، قُویٰ بجز شدید گراں گوشی کے عام طور پر آخر تک اچھے رہے۔ بے تکلف چلتی پھرتیں، کوٹھے پر چڑھتی اترتیں، دُعا بھی اس کی کیا کرتیں کہ اللہ ہاتھ پیر آخر تک جواب نہ دیں۔ ہاتھ میں ذائقہ تھا، کھانے کی مخصوص چیزیں کچھ روز

بیشتر تک کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے پکاتی رہتیں۔ اور عینک لگا کر سیتی پروتیں۔ کپڑے اپنے ہاتھ سے گویا بالکل آخر تک قطع کرتی رہیں، ادھر کئی سال سے اکثر اسی موسم میں بیمار نزلہ و بخار میں ہو جاتیں، اور چند روز بعد اچھی ہو جاتیں۔ اب کی بھی دھوکا یہی رہا۔ خیال سن کی طرف گیا ضرور، لیکن نفس نے جواب یہ سمجھا دیا کہ ان کا سن تو ابھی پھر کم ہے، اُن کی ایک بڑی بہن کی عمر ۹۵ سال کی ہوئی تھی، اور ان کی والدہ کی تو اس سے بھی زائد! اور پھر معالجین کی اطمینان دہی اس پر مستزاد! غرض یہ کہ آنکھوں پر پردے غفلت ہی کے پڑے رہے ——— اور ساعتِ موعود تو جب آتی ہے، ایسے ہی دبے پاؤں اور زیر نقاب آتی ہی ہے! آہ نادان انسان اور اس کے غلط اندازے!

"بھیا، اب سورہ یٰسین پڑھ دو" یہ آخری الفاظ تھے، جو اُس چاہنے والی، ناز اٹھانے والی ہستی کی زبان سے میں نے سُنے۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ اب اِس کے بعد کوئی اور پوری بات اس محبت والی زبان اور شفقت والے ہونٹوں سے سننا۔ مجھ کم نصیب کے نصیب میں نہیں تعمیل ارشاد میں یٰسین شریف ایک نہیں دو بار پڑھ کر دم کر دی عارضی سکون ہوا، چہرہ پر بحالی آئی لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی۔ نماز۔ وضو تیمم کی فرمائشیں ادھ کٹی لفظوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ برابر جاری رہیں۔ ہاتھ اٹھاتی ہیں، کانوں تک لے جاتی ہیں۔ پھر سینہ تک لے آتی ہیں، گویا نماز پر نماز پڑھے چلی جاتی ہیں ——— اللہ کے کلام اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ۔ کی تفسیر کتابوں اور روایتوں کی مدد کے بغیر، ایک نئے رنگ میں مُشاہد ہو رہی ہے!

اللہ کی بندی کا سابقہ اپنے مولیٰ سے تھا۔ بیٹے اور پوتے پاس کھڑے پکار رہے ہیں اور کوئی جواب نہیں ملتا! یا اللہ! اتنی بے رخی تو زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھی تھی! چہرہ دھلے کپڑے کی طرح یک لخت سفید، خون کی چھینٹ نام کو نہیں، بس نور ہی نور! حالت منٹ منٹ پر کچھ سے کچھ ہوتی گئی، تنفس تیز سے تیز تر ہو گیا، نبض کا نظام بگڑ گیا، آنکھ کی پتلیاں جم کر رہ گئیں، ناسوت کے رشتے ٹوٹنے لگے، برزخ کے دریچے کھلنے لگے، حلق نے دوا پانی سب سے انکار کر دیا، بجز آب زم زم کے! اللہ کی کریمی کے قربان کہ اس کے قطرے آخری وقت بھی اُتر گئے۔ چارپائی قبلہ رُخ کر دی گئی ہاتھ پیر برابر کر دیئے گئے، اس نامہ سیاہ نے سورہ یٰسین آخری بار پڑھنی شروع کی، جب آیہ کریمہ سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ، آئی، جی نہ مانا، بار بار اس کی تکرار اپنا منہ کان کے قریب لے جا کر کی! ادھر زبان پر فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ آیا، اُدھر روح پرواز کر گئی۔ شاید اسے انتظار ہی اس بشارت کا تھا!

موت کے کچھ دیر بعد میں نے ہاتھ چھو کر دیکھے، انگلیاں اب تک نرم تھیں، یہ وہی ہاتھ ہیں جو دادو دہش میں کیسے کھلے ہوئے تھے، اور نماز کے وقت کیسے بندھے ہوئے رہتے تھے! زمزم میں ڈوبا ہوا کفن اسی گھڑی کے انتظار میں ۲۹ برس سے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا، آج کام آیا۔ غسل، بیٹی، بہوؤں اور پوتیوں نے مل کر دیا۔ پردہ کے باہر سے ہم لوگ ہدایات دیتے رہے اور لوٹوں میں پانی بھر بھر کر دینے سے گویا خود بھی غسل میں شرکت کر لی۔ غسل و کفن کے بعد نعش ایک آرام دہ موٹر لاری پر وطن لائے۔ دفن کے لیے جگہ خاندانی مسجد سے بالکل متصل ملی۔

اے اللہ کی بندی، تیری عمر بھر کی آرزو پوری ہوئی۔ اذان کی آواز کے ساتھ تجھے عشق تھا۔ اب جی بھر کر یہ آواز قیامت تک سُنے جا۔

نماز جنازہ اسی نامہ سیاہ نے پڑھائی۔ جنازہ میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے، سب کو معلوم ہے اُن اذکار و ادعیہ کے ساتھ ساتھ زیر لب تقریباً یہ مناجات بھی جاری رہی۔ اے مالک و مولیٰ! آج تیرے حضور میں وہ بندی آرہی ہے جس نے پچاسی[۸۵] سال کی عمر تک روزہ حتی الامکان کبھی قضا نہیں ہونے دیا۔ نماز ایک وقت کی بھی ناغہ نہیں ہونے دی، تیری مخلوق سے محبت کرتی رہی، خود بعد کو کھایا اور دوسروں کو پہلے کھلایا، جو پایا اس میں دوسروں کو شریک کیا، مئی، جون کی لپٹ اور تپش میں روزے رکھے، دسمبر، جنوری کی کڑکڑاتی راتوں میں اُٹھ اُٹھ کر نماز پڑھی۔ عزیزوں کی، قریبوں کی، بستی والوں کی غمخوار تھی، تیرے نام کی عاشق، تیرے رسول ؐ کے نام کی دیوانی تھی، گواہی دیتا ہوں کہ اس نے میرے ساتھ دنیا میں جو آخری کلام کیا وہ تیرے ہی کلام کے پڑھنے کا حکم تھا! آج بیوائیں اُس کے نام پر ماتم کر رہی ہیں اور یتیم اس کے لیے سر پیٹ رہے ہیں اُس کی موت اس مہینہ میں آئی جو تیرے رسول ؐ برحق کی وفات کا مہینہ ہے، اُس وقت آئی جب شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی، اُس مرض (بخار) میں ہوئی جسے تیرے رسول ؐ نے شہادت کی موت بتائی ہے، پھر پردیس میں ہوئی جو تیری رحمت کو جوش میں لانے کا ایک ذریعہ ہے، ابدی نیند کی جگہ اُس نے ڈھونڈ کر تیرے گھر کے جوار میں اس طمع میں پائی کہ تیرا نام اس کے کان میں پڑتا رہے، تیری رحمت تو کسی سہارے کسی بہانے کی محتاج نہیں، اس کے لیے تو اتنے بہانے موجود ہیں۔ اے میرے اور اس کے دونوں کے کریم و شفیق آقا! اس کی لغزشوں سے درگزر کیجو، اس کی خطاؤں پر خط عفو پھیر دیجو، اس کے حسنات کو بڑھائیو اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیجیو جو شایان شان ہو، تیری رحمت کے، تیری صفت ستاری کے، تیری صفت غفاری کے!

احباب کرام مجھے تعزیت نامہ لکھنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ اللہ ہی سے دعائے مغفرت و ترقی درجات کریں اور ایصال ثواب اگر بلا تکلف و زحمت کر سکتے ہوں تو اپنے ہی مقام پر کر دیں!

(۹) سر سکندر حیات[1]

سر سکندر حیات خاں مرحوم کی ختم حیات کی خبر آپ نے اخبارات میں پڑھ لی؟ ماتم کی صدائیں جو ملک بھر میں گونجیں، وہ بھی سُن لیں؟ صوبہ اور پنجاب جیسے زبردست صوبہ کے وزیرِ اعظم تھے۔ اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے سارے ہم عصروں سے بڑھ چڑھ کر، تدبر و فرزانگی میں لاجواب، سوجھ بوجھ میں، فہم و دانش میں اپنی نظیر آپ۔ عملاً وزیر نہیں، تاجدار تھے، نائب نہیں خود مختار تھے۔ ماتحت نہیں، سالار تھے، بڑھ چکے تھے، بڑھ رہے تھے، اور خود تو بڑھ ہی رہے تھے، اوروں کو بھی بڑھا رہے تھے۔ اچانک حسرت ناک موت کی خبر سننے کے لئے دوست دشمن کوئی بھی تیار تھا؟ اس کا گمان بھی تھا؟ اچھے خاصے ہٹے کٹے، تندرست، توانا، مضبوط، چہرہ گُل کی طرح شگفتہ، صحت فصل بہار کی طرح شاداب و تازہ۔ موت عین شادی کے گھر میں، عین شادمانی کی گھڑی میں آئی! بڑے نورِ نظر اور چھوٹے لختِ جگر کے سہرے کے کھلے ہوئے پھولوں کو روندتی ہوئی، مسلتی ہوئی، کچلتی ہوئی۔ پھر جنگل بیابان نہیں، گاؤں اور دیہات نہیں، لاہور جیسا مرکزِ تمدن، بہتر سے بہتر حکیم، حاذق سے حاذق ڈاکٹر، بلانے کے لیے ٹیلیفون، آنے کے لیے موٹر، سکنڈوں میں خبر گئی، منٹوں میں ڈاکٹر آئے، موت کے فرشتوں کی رفتار دونوں سے تیز تر نکلی —— جو ہستی مجسم "حیات" تھی جس کی رگ رگ میں زندگی اور قوت کی تیز نبضیں اچھل رہی تھیں، آناً فاناً بجھ گئیں، ختم ہو گئیں قبل اس کے کہ علاج و تدبیر کوئی ادنیٰ بھی ہو سکے!

---

[1] صدق ۱۸ر فروری ۱۹۴۳ء

دنیا ایک بڑی اور اسی سکندر نام کی شخصیت سے بھی واقف ہے۔ اقبال مندی اور دنیوی خوش قسمتی کے لحاظ سے ان مرحوم سے بھی کہیں برتر۔ وہ دنیا کا فاتح اعظم تھا۔ سارا یونان فتح کیا، ایران کو مسخر کیا، دارا کے تخت کا تختہ اُلٹ دیا، عراق میں، توران میں اپنا جھنڈا لہرایا، خراسان کو، شمالی ہندستان کو زیر کیا۔ بلخ کو، بخارا کو، ترکستان کو تابع فرمان کیا۔ عین زمانہ شباب میں، عالم مسافرت میں خود اپنا وقت موعود آپہونچا۔ تو زور آوری ختم تھی۔ اور ساری کوششیں، تدبیریں بے اثر۔ مقررہ گھڑی، ایک سکنڈ کے لیے، ایک سکنڈ کی باریک سے باریک کسر کے لیے، نہ آگے بڑھ سکی نہ پیچھے ہٹ سکی!۔

جاہ وحشم کی خوش تدبیریں، طبیبوں کی حذاقت، تیمار داروں کی دردمندی، اگر کہیں بھی سپر بن سکتی تو ماضی میں سکندر یونانی اور حال میں سکندر پنجابی یقیناً موت کی گرفت سے باہر رہے ہوتے! غفلت کے بندو، عبرت کی آنکھ اب بھی بند ہی رکھو گے؟ خودی کے متوالو، ہوش اب بھی نہ آئے گا؟ سکندر مقدونی کا انجام تو اللہ کو معلوم۔ سکندر پنجابی کا حال اللہ کے کرم سے ہم پر آپ پر سب پر روشن ہے۔ الحمدللہ کہ مسلمان تھا، ہمارا بھائی تھا۔ توحید کا قائل، رسالت کا معتقد، اسلام کا کلمہ گو، محمدؐ کی اُمت میں شامل، نماز کا پابند، روزہ کا شدت سے پابند۔ کلام الٰہی کی اشاعت کا ساعی، اپنی بصیرت کے مطابق اُمت محمدیؐ کی فلاح کا داعی۔ اپنے کو عمر بھر مسلمان کہا، مسلمان سمجھا۔ اور ظرف ماحول، بساط کے موافق، اپنے کو مسلمان بنایا اور رکھا۔ فیلڈ مارشل ویول کے پیام، رائٹ آنریبل چرچل کے سلام، فوج کی سلامیاں، لاٹ صاحب کے ہاں کی حاضر باشیاں، سب جسم کی کثافتیں تھیں، یہیں زیر زمین دفن ہو گئیں۔ روح عرفانی لطافتوں کے پانی سے دُھل کر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک ہوئی اور ان قیدوں سے آزاد، ایمان کے بازوؤں سے چڑھی اور یقین و اعتقاد کے پروں سے عالم بالا کی سمت میں بلند ہوئی، ہزارہا دل والوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ ہزاروں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ؎

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی!

(۱۰) نئی نویلی[۱]

وہ ابھی بالکل نوجوان تھی، شادی کو پورا سال بھی ابھی کہاں گزرا، دس ہی گیارہ مہینے تو ہوئے۔ قریبی رشتے سے میری بھتیجی تھی، اردو ترجمہ قرآن پڑھنے میں شاگرد بھی۔ بڑی مذہبی، بڑی صالح، نماز کی عاشق، روزے کی شیدائی سب کی ہمدرد و غمخوار بڑی مخلص، بڑی خدمت گزار، بچہ، ہنستا کھیلتا پیدا ہوا۔ دوسری رات کو بیمار پڑی اور تیسری صبح کو قبل اس کے کہ آفتاب اپنے پورے عروج پر پہونچے اس کی عمر کا آفتاب غروب ہوگیا! انا للہ۔ زچگی کی موت شہادت کی موت ہے، سچے کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا، پھر دفن کے وقت شبِ جمعہ شروع ہوچکی تھی۔ زبان پر آخر تک یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم رہا۔ دوسروں سے سورہ یٰسین فرمائش کرکے پڑھوائی مردہ چہرے پر بجائے مردنی اور بے رونقی کے رونق اور تازگی۔ آنکھیں ذرا کھلی رہ گئیں، ان سے بجائے بدنمائی کے اور خوشنمائی اور زیبائی! نام ایک پیمبر زادی کے نام پر رقیہ تھا۔ قبر میں باپ نے اتارا یہ نہ پوچھیے کہ کس دل سے! —— اُس جواں مرگ پیمبر زادی کو بھی تو قبر میں اُتارنے والے اس کے والد ماجد اور اللہ کے محبوب ترین پیمبر تھے —— اللہ اللہ امت کا باپ اپنے فرزندوں کو، سخت سے سخت مصیبت کے وقت کیسے کیسے سبق تسلی اور تعزیت کے اپنی زندگی سے دے گیا ہے!

موت کا وقت عجب پُراثر، پردرد تھا، لکھنؤ کے ایک بڑے حاذق طبیب، بورڈ آف میڈیسن کے پُرانے ممبر اور شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز، جو اتفاق سے عزیز قریب بھی تھے، ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں، ابھی

---

[۱] صدق ۶ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء۔

ہاتھ مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی آنکھوں کی پتلیوں کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار باقی بھی ہیں! ——— گویا یہ تدبیریں موت کے فرشتہ کا ہاتھ پکڑ لیں گی! ——— ماں کی دلدوز آہیں اور دعائیں! کس قلم کے بس میں ہے کہ مصوّری ماں کے رنج کی کر سکے؟ لیکن رنج بحمداللہ مسلمان ماں کا تھا۔ اِدھر غش سے اٹھی اُدھر سلسلہ پھر دعا و مناجات کا، کلمہ و قرآن کا شروع ہو گیا۔ اے اللہ تیری امانت تیرے سپرد، نعمت تو ہی نے دی تھی، تو ہی نے اسے واپس بھی لے لیا! ——— مسلمان عورت جنّت بھی کتنے طریقوں سے لے سکتی ہے!

جسم رنجور، روح مسرور۔ "اب کوئی ہمیں پہچان نہیں پڑتا" مرنے والی نے ہراس و اضطراب سے نہیں، سکون و اطمینان سے کہا، سکرات شروع ہو چکا تھا۔ بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی اور معاً زبان بھی بند ہو گئی، ہونٹ دو بار اللہ اللہ کہنے کے لیے ہلے۔ اور ایمان والی کی روح رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بشارت پر دوڑتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

اللہ کی جو بندی اپنے مولیٰ کی یاد سے کسی حال میں غافل نہ ہوئی تھی۔ جس نے نماز کو شادی کے نغموں اور رخصتی کے ہنگاموں میں بھی قضا نہ ہونے دیا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ مولیٰ کی یاد اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی! کوئی اُس یاد کی طرف دوڑ کر دیکھے تو، وہ یاد خود کب اس کا پیچھا چھوڑتی ہے؟ ——— فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کی ایک نئی تفسیر، عملی رنگ میں!

---

(۱۱) قائد ملت[1]

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے، ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال یہ آیا کہ موت آج ہی کل میں اگر آگئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کا دل چاہتا ہے؟ نام کئی ایک ذہن میں آئے۔ لیکن سب سے پہلا نام جو ذہن میں آیا وہ اسی مجاہد اسلام، بہادر خاں حیدر آبادی کا تھا، کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے، پھرتے پھراتے عین اس وقت اتفاق سے لکھنؤ آموجود ہوتے! ایسا کیوں ہونے لگا۔ لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں! ــــــ

یہ تھی اس نامہ سیاہ کے دل میں اس شیر دل مجاہد ملّت کی محبت، عظمت اور عقیدت!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جارہی تھیں، کسے وہم گزر سکتا تھا کہ وہ یوں دھوکا دے جائے گا! اور جس کی دعاؤں کے لیے یہ طلب و تمنّا تھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہو جائے گا ــــــ آہ مشت خاک انسان، اور اس کے تار عنکبوت جیسے بودے، پھسپھسے، مکڑ ور ارادے، حوصلے، سہارے!

۴۰ سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی! اور پھر کیسے تندرست و توانا، ہنس مکھ اور خوش مزاج، خوش سیرت، خوش صورت، بلا کے ذہین و نکتہ رس۔ کس بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول، چمن بھر کو مہکاتا ہوا بات کی بات میں نذر خزاں ہو جائے گا؟ محفل بھر کو منوّر رکھنے والی شمع اسی لمحہ، اسی آن بجھ جانے کو ہے! ــــــ

---

[1] صدق ۱۰ر جولائی ۱۹۴۴ء

کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی، نہ سکرات کی تکلیفیں نہ نزع روح کی سختیاں۔ اور کیوں ہوتیں؟ جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کی ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنا لیا تھا، اس کی روح پکارنے پر مگا الیک آخر کیوں نہ کہتی؟ تاخیر و تامل کی وجہ ایک منٹ کے لیے بھی آخر اُسے کیا ہو سکتی تھی؟ —— رہبر دکن والے، رہبر ملت کی[1] دو سال قبل کی فوری موت کا راز بھی اب کچھ کچھ سمجھ میں آیا۔ جو دنیا میں نقیب تھا، اس سے آخرت میں بھی نقیب ہی کا کام لیا گیا۔ اور عجب کیا کہ جو دنیا میں خدمت ملت کے دیوانے اور فلاح اُمت کی خاطر ایک دوسرے کے دست و بازو، رفیق و ہم و دمساز تھے، انھیں جنت میں بھی اُن کی خواہش پر یہی مشغلہ تفریح دے دیا گیا ہو! جو یہاں محمدؐ کے دین کا سودائی تھا، عجب کیا جو جنت کی ہواؤں نے اس کو تیز سے تیز تر کیا ہو!

حیدر آباد کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ جس نے آج سے ۲۰۔۲۲ سال قبل کیا ہے، وہ آج ان حیدر آبادیوں کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ اتنے دنوں میں ان کی کایا پلٹ کس نے کر دی؟ جو قوم سر تا سر بے عمل، مجہول، افسردہ، منتشر اور پست مذاقی اور بد نظمی کا شکار تھی، اس میں عمل، تنظیم، انضباط کی برقی رو کس نے دوڑا دی؟ یہ مُردوں کو زندہ کر دینے والی مسیحائی کس نے کر دکھائی؟ حیدر آبادی مسلمان، شمالی ہند کے مسلمانوں کے سامنے شرم سے نہیں فخر سے پیش ہو سکے، یہ قلب ماہیت کس نے کر دی؟ اور جو دکن، اجتماعی اور ملی زندگی میں سبق لینے کے قابل بھی مشکل سے تھا اُسے سبق دینے کے قابل کس نے بنا دیا؟ سارا کارنامہ، (قلم لکھنے چلا تھا کہ اعجازی کارنامہ) اسی مرنے والے زندہ جاوید بہادر خاں اور اس کے چند مخلص رفیقوں کے اعمال ناموں میں لکھا جائے گا ——

"قائد ملت" جس کسی نے اُسے کہا اُس نے کوئی شاعری نہیں کی۔ ادبی صنعت گری، لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا، ایک حقیقت بیان کر دی، تاریخ کی طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اکل کھری۔ قائد ملت (اور آج یہ لفظ پہلی بار صدق استعمال کر رہا ہے) کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علیؒ کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا۔ ہندستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا تھا، تو وہ یہی تھا، وہی اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ وہی نبض شناسی، وہی ہمت و عزم، غرض بجز محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے اور سب کچھ وہی! —— لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سُننے میں آتی ("سنتا" اس لیے کہ شرکت کا اتفاق بہ طور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو برابر

---

[1] مولوی احمد محی الدین مرحوم، ایڈیٹر رہبر دکن (حیدر آباد دکن)

یہی اطمینان رہتا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرا کے رہے گی ؟

۲۶ راکتوبر ۱۹۴۱ء مقام علی گڈھ۔ یونیورسٹی کی مجلس تاریخ وتمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب دونوں کا بیان ہونے والا تھا۔ نواب سحر بیان کی خطابت بچہ بچہ سے خراج تحسین حاصل کیے ہوئے اہل جلسہ نے غلطی اور شدید غلطی کر کے مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ ہی رکھدیا۔ وسیع اور لق ودق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک کھچا کھچ بھرا ہوا۔ سامنے جولاوڈ اسپیکر لگا ہوا تھا، اس نے جواب دے دیا۔ اب بھلا میری آواز کیا ہو بخنی۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔ کچھ سنائی نہیں دیتا اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں" میں تو پہلے ہی ہٹنے پر آمادہ تھا، فوراً صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اُترنے لگا معاً نواب کھڑے ہو گئے اور گرج کر بولے" کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے بیان کو اوّل سے آخر تک سنوں گا، میں تو انھیں کا لکچر سننے کو آیا ہوں۔ اور جب تک وہ اپنا لکچر ختم کر نہ لیں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کروں گا۔"

مجمع میں سناٹا چھا گیا! ——— ہے کہیں اس دور میں اس شرافت کی مثال ؟

۶ راپریل ۱۹۴۲ء لکھنؤ۔ نواب یوم اقبال رح کی صدارت کر کے ندوہ میں، ڈالی باغ میں، گنگا پرشاد میموریل ہال میں، متعدد جلسوں میں معرکہ کی تقریریں کر کے صبح کی گاڑی سے براہ دہلی حیدر آباد واپس جا رہے ہیں۔ میں صبح ۸ بجے ان کی قیام گاہ پر پہونچا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی، موٹر سٹارٹ ہوتا ہے۔ ادھر نواب کی زبان دعاؤں پر کھلتی ہے، سواری پر سوار ہونے کی دعا ہوگی ابھی ختم ہوئی جاتی ہے۔ لیکن یہ کیا، کہاں ابھی ختم ہوئی۔ دو سکنڈ چار سکنڈ، بیس سکنڈ۔ ایک دعا، دو دعائیں، سلسلہ ہے کہ ختم ہونے ہی نہیں آتا۔ اور دعائیں زیادہ تر حدیث کی۔ یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین کی قسم کی کوئی کتاب! شرم سے کٹا جا رہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم اور مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں، یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی نہیں یاد ان کا ورد سفر تک میں رکھنا تو خیر الگ رہا، یہاں تو یاد بھی نہیں! اب انتظار کہ نواب کا خشوع وخضوع کچھ کم ہولے، تو ادھر اہل دنیا کی کچھ زبان کھلے۔ مگر توبہ اس کا موقع ہی کیوں آنے لگا تھا۔ دعاؤں کا سلسلہ نہ ختم ہونا تھا، نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اسٹیشن آگیا! ——— ایک مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو مستثنیٰ کر کے اور کسی لیڈر کی چاہے وہ آل انڈیا ہوں یا صوبہ دار، مذہبی اعمال میں مصروفیت کی ایسی مثال تو نہ اس کے قبل اپنی آنکھوں نے دیکھی تھی نہ اس کے بعد۔

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

خوش نصیب قبر، خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لیے اللہ کے دین کا دلیر و باہمت سپاہی آرہا ہے۔ وہ غریبوں کا سہارا تھا، بیکسوں کا والی تھا، ملت کا پشت پناہ تھا۔ وہ ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اور مجھ سے ان سے پہلی ملاقات جب حیدرآباد میں غالباً ۱۹۲۹ء میں میرے عزیز ترین دوست اور میزبان مولوی سید امین الحسن نسیمؔ موہانی مرحوم کے مکان پر مولانا عبدالرحیم صاحب (سابق انجمن اسلامیہ والے اور حال تفسیر القرآن والے) کی وساطت سے ہوئی تھی، تو میں بس اس قدر سمجھا تھا کہ ایک خوش مذاق و علم دوست نوجوان رئیس ہیں! (ان کی نفیس موٹر کی چمک دمک آج تک یاد ہے) دل و دماغ روح و ضمیر کے یہ حیرت انگیز اور قابل صد رشک جوہر تو رفتہ ہی رفتہ کھلے۔

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو؟ کیسے کیسے باغی و طاغی، غدار و سرکش، اسّی پچاسی سال کی عمروں کے پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، اور یہ مطیع و فرمانبردار بندہ، دین کا سپاہی اور امت کا علمبردار، ۴۰ ہی سال کی عمر ہی میں واپس بلا لیا جاتا ہے، سچ کہا اس عارف نے جس نے یہ کہا ہے

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست   کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

روایتوں میں آتا ہے کہ خلیفۂ برحق عمر فاروقؓ نے جب عین میدانِ قتال میں خالد سیف اللہ کو معزول کر دیا تو ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ لوگوں کا تکیہ حق تعالیٰ سے زیادہ خالد پر ہو چلا تھا، اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ فتوحات جو حاصل ہو رہی ہیں یہ خالد کی شجاعت و تدبیر کا نتیجہ ہیں، میں اس خیال کو مٹا دینا چاہتا ہوں۔ عجب کیا، جو ایک مصلحت کچھ اسی طرح کی اس جواں مرگ قائد ملت کی موت میں بھی ہو! ملت بہت زیادہ تکیہ اس بندۂ حق پر کر چلی تھی۔ اور مشیت تکوینی کو سبق یہ دینا منظور ہو کہ جو خدائے قادر و توانا، ایک بندہ کے توسط سے نصرت و کامرانی پر قادر ہے وہی اسی واسطہ کے بغیر بھی، اسی طرح قادر و متصرف ہے!

---

(۱۲) ہمشیر کی رخصتی [1]

ہمشیر ایک ہی تھیں، سن میں چار پانچ سال بڑی۔ عمر میں ۶۰ سال کے اندر۔ عابد اور صالحہ ایسی کہ دور دور تک مثال ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ حاجیہ، تہجد گزار نماز و تلاوت کی عاشق، غیبت و بدگوئی، لڑائی جھگڑے سے ناآشنا۔ ایک ایک کی ہمدرد و غم خوار۔ ۳۵ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں اولاد کوئی نہ تھی۔ وسط اپریل میں لکھنؤ میں بیمار پڑیں، اور بیماری کے وہ شدائد کہ الاماں، آہ، وہ تیمار داری کی راتیں! کبھی مایوسی کی تاریکیاں، کبھی امید کی ہلکی سی شعاعیں۔ ابھی قرآن مجید پڑھ پڑھ کر سنایا جا رہا ہے، رو رو کر دعائیں مانگی جا رہی ہیں۔ اور ابھی غفلت پھر امیدوں کے خواب دکھلانے لگی! پورا ایک ہفتہ موت و حیات کی کشمکش میں گزرا۔ سورہ یٰسین دن میں بیسیوں بار پڑھی جاتی رہی، اور دوا سے زیادہ استعمال آبِ زمزم اور شہد کا رہا۔ اپریل ۱۹۴۵ء کی ۲۲ تھی اور جمادی الاولیٰ کی ۵، کہ دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا، اور جو صابر و شاکر بندی شاید جنت ہی کے لیے بنی تھی، جنت کے سفر پر روانہ ہو گئی! غم نصیب ناکارہ سورہ یٰسین سنا رہا تھا، اور ایک جوان صالح منہ میں آبِ زمزم ٹپکا رہا تھا۔ گزرنے والی کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے دیکھے گئے، اور کمرہ رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کی صداؤں سے گونج اٹھا!——

موت شاید ہر مومنہ کی یوں ہی ہوتی ہے! غسل کے بعد چہرہ پر رونق تھی، معصومیت تھی، کوئی اثر نہ ضعف کا نہ مرض کے شدائد کا!— ایسا پر رونق و شاداب چہرہ شاید زمانۂ شباب میں ۳۰ - ۳۵ سال قبل رہا ہوگا نماز جنازہ لکھنؤ کے مشہور

---

[1] صدق، ۷ رمئی ۱۹۴۵ء

عارف باللہ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری نے پڑھائی۔ کئی دن قبل سے دعاؤں سے بھی لگے ہوئے تھے۔ جماعت میں شریک مولانا محمد اسلم فرنگی محلی مولانا عبدالباری ندوی (خلیفہ مجاز حضرت تھانویؒ) مولانا محمد عمران خاں ندوی اور دوسرے صالحین تھے۔ مولانا محمد شفیع فرنگی محلی اور دوسرے حضرات بعد کو پہونچے۔ تدفین بعد مغرب مشہور گورستان عیش باغ کے نئے چمن میں ہوئی۔ شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی، قبر میں یہ نامہ سیاہ اپنی عمر میں پہلی بار اُترا۔ اور جس نے عمر بھر نہ ان کے بہن ہونے کے حقوق ادا کیے تھے اور نہ سن میں بڑے ہونے کے، اس نے عالمِ ناسوت کی یہ آخری خدمت اپنے ہاتھ سے انجام دی ——— سن میں بڑی تھیں، مگر ساری عمر اپنے کو چھوٹا بنا کر رکھا تھا۔ آج اپنے پروردگار کے حضور میں ان شاء اللہ ہر طرح بڑائیوں سے سرفراز ہو رہی ہوں گی!

ماں کی خالص، بے غرض و بے لوث محبت کا اگر کہیں نشان ملتا ہے تو بہن ہی کی ذات میں۔ ہر بہن رکھنے والا اس کا تجربہ رکھتا ہے۔ اللہ نے آج وہ نعمت واپس لے لی، نعمت کا حق اتنے دنوں کب ادا ہوا تھا، جواب کبھی آئندہ اس کی امیدیں قائم کی جائیں ——— ہمشیر کی رخصتی ایک شادی کے وقت ہوتی ہے اور ایک یہ۔ وہ مجاز، اور یہ حقیقت!

عقلاً صبر کیا معنی، تسلیم و رضا داخل ایمان ہے۔ لیکن طبعی حزن و غم پر بس نہیں زندگی میں جو مستقل خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ زندگی بھر کے لیے ہے۔ صدق کے پڑھنے والے بھائی اور بہن اگر کوئی ہمدردی محسوس کریں، تو بجائے تعزیت نامہ پر وقت صرف کرنے کے، وہیں اپنی جگہ دعائے خیر فرمائیں اور اگر ہو سکے، تو کچھ قرآن پاک جس قدر بھی آسانی سے پڑھ سکیں، مرحومہ کو بخش دیں۔

غم اور طبعی غم میں، غم آفریں نے لذت بھی بلا کی رکھ دی! اور قلب کی قساوت کا تو اس غم سے بڑھ کر کوئی علاج ہی نہیں، کاش اسی کے اثرات میں پائداری ہوتی! ——— عجب شان حکمت ہے، اور جمال میں کمال، کہ نعمت دیتے ہیں تو ہنسا کر اور عارضی طور پر واپس لیتے ہیں تو رُلا کر! جسم کی لذت اُس میں، روح کی حلاوت اِس میں!

---

(۱۳) ایک قوال[1]

دریاباد - ۳ فروری سنہ ۱۹۴۶ء دوپہر - میت کو دفن کیے ابھی چلا آرہا ہوں - کل دن میں جاکر نزع کی حالت میں آب زمزم بھی تو پلایا تھا - مرنے والے کا نام افضل حسین تھا - عمر ستر سے کچھ اوپر - پیشہ یا "ذات" کے لحاظ سے قوال تھے ——— قوالی کا ذکر اور صدق کے صفحات میں ——— جی ہاں، صدق عالموں، زاہدوں عابدوں کا پرچہ کب ہے؟ نامہ سیاہ صدق نویس تو خود ہی ایک عامی اور عاصی ہے، اپنے ہم جنسوں کا ذکر چُن چُن کر کیا ہی کرتا ہے ——— ہاں تو اپنی جوانی کے زمانہ میں نامور قوالوں میں تھے، رُدولی کی چوکی کا شمار چوٹی کی چوکیوں میں تھا - آواز میں ایک خاص گداز، درد و اثر تھا - اب مدت سے نماز اور تلاوت کے شدت سے پابند تھے - نماز بڑے اہتمام سے اور دل لگا کر پڑھتے - قرآن مجید کے کئی ایک پارے اس سن میں حفظ کر لیے تھے - لکھنؤ میں کچھ دن جم کر رہنے کا موقع ملا، تو مدرسۂ فرقانیہ والوں کے پاس بیٹھ کر کچھ تجوید بھی حاصل کر لی تھی - اذان بڑے شوق کے ساتھ اور موثر لہجہ میں دیا کرتے -

بڑے پُرانے ہم نشین تھے - روزانہ سہ پہر کو آنے، بیٹھنے کا معمول ۲۴ - ۲۵ سال سے تھا مصاحبت اور علم مجلس کا سلیقہ تھا - جب پیشہ میں تھے، بارہا دل کو گرمایا تھا، تڑپایا تھا ——— اس راقم آثم نے برسوں سماع سنا ہے ——— محفل کے باہر جتنا اپنے لطیفوں سے ہنساتے تھے، محفل کے اندر اُسی قدر اپنے

---

[1] صدق ۱۲ فروری سنہ ۴۶ء

پُراثر ترنّم سے رُلاتے تھے۔ نزع کے وقت جب قبلہ رُخ چہرہ کرب سے کھنچ رہا تھا اور زیرلب اللہ اللہ جاری تھا، تو عبرت کی آنکھ روئی اور زبان نے دیکھنے والوں سے کہا "یہ وہی شگفتہ چہرہ ہے جو گھنٹوں ہنستا ہنساتا رہتا تھا" ——— زندگی کا آغاز تمام تر فسق کی غفلتوں سے، ہوا، خاتمہ رسول کی محبت اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دل میں آخری ارمان حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کا تھا ——— صحبت و رفاقت کا حق بڑا حق ہوتا ہے۔ نماز جنازہ پڑھاتے جب ایک آوارہ و ناکارہ کھڑا ہوا، تو خدائے آمرزگار کے حضور میں دعا دل سے یہ نکلی کہ "اے مغفرت و رحمت پر حریص مالک و مولا، تیرے دربار میں ایک بوڑھا نمازی حاضر ہو رہا ہے"!

---

(۱۴) جشن نوشابہ[1]

لکھنؤ ۲۹؍مارچ۔ جمعہ۔ ۷ بجے صبح۔ مرشد آباد پیلیس (دفتر حق وصدق) کی لق ودق بارہ دری میں اس وقت یہ چہل پہل کیسی ہے؟ چہل پہل ماتمی رنگ کی، جسے دیکھیے روئے دیتا ہے، رو ہی رہا ہے۔ ہنسنا، مسکرانا جیسے بھول ہی گئے ہیں، گھر اندر باہر بھرا ہوا ہے، اپنے بھی بیگانے بھی، بچے بھی، بوڑھے بھی، عوام بھی، خواص بھی، پر یہ ہے کیا کہ ہر آنکھ میں آنسو، ہر لب پر آہ وفغاں! یہ حق والے عباسی صاحب تو بڑے ہنس مکھ، صابر وضابط تھے، انھیں کیا ہو گیا کہ خود چیخ چیخ کر رو رہے ہیں، اور دوسروں کو بے اختیار رُلا رہے ہیں اور یہ اُن کے بڑے بھائی تو شاید ان سے بھی بڑھکر خوش مزاج تھے اور کہیں باہر بہت دُور ملازم۔ یک بہ یک یہ کیسے آ گئے؟ روتے جاتے ہیں اور شاید زیر لب کچھ پڑھتے بھی جاتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی پردہ نشین بیویاں، ان کی تو آواز تک کا پردہ تھا، یہ ہے کیا کہ بے اختیار سب باہر کی طرف ٹوٹی پڑتی ہیں، ساری رات ایک لخت رو رو کر کاٹی ہے۔ کل دن ہی سے رو رہی ہیں، جمعرات کی دوپہر سے جمعہ کی صبح کا وقت آ گیا، مسلسل اور بے ساختہ ایک عالم رونے پیٹنے کا ہے! کس نے اس مدت میں کھانے پینے کا نام اس گھر میں جانا ہے! سامنے دیکھیے نا، دیوان خانہ میں اُجلی شفاف چادروں میں لپٹی ہوئی، تازی نہائی ہوئی، کافور اور عطر کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی، گھر بھر کی مینا، بیٹی نوشابہ، پلنگڑی پر لیٹی ہوئی ہے! اچھا، تو یہ جشن نوشابہ ہے، وہ پُرانا جشن مسرت نہیں، مجلس ماتم، نوحہ، غم

---

[1] صدق ۱۰؍اپریل ۱۹۴۶ء

اور نغمۂ مسرت کے درمیان فرق ہی کیا ہے ؟

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی ، نغمۂ شادی نہ سہی

سنا تھا کہ ماں باپ کو اپنی اس گڑیا کی شادی رچانے کا بڑا ارمان ہے۔ ارمان کسے نہیں ہوتا ؟ یہاں تو اولاد کے داغ پہ داغ اُٹھانے کے بعد سات آٹھ اولادوں کو خاک میں سلانے کے بعد بھی ایک زندہ سلامت بچی تھی۔ سات لڑکوں سے بڑھ کر یہ ایک لڑکی عزیز، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، گھر بھر کی امیدوں کا مرکز، لڑکا بھی گھر ہی میں موجود، کہیں لے جانا نہیں۔ بھائی کی اولاد بھی اپنی ہی اولاد ہوتی ہے، تو کہیں لڑکی کی رخصتی ہی تو نہیں ہو رہی ہے ؟ بارہ برس کا سن، شادی کا سن تو نہیں ہوتا۔ لیکن عجب کیا جو ارمان کے مارے ہوئے ماں باپ نے اس سن میں شادی اور رخصتی ٹھہرا لی ہو! بیشک نوشابہ رخصت ہو رہی ہے۔ پھاٹک پر سیاہ رنگ کی لاری بھی تو لگی ہوئی ہے۔ رخصت وہاں کے لیے ہو رہی ہے جہاں جا کر پھر کوئی اپنے مٹی کے گھروندے میں واپس نہیں ہوتا۔ معصوم نے کل ہی اپنی بہنوں سہیلیوں سے کہا بھی تو تھا، کہ "اب ہم اپنے گھر جا رہے ہیں، ہمارا کہا سنا معاف کرنا، وہ دیکھو سفید موٹر کھڑے ہوئے ہیں"، بچوں کا انکشاف بہت قوی ہوتا ہے، عجب کیا جو برزخ کا انکشاف قبل سے ہو گیا ہو تو کیا ہنستی، کھیلتی، بھولی بھالی نیک سیرت و قبول صورت، محلہ کے غریبوں کو پیسے بانٹنے والی، پڑوسیوں کے دل میں جگہ رکھنے والی دنیا سے رخصت ہو گئی ؟ کل دوپہر کو اسی طرح کا فقرہ حسرت نصیب باپ کی زبان سے سنا بھی تو تھا۔ کسی آنے والے عزیز کو خبر دے رہے تھے۔ پلی پلائی ۱۲۔ برس کی اکلوتی کے لیے موت کا لفظ اُن کی زبان سے نکلا کیونکر ؟ ادائے تلفظ پر قدرت ہی زبان کو کیسے ہوئی ؟ اور پردہ نشین غمزدہ ماں! لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں رہی ہیں، محض سکتہ کا عالم طاری ہے، بیشک آنسو سلب ہو گئے ہوں گے، لیکن کلیجہ کی کھرچن کو کیا کر رہی ہوں گی ؟ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینے میں اٹھتی ہوگی، اس کا کیا علاج ہے ؟ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ہوئے اُجڑتے ہوئے دیکھ کر خود زندہ کیسے رہیں ؟ ہوش و حواس پر قابو رکھنے کی قوت و توانائی کس نے دے دی ؟ کڑے کڑے امتحان تو مالک و مولیٰ کے دربار میں پیمبروں کے اور خاص خاص برگزیدہ بندوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کیا ان عاجز و ناتواں بندوں بندیوں کو بھی اُسی مرتبہ پر پہونچانا منظور ہے ؟ در و دیوار بھی مرشد آباد پیلس کے اگر اس وقت رو رہے ہوں تو حیرت نہ کیجیے، اس سے بڑھ کر پراثر و دردانگیز منظر اس نے دیکھا کب ہوگا ؟

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں! اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں!
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں!

"سوئے مدفن" یہاں کسے لیے جا رہے ہیں؟ لڑکی کے یہ دن کھیلنے کھانے کے تھے، دوڑنے پھرنے کے تھے، گڑیا گڈے کے بیاہ رچانے کے تھے یا "سوئے مدفن" لے جائے جانے کے؟ لیکن شور و شیون کے ہنگامہ میں ذرا کان لگا کر سُنیے تو، غسل دینے والیوں کا بیان تھا کہ غسل والی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، عجب نہیں جو ہنس ہنس کر کچھ کہہ بھی رہی ہو، دل کے کانوں سے سُنیے، صدا کچھ اس طرح کی آ رہی ہے "میری امی آپ کا رونا، بلکنا سب آپ کے حق میں رحمت ہو رہا ہے، دنیا سے معصوم جا رہی ہوں، پھر آج جمعہ کا دن۔ انوار اور رحمتوں کی وہ بارش کہ میں خود انھیں میں گم ہوئی جا رہی ہوں۔ اپنے پیارے ابّو کو دیکھ رہی تھی، کیسا ہزار ڈیڑھ ہزار، روپیہ میرے دوا علاج میں صرف کر رہے تھے، جیسے کہیں کے امیر کبیر ہیں، آخر میرے ہی لیے تو جوڑ بٹور کر رکھنے والے تھے میرے فرض سے سبکدوش ہو گئے، امانت اپنے مالک کو واپس پہونچ گئی، یہ جُدائی کے دن ہی کتنے ہیں، اپنے آقا و سردارؐ کی یاد میں کاٹ دیجیے۔ جنھوں نے اپنی ایک نہیں، دو دو اور کنواری نہیں، بیاہی ہوئی جوان صاحبزادیوں کو کفنایا، دفنایا، اپنے ہاتھوں قبر میں اُتارا، مٹی میں سُلایا، اپنے مالک و مولیٰ کی سپردگی میں دیا۔ آپ کو تو اُنھیں کی کنیزی پر فخر ہے، اُنھیں سے سبق صبر کا بھی لیجیے، میرے لیے زیادہ نہ کڑھیے، یہ چند روزہ پردے اور حجاب تو آپ ہی کی مصلحت کے لیے ہیں، میں تو آپ لوگوں کی بخشش کا ذریعہ اور حیلہ بن رہی ہوں، دنیا میں آپ کی خدمت کر کیا سکتی تھی، آپ کی شفقتوں کا بدلہ کسی درجہ میں بھی کہاں دے سکتی تھی، یہاں البتہ انشاءاللہ کوثر پر آپ سے ملوں گی، بڑھ کر اور لپک کر آپ سے لپٹوں گی، مچلوں گی، آپ دونوں کی انگلی پکڑ کر جنّت میں لے چلوں گی، یہ وعدے سچّےؐ کی زبان سے آپ کو پہونچ چکے ہوں اور سچّے کے وعدے غلط نہیں ہوتے۔"

---

(۱۵) یادِ غم[1]

دریاباد ۱۳؍اپریل ۴۶ء۔ والدۂ ماجدہ کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کیے آج پورے پانچ سال انگریزی حساب سے ہوئے، اپریل ۴۱ء کی یہی ۱۳ ہی تو تھی (مرثیہ کے لیے ملاحظہ ہو صدق مورخہ ۲۸؍اپریل ۴۱ء) تربت مسجد سے متصل ہے، مسجد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں حاضری ہر روز پانچ بار بلکہ آمد و رفت ملا کر یوں کہیے کہ دس بار ہوتی رہتی ہے۔ پہلے ایصال ثواب و دعائے مغفرت کے بغیر گزر جانا ممکن نہ تھا، اب کئی کئی وقت اس کی بھی نوبت نہیں آتی۔ پہلے محض مٹی کے ڈھیر کا نظارہ دل کو بے قرار کر دیتا تھا۔ اب آنسو مدت ہوئی خشک ہو چکے، غفلت انسان پر کس درجہ مسلط رہتی ہے! غیرتِ یزیری کی عمر کتنی مختصر ہوتی ہے! بڑے سے بڑے حادثے گزر جانے کے بعد یوں معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے کبھی گزرے ہی نہ تھے ——— مرنا جیسے اوروں ہی کے لیے مقدر تھا! اور اپنے لیے تو سدا جیتے رہنا اور اسی طرح چلنا پھرنا، کھانا پینا، ہنسنا کھیلنا ہے!

مزار کے پائنتی ایک نیم کا درخت ہے، ہر سال اپنے موسم پر نئے پھول لاتا ہے، نئے سرے سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے، ابکی بھی اس وقت اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیسا سوکھا، بے رونق ٹھونٹھ ایسا کھڑا تھا۔ آج کیسا گلزار ہے، کیا مہک دے رہا ہے، نرم نرم ہلکی ہلکی ہری پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جا رہی ہیں، سفید سفید پھول کیسے خوشنما کھلے ہوئے ہیں۔ جیسے مردہ میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ اللہ اللہ! نباتات کے لیے یہ سرفرازیاں اور انسان کی قسمت

---

[1] صدق ۲۶؍اپریل ۱۹۴۶ء۔

میں محرومی! بہاروں پر بہاریں گزرتی جائیں گی اور یہاں دید و شنید کی حسرتیں ہی بنی رہیں گی؟

بہ ہر بہار گُل از زیرِ گِل بر آرد سر
گُلے برفت کہ ناید بہ صد بہار دگر!

معاً گویا کسی نے شانہ جھنجھوڑ کر سوتے سے چونکا دیا۔ خاک کے نادان پُتلے، یہ کیا ہذیان سرائی ہے، جب مخلوق کے ارذلوں کے ساتھ یہ لطف و کرم ہے تو تو سب سے اشرف ہے، اپنے مالک کا خلیفہ ہے، تیرے لیے جو سرفرازیاں ہیں، آج وہ تیرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں۔ یہ عزیزوں کی جدائیاں، یہ دل کی بے قراریاں، یہ دنیا کے صدمے اور امتحانات، سب تیرے مرتبے ایک سے ایک بڑھانے والے ہیں۔ خواب کا صدمہ بھی کوئی صدمہ ہے، آناً فاناً آنکھ کھُلی اور ختم۔ پھر یہ زندگی کا خواب تو اس خواب سے بھی کہیں زیادہ بے ثبات و بے بساط ہے، تسکین مقصود ہے تو آخرت کے خیال کو تازہ رکھ اور دل کو فانیوں سے توڑ کر باقی سے جوڑے رکھ۔

INSHA-E-MAJID

YA

LATAIF-E-ADAB

BY

HAZRAT MAULANA ABDUL MAJID DARYABADI